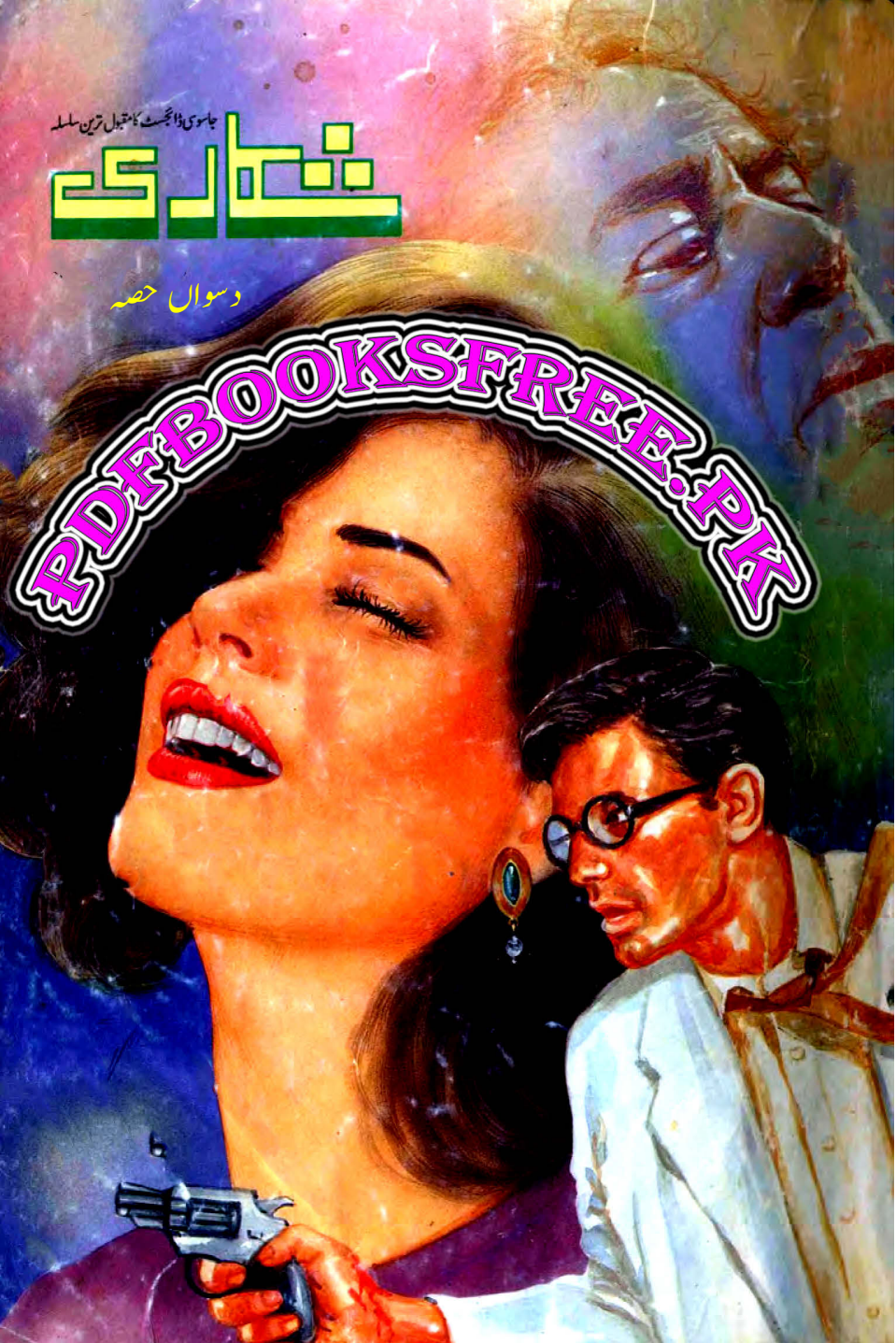


جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

ستارے

دسواں حصہ

PDFBOOKSFREE.PK





PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

نقاری عید تھارو ڈاڑھ

استقبال کے شریار و شبہ نشان قلم ہے۔

معاشرے کے اُن ناسوزوں کی رُوداد جو گوشت پلوست نے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اتر رکھتے ہیں ایک کفن

برہوش نو جوان کی کساف جس کے شب و روز موت کی

بستی میں گزر رہے تھے

چیلے کون سلگتی زات تک۔ آئن ویاس خوف کو ہراس

خارج حقیقتیں شیعری خواب

جاری رکھنے کے لیے موقع فراہم کیا۔

”معلوم نہیں کہ یہ کیا ہوگا، وہ بولی۔ فیمل میں کہیں نہیں ہوئی

تھی۔ میں نے رزلٹ دیکھا ہی نہیں۔ ہم اس زمانے میں برٹش

روڈ پر رہتے تھے۔ وہیں میرا کالج بھی تھا۔ ایک باہم کسی شادی کی

تقریب میں ناظم آباد گئے جس کی شادی تھی وہ میرے ابا کے

پرانے دوست کا بیٹا تھا۔ وہ ایک مقبول کاروباری گھرانہ

تھا اور اُن کے بہت سے کاروبار تھے جو چھ سات بھائی مل کر

سنبھالے تھے۔ اُن کے گھر میں لندن سے ایک مہمان آ کے ٹھہرا

تھا۔ لڑکوں کا کوئی دوست تھا، اُس نے مجھے دیکھا اور میرے

پیچھے پڑ گیا۔ میں ایک نادان اور عمر جذباتی لڑکی تھی، اُس کی

باتوں سے اور شخصیت کے رکھ رکھاؤ سے متاثر ہو گئی۔ دو چار

ملاقاتوں کے بعد ہی اُس نے بیفام بھجوا دیا۔ وہ لوگ درمیان

میں تھے جن سے ابا کے پرانے مراسم تھے جتنا بچہ کوئی تحقیق

تفیش نہیں ہوئی، لڑکے نے کہا کہ اس کے دور کے رشتے

سے جتنے چار ماہوں وغیرہ ہیں وہ ادھر ادھر ماری دنیا میں پھینے

ہوئے ہیں۔ اُس کی بڑی بہن دو بی بی ہیں اور بڑا بھائی کینیا

میں۔ اُن میں سے کوئی بھی شادی طے کرانے کے لیے اتنی دودھ

سے نہیں آئے گا۔ ویسے بھی اُن سے بس نام کا رشتہ کیا ہے

سب اپنے اپنے معاملات اور کاروبار میں مصروف ہیں۔ اُس کی

صاف کوئی نے سب کو قائل کر لیا اور شادی ہو گئی۔ وہ

”تم بھی شادی کر چکی ہو؟“ رابعہ نے کہا ”بھی کا لفظ اس

نے بلا ارادہ استعمال کر لیا تھا مگر میں محسوس کر سکتا تھا کہ اس

غیر شعوری عمل کے پس منظر میں کیسے جذبات کا فرمایا ہوں گے۔

”ہاں۔۔۔ ایک بار ایسا بھی ہوا تھا۔ پانچ سال ہو گئے

اس بات کو، مگر کبھی یہ کل کی بات لگتی ہے، کبھی میرے

بچپن کے۔“ وہ بولی۔

”کون تھا وہ؟“ رابعہ نے ایک فطری تجسس میں مبتلا

ہو کے کہا۔

”تھا ایک شریف آدمی۔ ڈاکو نہیں تھا۔“ وہ بولی، رشتہ

میرے والدین نے کیا تھا۔ اُس وقت میں انٹر کا امتحان دے

چکی تھی اور نتیجہ آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سوچا تو میں نے بھی

تھا کہ میں بی۔ اے، ایم۔ اے کر دوں گی، خوب پڑھوں گی اور پھر

بڑھاؤں گی۔ میں اپنے ساتھ کی لڑکیوں سے ذرا مختلف انداز

میں سوچتی تھی۔ وہ سب تو ڈاکو بننے کے خواب دیکھتی تھیں۔

یہ ایک فیشن تھا یا جذباتی انداز فکر جسے ماں باپ اور دوسرے

لوگوں کی طرف سے حوصلہ افزائی ملتی تھی مگر میں ٹھہرنا چاہتی

تھی۔ چاہنے سے کچھ ہو سکتا دنیا میں تو سب اچھا ہوتا۔ دنیا میں

غوث خالی ہوتی اور اسی ہوتا۔ کوئی کسی کا دشمن نہ ہوتا اور کوئی

مزیب نہ ہوتا۔ کوئی گل باؤ ڈاکو نہ بنتی، وہ چپ ہو گئی۔

”پھر کیا تم نے انٹر کر لیا تھا؟“ رابعہ نے اس کو بات

صرف ایک مہینے کے لیے پاکستان آیا تھا اور اسی عرصے میں سب کچھ ہوا تھا۔ جب وہ واپس گیا تو مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ ”کمان لندن“ میں نے کہا۔ ”ترکمان میں رہ چکی ہو؟“

”ہاں“ وہ اُداس سے مسکرائی۔ ”مگر بہت کم عرصہ۔“

تقریباً دو ہفتے۔ وہاں سے ہم ہیرس چلے گئے۔ دو ہفتے بعد ڈی جی پہنچے جہاں وہ اپنی بہن سے ملا۔ سچرینڈرا، وہاں اُس کا بھائی تھا۔ میں خوش تھی کہ مجھے ملوانے کے مہانے اس کے تعلقات تو استوار ہو رہے ہیں اور ساتھ ہی دنیا کی سیر بھی ہو رہی ہے۔

ٹھہرتے ہم تو وطن میں تھے۔ یہ مجھے عجیب سا لگا تھا کہ جہاں بھائی اور بہن کے گھر ہوں وہاں بھی ہم ہوٹل میں ہیں۔ بسکٹ بائریلی سے چلتا ہے۔ گھر میں جگہ تو بے حد بھی دلوں میں گنجائش نہیں ہوتی تو کوئی ممانوں کی خاطر خوب آرام ہو۔ ہم دوسری طرح کے لوگ ہیں۔ جہاں آجائیں تو پیچھے زمین پر سو جاتے ہیں۔ خود چاہے نہ دکھائیں اُن کو اچھے سے اچھا کھلاتے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ دو مہینے بعد ہم واپس پاکستان پہنچے ابھی تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے شوہر کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ میں نے اُسے کوئی کام کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ خرچ شاہانہ طور پر لیتے سے کرتا تھا۔ ہر جگہ ہم فوراً شاد رزم کے ہوٹلوں میں ٹھہرتے تھے۔ وہ نیکی میں سرفہرست نہیں کرتا تھا۔ جتنا عرصہ کہیں قیام کا ہوا۔ اتنے عرصے کے لیے کارکرانے پر حاصل کر لیتا تھا۔ میں نے خود بھی بہت شایستگی کی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرے تو ایک پتے دیا کا بانی ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا اور جس کے بارے میں نہ کوئی سوچتا ہے اور نہ جانتا ہے کہ کہاں سے آ رہا ہے۔ میں نے کبھی روکا ٹوکا بھی تو اُس نے کہا جان من! یہ فیکٹری میرے لیے چھوڑ دو۔ پھر پاکستان آنے کے بعد ہم نے الگ گھر لیا اور وہاں میرے شوہر نے مجھے پہلی بار بتایا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ ایک تو میری خوب صوفی سے متاثر ہوا تھا کہ نظر اہری خوب صورت بہت متنی ہے۔ یورپ بھرا ہوا ہے۔ کسی بھی ماڈل گرل کو دیکھ لو۔ اس بات سے مجھے متحور اور اسعد محسوس ہوا کہ کیا یورپ کی ایک معمولی ماڈل گرل جو بولے نہ نا اچھڑوں یا بچڑوں کے بغیر کسی اشتہار میں نظر آتی ہے مجھ سے بہتر ہے مگر حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے نا۔ اُس نے کہا کہ میرا انداز ہے میری ذہانت اور جرأت۔ شادی سے پہلے کچھ واقعات ایسے ہوئے تھے کہ اُس نے میری ان صفات کو نوٹ کیا تھا۔ پھر اُس نے واضح کیا کہ وہ ماہ کا یہ ہونے میں بھی ایک ٹیسٹ تھا جس میں میں سوئیں سے سوئے ہوئے رہا ہوں۔ اس ٹیسٹ کی تفصیل سن کر مجھے ہلے آگئے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ لندن سے میری

وہاں سے ڈی جی اور پھر کینڈا جاتے ہوئے میں کیا کچھ لے کر کسٹ سے گورنگی اور میں نے نہ کبھی شک کا اظہار کیا اور مزہ دلی کا۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ تم نے کیا کیا۔ میرے اعتبار کو دھوکا دیتے رہے۔ وہ ہولناکی نہیں، میں تو تھا اور اعتماد حاصل کرتا رہا اور اعتماد اب مجھے پرہیز نہ ہو کہ کسی شوہر کو اپنی بیوی پر نہیں ہوگا۔ میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔ ایک بار لندن میں دو آوارہ گرد کو روکے مجھے پریشان کر رہے تھے۔ میں نے سرعام اُن کی پٹائی کی۔ رات بھر کھائی مگر اُن میں سے ایک کو ہلکی طرح چٹائی تھی۔ میرے پرہیز سے بھٹ گئے اور مجھے جو کچھ بھی آئیں۔ کیونکہ وہ بہر حال ایک طاقتور مرد تھا مگر پولیس کے آگے ٹک میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ وہاں پولیس کو اُن سے کچھ نہیں ملے۔

”میں گئے، منٹ لگتے ہیں۔“

دو ماہ واقعہ ڈی جی میں پیش آیا تھا۔ میں کرسے میں اکیلی تھی کہ ایک سیکھ میرے کرسے میں ٹھکس آیا۔ وہ نشے میں دھند تھا۔ میں نے اس کو ہاتھ دوڑھائی بالیا، بڑے پیار سے اور وہ اُٹو کا پتھا۔

”چھو گیا؟“ رابع نے اسے ٹوکا۔

”سوری باجی، گل بانو نے کہا۔“ وہ بھانپ کر کہیں پٹ گئی۔

یہ پتا دوں کہ اُس وقت میں ہاتھ روم میں تھی جیسے ہی وہ میرے پیچھے آیا میں نے اُسے دھکا دیا اور غوراً باہر آ کر کڑی لگا دی۔ پھر نیچر فون کیا اور اُس نے پولیس کو بلا لیا۔ دس منٹ بعد وہ ہاتھ روم سے حوالات میں منتقل کر دیا گیا۔ میرے شوہر نے میری ہمت اور ذہانت کو سراہا اور کہا کہ تم نے تو کمال کر دیا پاکستانی لڑکیاں تو اتنی بزدل اور بے وقوف ہوتی ہیں کہ کارکوچ دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ تو میں بھی ہو جاتی ہوں۔ خیر، اُس نے مجھ سے پاکستان پہنچنے کے بعد کہا کہ میں آئی اے میں ائیر ہوٹل میں رہتی ہوں۔ وہ میری مدد کرے گا اور اس کے اوپر تک تعلقات ہیں میرے سرو کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ شادی شدہ عورتوں کو کہاں لیتے ہیں۔ میرا شوہر کہنے لگا کہ ضرورت ہے انھیں یہ بتانے کی کہ تم شادی شدہ ہو، ہم شے دیں گے تم جہاں جہاں ہم وہاں وہاں۔ ان پر یہ پابندی تو نہیں ہوتی نا کہ وہ کسی عرصے میں بھی نہ لائے فریڈ نہ رکھیں۔ کزن تو سب ہی ہلکے رکھتی ہیں۔ ٹھہرتی بھی وہ ہوٹلوں یا ہوٹلوں میں ہیں۔ میں نے کہا کہ تم کو خرم نہیں آئے گی بیوی سے ناجائز تعلقات رکھتے ہوئے اور جب تمہارا بڑا بڑا اچھا خاصا چل رہا ہے۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے ملازمت کی۔ عورت کی کمانی

کھانا تو میری نیت کبھی گوارا نہیں کرتی کہ وہ بہت ڈھیسٹ آئی تھی، کہنے لگا یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ میاں بڑی اگر ایک مڑی کے دو پیسے ہیں تو دونوں برابر ہو چکا ہے اور دونوں کو برابر ملنا چاہیے۔ ساتھ ساتھ پیسہ زمین سے آگیا جب بھی اس کے لیے بل چلانا پڑتا، کھانے کے لیے عزت ضرور کرتی پڑتی ہے اور ہم دونوں ایک بہترین ٹیم بن سکتے ہیں۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے لیے ہائر پورٹ پر الگ راستہ ہوتا ہے۔ ان کی چیکنگ بھی عموماً نہیں ہوتی۔ ہم ایک ہی جہاز سے سفر کر سکتے ہیں صرف ایر پورٹ پر ہم جدا ہوں گے اور وہ بھی ڈرامی دیر کے لیے، باہر ہم بھر جہاں ہیں گے۔ اُس کی اسکیم تو بہت لمبی تھی۔ تھوڑے عرصے کے میں نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں نے شادی کی ہے تو صرف بیوی رہوں گی اور گھر کے اندر سب کچھ کروں گی۔ گھر کے باہر کی ذمہ داریاں تمہاری ہیں۔ میں ان میں شریک نہیں ہو سکتی اس سے اختلاف بڑھا۔ وہ مجھے سمجھاتا رہا، میں اسے سمجھاتی رہی کہ جتنا پیسہ اب ہے اسی سے کوئی کاروبار کر لو یہاں۔ بہت زیادہ دولت کس کا کی اگر میرے ہمیشہ قانون کی تلوار چلتی رہے، ہر وقت احساس جرم ذہن پر تسلط رہے اور زندگی ایک مسلسل فرار ہو۔ اُس نے میری نہیں مانی اور میں نے اُس کی۔ وہ مجھے والدین کے گھر چھوڑ کے چلا گیا۔ دو ماہ بعد پھر آ گیا۔ اُس نے کہا کہ اب بھی وقت ہے۔ میں سوچ لوں ذرہ نہ مجھے طلاق دے کر چلا جائے گا۔ میں نے کہا کہ جاؤ گے کہاں تم۔ سب کچھ تو تم نے بتا دیا ہے اب مجھے معلوم ہے تم تو مجھے چھوڑ دے گے میں کب چھوڑوں گی۔ میں ایک ٹھکانے کا علم ہے مجھے۔ میں وہ آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں دیکھا میں نے اُسے۔

”تم نے اُسے تلاش بھی نہیں کیا؟“

”بہت تلاش کیا۔ میری ساری خوش فہمی دور ہو گئی۔ جو شخص انٹر پول کے ہاتھ نہ لگا اسے میں کیسے پکڑ سکتی تھی۔ پتا نہیں اُس کتنے نام ہوں گے اور کتنے جگہ لائے اور کتنے مددگار ہوں گے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر آج نہیں آئی، اُس نے خودی مجھے معاف کر دیا ہوگا کہ بے وقوف عورت ذات ہے۔ بڑا بڑا تعلیم و تربیت کے غول سے نہیں نکل سکتی وہ نہ مجھے اٹھا سکتا تھا، قتل بھی کروا سکتا تھا۔“

”اُس نے تمہیں آزاد بھی نہیں کیا تھا؟“ رابع نے کہا۔

”میں قانونی طور پر نہیں آج بھی اُس کی بیوی ہوں۔“

وہ بولی۔

”اور اس کی گمشدگی کو کتنے سال ہو گئے؟“

”پانچ سال، گل بانو نے کہا۔“

”اُس ماہ میں وہ بالکل لا تیار رہا، تمہارے کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوا؟“ رابع وکیل بن کے کیس کی قانونی نوعیت کا جائزہ لے رہی تھی۔

”گل بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ ایک بات نہیں ابھی تم نے کمر میرے پچھ کیوں نہیں ہیں۔ کم سے کم ایک تو ہوتا۔“

میں نے داخلہ معقولیات سے گریز کیا تھا ورنہ یہ سوال بہت دیر سے میرے ذہن میں گھل رہا تھا۔

”بعض اوقات مجھے دیر سے ہوتے ہیں اور اب تو کدہ“ وہ تو خدا کی مرضی کی بات ہے باجی، یہاں تو میرے شوہر کی مرضی کو دخل تھا۔ گل بانو نے کہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ پہلے سال میں ہی میں ماں بن جاؤں۔ مجھ سے تو وہ کتا تھا کہ ساری عمر بڑی ہے پچھتہ پیدا کرنے کے لیے۔ ابھی سے ان جھیلوں میں پڑ گئے تو لاف کو خاک انچوائے کریں گے۔ میں اُسے کیسے تیار کر عودت کے لیے تخلیق کے عمل سے گزرنا سب سے بڑی انجوائے منٹ ہے۔ اس کے بعد وہ ماسک کے جذبات کو انجوائے کرتی ہے۔ یہ سب مرد نہیں سمجھ سکتا، کیونکہ اس کا کام تو ختم ہو جاتا ہے نا۔ عورت ہی کو سب کچھ کرنا ہوتا ہے بعد میں اکیلے۔“

رابع ٹھوڑی سی جھنجھپی، لیکن گل بانو نے صرف حقیقت بیان کی تھی۔

”اصل مقصد تو اُس کا پورا اور تھا۔ میں ماں بنتی تو وہ مجھے غیر شادی شدہ لکھوا کے پانی آئی میں ائیر ہوٹل کیسے بھرتی کرانا۔“ گل بانو نے کہا۔

”میرے خیال میں تم نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا اگر تمہاری جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو میری کرتی۔“ رابع بولی۔

”گل بانو نے نفی میں سر ہلایا۔“ میں نے جلدی کی اور جذبات سے کا لیا۔ عقل سے کا لیتی تو اُس کو ڈرنا دے دھکا دے اور طاقت سے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتی بلکہ یہ کام آہستہ آہستہ کرتی۔ کچھ مہلت لیتی اُس سے، کچھ اضطامہ کرتی شکاری کہ ائیر ہوٹل میں بعد میں بول گی، پہلے میں ماں بنوں گی۔ میں تمہاری بات مانتی ہوں، تم میری بات مانو۔ شادی کو ایک سال چھپا جا سکتا ہے تو بچے کو بھی چھپا جا سکتا ہے اور ایک بچے کی ماں کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ یہ سب ہو جاتا اُسے میری اشد ضرورت تھی۔ ایک سال بعد جب وہ باپ بن جاتا تو اُس کے پیروں میں ایک اور زنجیر پڑ جاتی۔ پھر اس عرصے میں ایک عودت من کے میں اُس سے کچھ بھی مناسکتی تھی عودت

اگر چاہے تو اس کا جادو مرد کے سر پہ چڑھ کر بولے، مگر یہ جادو اس کی کمزوری میں ہے۔ بشرہ زوری میں نہیں، یہ بات اگر نہیں سمجھ لیتی تو میرے لیے کچھ بھی نامکن نہ ہوتا۔ عورتوں نے تو حاکموں پر حکمرانی کی ہے۔ جو عورت امرت کی حد رکھیندی ہے دل پر حکومت کرتی تھی اس نے یونانی ارب بیتی تاجر و اناس کو بھی فتح کیا۔ الزبتھ ٹیلر نے کتنے مرد فوج کیے، ان بادشاہوں کی طرح جو ملک فتح کرتے ہیں مگر ان عورتوں نے طاقت سے نہیں عبت سے فتح حاصل کی۔“

میں احمقوں کی طرح اس عورت کا فلسفہ سننا باجوکل ملک ناگ منی تھی ایک خطرناک ڈاکو کی خطرناک بہن۔ آج وہ گل بانوں کے زندگی کی باریک نفسیاتی گتھیاں سلجھا رہی تھی، نیچے تباہی تھی کردہ لندن پیرس گھوم چکی ہے۔ اس کے اندر کی حقیقی عورت کا لہو پنا قابل یقین تھا۔ یہ مجھے دوسری شخصیت کا پس لگتا تھا۔ ناگ منی اور گل بانوں میں قطبین کی دوری تھی، آکاں اور پاتال کا فرق تھا۔

”تمہارے بھائی اور تمہارے والدین نے تمہاری مدد نہیں کی؟“ رابعہ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

”مدد تو سب نے کی تھی، مگر حاصل کچھ نہیں ہوا۔ گل بانوں نے کہا۔“ آٹھ پولیس میں رپوٹ کرنے سے ہمارے لیے مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ وہ رات دن تفتیش کے لیے آتے تھے، ہمیں بولتے تھے۔ انھوں نے میرے الزامات پر بہت سے تفصیلی بیانات لیے۔ کس الٹ آئی اے نے لے لیا۔ معاملہ ایک اسمگلر کا تھا اور میں اس کی شریک حیات کی حیثیت سے انکشافات کر رہی تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ میں نے شریک جرم ہونے کا اعتراف نہیں کیا ورنہ میں تو اندر ہو ہی جاتی۔ پھر ایک بہت سمجھ دار افسر نے جو الٹ آئی اے میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھا، ہمیں سمجھایا کہ یہ سب بے کار ہے۔ ہم لوگوں کو آگ سے کھینٹے ہوئے ڈرنا چاہیے۔ جو نقصان ہونا تھا ہو گیا مگر آگے جانے سے زیادہ نقصان ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ وہ خود کسی کے ہاتھ نہیں آتے۔ ہماری خاندان اور محلے میں بہت بنامی ہو چکی تھی۔ لوگ ہر طرح کی باتیں کر کے مزہ لیتے تھے۔ ہم کس کس کو جھوٹا لیتے اور کہاں کہاں جا کے تردد کر رہے تھے۔ میرے آبا نے بھی مناسب سمجھا کہ اس ہمدردی کے آنے والے افسر کے مشورے پر عمل کیا جائے۔ ہم نے وہ معاملہ ہی نہیں چھوڑا۔ ابھی چھوڑ دیا۔ یہ پور خاص سزا دینے کی تھی۔ کچھ زمین تھی۔ وہ زمین آدمی کی فصل کے لیے بہت زرخیز تھی۔ آبا نے یہ فیصلہ کیا کہ ان زمینوں کو آباد کریں مگر یہ کہے

معلوم تھا کہ ہم سے قدرے ایک اور غلط فیصلے پر دستخط کرالیے ہیں۔ تمہیر کیا کرے گی جہاں تقدیر ہی خلاف ہو۔ پچاس سال بہت اچھا گزرا۔ میرے بھائی نے آگ کے ایک باغ کا ٹھیکہ لے لیا۔ وہ اس کام کا تجربہ حاصل کر چکا تھا اور اس کا رو بار کی اونچ نیچ کھنچا جاتا تھا۔ اس ٹھیکے سے پہلے ہی سال پچاس ہزار کا فائدہ ہوا جو اس وقت کے اعتبار سے بہت بڑی رقم تھی۔ اس علاقے میں سرحد پار کے ڈاکو بہت بڑگرم تھے۔ وہ گرد و فوج کے علاقوں میں حملے کرتے تھے اور عموماً ہندو سیٹھوں کو لوٹتے تھے۔ اندرون سندھ ہندو سا بڑا کار آزادی کے میں سال بعد بھی معاشی طور پر بہت مستحکم تھے۔ لیکن ڈاکو کسی کے مذہب سے کیا تعلق۔ ان کے جیسے ڈاکو دھرم بھی تھے اور وہ بھی مسلمانوں سے رعایت نہیں کرتے تھے۔ جس دن میرا بھائی ٹھیکے کی نیلامی سے ملنے والی رقم لے کر گھر آیا اسی رات ڈاکو آئے۔

”کسی نے خبر کی کی تھی؟“ رابعہ نے کہا۔

”خبر کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ نیلامی میں سب کے ساتھ وہ بھی ہوں گے۔ کسی کی صورت پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ ڈاکو ہے۔ میرا بھائی بھی اس خطرے سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ رقم لے لیا مگر پھر کہیں اور ملے گیا۔ دن کا وقت ہوتا تو وہ بینک میں جمع کراتا۔ رات کے وقت اس نے سب پیسہ ایک تھیلی میں ڈال کے زمین میں دبا دیا شاید کسی نے اسے دیکھ لیا یا کوئی پیسے سے اس تک میں تھا۔ وہ گھر گیا اور رات کو ڈاکو آئے۔ انھوں نے مجھے، میرے دو بہنوں کو اور ماں کو قہقہے میں کر لیا۔ اور پچاس ہزار روپے مانگے۔ میرا بھائی ان کے سروار کو ہال لے گیا جہاں اس نے رقم چھپائی تھی۔ وہاں اس کو خالی گڑھا ملا۔ کوئی پٹھان میں خنجر گھونپ رہا تھا۔ ڈاکو ہم سب کو ساتھ لے گئے۔ میرا باپ بندھ لے کر قہقہے دوڑا اور ان کی ہوائی فائرنگ سے مارا گیا۔ ڈاکو جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ تم کا بندوبست ہو جائے تو اپنی عورتیں لے جانا۔ وہ سرحد پار کے کسی علاقے سے آئے تھے۔ رات بھر چلنے کے بعد وہ کسی غیر آباد مقام پر پہنچے جہاں انھوں نے ہم سب کو الگ الگ رکھا۔ انھیں ڈر تھا کہ یہ مسلمان عورتیں ہیں جو اپنی عزت پر جان قربان کرنا معمولی بات سمجھتی ہیں، کہیں بڑھیا ایسی تینوں بیٹیوں کا گلہ نہ دیا دے۔ ایک بار پھر میری عقل اور بہت کام آئی۔ میں نے سردار سے کہا کہ تم میرے بیچ دو۔ میرے پچاس ہزار تو قبل ہی جا چکے تھے کسی پردہ فروش سے۔ باقی سب کو جانے دو۔ وہ بہت حیران ہوا۔ کہنے لگا کہ تیری باقی دو

بہنوں کو بھی بیچ دوں۔ ڈر تھا لاکھ تو قبل جا چکے تھے۔ میں نے کہا کہ اول تو یہ اصول کے خلاف ہو گا۔ تم نے کبھی ایسا نہیں کیا ہو گا۔ کچھ پچاس اور وصول کرو ڈر تھا لاکھ دوسری بات یہ کہ میری بہنیں ہیں بہت غیرت والہ وہ خود کشی کر لیں گی۔ ڈاکو نے کہا کہ اتحادہ غیرت مند ہیں اور قہر بہت ہے۔ میں نے کہا کہ ہوں تو میں بھی بہت غیرت مند مگر یہاں سوال اپنی جان بچانے کا نہیں دوسروں کی عزت اور جان بچانے کا ہے کسی کو تو قربانی دینی پڑے گی کسی کو سونے اپنی زندگی قربان کرنی پڑے گی۔ دو کی عزت اور دین کی جان بچ جانے تو میرے نزدیک یہ بڑا جرم نہیں۔ ڈاکو جھپٹیں آگیا۔ کہنے لگا کہ اچھا اگر میں ہی دیکھ لوں تجھے؟ میں نے کہا کہ وہ تمہاری مرضی۔ تم رکھ سکتے ہو کسی کو بھی پچاس روپے کی عورت یا پچاس ہزار کی عورت۔ آخر شہر کے لوگ بھی گاڑیاں رکھتے ہیں۔ کوئی دس ہزار کی رکھتا ہے اور کوئی ایک لاکھ کی شوق اور حیثیت کی بات ہے۔ بس جناب ڈاکو تو ایک دم شرمسار ہوئے اس ادا پر۔ رات کو میں نے اس کا کام تمام کیا۔ اس سے روٹا اور بھینا اور اسے گولی مار دی۔ یہی بنیادی غلطی ہوئی مجھ سے۔ میں اسے لگا گھونٹ کے تو نہیں مار سکتی تھی۔ وہ ایک طاقتور مرد تھا مجھے زہر وغیرہ میں بھی مل سکتا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ میں اس کے سر پر کچھ مارتی۔ وہی روٹا اور باقی خنجر سے اس کا گلہ کاٹ دیجی۔ یہ سب میں نے بعد میں سیکھا اور کیا مگر اس وقت تجربہ نہیں تھا۔ صرف حوصلہ تھا۔ گولی چلنے کی آواز نے دیر سے میں کھلبلی مچادی۔ باقی ڈاکو اسلحہ لے کر آئے لیکن میرے سامنے آکے دو پاسے گئے تو باقی ذرا ہو گئے۔ چلتے وقت یہ کہاں کو بھی لے گئے اور دونوں بہنوں کو بھی۔ میں اکیسی رہ گئی اور یہ مدت پچھو کہ کس طرح گھوڑے پر سوار ہو کے پانوں رات سفر کرتی ہوئی سرحد پار کر گئی۔ مجھے صرف سمت کا اندازہ تھا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ سرحد کتنی دور ہو گی۔ میں نے کبھی گھوڑے پر سواری بھی نہیں کی تھی اس دن کرلی گھوڑا بہت سمجھدار جانور ہوتا ہے۔ میں دو بار گری گھر گھوڑا سمجھا کہ نہیں۔ اس نے میرا ساتھ دیا اور اس رات وہی میرا دوست ہمدرد تھا اور میرا ساتھ دیا اور اس رات وہی میرا دوست ہمدرد تھا کسی سرحد پر کوئی گشت کرنے والا نہیں ملا۔ دھرمی ایس الین والے مل سکتے تھے۔ ادھر دہریز۔ جمع ہونے سے پہلے ہی میں ایک گاؤں میں پہنچی تو مجھے پتا چلا کہ گاؤں پاکستان کی سرحد میں ہے۔ وہاں میں مسجد کے دروازے پر گر پڑی اور جو لوگ جمع نماز پڑھنے آئے، انھوں نے مجھے سمجھا لیا۔ میری بیٹاسنی اور مجھے پولیس کے درپے میرے بھائی تک پہنچایا۔ میرا بھائی تقریباً

بائل ہو گیا تھا۔ وہ ڈاکوؤں سے رابطے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے اسوں کا باغ اور ملحقہ زمین سے سب پچاس ہزار میں فروخت کر دیے تھے حالانکہ وہ کسی بھی طرح ستر پختہ ہزار سے کم نہ تھے مگر اسے جلدی تھی اور وہ ہوش میں کہاں تھا کہ نفع اور نقصان کو سمجھتا۔ اسے تو بس پچاس ہزار سے کرماں اور بہنوں کو واپس لانے کے خیال نے باگل کر دیا تھا۔ جب میں پہنچی اور میں نے اسے ساری کامیابی سنائی، لیکن اس کامیابی میں سے میں نے بہت سا بچ نکال دیا۔ وہ وہ دانا پاگل ہو جانا کہ مجھے بھی قتل کر دیتا۔ میں نے اپنی بے وقوفی کی بات اسے نہیں بتائی۔ میں نے کہا کہ ڈاکوؤں نے مجھے چھوڑ دیا ہے یہ بیجا اہمیتانے کے لیے کہ پچاس ہزار کا انعام رکھو ہم خود آگئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ نہیں آئے۔ میرا بھائی پچاس ہزار لے کر پھر تارا۔ اس کی مالویسی بڑھتی گئی۔ پولیس اس کی مدد کرنے سے قاصر تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ڈاکو سرحد پار سے آئے تھے۔ میرے بھائی کا انعامی جنون اتنا بڑھ گیا کہ اس نے اپنے دو قابل اعتبار ساتھیوں کو ساتھ لیا اور مجھے ساتھ لیا۔ ہم رات کی تاریکی میں سرحد پار کر جاتے تھے اور ان ٹھکانوں کو تلاش کرتے تھے جہاں وہ ڈاکو مل سکتے تھے مگر میرا خیال ہے کہ ان کا گروہ ٹوٹ گیا تھا۔ ان کا سردار مارا گیا تھا اور دوسرا بھی بھی مارے گئے تھے ہائی سب ادھر ادھر ہو گئے اور۔۔۔ ان کے ساتھ وہ بھی ادھر ادھر ہو گئے۔ میری ماں اور بہنیں ماں کو تو شاید مار دیا ہو گا انھوں نے یا کہیں ریگستان میں چھوڑ دیا ہو گا۔ بہنوں کا پتا نہیں وہ کس کے حصے میں آئیں، زخمہ رہیں یا یک۔ چار چھ مہینوں میں ہم نے کون سے جگہ نہیں چھوڑی۔ میرے بھائی نے مجھے اس لیے ساتھ رکھا کہ میں اس جگہ کی نشاندہی کر سکتی تھی جہاں ہمیں لکھا گیا تھا اور انھیں پچا جانتی بھی تھی۔ اس عرصے میں ہمارا سامنا متعدد بار سرحدی پولیس سے ہوا۔ ہم بھائی بہن تو بچ گئے۔ مگر اس کے دونوں دوست ایک ایک کر کے مارے گئے۔ اس کا اشتعال اور بڑھ گیا۔ اب اس نے باقاعدہ گروہ بنالیا اور سرحدی دہشت میں ڈاکے ڈالنے لگا۔ اس کی تمام سرگرمیاں پاکستان کی سرحد کے اس پار تک محدود رہیں۔ میں اس کے ساتھ براہری شریک تھی۔ ویسی ہی انتقام کی آگ میرے خون میں بھی دھک رہی تھی مجھے کوئی طال نہیں ہوتا تھا جب میرے بھائی کے گروہ کی بربریت کا شکار عورتیں بچے، بوڑھے اور بے گناہ

لوگ ہوتے تھے تو میں سمجھتی تھی کہ یہ تو صاحب برابر ہو رہا ہے۔ ہم نے نئی بار خوردوں، بچوں کے عوض پچاس پچاس ہزار روپے کا تادان وصول کیا۔ کبھی تادان نہیں ملا تو ان خوردوں کو میرے بھائی نے منڈی میں ایسے بیچ دیا جیسے وہ بھیڑ بکریاں ہوں۔ جب وہاں دونوں طرف سے پولیس اور سرحدی حفاظتی فوج کا دائرہ ہمارے گرد تنگ ہونے لگا تو ہم نے سرحد بدل دی۔ ہم یہاں پورخاص کے علاقے سے بہاولنگر چلے گئے۔ وہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ وہاں سے ہم داگمک سرحد پہنچے اور اب حال ہی میں پھر پتھر پار کر، کھوکھرا پار اور ننگر پار کر کے علاقے میں وارد ہونے کرنے لگے تھے۔

”کبھی... اتنے طویل عرصے میں تمہیں خیالے نہیں آیا کہ انتقام کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔... اور کیا یہ واقعی انتقام بنتا؟ میں نے کہا: ”یا محض ٹوٹ مار اور جرم کی زندگی گزارنے کی عادت؟“

وہ کچھ دیر خاموشی سے اپنے اٹھ گٹھ کو باقی رہی پھر اُس نے کہا: ”اب انتقام کا خیال تو نہیں آتا تھا۔ ہم بھول چکے تھے اُن کو... کبھی یاد کرتے تھے تو ایسے جیسے وہ مر چکے ہوں اور وہ ہمارے لیے واقعی مر چکے... زندہ ہوں تب بھی کیسے مل سکتے ہیں۔“

”تم نے کتنے قتل کیے ہوں گے اب تک اپنے ہاتھوں سے؟“ میں نے کہا۔

”تم اعتراف جرم کرنا چاہتے ہو؟ وہ بد گئی۔

”نہیں، ایسے تو ہم نے بھی بہت لوگ مارے ہیں مگر ہم اس کو قتل نہیں سمجھتے۔ یہ جنگ تھی، اس میں ہم بھی مارے جا سکتے تھے اور ہمارے ساتھی بھی مارے گئے۔ ہتھیاری جنگ کا مقصد مختلف تھا اور ہمارے دشمن مختلف تھے۔ تم نے اپنے دفاع میں گولی چلائی ہوگی۔ قتل وہ ہوتا ہے جو آدمی سوچ سمجھ کے ایک پلان کے مطابق ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کرتا ہے۔“

میں نے کہا:۔

”مارے تو نہ جانے کتنے گئے میرے ہاتھوں مگر ایسے کسی کو نہیں مارا میں نے، جیسے تم۔۔۔ ہو۔“ وہ بولی ”ہاں ایک لڑکی نے مجھ سے کہا۔۔۔

”تھی کہ اُسے مار دوں اُس کے سر۔۔۔ بگنی تھی۔ اُسے میں نے مارا تو نہیں مگر غرور کر۔۔۔ س کے بعد میں نے اپنی ذمہ داری بنائی کہ جب جی جان خوردیں

آئیں تو انہیں اپنے ساتھ اپنی نگہانی میں رکھوں“ خاموشی کے ایک اور طویل وقفے کے بعد میں نے کہا: ”یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے پاس بھی حالات کا جواز ہے مگر کیا تم مطمئن تھیں اپنی اُس زندگی سے کہ اب ایسے گوارا سکتی تھیں؟“

”میرے لیے انتخاب کہاں تھا میرا کوئی مستقبل بھی تب ہوتا جب میرا ایک خرفیانا ماضی ہوتا۔ بھائی کے ہاتھوں دو اپنے ہی ساتھی اس لیے مارے گئے تھے کہ انہوں نے مجھ پر بڑی نگاہ ڈالی تھی اور ایک نے دوست دلیری کی بھی کوشش کی تھی۔ اُس وقت میرے ڈاکو بھائی نے یہ نہیں سوچا کہ اب میری زندگی کا ساتھی کوئی ڈاکو ہی ہو سکتا ہے۔ طریت آدمی کہاں سے آئے گا اور کبوں آئے گا میرا ہاتھ مانگنے والے بھی نہیں شادی شدہ تھے۔“

”انتہائی سخت تھیں پائیس نے تمہی سے کہا۔ دو سال کے بعد تم بیسنگ نکاح کی درخواست دے سکتے ہو،“ رابع نے فوراً قانونی مشورہ دے کر بات بنائی ”قانوناً سات سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے کسی کو لاپتہ قرار دینے کے لیے مگر ایک بات تو بتاؤ، وہ جو تمہارا شوہر بناتا تھا اُس کا نام کیا تھا؟“

”عبداللہ، گل بانو نے سپاٹ لیمے میں کہا۔

مجھ پر اس نام کا رد عمل شدید ہوا یا رابع چونک پڑی تو یہ ایک قدرتی بات تھی۔ میرے ذہن میں فوراً عامی عبداللہ کا خیال آیا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ دنیا میں ہزاروں عبداللہ ہوں گے۔ اُن میں بد معاش، اسمگلر، چور، ڈاکو، قاتل بھی ہوں گے۔ ضروری تو نہیں کہ وہ عبداللہ ہو مگر ایسا ہونا بعد از قیاس بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں عبداللہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرتا میں نے مہینہ کو اور اُس سے چند قدم پیچھے کریم بلوچ کو آدیا دیکھا۔ وہ شاید موٹر بوٹ کہیں اور چھوڑ کے آئے تھے۔

کریم بلوچ نے سر پر ایک ٹوکری اٹھا رکھی تھی اس کا وزن بھی کافی معلوم ہوتا تھا۔ لاٹچ پر آنے کے بعد اُس کے لیے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ میں نے اُسے سنبالا اور ٹوکری نیچے لے جانے میں مدد دی۔ ٹوکری میں وہ سب تھا جو میں نے منگوا یا تھا مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ کپڑوں کے نیچے ایک ایف ایم بینڈ ریسور تھا اور ایک شارٹ ویو ٹرانسمیٹر، بیڑی اور متعلقہ سامان۔ سب سے اوپر کھانے پینے کا سامان۔ ایک شاہانہ ضیافت

کا پورا اہتمام۔

نہیں جب پھر اوپر آیا تو مہن خال میری جگہ اُلٹی پالٹی مارے بیٹھے ہوئے تھے اور گل بانو ہنس رہی تھی، معلوم نہیں کس بات پر۔ اُس کے مقابلے میں مہن نہایت بھونڈے پن سے شرما رہا تھا۔

”کیا ہوا، چاندی ہلا؟“ میں نے اُس کی طرف اُلٹی پالٹی موبھی ملا کے کہا: ”یہ مردوں کا زور کہاں سے لیا؟“

رابع کھلکھلا کے ہنسی: ”یہ تو میں نے بھیے پوچھا تھا۔“

”اب میں موبھیوں کے بارے میں عرض کروں یا چارلی چپن کے متعلق بتاؤں؟“ مہن جھلکے کے ”سب کچھ بھی کر رہے ہیں جیسے موبھیوں نہیں، گدھے کے سینگ ہیں۔ تم سن ناگ منی...“

”اے، خبردار جو میری بہن کو پھر اس نام سے پکارا۔ گل بانو ہے اس کا نام،“ رابع نے اُسے ڈانٹا۔

”مہن بھونچکا ہوا گیا: ”بہن؟ گل بانو... یہ کیا ڈراما ہے خاتون اول؟“

”بعد میں پتا چلے گا،“ میں نے کہا ”تم یہ بتاؤ غالب ملا؟“

”مہن نے نفی میں سر ہلایا۔“ اُس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔“

”تو پھر اتنی دیر رات کے دس بجے تک آپ کہاں جھک مارتے رہے؟“ رابع نے کہا۔

”کیا وہ آیا ہی نہیں؟“ میں نے کہا۔

”کیا تو تھا ٹھیک وقت پر؟“ مہن بولا ”مگر میرے پاس رکنا نہیں، غائب تو نذریشہ تھا کہ اُسے دیکھا جا رہا ہے کوئی اُس کی نقل و حرکت کی نگہانی کر رہا ہے چنانچہ وہ میرے قریب سے بھی نہیں گزرا، خاصے فاصلے پر تھا۔ جب اُس نے وہ کے۔ ٹوکی خالی ڈیا نکال کر ایک طرف پھینک دی تو میں سمجھ گیا کہ دال میں خاصا کالا ہے۔ میں نے اُسے جانے دیا اور اُس خالی ڈیا پر نظر جمائے کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد میں سہتا ہوا اُسے گرہا۔ اُسی وقت ایک جھلکری نمودار ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں تھی جھارواہ کرپوٹو کری۔ اُس نے وہ ڈیا اٹھائی اور ٹوکری میں ڈال لی۔ اب میں اُس کے کچے تھے۔ پھر میں نہیں آتا تھا کہ اُس کیسے روکوں اور اُس سے وہ خالی ڈیا کیسے مانگوں۔ یہ امید تھی کہ میں دیکھیں وہ کوڑا پھینک دیں گی۔ اس کے پیچھے مجھے کافی

خوار ہونا پڑا۔

”تھی کیسی؟“ میں نے اُس سے کہا۔

”گل بانو بے اختیار ہنسی۔ مہن بگڑ گیا۔

”تم لوگ یہ س نہیں ہو۔ وہ سالی تھی پچاس برس کی بڑھیا۔“

”گالی نہیں، گل بانو نے انگلی کے اشارے سے کہا۔

”مہن ایک بار پھر ہتھکڑیا رہا گیا: ”یا مظہر العجائب... میں ہوا کا فرد وہ کاغذ مسلمان ہو گیا۔“

”پھر وہ کیا ملی؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

”ہاں ملے، اُدھے کھٹے بھرا کوڑے کے ڈھیر سے۔“

”مہن بولا: ”میں نے اُسے فورے دیکھا اور پھر کھول کے پھاڑا۔ اُس کے اندر غالب نے لکھا تھا، تو تم بھی دیکھ لو۔“

اُس نے حجب میں ہاتھ ڈال کے گتے کا وہ لکھنا نکالا جس کے پیچھے کے ٹوکی تصویر تھی۔ اس پر لکھا تھا۔

”دیر اور۔۔۔ الیف ایم ون ڈبل نیرو۔“

”میں نے پیغام کا مطلب فوراً سمجھ لیا۔“ پھر تو بازار چلا گیا؟

”نہیں۔ میں نے کریم بلوچ سے کہا۔ اس نے مجھے ایک بندے سے ملوایا جو پورٹ کے علاقے میں چوری کے مال کا سب سے بڑا بیوپاری ہے۔ جہاز کے بے ایمان ملازم جو کچھ یاد کر سکتے ہیں اُسے اونے پونے بیچ جاتے ہیں۔ آگے اُن سے مال خریدنے والے بہت ہیں، کیونکہ جہازوں پر سب فادران آئیٹم ہوتے ہیں۔ اُنہی کی معرفت یہ شارٹ ویو ٹرانسمیٹر اور بیڑی وغیرہ ملے۔“

”کھانا بھی فادران ہے۔ اُسی سے ملا؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، کھا کے دیکھو۔ بس ناگ منی سموری گل بانو یہ دونوں تو ہیں میری جان کے دشمن، تم ہی پوچھ لو کھانے کو۔ ظاہر ہے تم نے بھی میرے بغیر کچھ نہیں کھایا ہوگا۔“

”جاکے دیکھو میں تمہارے لیے کیا کچھ لایا ہوں۔“

”ناگ منی کا چہرہ دمک اٹھا۔ اُسے مہن سے ایسی نیاز مندی اور ایسے بخت پھرے ڈانٹا لگ سنے کی امید نہیں تھی۔ وہ ایک دم اٹھی اور نیچے چلی گئی۔

”یہ تم اوور ہو گئے۔“ میں نے کہا ”حد سے بڑھ گئے۔“

”مجھے تناؤ غالب نے کیا کہا؟ پتہ آ گیا تھا اُس کا؟

تاد تو خیریت سے ہے یا رابع نے کہا۔

”یہ سب تو معلوم ہو گا بی بی، آدھی رات کے بعد۔
زیروء اور کا مطلب ہے رات بارہ بجے۔ میں نے اسے
سگریٹ کے پیکٹ کا ٹکڑا اٹھا کر کہا: ایف ایم ہنڈرڈ
میک اپ فٹز پر ہم اس سے بات کر سکتے ہیں۔“
”براہ راست؟ رابع نے سرست سے کہا۔ مگر کیسے؟“
”یہ سائنسی سوال ہے۔ قانون کی کتابوں میں اس کا
جواب ہوتا تو ہم بتاتے،“ محسن بولا: ”آپ کی زبان عقل کی
ریج اتنی زیادہ نہیں ہے۔“

”تم جیسے مرد ہی جب لایا جاوے گا تو مالٹ
چاہیں تو انھیں عورت کو ناقص العقل قرار دینے کے سوا کچھ
میں سوچتا۔“ رابع نے خشکی سے کہا۔
”مجھے بھی کچھ نہیں سوچ رہا ہے۔ چکن اور برانی کے
سوا، جو میں ساتھ لایا ہوں۔“ وہ آنکھیں مچکے ہمارے
سامان ہمارے۔
”گل بانو،“ میں نے نصیح کی۔

”کھانا بہت مدت کے بعد مل بیٹھ کے اور کچھ جین سے
ہیتر ہوا اٹھانا مجھے سب کی جھوک چمک اٹھی تھی۔
میں نے کھاتے کھاتے کہا: ”یار، یہ تو سب پیش
آئے ہیں۔“

”محسن نے کہا: ”ہاں، انتخاب بھی کریم بلوچ کا ہے۔
اس نے بی بی یا تھا کہ کیا کہاں سے لینا ہے اور پھر سب
خود ہی لیا۔“ آج کی دعوت کریم کی طرف سے ہے۔“

”وہ کس خوشی میں؟“ رابع نے کہا۔
”اس کی شادی جو ہو رہی ہے،“ محسن نے کہا۔
”دو ٹکڑا ابھی بنا تھیں، ولیمر پہلے کھالیا۔“ میں نے کہا۔
”وہ بھی ہو میں کا صاحب۔ ولیمر بھی ہو میں کا۔“ وہ
دانت نکالتے ہوئے بولا: ”آپ کا مہربانی سے ہمارا سب
پیہ وصول ہو گا۔“ درجہ دوم کو ٹوٹ لیا تھا۔

”تھوڑی اپنے خرچہ سے بات چتی ہو گی؟“
”کیسے نہ ہوتا صاحب۔ آپ خوش میاں کو بولا تھا کہ
ایک ہفتہ میں شادی بناؤ، درجہ ٹریج،“ کریم نے کہا: ”وہ پڑھا
کو بولا کہ اگر تم مشن کا رشتہ کریم سے نہیں کرے گا تو
سب ٹریج۔“

”کڑیج،“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
”اور پڑھا بولا کڑیج کیا؟ تو خوش میاں بولا کہ جب تم
اور ہم سب کڑیج ہو میں کا تو چاہل جانے گا۔ کریم کا مانا

ایسا تھا اور وہ یہی بولتا تھا کہ سب کڑیج کریں گا۔ بولتا
تھا اسات آدمی کڑیج کر چکا ہے۔ بس بڑھا تو ایسا کا پتا تھا
صاحب، جیسے کرنٹ لگ گیا ہو، اس کا حال خراب ہو گیا
بولا کہ بابا میرے کو منجھ میرے باب کو منجھ، ہمارا ہر
منجھ، تم بھی لے جاؤ لے جاؤ۔ ہم بولا کہ ایسا کیسے
ہاؤ۔ بیکرا منڈی سے بیکرا خریدنے آئے آپ ہم کرم کان
پکڑ کے ہمارے حوالے کرتا۔ پہلے مشن کمر بڑھیں گا، سلیمن
ہو میں گا، پھر ہم ہمارے مالٹ لائیں گا، باجا ہاجا کے ساتھ
اور چھو ہاؤ ہمارا کھائیں گا۔ پھر کڑیج کریں گا، وہ کیا۔ مگر
شادی کریں گا۔“

”ہنستے ہنستے ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
رات کے گیارہ بجے محسن نے مواصلاتی رابطے کا سہا
جمع کیا۔ اس نے ٹرانسمیٹر کو بیڑی سے جوڑا۔ اس کے
بارے میں وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی بیڑی کیا ہو گی۔
اس نے لالچ کے سب سے بلند حصے پر ایک بانس کے
ساتھ ایریل کا تار بانڈھا۔ اور مجھے بتایا کہ ایریل جتنا بلند ہو گا
اتنی ہی دور تک آواز سنائی جائے گی اور صاف بھی ہو گی۔“

”یہ نہ ہو کہ دوسرے جہازوں پر بھی سننی جائے؟“
”سننی تو جائے گی،“ محسن بولا: ”یہ ریڈیو کی نشریات
ہیں، ان کو فضا میں پھیلنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔
لیکن ہزار میں ایک چانس بھی نہیں کہ عین اسی وقت کوئی
اپنے ریڈیو کو بالکل اسی فریکوئنسی پر ٹیون کیا ہو، پٹیا ہو جس
پر ہم بات کر رہے ہوں، ہر جہاز پر ریڈیو مشین ایک
الگ فریکوئنسی پر موصول ہوتی ہیں۔ وہ اس کو ٹیون کیے
بیٹھے رہتے ہیں۔ اسے چھوڑنے کا مطلب ہو گا کہ جو بیٹا
ان کے لیے ہیں وہ انھیں نہیں ملیں گے۔ یوں سمجھو
کہ ریڈیو پر دنیا بھر کے اسٹیشن آتے ہیں، جسے جو سننا ہے
وہ سونی کو ایک ہی جگہ رکھے گا۔ ہوائے کا تو بہت کچھ
سننے کا مگر اپنا اسٹیشن نہیں سن سکے گا۔“

”اچھا اچھا۔“ مجھے کوئی شوق نہیں ریڈیو انجینئر بننے کا
تو یہ بتا کہ غالب نے وہاں کیا چکر بٹایا ہو گا، میرا مطلب
ہے کہ اس جہاز پر اسے دائرہ میں کے آلات حاصل کرنے
کا موقع کیسے ملا۔ ریڈیو ریڈیو اور ڈائریکٹر وہ کہاں سے لایا
اور چھپ کر کیسے استعمال کرے گا؟“

”یہ سوالات تو مجھ سے کیوں کر رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”کیا گفتگو خواتین کی موجودگی میں ہو گی؟“ میں نے کہا۔
”کیا ہرج ہے، ہم سب تو ایک ہیں، اجنبی تو صرف

ڈاکو کی بیٹی ہے۔“
”اس کا باب ایک شریف آدمی تھا،“ میں نے کہا: ”اگر
تو چاہے تو اس کو ڈاکو کی بیوی کر سکتا ہے۔“
”بیوی! میرا خیال تھا کہ وہ مس ناگ منی... سو رہی
مس گل بانو ہے۔“ محسن نے کہا۔
”وہ مسز عبداللہ ہے،“ میں نے کہا۔

”محسن نے میری طرف یوں دیکھا جیسے وہ اس مذاق کو
سمجھنے سے قاصر رہا ہو، پھر مجھے سیریس دیکھ کر اس نے کہا۔
”مسز عبداللہ! کون عبداللہ؟“

”عبداللہ کے معنی ہیں اللہ کا بندہ،“ میں نے کہا۔
”ابھی یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے کہ وہ کون عبداللہ ہے
ہم ہیں، اپنے حاجی صاحب کو خارج از امکان نہیں سمجھتا
یہ کتنا صفات گل بانو کا سابق شوہر، جو عرصہ پانچ سال سے
لاٹاپا ہے ایسا ہی تھا جیسا حاجی۔ یہ معاملہ تصدیق طلب
ہے، تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔“

”ہاں، بارہ بجنے والے ہیں،“ محسن بولا: ”میں ان آلات
کو چیک کر لوں۔“

”اس نے ٹرانسمیٹر اور ریڈیو کو باہم منسلک کیا۔
ایکڑا ٹکس میں وہ شروع سے گہری دلچسپی رکھتا تھا اور
ہمارے ساتھ اسے اپنی فیلڈ میں تجربات کرنے کے
مواقع بھی بہت ملے تھے۔ یہ اس کے لیے بہت معمولی
کام تھا۔“

”الف ایم بیڈ پر ادھر ادھر کے بہت سے سنگل
موصول ہو رہے تھے۔ بیشتر سنگل ہورس کوڈ میں تھے لیکن
کچھ کچھ دور ریڈیو آپریٹر کی گفتگو بھی سنائی دے جاتی
تھی جس کا تعلق جبری جہاز کے اپنے مسائل سے ہوتا تھا۔
موسمیاتی رپورٹ، سمندر کا حال، سمجھارتی خبریں، قریب
کی آوازیں اور واضح سنائی دیتی تھیں، جواب جو دور
سے ملتا تھا مشکل سے سنا جاتا تھا۔ صرف ایک ہنگو دلچپ
گفتگو سننے کو ملی۔ یہ بالکل ٹیلی فون پر سنائی دینے والی
کراس ٹاک کی طرح تھی۔“

”تم نے اٹو بتایا مجھے، چھ مہینے تک۔“
”میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔“

”تم بچا رہی ہو خود کو۔ کیا ہے اس کا لے چرخ کے
پاس تھیں دینے کے لیے، وہ گنہگار، بگ لگا آتا ہے۔“
”تم مجھ کو لینک لگاتے ہو اور جو کچھ وہ دے رہا
ہے مجھے، تم ان چیزوں کے خواب دیکھ سکتے ہو تم ایک

ہزار کہاتے ہو، اس کی آمدنی دس گنا ہے، کار ہے اس کے
پاس کوٹھی ہے۔“

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ایک طوائف ہو،“
”کیا کوئی عورت ہے جو سب نہ مانگتی ہو، ایسے
تو ہر عورت طوائف ہو گئی اور مرد کیا ان چیزوں کے پیچھے
نہیں بھاگتے۔ کیوں زیادہ پیسہ کمانے کے لیے چوری،
اسمگلنگ اور رشوت کا راستہ اختیار کرتے ہیں؟“

”تم بھی پتے آدو وہ بھی سچی،“ محسن نے براؤن بلند
کہا: ”اب تو لیٹی بھی جنیوں کا گریڈ پوچھتی ہے اور جنیوں
معلوم کرتا ہے کہ لیٹی کو جزیں میں کیا ملے گا، محبت الگ
مسئلہ، شادی الگ مسئلہ۔“

”یہ کون ہے؟“ پوچھا۔
”کوئی سن رہا تھا مگر میں اب نسلے کو سناؤں گا
اور تم بھی سن لو کہ اب میں بھی برائے فروخت ہوں۔ میں
اس ٹھیکے دار کی موٹی کالی جھینس سے شادی کر دوں گا۔“

”شاباش بیٹے عقل! آگئی تھیں،“ محسن بولا۔
”چل یار، چھوڑ انھیں،“ میں نے کہا: ”بارہ بجنے
فلے ہیں، دو منٹ رہ گئے ہیں۔“

”محسن نے الف ایم بیڈ پر سو مگنا ہر ٹر کے قریب
ٹوٹنگ کی کوشش جاری رکھی۔ صحیح فریکوئنسی معلوم نہ ہونے
کے باعث وہ اٹھا تو اسے اور ایک سو دو مگنا ہر ٹر کے
درمیان رہتے ہوئے غالب کی آواز سننے کے لیے کان لگائے
بیٹھا ہوا تھا۔ اب رابع اور گل بانو بھی آگئی تھیں اور میں
نے انگلی کے اشارے سے انھیں خاموش بیٹھا دیا تھا۔ رابع
کے چہرے پر امید اشتیاق اور فکرمندی کے جذبات کا ہر
رنگ بہت واضح تھا۔“

”میں نے بے چینی سے گھڑی دیکھی، بارہ بج کے
ساڑھے تین منٹ ہو گئے تھے۔ محسن بڑے اٹھناک سے
غالب کی آواز کو اجنبی آوازوں میں تلاش کر رہا تھا۔ انیسٹ
اور دوسرے میرے دل میں ہالوسی کے ساتھ احساس عدم
تحفظ پیدا کر رہے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رابطہ قائم کرتے
ہوئے بچکا جائے۔ دشمن کے قلعے کے اندر بیٹھ کر جاسوسی
کرنا آسان نہ تھا۔ مواقع دستیاب ہونے کے بعد بھی ایسی
کوشش ناکام کے نتائج تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ
کہ وہ دونوں مصیبت اور مذہب میں گرفتار نہیں گئے بلکہ
یہ ہمارے پورے مشن کے حق میں برا ہو گا۔ قیامت کسے
والے ان سے سب اٹھوا لیں گے۔“

”جاری...“ میں نے ایک لفظ سنا اور خیالات کا تسلسل ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ یہ آواز غالب کی تھی۔

”محسن کا چہرہ دمک اٹھا۔ اُس نے پھر وہیں ٹھونکیا۔“ ہیلو کے۔ ٹو... جاری، بیڑ... ڈو پو ریڈ...؟ ”راجہ؟“ میں نے کہا۔ ”لاؤ ڈائینڈ کلیر...“ جاری

”ڈو پو ریڈ می؟“ ”لاؤ ڈائینڈ کلیر“ غالب کی آواز آئی۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم محفوظ ہو؟“ محسن نے کہا۔ ”کوئی تمہیں دیکھنا نہیں تو نہیں رہا ہے؟“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ جہاں تک مجھے یقین ہے۔“ غالب نے کہا۔ ”نازد از او کے؟“ راجہ نے کہا۔ ”تم؟“ غالب شاید راجہ کی آواز پہچان کر سخت حیران ہوا تھا۔

”ہاں میں؟“ راجہ نے نہیں کے کہا۔ ”نازد سے بات ہو سکتی ہے؟“ ”نہیں، میرے پاس بھی وقت کم ہے۔“ غالب نے کہا۔ ”تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی تھی؟“

”نہیں سب بلان کے مطابق رہا۔ تم گئے تھے؟“ ”نہیں، ہم گرفتار بنا ہو گئے تھے، محسن نے کہا۔ ”بلا کا نام حاجی عبداللہ“

”لیکن وہ سب قدرت کی طرف سے ایک انتظام تھا۔ راجہ کو پھر ہم سے ملنے کا۔“ میں نے کہا۔ ”والہی پر معلوم ہوا کہ جہاز کی روانی ملتی ہوگی۔“

”ہاں، جہاز میں کوئی خرابی ہوگئی تھی۔“ ”مناہجے خرابی کسی تجزیہ کار درواری کا نتیجہ تھی۔“ ”میں نے تو نہیں سنا، غالب نے کہا۔“ ”یہ بھی سنا تھا کہ ہمیں سے دوسرا جہاز آئے گا اور اسباب اس پر منتقل کیا جائے گا۔“

”یہ افواہیں پھیلائی گئی ہوں گی۔“ ”پھر کیا اب یہی جہاز جائے گا؟“ میں نے کہا۔ غالب نے جواب دیا۔ ”ظاہر ہے خرابی معمولی تھی۔“ ”جور ہو گیا۔“ ”روانگی کا بکیر پور گرام ہوگا؟“ ”کل رات کسی وقت۔“

”تم سے پھر رابطہ ہوگا؟“ میں نے کہا۔ ”میں کچھ نہیں کر سکتا، چائٹ ملنے پر ہے۔“ وہ بولا۔ ”یہ جاس کیسے ملا؟“

”نازد کی بدعا شمسے؟“ غالب نے کہا۔ ”کیا؟ کیسی بدعا شمسے... مارہاڑ سے زبردستی...“ ”نہیں یار، ریڈیو دم کے غلطی میں تین افراد ہیں۔ ایک ریڈیو آفیسر اور دوسرا سخت۔“ غالب نے کہا۔ ”اُس نے ریڈیو آفیسر کو پھنسا لیا ہے۔ ماتحت تو مرنے ہوئے تھے۔ کام جو نہیں ہے آج کل۔“

”ریڈیو آفیسر کون ہے؟“ ”تھے ایک، آؤ کا بھٹا، آؤ کا ٹو۔“ غالب نے غصے سے کہا۔ ”اس وقت بھی نازد اُسی کے ساتھ بے اُسی کے کمرے میں کافی بیٹے گئی ہے۔“

”گستاخ ہے تم غاصے پر نشان ہو؟“ محسن بولا۔ ”ارے بھائی اس عورت ذات کا کوئی بھروسہ نہیں کھیل ہی کھیل میں تمہارا بیٹا نہ کٹ جائے تمہارا یہ رقیب رو ساہ۔“ ”وہ تو گورا چٹا نوڈا ہے، ہیر ڈانپ بلکہ میر وٹن ڈانپ،“ غالب نے کہا۔ ”سالاریشہ غلطی ہوگیا اور نازد ایک بدعا شمسے، اُس کو ڈال دیا چٹا شمسے۔“

”کتنے لگی کہ سنا ہے؟“ ”تم کافی بہت اچھی بناتے ہو، بلاؤ کے نہیں؟“ اُس نے کہا۔ ”تم شرف میزبانی تو دو۔“ چنانچہ وہ مہمان بن کے گئی ہے۔ ”اسی بے شرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔“

”میزبان پر اللہ رحم کرے؟“ راجہ نے کہا۔ ”وہ اپنی حفاظت کر سکتی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”تم فکر مت کرو۔ یہ بے شرمی وغیرہ سب کچھ نہیں، صرف اداکاری ہوگی اُس کی۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔“ غالب نے کہا۔ ”جب جہاز روانہ ہوگا تو ایک آپریٹر ڈیوٹی پر رہے گا۔ پھر دیکھو موقع کب قتل ہے۔“ مجھے تو لگتا ہے ڈاکٹر جینٹلری اور اس ریڈیو آفیسر میں سے ایک رہے گا۔ دونوں کو اُس نے ہزار جان سے فریضہ کر لیا ہے۔“

”گو یاد مزار جان سے؟“ محسن بولا۔ ”اجتہاد سونو میری بات۔“ غالب نے کہا۔ ”مجھے ایک کارآمد بات معلوم ہوئی ہے۔ آج رات کو لاہور سے کچھ اہل مال پہنچ رہا ہے جو یہاں لوڈ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ جہاز کی خرابی جہاز تھی۔ اسی لیے افواہیں پھیلائی گئی ہوں گی۔ یہ سامان دوسرے راستے سے اُندھ آئے گا اور لاہور

میں جہاز پر چڑھایا جائے گا۔“ ”ٹھیک ہے، ہم نگاہ رکھیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”تم لوگ جہاز کے زیادہ قریب مت آنا۔“ غالب نے کہا۔ ”اُس کے عرشے پر تاریکی میں دیکھنے والے تصویریں اُتار لینے والے کیمرے ہیں۔ محافظوں کے پاس جو رائفلیں ہیں اُن پر بھی اندھیرے میں نشا تر لینے کے لیے دوڑ رہے ہیں۔“

”ذکر مت کر، ہم دور رہیں گے۔“ ”اسی جگہ اپنا ریسیور ٹھونکنا، مگر صرف سنتے رہنا، تمہیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اُس کے غلطی میں مت کرنا۔“ ”میں نہیں کر سکتی۔“ ”اس کی غلطی میں مت کو کچھ کر لیا ہے۔ وہ فریضہ کیسے بدل دیں گے۔“

”ہم جار آدمی ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ ”جار گولن؟“ ”تم دونوں، راجہ اور کریم؟“ ”ہاں...“ میں بھی ہو سکتے ہیں اور پانچ بھی، مگر تم

”ہمیں یہ تو جادو کہ جس طرف سے آئیں؟“ ”کون ہے اندھ؟“ ”کسی نے بلند آواز میں کہا اور ہم نے ایک دھماکا سنا جو دروازہ اچانک کھولنے کی آواز تھی پھر اسی آواز سے کہا۔“ ”تم...“ ”میاں...“ ”ادھ مانی لاؤ۔ یہ میڈٹ بھی اُن ہے۔“ ”یوں ملے۔“ ”مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے ورنہ میں گولی مار دوں گا تمہیں۔“

”اُس کے ساتھ ہی ہمارے ریسیور میں تناؤ رہ گیا۔“ ”دوسری جانب سے ڈائریکٹ آف کر دیا گیا تھا۔ ہم سب ایسے بیٹھے رہ گئے جیسے ہم سب جھڑکی کرتے ہوئے ہو۔“ ”جیم تقور سے؟“ ”ہم نے غالب کو لاہور اور سب سے اعتراف خیر پر مجبور اور پریشان دیکھا۔“

”یہ تو بہت بڑا ہوا؟“ ”بالآخر راجہ نے کہا۔“ ”اتنی لمبی بات ہوگئی تھی غلطی ہم نے بھی کی، محسن نے کہا۔“

”میں نے اقرار میں سر ملایا۔“ ”صرف کام کی بات کی جا سکتی تھی غالب نے رسک لیا۔“ ”کیا ریڈیو آفیسر خود تھا؟“ ”راجہ نے پوچھا۔“ ”ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟“ ”محسن نے کہا۔“ ”جہاز کا کپتان بھی ہو سکتا ہے؟“ ”آرڈر؟“

”غالب کیسے؟“ ”ابو نے بے خیال...“ ”کیسے؟“ ”میں نے کہا۔“ ”ہم ہوتے تو کیا کہتے؟“ ”کیا ہوتا کہنے کے لیے، خدا اُسے بھانے تو بھالے۔“

رات کا باقی حصہ میں نے سوئے کی کوشش میں کروٹیں لیتے ہوئے گزارا۔ راجہ اور گل بانو بھی آنکھیں بند کیے ہوئے پڑی تھیں۔ پھر میرے ساتھ لیٹا ہوا محسن اٹھا اور عرشے پر چلا گیا۔ ہم نے بہت دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کی تھیں اور بہت سے سوالات پوچھے تھے جو سب کے ذہن میں تھے مگر اُن کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ پھر خاموشی کا ایک طویل عرصہ آیا تھا جس میں سب نے فرخ کو لیا تھا کہ دوسرے سو رہے ہیں۔

محسن کے جانے کے چند منٹ بعد گل بانو اٹھی اور دسے پاؤں اوپر چلی گئی۔ میں اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کیا یہ لڑکی کل تک اپنی زندگی میں اُسے والے اتنے بڑے انقلاب کی خواہش بھی کر سکتی تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ تبدیلی چاہتی تھی، بہتری کی آرزو مند تھی اور اپنی زندگی کے ان معمولات سے فراق کی تنہا تھی جس میں قتل و خونریزی، ڈکے اور اغوا، قانون شکنی اور مزاحمے خوف سے مسلسل بھاگتے رہنا شامل تھا۔ کون عورت ہے جو ایک گھر نہیں مانگتی، خصوصاً اس عمر میں اور ایسے حالات میں اور اس شخص دشاہ کی ملکیت کے ساتھ۔ گھر، شوہر اور بچے کل کر اس حصار کے تین اضلاع ہوتے ہیں جس میں عورت کی ساری خوشیاں آباد ہوتی ہیں لیکن اس حصار کی تکمیل وہ خود چوتھا ضلع بن کے کرتی ہے اور پھر اسی حصار میں ہنسی خوشی مگر گزرا لیتی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ گل بانو نے بہت جلد اپنے ماضی کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ اس میں یقیناً کسی لاشعور سے خواہش کو بھی دخل تھا۔ چنانچہ جب موقع ملا تو اس نے مستقبل کے لیے وہی راستہ اختیار کرنے میں دیر نہیں کی جو حادثات وقت کی آندھ میں کھو گیا تھا۔ اُس نے بھائی کا غم بھی بھلا دیا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ ایسا کبھی نہ کبھی تو ہوتا ہی تھا۔ یہ یونکو یہ سلامتی کا راستہ کبھی نہ تھا۔ وہ....

”خوش قسمت تھی کہ بد قسمت زندہ رہی مگر سب سے بچھڑ کر ماں باپ بھائی بہن مر گئے۔ اس نے سب غم سمیٹے۔“ ”سکندر؟“ راجہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ میرے قریب دیوار سے ٹپک لگا کے بیٹھی ہوئی تھی۔

”میں اٹھ بیٹھا۔“ ”تمہیں بھی نیند نہیں آرہی ہے؟“ ”نیند کے آ رہی ہے۔“ ”دو بولی۔“ ”وہ دونوں اوپر ہیں۔“ ”ہاں، محسن پھر کھڑا گیا تنہا ہی۔“

”گل بانو سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔“ ”دو بولی۔“

13

”جب اُسے حقیقت کا علم ہوگا تو کیا یہ جذباتی صدمہ اس کے اعتماد کی بنیاد کو نہیں ہلا دے گا؟ وہ اعتماد جو اُس نے ہم پر کیا، کہ ہم اُسے با عزت مستقبل دیں گے۔ ہم نے بھی اُسے سب سے پہلے دھوکا دیا۔“

”تم کیا چاہتی ہو؟ ہم اُسے ابھی اسی وقت بتا دیں کہ محسن سے ہمارے کسی امید نہ رکھے۔ ہمیں نے کہا: محسن سے کہیں کہ وہ گل بانو کا ہاتھ جھٹک دے اور اُسے کہہ دے کہ میں تو شادی شدہ ہوں، مجھے معاف رکھو۔ نہیں رالہ! ابھی یہ ممکن نہیں۔ بعض اوقات جھوٹ بھی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتا ہے اور یہ بولنا جرم ہو جاتا ہے۔ ہم پہلے اسے ماضی کی دلدل سے نکال کے اس قابل بنائیں گے کہ وہ اعتماد کے ساتھ تم جہاں چاہو اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے۔ کسی ہمارے کے بغیر یہ ناممکن ہے اور اگر آج وہ محسن سے ہمارا ملتی ہے تو محسن کا فرض بنتا ہے کہ اس کی دستگیری کرے۔“

”کیا وہ ہمارے ساتھ جائے گی؟“

”مجھے تو ہمارے بارے میں بھی سوچنا پڑے گا۔“

”کیا سوچنا پڑے گا؟ وہ برہمنی سے بولی۔“

”یہ ایسا سفر نہیں ہوگا جس میں خواتین کو ساتھ رکھا جائے۔ اس سے ہماری ذمہ داری اور مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ یہ ایک انتہائی پرخطر مہم ہے۔ اس میں تم ہماری کوئی مدد نہ کر سکو گی۔ تم دونوں کو ہم اکرام شیخ اور موہنی کے پیرو کر کے جا سکتے ہیں۔ وہ نہ ملے تو ڈاکٹر انوار احمد خاں جھٹک والا ہے۔ تم واپس لاہور جا کے شملہ کے ساتھ یا منظر کے گھر میں رہ سکتی ہو۔“

اُس نے اندھیرے میں میرا ہاتھ ہتھام لیا۔ سکندرا پلیز، ایسا مت کرنا۔ میں تم کو چھوڑ دے کہیں نہیں جا سکتی۔ رالہ کا نرم اور گلاز ہاتھ بالکل سر ہٹا رہا تھا۔ اُسے اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھ لیا۔ رالہ! میری جان، سمجھنے کی کوشش کرو عقل سے کام لو۔“

”عقل سے کام لیتے تو تمہارا ساتھ ہی کیوں دیتی؟“

”تم میری خاطر بھی یہ نہیں کرو گی۔ اگر میں کہوں کہ یہ میری خواہش ہے، میری درخواست ہے یا میرا حکم ہے تب بھی انکار کرو گی تم؟“

وہ کچھ نہیں بولی گرم شدت جذبات سے نکلنے اور آتش سوزی سے دھکتے ایک قطرہ اشک نے میرے ہاتھوں کو چھو لیا۔ میں نے اُس کا سر اپنے شلے پر رکھ لیا اور

آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو سماتا رہا۔ آصواب میرے شانے پر اترنے لگے۔

”تم کیا چاہتے ہو سکندر؟ یہ کہ ایک دن انتظار کی طویل صدیوں کا مذہب کاٹنے کے بعد مجھے تم سے کچھ ہو کر تم نے میری ساری زندگی کو ایک لا حاصل پیشانی کے سوا کچھ نہیں دیا، یا تمہیں احساس ہو کر رالہ برڈل اور بے وفا شخص کہ انتظار بچ نہ کر سکی۔ تمہارے آنے سے پہلے ہی موت آگئی۔۔۔“

”تم پر ڈیپریشن کا دورہ پڑا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یالہ ہی کسی دورے میں اگر میں نے خود کو بڑی ہمت کر لیا تو مجھ سے کچھ ہمت کرنا۔ تمہارے ساتھ رہ کے میں حالات کا مقابلہ بھی کر سکتی ہوں اور خطرات کا بھی مرنا ہوگا تو ساتھ رہ جائیں گے لیکن میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی کہ تم مجھے اکیلے جیسے کی مزاد دو اور یہ بھی نہیں سوچ سکتی کہ تم اکیلے رہ جاؤ۔“

”یہ اچھی زبردستی ہے۔ میں نے کہا۔“

”ہاں ہے زبردستی، وہ بولی۔ تمہیں معلوم ہے یہ گل بانو، جو کل ہمارے ساتھ آئی ہے، وہ بھی تیار نہیں اکیلے رہنے کو۔“

”تم نے کہا تھا اس سے؟“

”لو چھٹا تھا کہ تم کہاں رہو گی؟ ہم تو شاید چلے جائیں۔ وہ کہنے لگی کہ میں ساتھ آئی ہوں تو ساتھ ہی رہوں گی۔ میرا کون بیٹھا ہے یہاں۔ میں نے سمجھا یا تھا کہ ہمارا کام بہت خطرناک ہے تو کہنے لگی کہ کیا مجھ سے زیادہ خطرات دیکھے ہیں تم سے؟ ہم خود کو کیا بہادر سمجھتی ہو۔ کیا میں ڈرتی ہوں موت سے؟“

”یہ تو بہت مشکل ہو جائے گی۔“ میں نے سر کھجائے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے وہ محسن سے یہی بات منوانے لگی ہے۔ رالہ نے کہا۔“

اور پھر گل بانو کے چہنچہ کی آواز آئی۔ ”چھوڑ دو چھوڑ دو مجھے۔“ کہنے لگتے کے بچنے۔ وہ مچھراہنی پرانی زبان سے استعمال کر رہی تھی۔ میں گھبرا کے اٹھا اور اوپر کی جانب ہلکا۔

”گل بانو،“ محسن نے چلا کے کہا۔ ”میری بات سنو۔“ جواب میں گل بانو نے چلا کے کہا۔ ”ناگ منی ہے میرا نام۔“ اُس نے محسن کو ایک اور گالی دی۔

رالہ کے ساتھ جب میں اوپر پہنچا تو مجھے محسن لالچ

کے آخری کنا بے پر بے بس کھڑا دکھائی دیا۔ گل بانو نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی، چند سیکنڈ کے وقفے سے محسن اُس کے پیچھے کود گیا۔

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے؟ اور ریلنگ پر چڑھ گیا۔

رالہ نے میرا بازو پکڑ لیا۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ محسن نے نکال لائے گا۔“

”پاگل ہو رہی ہو محسن کو تیرا کہاں آتا ہے؟ میں نے کہا۔ ”چھوڑو میرا ہاتھ۔ وہ دونوں ڈوب جائیں گے۔“ رالہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور اجازت کے انداز میں سر ہلایا۔

دس بارہ فٹ کی بلندی سے میں بندرگاہ کے تیل ریلے ہونے کا لے کچھ جیسے بدبو دار پانی میں گر گیا۔ مجھ سے پہلے ساتھ والی کشتی پر سے کوئی سمندر میں چھلانگ مار چکا تھا، شاید یہ سمجھتے ہوئے کہ لالچ بے بس کو پانی میں گر گیا ہے۔ دس بندہ منٹ کی قید جہد کے بعد میں اور کریم بلوچ مل کے محسن اور گل بانو کو واپس لالچ پر لانے میں کامیاب ہے۔ محسن ہوش میں تھا مگر گل بانو بے ہوش تھی تاہم خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔

مجھے رالہ کی مدد کی ضرورت تھی مگر رالہ اب وہاں نہیں تھی جہاں میں اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی۔ پھر نیچے جا کے دیکھا لیکن رالہ کہیں بھی نہیں ملی۔ میں نے اسٹور کین ہاتھ زور، ہر جگہ دیکھی۔ میں نے اُسے آؤٹریں دیں۔ محسن اور کریم بلوچ میرے ساتھ ساتھ اوپر نیچے دوڑتے رہے اور رالہ کو پکارتے رہے مگر وہ لالچ پر ہوتی تو ملتی نہیں دیوانوں کی طرح اوپر گیا۔ ”وہ ضرور سمندر میں کود گئی ہوگی، میرے پیچھے۔“ میں نے کہا اور پھر ریلنگ پر چڑھ گیا۔

محسن نے مجھے نیچے کھینچ لیا۔ ”پاگل مت بن، وہ سمندر میں گرے گی تو ہم سب نہ دیکھتے اور تمہیں لوگ دیکھ رہے تھے۔“

میں نے سمندر کی سطح پر نگاہ ڈالی۔ ”وہ اور کہاں جا سکتی ہے وہ ڈوب گئی ہوگی محسن۔“

”اُسے ترنا آتا ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”اول تو وہ ایسی حرکت کر نہیں سکتی۔ اور اگر وہ اس پانی میں کود پڑتی تو اب تک ضرور نکل آتی۔ یہاں کون سی لہریں ہیں؟“

کریم بلوچ ایک رچ لائٹ لے آیا۔ اُس نے تیس چالیس گز کے دائرے میں روشنی پھیلا دی۔ میں اب

مستطیل پانی کی سطح پر گھاس بھوس، کچڑ، گالی کے ٹکڑے اور کالے رنگ کا تیل دیکھ سکتا تھا۔ ہماری لالچ اور ایک ماہی گیری کی بہت بڑی شفتی کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ پندرہ بیس گز پانی کی اس مختصر فاصلے میں رالہ غائب نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر کریم بلوچ نے سرچ لائٹ سے عرشے کا ہاتھ لیا۔ روشنی کیلے کپڑوں میں بے ہوش پڑی ہوئی گل بانو پر سے گزرتے اس مقام تک پہنچی جہاں رالہ صرف بندہ منٹ پہلے موجود تھی۔ جہاں اُس نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ میرے سمجھانے پر وہ مگنی تھی۔ اُس نے مجھے اجازت دے دی تھی کہ میں محسن اور گل بانو کو سچاؤں۔ وہ بالکل ہوش میں تھی۔ اب میں یہ فرض کرنے سے قاصر تھا کہ وہ دیوانگی کی کیفیت میں خود بھی چھلانگ مار دے گی۔

پھر میری نگاہ اس چمکتے ہوئے سفید کاغذ کے ٹکڑے پر پڑ گئی جو عین اُسی جگہ پڑا ہوا تھا۔ روشنی میں وہ کاغذ کا ٹکڑہ اور نمایاں ہو گیا۔ میں شرط لگا کے کہہ سکتا تھا کہ وہ پھر وہ پہلے وہاں نہیں تھا۔

لے کاغذ اٹھایا تو وہ ایک کھلا ہوا سفید

ہیل

لمبوتر العاف ثابت ہوا۔ اُس کے اندر سے ہوائی جہاز کا ایک غیر استعمال شدہ ٹکٹ برآمد ہوا جو منسوخ ہو چکا تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس پر رالہ قاری ایڈووکیٹ کا نام تھا۔ یہ ٹکٹ چھ ماہ قبل خرید لیا تھا اور اس پر ٹکٹ آج ہی کے دن کی تاریخ کے لیے کوئی گئی تھی مگر بعد میں سیٹ کنفرم نہیں کرائی گئی تھی۔ میں نے ٹکٹ کو الٹ پلٹ کے دیکھا کہ شاید اس پر کہیں کوئی تحریری پیغام ملے مگر مجھے بالیسی ہوئی۔ لفافے کے اوپر اندر کسی قسم کی کوئی تحریر نہیں تھی۔

”یہ کیلے محسن؟ میں نے پریشان ہو کر کہا۔“ رالہ کے نام پر ہمیں کے لیے ایئر ٹکٹ؟

محسن نے بھی ٹکٹ کا بغور مطالعہ کیا۔ ”یہ تو منسوخ ہو چکا ہے۔“

”وہ تو میں نے بھی دیکھ لیا ہے مگر اس ٹکٹ کی یہاں موجودگی کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا۔“ کیا وہ بمبئی چلی گئی؟“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”پھر رالہ کہاں گئی؟ اور یہ ٹکٹ کہاں سے آیا؟ میں نے کہا۔“ اس پر آج ہی کے دن کی تاریخ ہے۔ یہ سب ہمیں

”مقصود کیا ہوگا؟“ محسن نے بے خیالی میں کہا۔

”یہ ایک بیگانہ ہے سمجھنے والوں کے لیے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ رابعہ کو آج بھی جانا تھا لیکن وہ پروگرام میں قدرت کی دخل اندازی کے باعث ہم تک پہنچ گئی۔ میں نے شکستہ دلی سے کہا۔ حاجی عبداللہ اُسے ایک خاص مقصد کے تحت چاند بھائی کے قبضے سے چھڑا لایا تھا۔ اگر وہ مقصد پورا ہو جاتا تو چاند بھائی عین وقت پر اپنی پوری قوت کے ساتھ حاکم کرنا حاجی عبداللہ سے سب سونا چھین لیتا اور رابعہ کو بھی واپس لے جاتا۔“

”اُس نے رابعہ سے کہا تھا کہ نصف سونا ہمارے من کی تکمیل کے لیے دے گا۔“

”لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ تم کو بھی اُن کے ساتھ جانے کی آزادی ہوگی؟“ میں نے کہا۔ ”آخر یہ چاند بھائی رابعہ کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے کیوں اتنا بے چین اور متعصب ہے؟“ ”رابعہ بتا چکی ہے کہ وہ دلا کو اپنے خلاف کرنا نہیں چاہتا۔“ محسن بولا۔ ”اُسے یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ رابعہ قید میں ہے اور وہ پردہ ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔“

”یہ سب جھوٹ ہے، بھگواس ہے۔ یہ اُس نے رابعہ کو بے وقوف بنانے کے لیے کہا ہوگا۔“ میں نے طیش میں جلا کے کہا۔ ”اصل بات وہی ہے۔ وہ رابعہ کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہے مگر جانتا ہے کہ اُسے حاصل کرنا اتنا آسان نہیں۔ وہ رابعہ کو دھوکا دے رہا ہے، یہ اُس کے شاطر ذہن کی جال ہے۔ نہیں چاہیے ہمیں ایسی مدد۔“

”اچھا۔۔۔ چھینے چلانے سے کیا ہوگا؟“ محسن ہلا۔

”چل یہ گیلے کپڑے بدل لے۔“

میں جلا آ رہا۔ ”ہم نے اُس کی لالچ دیکھی تھی۔ وہ حرام زادہ رابعہ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اُس نے ہمارے عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا لیا۔“

محسن کی نظر اگل بالوں کی طرف تھی جو اسی تربت پر پڑوں میں عرش پر پڑی ہوئی تھی۔

”اس کے کپڑے کون بدلے گا؟“ محسن نے جیسے خود سے سوال کیا اور پھر کریم سے مخاطب ہوا۔ ”کریم؟“

”میں... صاحب ہم کیسے کرے گا۔۔۔ دنانہ لوگ“

کا کپڑا ہم سبھی بدل میں کیا۔ کریم بلوچ نے لوکھلے کہا۔

”چلو آج کرو۔ سمجھو کہ تم ایک ڈاکٹر ہو جسے ایک

مریض کی جان بچانی ہے۔ اس کے کپڑے بدلے گئے تو اسے تشدد مل جائے گی۔“ محسن نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔

”اس کی جگہ کسی ہوتی تھی تو؟“

”اچھا صاحب۔ بہت مشکل کام بولا آپ ہم کو خبر؟“

”ہم اپنا آنکھ بند کرے گا۔ پردہ آنکھ کا ہوتا ہے۔“ وہ جلتے جاتے بڑبڑاتا رہا۔ ”وہ بڑا بہن ہے ہمارا مگر۔۔۔ اللہ تعالیٰ“

دوڑے ہو کر۔

”چنے جانے کے بعد میں نے لباس بدلا اور سر کو تولیے سے رگڑنے خشک کیا۔ میرے ذہن میں ایک طرف مایوسی

لپٹنے پر آذیت چنے کا ڈر ہی تھی تو دوسری طرف حسد کی آگ

تھی جو میرے احساس کو جھلسا رہی تھی۔ میرے خون میں چاند بھائی کے خلاف ایک آتش فشاں کھول رہا تھا۔ آخر وہ

کون ہوتا ہے ہمارے معاملات کو اپنے طریقے سے طے

کرنے والا۔ اُسے دلا کی مخالفت سے نقصان کا ڈر ہے

اس لیے وہ رابعہ کو میرے رکھے گلیا کی طرف دلا کو دھوکا

دے گا جبکہ دوسری طرف وہ رابعہ کو دھوکا دے رہا ہے۔

دونوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ دونوں سے حقیقت

کو چھپا رہا ہے۔ کاروباری مفاد بھی بڑے اور رابعہ بھی

چاہتا ہے کہ نہ مال ہاتھ سے جائے نہ رابعہ۔ رابعہ کی خوشنوی

کے لیے تھوڑی بہت مدد اس نے ہماری بھی کر دی تو یہ

مدد نہیں رشوت ہوگی۔ مدد بے مروت کی جانی ہے اگر اُس

نے دس بیس لاکھ ہمیں دیے تو اس کا مقصد رابعہ کو اور

مجھے اس بات کا یقین دلانے کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ

ہمارا ہمدرد ہے۔ لعنت اس جیسے ہمدرد پر۔ اس کے دل میں

کچھ اور ہے۔ پیسہ اس کے لیے گندے ہاتھ کا میل ہے

اور اس سے وہ رابعہ کو اور اس کے اعتماد کو خریدنا چاہتا

ہے۔ رابعہ پر ظاہر کرتا ہے کہ وہ کتنا محب وطن ہے۔ کتنا

قیامت ہے اور کتنا شریف النفس ہے کہ اُس کو تحفظ بھی فراہم

کرتا ہے۔ حالانکہ زبردستی رابعہ کو حاصل کرنا ہر وقت اُس

کے اختیار میں تھا اور ہے۔ وہ تو جاکھیل رہا ہے نہ اپنے

فیصلہ یقین کے ساتھ کہ بلاخر میں مارا جاؤں گا۔ یہ ارشاد تو

موت کا من ہے اور خود کشی کے مترادف ہے۔ بکرے

کی مال خیر منائے گی تو کب تک۔ بفرض محال میں ایک

فیصلہ پر پہنچ گیا تھا کہ خود مجھے ختم کروائے گا۔

محسن جب دوبارہ میرے پاس آیا تو میں بے حد

آزردہ، دل شکستہ اور پریشان تھا۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

محسن نے گرم کافی کے دو گنگ درمیان میں رکھ کے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”رابعہ کسی سازش کا شکار ہوئی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے تو نہیں جاسکتی۔“

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”وہی سوز کا پتھر چاند بھائی لے گیا اُسے۔“

محسن نے کہا۔ ”ہاں، میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔

میرا ذہن بھی یہ بات قبول نہیں کرتا کہ کسی طے شدہ پروگرام کے تحت اُس نے اچانک بیٹھی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ پاگل ہو جاتی تب بھی ایسا نہ کرتی۔“

”یار، اس ٹکٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ رابعہ کا پردہ گرام

تھا لیکن بیچ میں گڑبگ ہو گئی اور وہ ہمارے ساتھ آگئی۔“

میں نے کہا۔ ”مگر اُس کو ذکر تو کرنا چاہیے تھا۔“

”وہ ذکر کرتی اگر اُسے معلوم ہوتا۔“ محسن نے پورے

یقین کے ساتھ کہا۔ ”ایسا تو چاند بھائی نے سوچا ہوگا۔ رابعہ

کو اُس نے کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ مجھے تعجب نہ ہو کہ وہ

اتنی خاموشی سے رابعہ کو کیسے لے گیا۔ ہم نہیں دیکھ رہے

تھے تو کیا رابعہ کو بھی بتائیں چلا؟ وہ لالچ تک آیا کیسے؟

کسی بوڑھو کیسے؟ کیا وہ رابعہ کو بے ہوش کر کے اٹھالے

گیا؟ رابعہ آواز تک نہ دے سکی کسی کو۔“

”یار محسن، میں اس چاند بھائی کے ٹکڑے کر دوں گا۔

وہ کیوں اتنی دلچسپی لے رہا ہے رابعہ میں کیوں اُسے

زبردستی ساتھ کھینچا رہتا ہے؟ اُس کی نیت خراب لگتی ہے مجھے۔“

”تو یا گل ہو رہا ہے۔“

”ہاں، میں پاگل ہو رہا ہوں۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

”میں کب پاگل نہیں تھا رابعہ کے خیال سے۔ میں یہ

برداشت نہیں کر سکتا محسن۔“

”یازد عقل سے کام لے کیا رابعہ پر بھروسہ نہیں تھے؟“

”اس بھروسے کا میں کیا کروں، مجھے رابعہ چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”رابعہ میری ہے۔ اُسے میرے ساتھ، میرے

پاس، ہونا چاہیے۔ کوئی مصلحت، کوئی ضرورت ایسی نہیں

جس کی خاطر میں رابعہ کی دوسری کا عذاب قبول کر سکوں۔ وہ

مجھ سے رابعہ کو چھین لینا چاہتا ہے سوز۔“

”رابعہ کو مجھ سے کون چھین سکتا ہے؟“ محسن نے

پُر غصہ، پُر یقین اور پُر امید لہجہ میں کہا۔

”چھین سکتا ہے وہ۔“ میں نے چاند بھائی کو ایک

اور غلطی کا دی۔ ”وہ ہمت متیار اور مکار ہے۔ ذہنی

مریض ہے۔ رابعہ کے سامنے جھوٹ کو بیچ پناہ سکتا

ہے۔ کسی دن وہ رابعہ کو یقین دلادے گا کہ سکندر فلاں جگہ یوں مارا گیا۔ اُس کا ذہن جھوٹے سے حقے کھڑے میں ماہر ہے۔ وہ تو ایک دن کا جعلی اخبار تک چھاپ سکتا

ہے۔ پاکستان ٹائمز یا دہلی اسٹیشن کی چند کاریاں جھوٹے

میں لاکھوں خرچ نہیں ہوتے۔ پورا اخبار وہی ہوگا۔ صفحہ

اول کی کسی ایک خبر کو نکال کے وہ میری تصویر اور میرے

مارے جانے کی جھوٹی خبر، لے پی پی یا پریس فرسٹ آف

انڈیا کی جاری کردہ، لگا سکتا ہے۔ رابعہ کیا جانے پھر دل

کو وہ یقین کرنے لگی۔

”رابعہ کبھی یقین نہیں کرے گی۔“ محسن کے یقین میں

ذرا بھی فرق نہ آیا۔ ”وہ چاند بھائی کو بھی جانتی ہے ہلا اس

کے قریب رہ کے زیادہ بہتر طور پر جان چکی ہوگی اور ایسے

تمام چکر میں سے بھی واقف ہو چکی ہوگی۔ تو کیوں بھول جانا

ہے کہ وہ ایک مامور کل بھی اور ہر قسم کے فراڈ، دھوکے بازی

جمع سازی کے واقعات دیکھے ہوئے ہے اور مجھے ایک بات

دل پر ہاتھ رکھ کے بتاؤ فرض کر، خدا نخواستہ۔۔۔ خال غلام

... تو جھج مارا جائے تو کیا رابعہ اسے قبول کرنے پر

مترہلے کو ترجیح نہیں دے گی؟ سال دو سال کیا ایک عمر

کبھی گزر جائے انتظار کرتے، تو کیا وہ تیری واپسی کا انتظار نہیں

کرے گی؟“

محسن نے مجھے لا جواب کر دیا۔ میں اُس کی بات کے

جواب میں ہاں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں کتنا زیادہ وضوار

تھا۔ میں آف کے تارک منظر کو گھور رہا تھا جس میں ایک

بھی ستارہ روشن نہیں تھا۔ ایک لامتناہی، بیکراں، بیپناہ

قوت سے زیر و زبر ہونے والا، حریف، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک، تارک،

”پھر ٹھیک اُسے ایئر پورٹ پر چا کے جہاں سے اُنار
لائے گا یہ کیا تجھے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایئر لائن کی کون
سی فلائٹ سے کب جائے گی؟“ محسن بولا ”چاہا نہ جانی جیسے
شخص کے لیے کچھ بھی ممکن نہیں۔“

”لیکن رابعہ اُس کے ساتھ گئی تو ایک بات بہر حال
واضح ہو جائے گی کہ وہ خود مجی رہنما مذہبی کسی کو اغوا کر کے
زبردستی ہوائی جہاز میں نہیں لے جایا جا سکتا۔ رابعہ کوئی دھوکہ
پیتا ہے، بڑا دلیر نادان نہیں ہے۔“

میں پُرا شور و میں۔ مسٹر ایڈمنسٹرینڈ سرجن جی۔ وہ فلم انڈسٹری کا ایک ڈراما ہے۔ سکندریہ کا ایک بھولا پس منظر۔۔۔
سمن آباد کا وہ گھر شمس آباد ہے جس کو سکندریہ اور البی نے
پھر سے آباد کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ وزیر خاں کی روح
اس میں تباہ ہو چکی ہے پھر یہ ہے محرم اس کی پکار سننے والا
کوئی نہیں۔

ہمارے میں بھی ملے نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ جلتی ہوئی
اکرام شیخ کے پاس رہے گی لیکن بھائی اس گل بانوسے خدا
سمجھے میری ایک سنت پر تیار نہیں تھی۔ کہنے لگی، مجھے ایسی دلی
منت سمجھنا، ڈاکوؤں کے درمیان رہتی تھی۔ اپنے ہاتھ
سے دو کوئین نے جھگر گھونپ کے مارڈال جو مجھ پر برتری
نظر رکھتے تھے۔ ایک حد سے بڑھ گیا تھا، اس کی تو میں
نے آنکھیں نکال دی تھیں، غصے نے بالکل کر دیا تھا مجھے۔
بعد میں مجھے اس پر ترس آیا کہ ایسے وہ کیسے جے گا میں نے
اسے مار دیا اور ایسے جو واردات میں مقابلہ کرتے ہوئے یا
خواب ہوتے ہوئے اپنی جان بچانے کے پلے میری گولی کا
نفاذ دینے ان کی تعداد کا مجھے علم نہیں۔ تنہا سی راجہ کر سکتی
ہے۔ یہ سب کچھ، بس مجھے عقدا لگیا۔ نہیں نے کہا کہ اپنا اور راجہ
کا مقابلہ کر دو، وہ ایک نامور وکیل تھی۔ ایک باعزت
اور شریف عورت تھی، بس اس بات پر وہ چلانے لگی کہ
اچھائیں بے عزت ہوں، جج ہوں، ڈاکو ہوں تو مجھے
مڑ جانے دو، ساتھ کیوں لائے تھے مجھے۔ پولیس کے
حوالے کر دیتے اور سمجھ پائی میں کوڈ گئی۔ عجیب طوفانی چیز
ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا ہوگا؟

ہاتھ اٹھائے دھا کرو۔ اللہ میاں، اَللّٰہی عرو وادکر، اخصیں
دشمنوں کے خلاف جہاد میں کامیاب کرو، اُن کی حفاظت کرو،
اعضیں جلد ہمارے پاس لے آ۔ دن کو ترک ہی جاتا ہے یار۔
رات بڑے خوف اور اندیشے اور اُمیدوں کے خواب لے
کر آتی ہے۔“

تھی۔ میں بلی بھر کے لیے کہیں کے دروازے میں رکا کیڑو
والیہ کر پڑھو دامن گیر ہو گئی تھی پھر صحن نے مجھے کھینچ لیا۔
اُس نے مجھے دو خواب آدرو کیا دیں اداس وقت
مک میرے سر پر رسوا رہا جب تک میں نے انھیں حلق سے
نہیں اتار لیا۔ پھر خود اس نے بھی ایک گولی کھائی اور ہم
آہستہ آہستہ دو باروں کے ساتھ بے ہوش ہوتے ہوتے ریلیٹ
گئے۔ آہستہ آہستہ میرے جذبات کا آتش فشاں سرد پڑنے
لگا تھا۔ بات تسلیم کرنے کے بعد کہ رالبر کو صحت جاننا بھائی
ہی ہے جا سکتا تھا میرے دل کو کچھ قرار گیا تھا۔ اگر میرے
لیے ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں تو میری ہوشی مہی مصلحت
یا جھوٹی سی خلیج ہے۔ راستے الگ ہو گئے تو کیا منزل تو
وہی ہے اپنی۔ یہ چار دن کی جہادی تو کوئی بات نہیں۔
آنکھیں بند کرتے ہی رالبر نے خیال سے دل نہ کہا: میں تو
تم کو کراچی میں ڈاکٹر جی ڈالا یا اگر ام شیخ کے پاس جھوڑے
جانا چاہتا تھا، تو پہلے ہی مجھے جھوڑ گئیں۔
اُس نے کہا: پاگل ہو تم بھی۔ تمہارے پاس ہی تو
ہوں میں۔ مجھ کو دردی کیوں سمجھتے ہو۔ میں نے اسی لیے
اپنے خط میں وضاحت کر دی تھی؟
میں نے کہا: کون سے خط میں...؟
”اُس خط میں جسے تم جیو ٹیگم کی طرح کھا گئے تھے“
وہ ہنسی اور غائب ہو گئی۔
”واقعہ نہیں ہے خود سے کہہ سب کچھ تو سمجھا دیا تھا اس
نے۔ چاند بھائی کو میں نے رقیب بنا لیا ہے۔ جو تھا راز داروں
اپنا۔ رالبر سے دُوری کیا جب اس کے میرے درمیاں ہیں
فاصلے خیال کے بغیر خیال بے وجہ جو ہے۔ لہروں کی سرکشی ایک گیت
بن گئی۔ کب دیا میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ
نہیں۔ خدا شکر کہ اپنی راتوں میں اب بجز کوئی رات نہیں۔
یہ گیت سکون بن کے میرے رگ و پس میں اتر گیا۔
دن کے جاہلے کے ساتھ بہت سی مانوس آوازوں
نے مجھے بیدار کیا۔ میں نے رسٹ واپس پرنگاہ ڈالی تو مجھے
احساس ہوا کہ میں آٹھ گھنٹے کی نیند پوری کر چکا ہوں۔ اب ساڑھے
گیارہ بج رہے تھے گویا دوپہر ہوئے دالی تھی مجھے رالبر کا
خیال آیا کہ وہ اس وقت بیٹھی میں ہوگی۔ چاند بھائی کے ساتھ
تاج محل کے کسی سوئیٹ میں، یا کسی شاہانہ بیوہ زین میں میری
ڈرائیو پر۔ رشک اور حسد کے جذبات سے جبر پیر سے دل
کو جلا یا مگر میں نے ان فضول خیالوں کو ذہن سے جھٹک

دیا مشکل تھی کہ دل کے جذبات کو عقل کی دلیل راس ہی
دے آتی تھی اور جذبات بہت بے قدر بن گئے تھے اور کوئی نیکر نہ پھانسنے سے
زیادہ مشکل کام تھا۔
ادھر آکے نہیں ملے گل بانو کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ
گیا۔ کل بات کی سمجھنے کے غلط فہمی میں ڈوب کے نکلنے
والی اور میرے سامنے موجود گل بانو میں اتنا ہی فرق تھا
جتنا خزاں کی شام اور سبار کی صبح میں ہوتا ہے۔ جو تیر
میں سوکھ جانے والے پتے اور موسم گل کے پھلے ٹھوکنے
میں نظر آتا ہے۔ اب وہ بہت پر سکون تھی۔ اُس نے
ہنا دھوکے پر بے بدلے تھے۔ رنگ رخسار پر ہلکا سا
خازنے کا بخار، ہونٹوں پر لب اسٹک کا گلانی رنگ شادوں
مک ترلے ہوئے ہوا کے ساتھ لہرا کے اڑتے ہوئے
سنہرے امل سمورے بال جو پہلے میل سے چپکے ہوئے تھے
مگر دھل کے دلیم کی طرح ہو گئے تھے۔ انھیں اس نے
ایک گلابی رین میں یوں قید کیا تھا کہ وہ چہرے پر نہ آئیں۔
اس کی قدر سے سبز اور چھوڑی آنکھوں میں غرور جن کی شونی
تھی اور اداؤں میں نیا بنائیں۔
اُس نے رالبر کے کپڑے پہنے تھے، جالی کی آستینوں
والی سیاہ قمیص، سیاہ سفید دھاری دار کپڑے کی شلوار اور
دوپٹہ۔ اس نے میک اپ کا سب سامان بھی رالبر ہی کا
استعمال کیا تھا۔ راتوں رات وہ ایک مکمل عورت بن گئی
تھی۔ وہ جوانگ منی تھی اور ناگن سے زیادہ خطرناک تھی۔
جو ڈاکٹروں کے ایک گروہ میں شامل تھی، فرائے سے
گالیاں لیتی تھی اور مردوں کی طرح سرگرم بھی پچی تھی ہے
یہ احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی حسین ہے۔ اُس نے فنی زندگی
کے بارے میں حزن کو اپنا لیا تھا اور اُس کا یہ نیا تانگ روپ
محسن کی نگاہوں کو بھی خیر و کرہ تھا۔ مطمئن اور سرد نظر آنے
کے باوجود وہ مضطرب تھا۔ اس خیال سے کہ گل بانو نے اس
پر اپنی قوتِ تسخیر آزمائے کے لیے یہ سب تیاری
کی تھی۔
میرے قدموں کی آہٹ پر انھوں نے ہلٹ کر دیکھا
گل بانو کی نظر نے آخوند مجھ سے پوچھا: بتاؤ میں کیسی لگتی
ہوں؟
میں نے کہا: لگتی بانو ارات چھڑا کا ڈالا تھا؟
اُس کی مسکراہٹ کی شوخی کا فور ہو گئی۔
”راتوں رات یہ کس کے حزن کا خزانہ لوٹ لاتی ہو؟“
میں نے سناس میں پرستش کا انداز نمایاں کر کے کہا۔

وہ کھل کھلا کہ ہنس پڑی۔ دل کے اندر سے پھوٹنے
والی تپتی خوشی سے سہر پڑا حلی اور کھنکھتی ہنسی، یہ تم سو کے
اٹھے ہو۔ من کو تو ایسی کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔
یہ شکایت کا ایک مجبوری انداز تھا جس نے من کو
دوس کر دیا۔ میں نے کہا: ”پھر یہ کالافشان کس نے بنایا ہے
تھیں نظر بد سے بچانے کے لیے؟“
”...؟“ یہ تو قیل ہے؟ وہ پھر ہنسی اور اس نے
یوں گال پر انگلی رکھی کہ مجھے من پر ترس آنے لگا۔ آخر وہ کب
مک بچے کو اور کیسے بچے کا حزن اور اولے حزن کی اسس
بے باک پیش قدمی سے؟
”یار، یہ بالکل رالبر نہیں گئی؟“ من نے کہا: ”اگر بال اتنے
ہی لہجے ہوتے؟“
”وہ تو میں نے بتایا تھا نا کہ ایک بار کٹلے پڑے
تھے، وہ اڑتے بالوں کو نازک انگلیوں سے سمیٹ
کر لہلی۔“
”رالبر...؟“ ہاں، لگتی ہے؟ میں نے گل بانو کا دل
رکھنے کے لیے کہا۔ میں حیران بھی ہوا کہ مجھے وہ رالبر جیسی
کیوں نہیں لگتی جو من کو اسی کی طرح نظر آتی ہے۔ یہ بات وہ
پہلے بھی کہہ چکا تھا تھا یاد اس لیے کہ وہ اسے جذبات کے بغیر
دیکھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے رالبر کے حزن میں اپنے جذبات
کا جو رنگ نظر آتا ہے وہ اُس کے حزن کو سب سے جوا سب
سے منفرد اور بے مثال کر دیتا ہے۔ کوئی اور مجھے رالبر جیسی
کس طرح نظر آسکتی ہے جب کہ وہ رالبر نہیں۔
ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے اور من نے
اپنا ہالاس بدل اور کپڑے کریم بلیوچ کے لائے ہوئے کپڑے پہن
لیے۔ معلوم نہیں کس نے اپنی پرانی وردیاں یوں بیچ دی تھیں
کہ ان پر سارے بیچ اور موڈ گرام بھی گرے گئے تھے۔ وردیاں
میں تھیں اور اسری کے بغیر تھیں لیکن کپڑا زیادہ پرانا نہیں
تھا۔ میں اور من کی غیر ملکی جہاز کے پٹلے درجے کے ملازم
نظر آنے لگے تھے۔ یہ پٹلے رنگ کی وردیاں تھیں اور ان کے
شو لڈز پر پیتل کے حروف میں ’سی فاکس‘ لکھا ہوا تھا جس
کا مطلب ”سمندری لومڑی“ ہوتا تھا۔ یہ کوئی انگلش لومڑی
جہاز بھی ہو سکتا تھا۔ کنڈرا، آسٹریلیا، ہندوستان، پاکستان
میں اور جہاں بھی انگریزی بولی جاتی تھی، یہ نام استعمال کیا جا
سکتا تھا۔ یہ تصدیق کرنا ناممکن تھا کہ سمندری لومڑی کوئی چھوٹی
سی موڈ لوٹ تھی، کوئی لالچ تھی یا تجارتی جہاز۔ ودی کی جیب

پر جہاں پہننے والا نام کا بیج لگا ہے صرف پن لگ رہی تھی۔
مگر ودی پہننے کے بعد ناموں کی اچھا اچھ چوڑی اور دو
ڈھائی اچھ لمبی بچیاں بھی جیب میں سے برآمد ہوئیں۔
”یہ ودی تو بے کسی محو صوف با حرم جلد ہیپ آرمینڈ
کی۔“ میں نے کہا: ”یہ کس خط کا نام ہے جیلا؟“
”جل دیپ اور مینڈس“ من نے کہا: ”یہ تو ری کٹا
مارٹن سن نال دیپ براڈ نا ہے اور غار سا براڈ ایوسٹ
پور یو یا پور یو:“ اُس نے اپنا نام پڑھا میں نے منے
سے اتفاق کیا کہ یہ انڈونیشیا، ملائیشیا، ٹائپ نام ہے۔
”جل دیپ کوئی ہندو ہو سکتا ہے یا کہ یہیں اور
ایوسٹ تو شاہی مسلمان ہو؟“ میں نے کہا: ”لیکن فرض کر لے
وہ تو دل حضرات، یہیں کہیں مل جائیں؟“
”اپنی ودی تلاش کرتے ہوئے؟“ من بولا: ”کیا بیتا
انھوں نے خود ہی ودی بیچ ڈالی ہو؟“ یہ کیپ تو مجھے لومڑی
پور یو کی نہیں لگتی۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا؟“
میں نے اپنی کیپ اس کے سر پر رکھ دی۔ یہ مجھے
ڈرائنگ تھی اور اس طرح ہم ٹوپی بدل بھاٹی ہو گئے ہیں۔
دو پندرہ بل ہونوں کی طرح؟
”ٹوپی کو مردانہ دوپٹہ کہا جاسکتا ہے؟“ من بولا: ”دونوں
مڑھانے کے کا آتے ہیں۔ کیا خیال ہے اب جلیں؟“
من نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”کیونکہ کریم بلیوچ، ہماری
ڈالسی مک شکاری، خود کوشی، مے کٹی کچھ مست کرنا؟“
”کم سے کم ایک آنکھ کھلی رکھا مگر اس سے چاروں
طرف دیکھتے رہنا۔“ پھر وہ تومایہ خولیش را؟“ میں نے کہا۔
کریم بلیوچ کا منہ کھل گیا۔ ”کیا بولتے آپ صاب؟“
”مطلب یہ کہ چاندی سی جوا ب تیرے حوالے؟“ من بولا۔
”چاندی سی بانو؟“ میں نے تبصیح کی اور گل بانو کا چہرہ
رنگ اٹھا۔
”لوٹ کر کب آؤ گے؟“ اُس نے من کی طرف دیکھا۔
من نے صبح عاشقانہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھا اور
آگے جھک گیا۔ ”جب بھی تم بلاؤ گی؟“
”نہیں کیوں بلاؤں گی؟“ گل بانو شہر کا کہنسی۔ ”میں تو کبھی
ہوں جاتے ہی کیوں ہو؟“
معلوم نہیں من کے دل پر کیا بیٹی مجھے تو اُس بیچنے نے
متوجہ کر لیا تھا، جو جھلا ننگ مار کے لالچ پر آ گیا تھا۔ وہ
بارہ تیرہ سال کا مغرب اور غلیظ بچہ تھا۔ میلی عورت، میلے

کپڑوں اور سیلے بالوں والا۔ وہ بچہ جس کا وارث پیرنے
دمانے کی تھوکروں میں رہتا ہے، جسے کسی ٹھکری چست
کاسایہ ملتا ہے اور کسی سے پیار کا تحفظ۔ وہ زور پیشہ یا
گداگر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

”اے، کون ہو تم؟“ میں نے متحاط ہو کر کہا، ”کیا
بات ہے؟“
”ہم چھٹی لایا ہے۔“ اس نے ایک براؤن رنگ کا
لقافہ بڑھا کے کہا۔

”کس کے لیے؟“ میں نے کہا۔
”اپن نام نہیں جانتا۔ دس روپیہ دو اور چھ لے لو“
وہ بولا۔

میں نے جب میں سے دس کانوٹ نکالا، اچھا
بھئی، ”لو،“ میں نے نوٹ بڑھا کے کہا۔ وہ خاصی بے غوفی
سے آگے آیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے لافاز آگے بڑھایا اور
دوسرے سے نوٹ لینے کی کوشش کی مگر میں نے اس
کی کلائی کو گرفت میں لے لیا۔ اس نے ہاتھ جھڑانے کے
لیے واجبی سا زور لگایا۔ پھر مزاحمت ترک کر دی۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مت دوس روپیہ۔
یہ لو پانا چھٹی، ابھی جانے دو میرے کو۔“ وہ بولا۔

”نہیں، ایسے نہیں بیٹے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”مجھے
معلوم ہے کہ جس نے بھی تم کو چھٹی دی ہوئی اس نے تمہیں
اس کام کا معاوضہ بھی دیا ہوگا۔ تم چالاک ہیں۔ دس روپیہ
اور اسٹھنا چاہتے تھے۔ دس روپیہ کی کوئی بات نہیں، میں
اپنی خوشی سے تم کو انعام میں دے سکتا ہوں لیکن پہلے یہ
بتاؤ کہ لافاز کس نے دیا تھا؟“

”ہم نہیں جانتا صاحب۔ ہم قسم ہم کبھی نہیں دیکھا اس
کو،“ لڑکے نے عاجزی سے کہا۔ ”ہم ادھر کھڑا تھا۔ وہ ہم کو
دس روپیہ دیا اور بولا کہ وہ ادھر سامنے لالچ پر چھٹی دے
کر آؤ۔“

”کس کو؟“ میں نے لافاز چھین کے دیکھا مگر اس پر
کوئی بھی نام یا پتا نہیں تھا۔

”بس وہ بولا کہ اس لالچ پر دے آؤ،“ لڑکا اب کچھ
خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔ اس نے اپنی عمر سے زیادہ
چالاک بینی کی کوشش کرتے ہوئے ہم سے دس روپیہ
چھیننے چاہے تھے مگر اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ دس
روپیہ بھی منگنے نہ پڑ جائیں جو اب والدین معاوضے کے طور پر
کسی نامعلوم شخص نے دیے تھے۔

میں نے لافاز محسن کو دیا کہ کھول کر دیکھئے مگر احتیاط کے
ساتھ۔ سانس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ نامہ ارجل مستول کے
لیے ڈاک سے بھی ارسال کر دیا جاتا ہے۔ کھولتے ہی دھماکا
ہوتا ہے یا کسی مہلک گیس کا اخراج اور قحط بالغیر۔

محسن نے خامسے بڑے لفافے میں سے ایک اتنا چھوٹا
سا پڑھ برآمد کیا کہ مجھے کھوا ہوا ہٹکا چوہا والی کھات یاد
آئی۔ محسن نے بڑے کو بغور ملاحظہ کیا اور اس پر مزید غور
فرمانے کے بعد اس فلسفی کی طرح سر ہلایا جس نے اپنی عقل و
دانش سے کائنات کی کسی پیچیدہ کھجی کو سمجھا لیا ہو۔

”ڈیر نامہ بر!“ محسن نے پرچی مجھے تھا کے کہا۔ ”تم اس
کا علیحدہ کرنا سکتے ہو جس نے یہ خط دیا تھا۔“

لڑکے نے سر ہلایا اور کچھ سوچ کے بولا۔ ”کوئی ٹھیکر
تھا، بلوچ میں بات کیا۔ آپ سے تھوڑا کم لیا۔ ہم غلطی ہوا
تو ہم کو معاف کرو۔ وہ چھٹی دے کر بھاگ گیا۔ لو لٹا تھا،
صاحب نہیں ہو دیں گا تو ایک میم صاحب ہو دیں گا۔ ایک دم
نیو کا مالک خوب صورت،“ اس نے ناگ منی کی طرف اشارہ
کیا۔ ”اس کو دے دینا چھٹی۔“

میں نے اسے دس کانوٹ دیا۔ ”یہ لو شاہنشاہ تم بہت
اچھے لڑکے ہو۔ کچھ بھی کوئی کام ہو، کسی چیز کی ضرورت ہو تو
آجانا اور وہ آدمی پھر نظر آنے تو بتانا۔“

”نام کیا ہے تمہارا، کہاں رہتے ہو؟“ گل بانو نے کہا۔
”اللہ بھلا کرے آپ کا صاحب!“ اس نے دس کانوٹ
جیب میں رکھ کے پیشہ ور گدا گروں کے لہجہ میں کہا۔ ”اللہ
سکھی رکھے آپ کو ہم صاحب۔۔۔ اللہ آپ کا ہر مراد
پورا کرے۔“

میں نے اسے چھوڑ دیا تھا، اگر محسن اس کے پیچھے نہ
ہوتا تو وہ گل بانو کے سوال کا جواب گول کر کے بھاگ جاتا۔

لڑکے نے کہا۔ ”اپن چھوڑا ہے صاحب۔۔۔ اپن ادھر
ہی رہتا ہے۔ ابھی پان چلا ہے۔“ وہ تیزی سے پٹا اور محسن
کے ہاتھ کے نیچے سے نکل گیا۔ پلک جھپکتے ہی وہ لالچ پر
سے ایک کشتی میں کودا اور غائب ہو گیا۔ اس نے ایک بائیں
پلٹ کے نہیں دیکھا۔

”اب ہم بھی چلتے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”کیا تھا اس خط میں؟“ مجھے نہیں بتاؤ گے،“ گل بانو
نے کہا۔

میں نے وہ پڑھ اس کی طرف بڑھایا جس پر لکھا ہوا

”جنا! ایل ای ڈبل سیون ڈبل فور زیرو!“ اور اس کے بعد
”ڈی ای پی۔ ایچ ڈی ڈبل ون تھری زیرو۔“
”کیا؟ کیا مطلب ہے اس کا؟“ گل بانو حیرانے
ہو کے بولی۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ ”تو کچھ سمجھا؟“
محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شاید کسی نے غلط کیا ہے۔“
”اور تم نے خوش ہو کے دس روپیہ دے دیے۔“
”غنا؟ تم کو پسند آیا؟“ گل بانو نے تلخی سے کہا۔ ”صاف کیوں
نہیں کہتے کہ بتانا نہیں چاہتے۔“

”کمال ہے یہی۔ جچھانا ہوتا تو تمہیں یہ بھی کیوں دکھائے؟“
میں نے کہا۔

”خواہ خواہ کی بدگمانی اچھی بات نہیں ہے۔“ محسن
نے مری تائید کی۔ ”اگر تم کچھ مطلب نکال سکتی ہو تو ہمیں
بھی بتاؤ۔“

”ہم نے اسے خاموش تو کر دیا مگر وہ مطمئن نہیں ہوئی
تھی۔ ہمارے روانہ ہونے تک اس کا چہرہ ہنچا ہنچا سا
رہا۔ پھر محسن نے نفسیاتی داؤ ڈالنا۔“

”منکرا کے رخصت نہیں کرو گے تو یہ کوئی اچھا شوگون
نہیں ہوگا۔ معلوم نہیں دن کیا گزرے؟“ محسن نے آہ
بھر کے کہا۔

گل بانو کی عقلی قدر کوئی ”جلدی آجاتا۔“ وہ منکرا کے بولی۔
”تم بھی ذرا محتاط رہنا، زمانے کی نفرت ننگ جلتے۔“

محسن بولا۔

میرے کندھے پر بیگ تھا۔ اس میں ایک تو دور بین
تھی۔ دوسرا دی ڈائریکٹ نکشن والا پورٹریٹل فون تھا جس
کا استعمال ہم نے مدت سے نہیں کیا تھا۔ باقی اہم اقدام صرف
بیگ بھرنے کے لیے تھا۔ مثلاً اس میں نوٹ بک اور قلم
دیکھا، برش، شیونگ کا سامان اور سپر تھے۔ یہ سب اس لیے
تھا کہ کوئی ہم سے کہیں بھی بیگ دکھانے کو کہے تو اس میں
کوئی چیز قابل اعتراض نہ ملے۔ سیکوری والے بعض مقامات پر
زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ بیگ میں تین سو روپیہ پاکستانی
نرخی میں اور میں اور بھی صرف اس لیے رکھے تھے کہ کوئی
بطور رشوت وصول کرنا چاہے تو کہہ لے۔ ہم معترض نہ ہوں گے۔

پھر اصل اسباب ہمارے پاس محفوظ رہے گا۔ ایک ایک روٹلو
جسے ہم نے بٹرنٹ کے نیچے اور پتھون کی بدلیٹ کے بھی نیچے
چھپایا تھا۔ ایک ایک ہزار روپیہ پاکستانی نرخی میں جو ایک
بیری بڑا بے میں تھے اور پانچ پانچ سو ڈالر دوسرے پیری بڑا بے

میں ڈالر ہم نے آج پہلی بار نکالے تھے۔ اب تک وہ ساری
کرسی جو میں ایک سوٹ کپس میں بھری ہوئی ملی تھی، لالچ
کے خفیہ خانوں میں محفوظ پڑی ہوئی تھی۔

”تو نے وہ معاملہ کر لیا تھا؟“ میں نے ہند گاہ کے
علاقے سے گزرتے ہوئے فریج میں بات کرنا مناسب
سمجھا۔

”کسی حد تک،“ محسن بولا۔ ”ایک ٹرک جس کا فیرل ایل
سیون سیون فور فور زیرو ہے۔ یہ لاہور کا نمبر ہے۔“

”مگر کسی گاڑی کا ہے۔ تو نے ٹرک کیوں فرض کر لیا؟“
”ہمارا واسطہ گول سے ہی پڑتا ہے۔“ محسن نے سر ہلایا کہ
”کہا۔“ آگے ڈی ای پی کا مطلب تو خیر ڈی پیر ہوا، یعنی کروڑا بے۔

اس کے بعد کیا ہے، کچھ آپ بھی ارشاد فرمائیے۔“
”آگے اتھری ناقص عقل میں ہے۔ آگے کروڑا بے کا وقت
اور مقام بھی بتایا گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسی ڈی کو میں جیڈا بے

فرض کر لوں تو ڈبل ون تھری زیرو، گیا، میں۔“
”آخر میں۔“ محسن نے جھلک کے کہا اور میرے کندھے
پر زور سے ہاتھ مارا۔ بہت سے لوگ ہماری طرف متوجہ
ہو گئے۔

میں نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔ ”یہ کیا ہو توئی
ہے۔“ میں نے کہا مگر اس کے بعد میں بھول گیا کہ مجھے کیا
کہنا تھا۔ میں نے ایک مکروہ صورت والے مسٹرنے کو دیکھا
جو بڑی بے رحمی سے ایک پیٹے کو مار رہا تھا۔ یہ وہی بچہ تھا
جو خط لے کر ہمارے پاس آیا تھا۔

میں بے اختیار اس کی طرف دوڑا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ
آس پاس کھڑے ہوئے درجن بھرا ذرا خاموش تماشائی بنے
ہوئے ہیں۔ محسن نے مجھے روکنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

”دیکھنا کہ دوست بولنا۔“ محسن نے میرا ساتھ دیتے
ہوئے کہا۔

کچھ پوچھے بغیر میں نے اس غنڈے کے ایک مٹکا
رہید کیا اور پیٹے کو اپنے پیچھے کر لیا۔

”بدعاش اقصائی، اس کو قتل کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے
فرانسیسی میں غل جھپائی۔ ”آؤ میرا مقابلہ کرو۔“

غنڈہ میرے ہاتھ کے اشارے کو سمجھ گیا اور ایک
غلظت گال دے کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کے دوسرا
مٹکا زیادہ زور سے مارا۔ وہ لڑکھڑا کے پیچھے گرا۔ اب دوسرے
تماشا دیکھنے والے بھی مستحضر ہوئے۔ انھوں نے درمیان میں
حاصل ہو کے اس بدعاش کو مزید مار کھانے سے بچایا۔ سما

اجانک مجمع میں سے ایک خاکی ٹوپی والا نمودار ہوا۔
اُس نے خاکی وردی بھی پہن رکھی تھی۔ چلو جو پولیس اسٹیشن
چلو، اس نے فیصلہ کرنا انداز میں کہا۔
میں اُس کی آواز پر اچھل پڑا، وہ اکرام شیخ تھا، ہم اس

اُس نے شور مچایا: "اوٹے یہ کدھر لے جا رہے ہو تم لوگ مجھے کون ہو تم سب؟"

وہ نہایت بے ڈھنگے طریقے سے سر کے بل کی سڑک پر گرا۔ اس وقت ٹینگی کی رفتار بھی کافی تھی۔ ایک دم کھل

”آپ تو شوقیہ فن کار ہیں تاہم محسنِ بولالہ“ بچپن سے سڑک کے کنارے جہاں کوئی بالقوہ تصویرِ مطب دیکھا کھڑے ہو گئے۔

کاج کوئی نہیں؟

”میرا کام کیا رہ گیا ہے سوائے تمہاری تلاش میں جھک مارنے کے“ شیخ نے کہا۔ ”آج تین دن ہو گئے۔ دن میں تین بار یہاں ٹیکسی لاکے گھڑی کر دیتا ہوں۔ سب سے کم رکھا ہے کہ مجھے کوئی پوچھتا ہوا آئے تو بتا دینا کہ میں کس وقت یہاں ملتا ہوں۔ کچھ پتا نہیں چلتا تمہارا کہ کہاں ہو، زندہ ہو کر نہ گئے۔“

”برادر عزیز سابق ڈبل ایس آئی شیخ“ میں نے کہا۔ آپ سے ملنا ایک نیک فال ہے۔ شام کو ہم فارغ ہیں۔ آپ پورا پیر ٹریکچر دے سکتے ہیں اور میں جتنا چاہیں جھاڑ سکتے ہیں۔ ابھی تو ایک ہم مسئلہ درپیش ہے۔“

”ڈیڑھ سلا۔“ مومن بولا۔ ”آدھا آپ کے سامنے موجود ہے۔“

”یہ کس کا بچہ ہے؟“

”یہ تو کم کا بچہ ہے، کسی ماں کی آنکھ کا نور ہے کسی باپ کے دل کا سرور ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بہت مجبور ہے۔“

معتوب ہے اور مقبور ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس کے سر پر دست شفقت رکھو۔ تفصیل سے یہ خود بتائے گا، ابھی ہم جاتے ہیں، پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ فقط والسلام۔“

”ارے... بات تو سنو... جا کہاں رہے ہو؟“

اکرام شیخ میں اٹھتے دیکھ کر بولا۔ ”جلو نہیں چھوڑاؤں۔“

”تم اس بچے کو لے جاؤ۔ ہم خود جا سکتے ہیں اور تم حق میں دلیہ بھی ہیں بہتر ہے کہ فی الحال خود کو ایم آر ایس کے معاملات سے الگ رکھو۔ اس طرح تم ہماری زیادہ مدد کر سکو گے۔“ میں نے کہا۔

”ویسے آج کل تمہارا عشرت کدہ... میرا مطلب تمہارا عزت کدہ کہاں ہے؟“ مومن بولا۔ ”تمہاری ٹیکسی ڈرائیور بلوری سخت رشک اور حسد کا شکار ہے کہ یک نہ شد و نشد۔“

”کیا کریں وہ بھی ہے چارے نہ سہی وصل تو حشر

ہی سہی“ میں نے کہا۔ ”آج وہ میرے ساتھ نہیں ہیں؟“

”تم ایک تو ہوا گے گھوڑے پر سوار ہو۔ ایسی بھی کیا آفت آ رہی ہے کہ دس منٹ میں رگ سکتے۔“ اکرام شیخ بھڑکے بولا۔ ”بہت چڑدی... اور اہم باتیں تھیں، خبریں تھیں۔“

”ابھی تو سرخیاں بڑھ دے،“ میں نے کہا۔ ”تفصیل پھر منیں گے۔“

”انگل رضوی کا انتقال ہو گیا ہے۔“ اُس نے کہا۔

میں اور مومن اس ایسے پر کچھ دیر تو رنج اور دکھ کے جذبات کی بیخیز میں اسی طرح کھڑے رہے جیسے زلزلے کا پہلا جھٹکا محسوس کرنے والا کچھ دیر خوف اور ہمت سے مغلوب اور منجمد کھڑا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس دل کنگرے کی شدت نے احساس میں درد بھر دیا۔ میں کتنا جاہل تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھ پر یہ یقینی پر یقین غالب آگیا۔ ہو کیوں نہیں سکتا۔ ہم سب فانی انسان ہیں۔ خدا کی عطا کردہ سہولت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ چنانچہ طمانیت اور تحفظ کے ساتھ کاروبار حیات کی جدوجہد میں ہم قمر مصروف رہتے ہیں۔ بے فکر سی کے ساتھ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیریں دھونڈتے مقصود بناتے کامیاب ہوں کی جستجو کرتے اور مستقبل کو لامحدود تصور کرتے ہوئے اوندھ نگہی ہر خواہش کو اپنے اختیار میں جانتے ہوئے۔

”وہ دونوں لاہور چلی گئی ہیں۔“ اکرام شیخ نے خاموشی کے ایک سو گوار دھنکے کا قیامی ستا ختم کیا۔

”یہ کب کی بات ہے؟“ میں نے پٹا لیے میں کہا۔

”ایک ہفتہ ہو گیا۔ مجھے بھی دیر سے اطلاع ملی ہیں۔“

”منظر کو فون کیا تھا۔“ اُس نے بتایا اور تھرا پوچھا۔ میں نے کہا کہ کیا معلوم کہاں ہوں گے۔ ملیں گے تو بتا دوں گا۔ سوئم بھی ہو چکا تھا۔ سگریٹس نے ان دونوں کو بھیج دیا۔ شملہ کو اور آئی کو کچھ تو تسلی ملے گی۔ الفاظ کی ہمدردی کو وہ کیا کریں گی۔ سب نے ہی کہے ہوں گے۔ اپوں کی ضرورت تھی نہیں؟

میں نے سر ہلایا۔ ”اُن کا بھی کون تھا۔ نہ ماں باپ نہ بھائی بہن۔“

”ہم تھے، تو ہمارا ہونا نہ ہونا برابر۔ بس دکھ دیتے رہے انھیں۔ شکہ دینے والا تو وہی تھا جو چلا گیا انھیں بڑھ کے اور ہم بدبخت اس وقت بھی اُن کے پاس نہیں۔“

”یہ سب کیسے ہوا یا اکرام؟“ مومن بولا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہا تھا۔

”بس،“ ہونے والی بات تھی، ہارٹ فیل ہو گیا۔ کوئی کچھ نہ کر سکا۔ اکرام شیخ نے کہا۔

”اب خیال آتا ہے کہ اس بختی آدمی نے اصول اور ایمان کے راستے پر چل کر کیا پایا؟“

”مومن نے شامی کا کیا صلہ ملا اُسے۔ ایک اپنا مکان ملک وہ جانیوں کے تھے۔ پھر بھی ہم سب نے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیا اور نہ نکالے جاتے یہاں سے بھی، جیسے نوکری سے نکالے گئے۔“ میں نے تنہی سے کہا۔

”اس مکان کا بھی وہ نوکریہ دیتے تھے۔ انھیں کس

معلوم تھا کہ ہم نے کیا کچھ جلا کے اُسے خرید لیا تھا۔“ مومن بولا۔

”جیسا درویش صفت ظہور تھا، ویسی ہی اُسے شریک حیات ملی۔“

”صاحب رو شاہ اور باہمت۔“

”بکھیں نہیں کہا اس نے کہ تمہارے مرتبے کے افراد کی چار چار کوٹھیاں ہیں لاہور کراچی اور مری میں۔ وہ ہر سال شاندار کارین بدلتے ہیں۔“

”اُن کے بیوی بچے پورپ سے مشرق بعید تک شاپنگ کے لیے جاتے ہیں۔“

”میں نے تو نہیں دیکھا کوئی ان کے پاس بھی جو کچھ جتن نہ ہو۔ وہ تو ایسے پنی تھے۔“ مومن نے کہا۔

”اب دیکھو ایک اسکول چلا رہے تھے میاں بیوی۔“

”خدا کا شکر ہے کہ بیوی باصلاحیت ہے اور اسکول اچھا چل رہا ہے۔ آمدنی کا مسئلہ نہیں ہوگا۔“ اکرام شیخ بولا۔ ”مومنہ تو غیر نہیں مافی تھی۔“

”زیب النساء سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہیں رہے۔ وہ اور شملہ دونوں اسکول چلائے میں مدد کریں آئی کی۔“

”زیب النساء ڈرا ڈرائی تھی۔ میں نے کہا کہ جب تک ہم لاہور میں تھے اور صامن رضوی ایس پیس تھے، اُن کا گھر غیر محفوظ تھا۔ اب وہ بات پرانی ہو گئی۔ سب بھول چکے انھیں۔ اس گناہ گھر کی دیواروں میں تم بھی محفوظ ہو گئے۔ چاہو تو نام بدل کے وہیں نچر ہو جانا انھیں سہارا ہوگا۔“

”یہ تو نے اچھا کیا۔“ مومن آنسو پونچھ کے بولا۔

”میں نے کہا۔“

”بڑی حوصلہ شکن خبر سنائی تو نے کاش؟“

”وہ کچھ دن اور جی لیتے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے کہ ہم اپنی جدوجہد میں کامران ہوئے ماں کے اور ہمارے دشمن۔“

”ایک تھے، مجرم ہم نہیں وہ تھے۔“

”یہ تو جانتے تھے وہ۔ پہلے ہی سمجھ گئے تھے۔“ مومن بولا۔ ”ان کے پاس عقل اور ذہانت تھی اور اتنا طویل تجربہ تھا۔ حالات کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ اپنے یقین کا کھل کے اظہار کرتے۔“

”منظر نے بھی بتایا کہ اس زمین کا قبضہ حاصل ہو گیا ہے، جس پر وزیر اینڈ کمپنی اور سپر ایم ڈیوڈی سٹیکس تھے۔“

”وزیر خاں ہسپتال کے پروجیکٹ کی تکمیل کی راہ میں اب کوئی رکھٹ نہیں رہی۔ وزیر خاں چیرمینیل ٹرسٹ کا کنٹراں خود عبدالودود منظر ہے۔“

”راہد کی نیگل خرم بھی اُس نے سنبھال رکھی ہے۔ منظر اینڈ بھاری کے نام سے اچھا بڑس کر رہی ہے۔“

”اکرام شیخ نے کہا۔“

”انگل رضوی نے اس کی بہت

”منظر نے بھی بتایا کہ اس زمین کا قبضہ حاصل ہو گیا ہے، جس پر وزیر اینڈ کمپنی اور سپر ایم ڈیوڈی سٹیکس تھے۔“

”وزیر خاں ہسپتال کے پروجیکٹ کی تکمیل کی راہ میں اب کوئی رکھٹ نہیں رہی۔ وزیر خاں چیرمینیل ٹرسٹ کا کنٹراں خود عبدالودود منظر ہے۔“

”راہد کی نیگل خرم بھی اُس نے سنبھال رکھی ہے۔ منظر اینڈ بھاری کے نام سے اچھا بڑس کر رہی ہے۔“

”اکرام شیخ نے کہا۔“

”انگل رضوی نے اس کی بہت

”مرد کی تھی۔“

”میں نے گھڑی دیکھی، ڈیڑھ بجنے والا تھا۔“

”اگر ایک ٹرک ساڑھے گیارہ بجے حیدر آباد سے چلے۔“

”میں نے کہا۔“

”تو کتنی دیر میں کراچی پہنچے گا؟“

”ٹرک؟“

”... ڈھائی تین گھنٹے تو ضرور ملگ جاتے ہیں۔ ایک تو ٹرک زیادہ رفتار سے نہیں چل سکتے، سڑک خراب ہے، کئی جگہ سے بند رہی ہے، نیپلوں کچا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔“

”بس پھر ٹیکس ہے۔“

”میں نے اُس سے ہاتھ ملایا۔“

”تم اب چلتے ہیں ورنہ دیر ہو گئی تو اُس کی محنت بھی کارت جاسے گی جس نے یہ اطلاع ہم تک پہنچائی۔“

”وہ کون ہے؟“

”بے کوئی نا دیدہ مہربان، ہم قیاس کر سکتے ہیں مگر یقین کے ساتھ اس کا نام نہیں لے سکتے۔“

”میں نے کہا۔“

”دیکھو، کہیں یہ حال نہ ہو، جو مضبوط اطلاعات پر یوں دوڑے چلے جانا کوئی دانش مندی نہیں۔“

”اکرام شیخ بولا۔“

”فکر مت کر ہماری۔ مارگریڈہ اتنا رستی سے نہیں ڈرتا، جتنے ہم مرد گریہ انسان کے جھبیس میں پھرنے والے شکریہ جیواؤں سے ڈرتا دیکھ گئے ہیں۔“

”انھیں نے ہمیں سے متاثر رہنا اور تاریک پہلو پر پہلو زور کرنا سکھا دیا ہے۔“

”میں نے کہا۔“

”وقت اور غم نے وفا کی تو شام سے پہلے پھر نہیں ملیں گے۔“

”ہم کٹھن نکلے اور سڑک پر پیدل چلتے گئے۔“

”ایک فلائنگ کے اس راستے پر ہمیں سامنے سے آنے والی دو گاڑیاں ملیں۔“

”پچھلے سے آنے والی تین گاڑیوں میں سے دو ہمارے اشارے کو نظر انداز کرتے ہوئے گولی کی طرح گور گئیں۔ تیسری کار ایک فاسک دیگن تھی جسے ایک عورت چلا رہی تھی۔ خلاف توقع اُس نے کار روک لی اور میں بچے بیٹھنے کا موقع عطا کیا۔“

”کار کے ڈنڈا سکرین پر ریڈ کر اس کا نشان تھا اور اس کے نیچے ڈاکٹر کے الفاظ درج تھے۔“

”وہ تیس سال سے زائد عمر کی خاصی قبول صحت اور خوش اخلاق عورت تھی مجھے اس خیال سے شرمندگی ہوئی کہ ہم اس کی نیکی کے بدلے اُس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور اس سے کار چھین کر اس کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کرنے والے ہیں۔“

”سبے شک! ہم کوئی نقصان نہیں ہونے دیں گے مگر کچھ بھی ایک عورت کے لیے گھر کے راستے کو چھوڑ کر دو اجنبی افراد کے ساتھ

کسی خطرناک قسم پر جانا بہت سے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے گھر والے، شوہر اور بچے سب اس کی گمشدگی سے پریشان ہوں گے۔ خود اس کا جذباتی رد عمل نہ جانے کیا ہو۔ آئندہ تو خیر وہ راہ چلتے کسی کو مرنا بھی دیکھے گی تو گاڑی نہیں روکے گی۔

میں نے اچانک آگے جھٹک کر کہا: بس یہاں اتار دیں میں۔

عصمت تھوڑی سی متعجب ہوئی: اتنا فاصلہ تم کو پیدل طے کرنے کی عادت ہوئی چاہیے۔ جوان آدمی ہو،

”بس میٹم“ میں نے اترنے کے بعد کہا۔ آپ سے بھی ایک گولرٹن ہے۔ راہ چلتے ہر اجنبی کو یوں لفظ مت دیجیے۔ خصوصاً خیر آباد سڑکوں پر۔

وہ مسکرائی: ”میں ڈاکٹر ہوں۔ بیمار ذہن رکھنے والوں کے چہروں پر عجیب خیالات کا عکس دیکھ لیتی ہوں۔“

”کبھی کبھی چہرے دھوکا بھی دے جاتے ہیں ڈاکٹر صاحبہ! محسن بولا۔

وہ ہنس: ”مجھے کوئی دھوکا نہیں ہوا تھا میں نے تم دونوں کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ تم سنکر راور من ہو۔“

اس کی بات نے مجھے اندر من کو ایک سائین پریشان کر دیا۔

”مجھے انوس ہے کہ اس سے زیادہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گی۔“ وہ بولی۔ ”میری کچھ میموریاں ہیں جن پر

گڈ لک ٹیو جٹا میں، خدا حافظ؟“

ایک وقت ہم دونوں نے سیلیوٹ کے انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

”خدا حافظ! محسن نے کہا: اینڈ تھینک یو“

”مجھ سب سے زیادہ نیک خواہشات کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

جب کار چلی گئی تو میں نے ایک گہری سانس لی۔

”یہ اچھا کیا تو نے؟“ میں بولا۔ ”خود مجھے ہیشیاں ہوتی تھی اسے روکنے کے لیے۔“

”چلو۔ اچھا ہی ہوا۔ جاتے جاتے دعا تو دے گئی۔ یہ احساس تو دے گئی کہ دشمنوں کے مقابلے میں

دوست بھی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اب یقین آئے گا کہ ہے کہ راہ چلتے سیڑیوں پر زوروں لوگ، ہمیں پہچان لیتے ہوں گے لیکن وہ کسی ذاتی میموری کے باعث یا ہماری پریشانی

کے خیال سے سامنے آئے شناخت کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس یقین کے ساتھ کتنی طاقت ملتی ہے۔ راہ چلے ہوئے سڑک اور بازار میں، ہوٹل، ریسٹورانٹ میں، بیچ سے شام تک ہمارا بیشتر وقت ایسے ہی پس پردہ رہنے والے دوستوں، مددگاروں اور ہمدردی خواہوں..... کے درمیان گزرتا ہے۔ لاکھوں میں ایک شکاری ہے۔ ہزاروں محافظ۔“

میں نے پلٹ کے دیکھا: ”اے بھئی، ہمارے مطلب کی گاڑی بھی دی اللہ میاں نے۔“

”اللہ کرے ڈک بھی جائے،“ محسن بولا۔

وہ گاڑی جو ایک چلتا پھرتا ڈاک تھا کسی بیکری کی ڈیل روٹیاں دکاؤں پر بیچتی تھی۔ ڈیل روٹی کا ایک کسٹنی پیر

اشتمال اس کے پچھلے باس ناخنوں کی تینوں دلیاروں پر نقش تھا۔ اس میں ایک حسینہ سوئٹنگ کے لباس میں بڑی

نراکت سے ایک سلاش کھا رہی تھی نیچے بیوٹی بریڈ کا نام لکھنے والے نے زبان ازگ سے ناواقفیت کی بنا پر

بریڈ میں لے کر جگہ ”ڈیل آئی اے“ لکھ دیا تھا۔ اس دلچسپ غلطی نے بریڈ کو بریڈ کر دیا تھا جس کا مطلب ”ہو۔ نا ہے“ نسل۔

”حسن کی نسل“ مار ڈک ڈیل روٹی کے تقسیم کرنے گاڑی روک کے اپنا مشہور پر نکالا جس کے اوپر نیچے اور چاروں

طرف بھجورے بالوں کی کھنی بائد تھی۔ وہ چہرہ ایک ناریل سے شاہ تھا جس کو ابھی چھیلا نہ گیا ہو۔

”کہاں جاؤ گے پو پائی دی سیلے؟ اس نے مزاح انداز میں کہا۔ یہ کارٹون سیریل ان دنوں خاصا مقبول تھا۔

ہم جواب دیے بغیر آگے چڑھ کر ٹھٹھ گئے جہاں تم بے جاؤ گے،“ میں نے کہا۔

”دو دور روپے لوں گا۔ نہیں منظور تو آؤ گاڑی نہ دے دے۔“

وہ بولا۔

میں نے اسے پانچ روپے دیے اور کہا: ہم ڈھائی ڈھائی دیں گے، بولو منظور ہے؟“

اس نے دانت نکال کر کہا: پیڑوں بہت سنگ ہو گیا ہے۔“

”تمہاری بیکری کا...“ میرا مطلب ہے گاڑی کا پچھلا

پہتہ پیچ گیا ہے غالباً،“ میں نے گاڑی کے روانہ ہوتے ہی کہا۔

اس نے گاڑی فوراً روک دی اور اتر کے پیچھے گیا۔ دوسری طرف سے میں اُترا۔ میں نے محسن کو آگے بھٹک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا اشارہ کیا۔

ڈرائیور نے باری باری دونوں ڈرائیوروں پر بلک مار کے کہا: ”ہذا تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں،“ میں نے گاڑی کے پیچھے والے دروازے کے دونوں پٹ کھول کے کہا: ”زمانہ ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ میری حرکت پر حیران بھی نہ ہوا یا تھا کہ میں نے اسے اندر اچھال دیا اور پھر خود بھی چھلانگ مار کے اندر

پہنچ گیا۔ اس کے فریزر پر رکے اٹھنے سے پہلے ہی میں نے دروازہ اندر کھینچ کے بند کر لیا اور محسن نے گاڑی چلا دی۔

اندرا خاصا اندر تھا اور ڈیل روٹیوں کی مخصوص مہک تھی۔ اندر سے ڈیسے کی ساخت بھی کسی بہت بڑی ڈیل روٹی جیسی تھی۔

”حسن کی نسل“ ڈیل روٹی کا تقسیم کار کسی آتش فشاں کی طرح گولگول آ آ دھواں دیتا اٹھا۔ پدماسی، غنڈہ گردی میں

تم کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ میرے مہلوں سسر ڈی ایس بی میں۔“

”پانچ روپے نکالو،“ میں نے اس کے ایک ایسا جھانپڑ مارا کہ وہ پھر پیچھے جھاگرا۔

”کون ہو تم لوگ؟ کیا جانتے ہو؟“ وہ کانپتی آواز میں بولا۔ اس نے پانچ کا نوٹ میری طرف بٹھا دیا۔

میں نے اس کی آنکھوں پر بھی بانجھی۔

میں نے یہ وقت مسلسل ڈرائیونگ میں صرف کیا۔ اس نے خاصی رفتار سے گاڑی چلائی۔ اس کا اندازہ مجھے پچھلے

میں پچھنیک جائیں؟“ وہ چلانے لگا۔ ”خدا کے لیے مجھے مت مارو۔ چارو تون کو بھوہ کرنے کا گناہ مت کرو۔“

”کون چارو تیں؟“ میں نے کہا۔

”میری بیویاں۔ ان سب کا ایک ہی فور ہوں میں۔“

”اجتا میں نے دلچسپی سے کہا: ”اکھوتے شوہر تو تم مجھوں پر ہوا کرتی ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا: ”اللہ نے اولاد دی ہوتی تو میں دوسری بھی کیوں کرتا۔“ وہ ایک سرو آہ خبر کے بولا۔

”بھراب کیا کرو گے، پاپو جس کی تو گنجائش ہی نہیں؟“ میں سب کو طلاق دے دوں گا۔“ وہ بولا۔ ”شترعی حق ہے برا۔۔۔“

”واہ، کیا شرع کا استعمال ہے۔ ان چاروں کو طلاق دو

پھر مزید چاکر۔ اُن سے بھی کچھ نہ ہوتا تو اللہ کی مرضی اور انھیں بھی نکال باہر کرو۔ سلسلے ناریل کی اولاد۔ اس سے بہتر ہوگا کہ میں اُن چاروں کو آزاد کردوں ایک گولی سے تاکہ وہ اپنی مرضی سے پھر شادی کر سکیں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ چاروں اولاد والی ہوں گی۔“

میں نے ریو لورا اٹھا یا تو وہ بلبلانے لگا: ”اللہ رحمت کا واسطہ تم کو۔“ مجھ سے جتنا پیسا جاہو لے لو۔“

میں نے ریو لور رکھ لیا: ”ہم ڈاکو نہیں ہیں، فقیر لوگ ہیں پیسا ہاتھ کا بیل ہے ہمارا۔“

یہ۔ تمہاری جان بخشی کی صرف ایک شرط ہے۔ تم چپ چاپ بیٹھو اور کوئی سوال نہ کرو۔ شام کو تم گھر جا سکو گے لیکن بعد میں اگر...

تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا ہمارے بارے میں تو ہم آجائیں گے۔“

”میری تو بہ، میرے باپ کی تو بہ؟“ وہ کان بچو کے بولا۔ اس کے باوجود میں نے اس پر اعتبار کرنے کا خطہ ہول

نہیں لیا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو لانا خدا کے پیشے کے مہنوم کو بھی غلط بیان کر سکتا تھا۔ ایسا شخص دنیاوی معاملات میں خیمہ کی پروا کہاں کرتا ہوگا۔ میں نے اسے گاڑی کے

اندر ہی باندھ کے ڈال دیا۔ اس کے ہاتھ پیر باندھنے کے لیے مجھے ایک دست بل گئی تھی۔ منہ بند کرنے کے لیے میں نے

اس کی جینس پھاڑی اور کیڑا اس کے حلق میں تھونس دیا۔ ایک پٹی میں نے اس کی آنکھوں پر بھی بانجھی۔

محسن نے یہ وقت مسلسل ڈرائیونگ میں صرف کیا۔ اس نے خاصی رفتار سے گاڑی چلائی۔ اس کا اندازہ مجھے پچھلے

جتنے میں چکوں اور جھٹکوں سے ہوتا رہا سڑک واقعی بہت خراب تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد گاڑی ٹھہر گئی۔

میں نے نیچے اتر کے دیکھا تو محسن بھی باہر آ چکا تھا۔

”ہم کراچی سے تقریباً تیس چالیس میل دور ہیں؟“ محسن نے کہا۔

”یہاں گاڑی کیوں روکی ہے؟“

محسن نے سڑک کے دائیں جانب اشارہ کیا۔ ایک چھوٹی سی سڑک کو لڑی کے ایک سٹنچ سے بند کر دیا گیا

تھا۔ یہ تختہ تقریباً ایک فٹ چوڑا اور بیس فٹ کے قریب لمبا تھا۔ اس پر سفیدی پھیر کے سرخ حروف میں لکھا تھا: ”ہر قسم کی ٹریفک کے لیے بند ہے۔“ اس کے وسط میں تین

گول دائرہ ماحقہ خطرے کی علامت ایک انسانی کھڑی

اور دو جلیاں بنی ہوئی تھیں۔

”ابھی ہم راستے سے آئے ہیں اس پر جگہ لے لے کر دوڑ گئے ہونے تھے جن پر کھڑا ہوا تھا۔ متبادل راستہ“ اور ایک تیز کاٹنا تھا، عمن نے کہا ”مثلاً وہ دیکھ ابھی ہم ایک متبادل راستے سے گزر رہے تھے“

تقریباً سو گز پہلے عمن نے متبادل راستے کا سامن بورڈ نظر لیا۔ سڑک جہاں سے بھی ٹوٹی چھوٹی تھی وہاں ٹریفک کو روک دیا گیا تھا۔ بائی وے ڈیپارٹمنٹ والے سڑک کی مرمت کر رہے تھے چنانچہ ٹریفک کے لیے سڑک سے ہٹ کر کوئی ماضی راستہ فراہم کیا گیا تھا۔ چونکہ پوری سڑک ایک بارش ٹریفک کے لیے بند نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے صرف موقت قلاب حصے پر متبادل راستے سے سامن بورڈ لگا دیے گئے تھے اور وقت کا کارڈ پورا ہونے تک ٹریفک کو وہاں یا میں سڑک سے نیچے کچے راستے پر رواں رہنا تھا۔

”میں سارا راستہ ایک سیکر پر منور کرتا آیا ہوں“ عمن نے کہا ”اور یہاں پہنچنے کے بعد گویا اسکیم فائل ہو گئی“

”تو نے سامنے سے آئے والی گاڑیوں کے نمبروں پر بھی غور کیا؟“ عمن نے کہا۔

”میں وہ بھی دیکھتا ہوں“ عمن بولا ”لیکن ابھی تک لاہور سے آنے والی صرف تین کاریں گزری ہیں“

”اچھا۔ اسکیم کا ہے آپ کی سٹر اسکیم؟“ عمن نے کہا۔

”اگر کچھ ایسا ہو سکے“ عمن سوچتے ہوئے بولا کہ ”کوئی گاڑی لے کر آگے جلا جائے جیسا کہ سامنے نظر آ رہا ہے“

دو فرلانگ کے بعد ایک موڑ ہے۔ سڑک تھوڑا سا دائیں جانب گھوم گئی ہے اور یہ موڑ آیا ہے ایک نیلے کی وجہ سے“

”میں نے اس جگہ پر فوٹو سے دیکھا۔ واقعی نیلے کے پیچھے سے آنے والی گاڑی موڑ کاٹنے سے پہلے دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔“

”تو اس نیلے کے پیچھے کس جگہ اپنی گاڑی روک کر سڑک پر نظر رکھ کر تیرے پاس دوڑ رہی ہے۔ تو اُدھے ہوئے میل تک ہر آنے والی گاڑی کو دیکھ لے گا۔ اس کا نمبر بھی دو فرلانگ سے پڑھا جا سکے گا“

”میں سمجھ گیا نہیں وہاں آہر ویلن پوسٹ بنا کے بیٹھ جاتا ہوں اور جیسے ہی کوئی گاڑی آتی ہے جس پر مطلوبہ

نمبر ہو نہیں دوڑ کے آتا ہوں اور۔۔“

”نہیں دوڑ کر آنے کی ضرورت نہیں، تو وہیں سے مجھے سگنل دے سکتا ہے گاڑی کا بارن بجائے“

”بارن تو ادھر سے آنے والی ہر گاڑی پر بجاتی ہے۔ تو وقتے وقفے سے تین بار بارن بجا سکتا ہے۔“

عمن بولا۔

”اتنے فاصلے سے بارن کی آواز سنائی دے گی؟“ عمن نے کہا۔

”اچھا فرض کریں نے بارن سگنل دیا کہ ٹرک آ رہا ہے تو بچھڑے“

”پھر یہ کہ میں یہاں اپنی کارروائی کروں گا۔ ٹرک کا راستہ بدل دوں گا۔“ عمن نے کہا ”میں وہ متبادل راستے کا سامن بورڈ اٹھا کے لانا ہوں۔ میں بالکل تیار ہوں گا۔ ادھر میرا سگنل ملا“ ادھر میں نے متبادل راستے کا یہ سامن بورڈ

ادھر رکھا جہاں لکھا ہوا ہے کہ راستہ پر قسم کی ٹریفک کے لیے بند ہے۔ اس سامن بورڈ کو مٹا کے میں یہاں سڑک کے بیچ میں لگا دوں گا“

”تو اکیلا کرے گا یہ کام؟“ عمن نے اسکیم کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

”متبادل راستے کا سامن بورڈ میں ابھی لے آتا ہوں“ ایک طرف رکھ کے انتظار کرتا ہوں۔ پھر وہ سڑک بند کرنے والا بورڈ مجھے گھسیٹ کر ادھر لائے اور متبادل راستے کا بورڈ ادھر رکھنا ہے۔ یہ صرف پانچ سات منٹ کا کام ہے“ عمن نے کہا۔

”پلان تو زبردست ہے۔“ عمن نے کہا ”مگر دوست! پہلی بات تو یہ کہ ٹرک کو غلط سمت میں موڑنے سے کیا ہو گا؟“

”میرا خیال ہے کہ آگے سڑک پر کوئی کمزور مٹی ہوگا۔ عموماً اس قسم کے غیر محفوظ ٹکڑے جو زیادہ وزن نہیں برداشت کر سکتے، پہلے بھاری گاڑیوں کے لیے موزع قرار دیے جاتے ہیں، اس کے بعد ہر قسم کی گاڑیوں کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ آگے کی بات ہے“

سامن بورڈ پر غلط سے نشان ہے تو خطرہ ضرور ہوگا“

”دوسری بات یہ کہ اس ٹرک کے ساتھ آگے جاتے ہوئی اور گاڑی ہوئی تو؟“

”خدا کرے کہ نہ ہو۔ ہوئی تو اسے روکنے کی اور میری جیت میں بھیجے کی کوئی صورت کریں گے“ عمن نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گھڑی دیکھ کے کہا ”میں آگے جاتا ہوں۔“ دوڑ میں کی مدد سے میں ٹرک کو کافی فاصلے سے دیکھ سکوں گا۔ جیسے ہی مجھے زیر نظر آئے تو میں ایک ہوائی فائر کروں گا“

”فائر پر وہ چوتھے نہ ہو جائیں؟“

”اس دیر نے میں انھیں کیا نظر سے لے گا۔“ بیوٹی بریڈ کی اس گاڑی پر توجہ شک کرنے سے رہے۔ فائر کرتے ہی میں بھی چل پڑوں گا اور کوشش کروں گا کہ کسی دوسری گاڑی کو اس کے ساتھ نہ آئے دوں“ میں نے کہا۔

”میں نے عمن کو واپس جاتے دیکھا۔ وہ متبادل راستے، کارروائیاں اٹھانے جارہا تھا۔ سڑک کے آگے اُس صفے کی مرمت کا کام ختم ہو چکا تھا۔ مگر بائی وے ڈیپارٹمنٹ کے ٹھیکے دار نے انہی تمام اسباب نہیں اٹھا یا تھا۔ شاید اس کا ارادہ سب سامان ایک ہی بار میں بیٹھنے کا ہو گا“

”ابھی بھی در ہے۔“

”میں سڑک کی سلسل مار کر ٹیل روٹی کی گاڑی لے کر آگے چل پڑا۔ دو فرلانگ کے بعد میں نے موڑ کاٹنا تو مجھے سڑک

تاجہ نگاہ سیاحی اور سپاٹ نظر آئی۔ دوپہر کے وقت ٹریفک بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ وہ بین لگا کے دیکھنے سے مجھے کافی فاصلے پر سڑک کی مرمت کرنے والے مصروف دکھائی دے رہے۔ وہاں سے ایک بس گزری تو اُس نے

سڑک چھوڑ کر متبادل راستہ اختیار کیا۔ اور گرو کا بچہ لاسا اٹھا۔ بس جب پھر پکی سڑک پر آئی تو میں نے اُس کا نمبر پھٹنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس بہت طاقتور دوڑ میں کی مدد سے میں نے نمبر صاف پڑھ لیا۔ حالانکہ بس ابھی آدھا میل دوڑ تھی۔“

”میں نے بیوٹی بریڈ کی گاڑی کا رخ واپس کرنا چاہی

کہ طرف کیا اور جب بس گز گئی تو مجھے کے دونوں دیوانے کھول کے اندر چار بچوں کے اگوتے نیلے اولاد شہر کو دیکھا۔ وہ عجیب کھسکا ہوا دروازے تک پہنچا تھا

حالانکہ اُس کے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے تھے۔ شاید اُس کا ارادہ لائیں مار کے دروازہ کھولنے کا ہوگا۔ اس طرح وہ گزرنے والوں کو متوجہ کر سکتا تھا۔“

”تم کیوں چار بچوں کا تھما لے جا رہے ہو؟“

”میں نے اُسے گھسیٹ کر پھر پیچھے پھینکا۔ اُس کا سر من سے سامنے لگا اور اس چوٹ نے واقعی طور پر اُسے

ٹانگ آؤٹ کر دیا۔ میں نے اُس کے ٹانگوں کو آدھے کے لیے ملتی سگرت اُس کے بازو پر لگائی اُس نے حرکت تو کی مگر وہ اٹھلا نہیں۔“

”میں مطمئن ہو کر باہر آگیا اور موقع محل دیکھ کے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ وہ جگہ بہترین آہر ویلن پوسٹ ثابت ہوئی۔ میں وہاں پتوں میں چھپا ہوا کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا لیکن سڑک پر دوڑ تک کا منظر دیکھ سکتا تھا۔“

”بیوٹی بریڈ کی گاڑی سڑک کے ایک کنارے گھڑی ہوئی تھی کوئی بھی دیکھنے والا اس سے بھی سمجھ سکتا تھا کہ گاڑی خراب ہے۔ ایک اضافی فائدہ یہ تھا کہ درخت کے اوپر سے فائر کرنے میں آواز پھیل کر سنائی دے گی۔ کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ فائر بیوٹی بریڈ کی گاڑی سے کیا گیا ہے۔“

”ادھر کھسٹنگ تک میں ایک شاخ پر نیم دراز سگریٹ پیتا رہا اور وقفے وقفے سے دوڑ میں لگا کے دیکھتا رہا اس

عرصے میں دس گاڑیاں گزریں۔ ان میں سے تین مسافر بس تھیں، پانچ ٹرک تھے اور دو پرائیویٹ کاریں۔ گھڑی میں اب ہونے تین ہو رہے تھے گویا ٹرک کو حیدر آباد سے

روانہ ہوئے سو تین گھنٹے ہو چکے تھے، ابھی کراچی تک مزید ایک گھنٹے کی مسافت تھی کہ ٹرک سوا چار گھنٹے میں پہنچے گا، نہیں، راستہ تو ڈھائی تین گھنٹے کا ہے۔ کہیں ٹرک گزر تو نہیں گیا، لیکن عمن خاصے یقین کے ساتھ کہہ رہا

تھا کہ وہ ساڑھے سات دیکھتا آیا تھا۔ ممکن ہے ٹرک کی ریلنگ در سے ہوئی ہو یا راستے میں کوئی خرابی ہو گئی ہو، میرا ذہن دونوں طرح کے دلائل و شمار پر متاثر کے حق میں بھی اور

اس کے خلاف بھی۔ میری جھنجھلاہٹ اور مایوس پڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کے خیال آ رہا تھا کہ ٹرک پہلے ہی نہ نکل گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو قصور میرا ہوگا۔ میں نے اُس فحیر

ٹھیکہ دار کے معاملے میں ٹانگ اڑا کے کم سے کم ادھا گھنٹا گنوا دیا تھا۔ پھر ہم نے اکرام شیخ سے بھی ادھا گھنٹا تین کی تھیں۔ حالانکہ ہم چاہتے تو اس وقت ملاقات کو مختصر کر دیتے۔“

ٹرک اچانک نمودار ہوا۔ میں نے دوڑ میں سے دیکھا تو اس کا نمبر نوکس کرتے ہی واضح ہو گیا۔ یہ ایک آئل ٹینکر تھا جو ایک عجیب بات تھی۔ میں کسی مال بردار ٹرک کی توقع کیے بیٹھا تھا۔ ٹرک ابھی آدھا میل دوڑ تھا مگر

31

ایک گڑبڑ پھٹی کہ اُس کے آگے آگے ایک پرائیویٹ کار آ رہی تھی۔ اُسے روکنا ضروری تھا۔
وقت کم تھا چنانچہ نہیں نے فائر کیا اور درخت پر سے پھلانگ لگا دی۔ دو منٹ بعد میں بیوٹی بریڈ کی گاڑی کو آہستہ آہستہ چلانا ہوا واپس کر اسی کی طرف رول تھا۔
کار جب میرے قریب سے گزرنے لگی تو میں ایک دم سڑک کے درمیان میں آگیا۔ کار ڈرائیور نے ایک دم بریک لگائے اور کار کو انتہائی بائیں جانب موڑ کے تصادم سے بچا لیا۔ میں پھر سڑک میں ہو گیا مگر کار ڈرائیور بے حد مشتعل تھا۔ اُس نے کار روک لی تھی۔
”لشے میں ہے“ اُس نے مجھے گالی دے کر کہا۔

”اندھے...“
میں نے اپنی گاڑی اس کے سامنے روکی اور نیچے اُتر آیا۔
”گالی کیوں دی؟“ میں نے اُسے کار سے پکڑ کے باہر کھینچ لیا۔

”چھوڑو میرا کار۔ تم جانتے نہیں میں کون ہوں؟“ اس نے میرا ہاتھ جھٹکنے کی ناکام کوشش کی۔
”تم ٹولے لٹ کے پھرتے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”یا ظم خاں کے ماہے ہو۔ میں تم کو بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں؟“
اُس نے میرے سر پر ہتھ مارا۔ میں نے جواب میں اس کو دو بار پٹختی دی۔ ایک بار دھوپی ڈنٹے کے انداز میں اور دوسری بار فٹنگ ٹنگ مار کے دھکا توڑ آدمی تھا مگر پروفیشنل نہیں تھا۔ دوسری پٹختی کے بعد وہ لپا لپٹ گیا۔ میں نے اُسے اٹھا کے کار میں واپس اپنی جگہ بٹھا دیا۔

”سڑک پر کار لے کر آتے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نے سڑک خرید لی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”امید ہے کہ آئندہ تم پہلے تو لوگے پھر رولو گے غلطی اگر میری تھی تو تم مجھے معذرت کرنے کا موقع تو دیتے۔ غلطی کسی سے

مجھ ہو سکتی ہے اور غیر ارادی بھی ہو سکتی ہے۔“
وہ مجھے خون آشام نظروں سے گھورتا رہا اور ہاتھ مارا۔
”میں دیکھ لوں گا تم مجھے جانتے نہیں؟“
”گالی بکنے سے پہلے تم مجھے نہیں جانتے تھے۔“
میں نے کہا۔ ”لیکن تم نے دو منٹ پہلے وہ دیکھ لیا جو اتنی زندگی گزار کے پہلے کسی نہیں دیکھا تھا۔ آئندہ کیا دیکھو گے یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے۔“

ٹرک اتنی دیر میں میرے قریب سے گزر چکا تھا اور میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے کسی شخص نے میرا چہرہ نہیں دیکھا تھا کیونکہ اُن کی طرف میری پشت تھی۔

”میں نے خیال رکھا تھا کہ تمہیں زیادہ چوٹ نہ آئے۔“
میں نے اس کی گاڑی سے چابی نکال کے کہا۔ ”پھر صبریں...“
آئی ایم سوری۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو؟ وہ پریشان ہو کے بولا۔
میں نے اندر ہاتھ ڈال کے اس کا بونٹ کھولا۔ ٹرک پر موٹر کیپ کے تار ایک جھکے سے کھینچ کر الگ کیے اور بونٹ بند کر کے چابی واپس اُسے تھمادی۔ ”میری گاڑی کا فبر نوٹ کرلو“ میں نے کہا۔ ”اور مجھے اجازت دو۔“
”خدا کے لیے ایامت کرو۔ وہ چلا گیا۔“ میں گاڑی کیسے لے جاؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں کچھ نہیں کموں گا۔“

لیکن میں نے بیوٹی بریڈ والوں کی گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب وہ کسی سے لفٹ لے لیا بس میں بیٹھے اور کراچی جانے۔ وہاں آٹو پارٹر مارکیٹ سے ڈسٹری بیوٹر کیپ وائر کا سیٹ لاسٹ اور پھر گاڑی لے جانے۔ جو قانونی یا غیر قانونی کارروائی کرنا چاہے کرے۔ چار بھائیوں کا اکوٹا ہے۔ اولاد تو ہر گز سے کیا بتائے گا کہ وہ کون تھے جو اس کی گاڑی چلا رہے تھے۔

مارہٹ ہوتے صرف ٹرک والوں نے دیکھی تھی۔ بعد میں جو بس گزری تھی، اُس کے مسافروں نے مجھے کار والے سے باتیں کرتے ضرور دیکھا تھا لیکن اس وقت میں کار کی کھڑکی سے لگا بہت پرسکون کھڑا ہوا تھا۔ پھر میری اندیشہ ضرور تھا کہ کسی کار کو روک کر لفٹ لے اور میرے تعاقب میں آئے۔

”من نے دور سے ہی مجھے آتا دیکھا تو میری طرف لپکا۔“

”کیا ہوا؟“ میں نے اس کے قریب آتے ہی کہا۔ ”ٹرک کھر گیا؟“

”من دواؤں کھول کے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔“ اُسی طرف جدھر ہم بھیجا جا رہے تھے۔ مگر یہ آؤ تو آئل ٹینک تھا۔
”ہاں، مگر تو آئل ٹینک میں بھی بہت ہوتی ہے اور اس میں اگر اوپر تک تیل بھر دیا جائے تو بیچے کا مال نظر بھی

نہیں آتا۔“ میں نے کہا۔ ”بعد میں ایک بس بھی آئی تھی؟“
”ہاں، لیکن اس وقت تک میں روڈ ماں میں بدل چکا تھا۔“ من نے کہا۔ ”تو نے دیر کیوں کی؟“

اس کی بات کا جواب دینے کا موقع مجھے نہیں ملا۔ ہمارے بائیں جانب ایک ایسا قیامت خیز دھماکا ہوا جس نے زمین ہلا دی۔ اس پہلے دھماکے سے ہی میرے کان میں بوٹھنے اور میں نے ونڈا سکرین کا شیشہ بکھرتے دیکھا۔ میرے ہاتھوں میں گاڑی امرانی اور میں اسے خاصی کوشش سے سنبھال کے پھر سڑک پر لڑنے میں کامیاب ہوا۔
”من نے غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر سڑک کیوں کے بیچ میں کر لیا تھا۔ اب میرے ساتھ اس نے بھی سہراٹھا کے دیکھا تو بائیں ہاتھ پر ہیس گرونگار کا ایک بہت بڑا دایا سا اٹھٹا دکھائی دیا۔ اس خبر میں پھر اور چٹانوں کے ٹکڑے بھی تھے۔ ٹرک کے جلنے ہوئے ٹکڑے بھی اور شیلڈان کے اٹھٹا کے ٹکڑے بھی جو ٹرک چلا رہے تھے پہلے بڑے دھماکے کے بعد متعدد جھوٹے دھماکے ہوئے اور ہر دفعہ میں نیا نیا جگلا ہٹا رہے نظر کسی آتش فشاں کے پھٹنے کا منظر لگتا تھا جس کے دہانے سے بار بار لادو اسیکورڈس فٹ کی بلندی تک اچھل رہا ہو۔

گاڑی کا ونڈا سکرین کسی چیز کے گرنے سے نہیں ٹوٹا تھا۔ اسے دھماکے سے پیدا ہونے والی شاک ویو نے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیشے کے ذرات اُڑ کر ہمارے چہرے پر نہیں آئے۔ ورنہ ہم آئندہ بھی ہو سکتے تھے۔ تھوڑا سا تحفظ ہمیں دھوپ کے چشموں سے بھی ملا جو ہم نے تو ہمیں بدلنے کے لیے لگائے تھے مگر اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ڈھال بن گئے۔ ہماری آنکھیں گرونگار سے محفوظ ہیں، گاڑی کے بے قابو ہونے کی وجہ یہی شاک ویو ہی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ جب کہیں کوئی بڑا دھماکا ہوتا ہے تو وہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے اور اس خلا کو پکڑ کرنے کے لیے ہوا شدید دباؤ کے سخت حرکت میں آتی ہے۔ اس سے ایک زبردست طاقت رکھنے

والی لہو پیدا ہوتی ہے جس سے دُور کی عمارات کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں اور قریب کی عمارات گر بھی جاتی ہیں۔
میں نے اب گاڑی کو ایک کنارے پر روک لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والی ٹریفک بھی خوف اور ہزمت سے جام ہو گئی ہو گی۔ یہ نظارہ ایسا تھا کہ اسے

سڑک پر آتے جاتے کسی نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ جو ٹرک مشرقی پاکستان میں غزنی عناصر سرگرم عمل تھے اور یہاں تو اب بھی مام ختین کہ انتہا پسند مغربی پاکستان کو بھی نشانہ بنانے والے ہیں۔ اس لیے لوگوں کا خوف و ہراس میں مبتلا ہونا ایک فطری بات تھی۔

میرے اندازے کے مطابق اس آئل ٹینک کو ایک میل جانے سے پہلے ہی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اب یہ تصدیق کرنے کی نہ گنجائش تھی نہ ضرورت کہ حادثہ کیوں پیش آیا۔ کیا واقعی من کی تنہا سوری کے مطابق اور کوئی کمزور پہل تھا جو ٹرک کا وزن نہ برداشت کر سکا یا کسی برساتی نالے کا پہلے سے ڈھاپا پہل تھا جسے ڈرائیور بروقت نہ دیکھ سکا تاہم ایک بات ثابت ہو گئی کہ اس آئل ٹینک میں بہت بڑی مقدار میں آتش گیر مادہ، یعنی ڈی بی ایم، بارودی سرنگ یا ڈائنامائٹ کی شکل میں بھرا ہوا تھا۔ ایک معمولی چنگاری نے آئل ٹینک کو ایک بہت جلد سے متحرک بم کی طرح اُڑا دیا۔ کوئی بھی گاڑی جب آتش سے تواتروں کے شات بننے سے بھی لگ لگ جاتی ہے۔

میں اور من اچھی تک بے خودی کے عالم میں اس غبار کو دیکھ رہے تھے جو آہستہ آہستہ بیٹھ رہا تھا۔ دھواں الگ ہو کے منتشر ہو رہا تھا اور بہت لمبی پریٹیل کو سے دائروں میں پکڑ کاٹنے لگے تھے۔

”ہتیرا...“ میں نے من کے کندھے پر ہاتھ مار کے نعرہ لگایا۔ ”وہ مارا پا پڑ والے کو۔“

”من نے قہقہہ مار کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ایم آر ایس کے لیے ایک اور تحفظ ذہانت۔ ایک اور فتح۔“
”دلاور اینڈ کمپنی کے لیے متبادل راستہ۔“ میں نے پھر سترت لے لی۔ میں نے کہا۔ ”سیدھا جہنم کی طرف۔“

واپس شہر کی طرف آتے ہوئے ہم دونوں بہت خوش تھے۔ یہ ہم دونوں کی مشترکہ کوشش تھی۔ بلاشبہ اس میں ہماری ذہانت اور بہت کا بڑا ہاتھ تھا لیکن اصل ہاتھ اس کا تھا جو ہمیں طاقت دیتا تھا، راستہ دکھاتا تھا اور تحفظ فراہم کرتا تھا۔ میرا دل اُس خدا کے لئے تھوڑا سی

کے جذبات سے معمور تھا جس نے ہم بے وسیلہ لوگوں کو اتنے جیسے کام کا وسیلہ بنایا اور ہمیں توفیق عطا کی۔
سارے چار سبجے ہم نے، بیوٹی بریڈ کی گاڑی کو فیشنل اسٹیلیم کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا۔

”فی امان اللہ!“ میں نے پیچھے کا دروازہ کھول کے چار بیروں کے اکوٹے پر، اولاد شوہر سے کہا۔ اب ہم جلتے ہیں۔ تمہاری گاڑی کا ٹھکانا اس نقصان ہوا ہے لیکن اس میں ہماری غلطی نہیں۔“

”دشمن نے انجیم گرا دیا تھا،“ محسن بولا، گھر پہنچ جاؤ تو چاروں بیروں سے کہنا کہ شکرانے کے نفل پڑھیں، نیاز دو لائیں۔“

کے ڈی اے اسکیم فیروں سے کارساز جانے والی سڑک پر آتے ہی ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس ٹیکسی نے ہمیں ڈرگ روڈ کے راستے نرسری پر آکارا، وہاں سے ہم نے دوسری ٹیکسی پکڑی تو مسافر پہنچے۔ بھوکا اور تھکنے سے ہم دونوں کا برا حال تھا۔ شام کے پانچ بجے لیج کا کوئی وقت نہ تھا۔ سینٹرل کافی ہاؤس میں ہمیں سینڈویچ اور گرم سو سے ملے جو ہم نے کافی کے ساتھ کھائے کافی بھی بہت عمدہ تھی۔ ایک بہت بڑی کھانا کی کلبھیٹ میں کچھ کیا تو مجھے سرور موس ہوا۔ چونکہ میں اور محسن فریج میں گفتگو کر رہے تھے اس لیے ہمیں غیر ملکی جہاز کا ملاح سمجھا گیا۔ صدر کے علاقے میں ابھری ملکوں کے سیلوا کٹر شاپنگ کرتے دکھائی دے جاتے تھے۔

”اب یہ ضروری ہے کہ ہم یہ وردی آمادہ ہیں“ محسن نے دوسرا سگریٹ جلانے کے بعد کہا۔ ”ہمیں نوٹ کرنر گاہ کے علاقے میں جانا ہے جہاں صبح ہم خاصا ہنگامہ کر چکے ہیں۔“

”فیروں کے ٹیکسیڈار کو ہماری تلاش بھی ہوگی۔“ میں نے اس سے اتفاق کیا۔

”وہ ٹیکسیڈار تو انڈ کو پکارا ہوا۔“

”ایسے لوگ جہنم رسید ہوتے ہیں اللہ کو پیار سے نہیں ہو سکتے۔“ میں نے کہا۔

”اس کے والی وارث دوسرے ٹیکسیڈار، زیادہ بڑے بدعاش ضرور پوچھتے پھر رہے ہوں گے کہ وہ غیر ملکی کون تھے اور کس جہاز پر سے آئے تھے“ محسن بولا۔

”نام تو دیکھ لیا ہوگا وہاں بہت سے لوگوں نے۔“

ہماری وردی کے کندھے پر جہاز کا نام تھا۔ ”میں نے کہا۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے نام نوٹ کر لیے گئے ہوں۔“

”جس نے نوٹ کیے وہ سامنے کیوں نہیں آیا؟“

”یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ہمارے راستے میں مزاح

ہوتا وہاں باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی،“ میں نے کہا۔ لیکن بات یقینی ہے کہ اس علاقے میں دوسرے غیر ہوں گے اور دوسرے ایجنٹ بھی ہوں گے، ان کی کس بھی پیشہ ورانہ فائز ایک چیز ہے۔ گمار کی کے مخالفین کے سامنے ان کے مشترکہ مفادات ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ مطمئن ہوں گے کہ ہم پولیس اسٹیشن ہی تو جا رہے ہیں، فکر کی کون سی بات ہے۔ وہ بھی انہی کے سرپرست ہوتے ہیں۔“

”لیکن اب تک انہیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہم نے اس گمار کی کے ٹیکسیڈار کو مار کے پھینک دیا ہے۔“

یہ حقائق کے خلاف بات ہے مگر واقعات کی شہادت تو ایسا ہی ثابت کرے گی، جب اس کی لاش پکڑی ہوئی حالت میں سڑک پر پڑی ملے گی۔“

”وہ جیب والا تو یقیناً سمجھا گیا ہوگا،“ میں نے محسن کے خیال کی تائید کی۔ ”میں خیال ہے اب تک دوسرے گمار کیوں تک یہ خبر پہنچ چکی ہوگی، ایسی صورت میں ہمارے نام کی اہمیت ہمارے جہاز کے نام کی تلاش جاری ہوگی۔“

محسن ہنسا۔ ”ڈھونڈتے رہیں سالے۔ معلوم نہیں وہ جہاز کہاں گیا اور وہ کہاں گئے جن کی دریاں ہم زیب تن کیے پھر رہے ہیں۔“ ناگامی انہیں مزید مشغول کرے گی۔

”خود کو غیر ملکی ثابت کرنے کے لیے میں نے بیل کی ادائیگی کے لیے دس ڈالر کا نوٹ نکالا۔“

”وٹر کچھ دیر سرکھیا تاربا۔“ پھر نوٹ اٹھا کے کاؤنٹر پر لے گیا جہاں مالک یا منیجر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خود ہمارے پاس آیا۔

”یو نو انگلش؟“ دھیمی انگریزی آتی ہے؟

”ہم نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔“

”اُس نے اپنی جیب سے دس کا نوٹ نکالا اور دس ڈالر کے نوٹ کے ساتھ میز پر رکھا۔“ دس۔“ اس نے دس روپے کے نوٹ پر انگلی رکھی اور سر کو اوپر نیچے ہلایا۔ ”یہ“

”پھر اُس نے دس ڈالر پر انگلی رکھی اور سر کو نفی میں حرکت دی۔“

”میں نے اس سے دس ڈالر کا نوٹ لے لیا اور احمقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگا۔ سوال میری صورت پر تجرید تھا کہ بتاؤ اب ہم کیا کریں وہ وہ شجر تھا یا مالک مگر اُس نے بڑی خوش اخلاقی اور فیاضی سے ہمارے شانے پر تھپکی دی۔“

”اب اڈا آئل رائٹ؟“ کوئی بات نہیں۔“

”یو آر مانی گیسٹ؟“ تم میرے مہمان ہو، سو الٹا الٹا

ان پاکستان۔“ حسب تکم پاکستان میں ہو۔“

اس شخص کی مہمان نوازی اور وطن دوستی نے مجھے خوش بھی کیا اور شرمندہ بھی۔ شرمندہ اس لیے کہ میں نے بے سبب خود کو غیر ملکی ظاہر کیا جبکہ میں پاکستانی میرے پاس پاکستانی کرنسی تھی مگر میں کھانسی کے ادائیگی کے بغیر جانے پر مجبور تھا۔ مجھے ایسی صورت حال پیدا ہونے کی توقع بالکل نہ تھی ورنہ میں ایسا ہرگز نہ کرتا۔

آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے بہت سے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک قد لمے تانیر سے ترجمان بننے کے لیے اٹھا۔ جو کچھ اس نے مفید خبر فراموشی میں کہا، اُس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ وہ ابھی فریج دیکھ رہا ہے اور شام کے وقت ”الائٹس فراس“ سے فریج لیٹو کچھ کاؤنٹر کر رہا ہے۔ اس نے سڑک کافی باؤس کے مالک یا منیجر کے جذبات کی عکاسی میں بھی بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور دوبار اپنے سینے پر بھی ہاتھ مار کے کہا کہ ہم پاکستانی قوم ہیں اور مہمان نوازی ہماری تمدنی روایات کا حصہ ہے چنانچہ وہ ہماری طرف سے ادائیگی کرنا چاہتا ہے۔

اب کافی باؤس کے اس مالک یا منیجر اور ہمارے نئے جوشیلے میزبان کے درمیان مکالمہ شروع ہوا جس میں بالآخر کافی باؤس والا جیت گیا اور جوشیلے تو جان کو خاصی باؤس کے ساتھ والیں اپنی میٹ پر جا بیٹھا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور کاؤنٹر تک گئے تاکہ میزبان کا شکریہ ادا کریں۔

میں نے اس سے مصافحہ کر کے فرانسیسی میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر محسن نے اس سے ہاتھ ملایا مگر مجھے یوں لگا جیسے ہمارا میزبان ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہے اور حشر ہے ہم باہر نکلے ہی تھے کہ ایک ویٹر نے ہمارے ہاتھ میں وہ بل تھا جو ایس کی ادائیگی ہم فلاں کیس پیج میں نہیں کر سکے تھے۔ بل پیش کرنے والا ویٹر بھی وہی تھا۔

”یہ کیا! سب کے سامنے ڈراما ہو رہا تھا؟“ میں نے مدھی سے کہا۔

”خبیث، بڑا مہمان نواز اور فراخ دل بن رہا تھا۔“

محسن بولا۔

لیکن پھر میں نے بل کو دیکھا تو اس کی پشت پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ ”مسٹر کنڈر! اس ویٹر کے ساتھ آجائے۔“

میں نے وہ رقم محسن کی طرف بڑھایا۔ محسن کی صورت بدھکا ہوا رہ گئی۔ ویٹر خاموش اور منتظر کھڑا ہوا تھا اور

میں عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ میں ویٹر سے یہی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ رقم کس نے دیا ہے۔ ویٹر فریج نہیں جانتا تھا۔ میں اردو بولتا تو اس کے سامنے شرمندہ ہوتا کہ میں نے بل نہ دینے کے لیے سب سو اٹک دیا تھا۔ محسن میری طرف دیکھ رہا تھا اور ہم کو سولہ لائٹ ان بنا ہوا تھا۔

فیصلے سے پہلے سوچ بچار میں گوانے کے پیار وقت تھا ہی نہیں۔ میں نے اشیات میں سر ہلایا اور محسن نے سر ہلایا کہ اس فیصلے کی توثیق کی۔ دو دست، دشمن ہر جا، تھے مگر تجرہ برتا تھا کہ دشمن ایک ہے تو دوست ہزار۔ اور یہ شخص جو کراچی کے ایک معروف علاقے میں اپنا شرفیقا کا دربار چلا رہا ہے، دلاور یا حاجی عبداللہ جیسے بدعاش لوگوں کا ساتھی کیسے ہو سکتا ہے۔

ویٹر ہمیں فریج جیمز کی طرف سے اندر لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ کئی منزلہ عمارت میں بہت لمبی چوڑی ڈگریوں والے اسپیشلسٹ ڈاکٹر برفلور پر موجود ہیں۔ ان سب کے ناموں کی سختیاں نیچے ہی لگی ہوئی تھیں جن پر ان کا درجہ نمبر اور اوقات، مطلب ہمیں لکھے ہوئے تھے۔ گزرتے گزرتے میں نے ایک نام دیکھا۔ ”رندھا والا بہت سی ڈگریوں کے بعد کھانا کھاتا سابق سول سرجن اس سے مجھے کچھ یاد آیا۔ شاید میں نے کسی اخبار میں کوئی خبر پڑھی تھی کسی ڈاکٹر رندھا والا پر پولیس نے رشوت ستانی کا جھوٹا کیس بنانے کی ناکام کوشش کی تھی پھر مجھے شک ہوا کہ بات کچھ اور تھی۔ اچانک محسن نے کہا۔ ”یاد رہے جو ہمیں خاتون ہیں ملی تھیں۔۔۔“

”ہاں، وہ مسز ڈاکٹر رندھا والی تھی۔“ میں نے کہا۔

اُس نے ہمیں پہچان لیا تھا۔

”وہ خود ڈاکٹر تھی۔۔۔ یا اس ڈاکٹر رندھا والی بیوی تھی۔“

”تو نے کیسے جانا کہ وہ مسز رندھا والی تھی۔۔۔؟“ میں نے کہا۔

”پچھلے گاڑی میں بہت سے لفافے وغیرہ پڑے تھے۔ ان سب پر ایک ہی نام تھا۔“ محسن نے کہا۔

ویٹر نے ایک کمرے کے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور پھر ہینڈل کھما کے اندر چلا گیا۔ اندر وہی شخص موجود تھا جس سے ہم چند منٹ پہلے کاؤنٹر پر ہاتھ ملانے آئے تھے۔ ہم نے

اُس کے سامنے اداکاری کی تھی مگر وہ ہم سے ہانڈی لے گیا تھا۔

”آئیے مسٹر سکندر“ اُس نے پھر ہم سے ہاتھ ملا دیا اب اردو میں بات کی کیا ہے آپ کے ساتھی میں من خان؟

”پہلے تو میں بل ادا کروں گا“ میں نے کہا مگر زندگی کے ساتھ“

وہ ہنسنا۔ بل آپ ریسٹورنٹ میں دسے سکتے تھے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ مہمان ہیں میرے“

”لیکن میں اور آپ دونوں پاکستانی ہیں“

”پھر کیا ہوا؟ کیا پاکستان میں لوگ ایک دوسرے کے مہمان نہیں ہوتے؟ وہ بولا“ مگر زندگی کیسی مجھے تو خوشی سے کراس طرح مجھے آپ لوگوں سے ملنے کا موقع ملا میں ہر گاہ کی صورت پر غور نہیں کرتا لیکن میں آپ کی ٹیبل پر آیا تو میں نے فوراً پہچان لیا آپ کو“

”یہ مسئلہ بہت تشویشناک ہوتا جا رہا ہے۔ تاج صبح ایک لیڈی ڈاکٹر نے میں پہچان لیا تھا میں نے کہا۔

”میں نے آپ لوگوں کو اسی لیے بلایا ہے کہ آپ کو کچھ سمجھا دوں“ وہ بولا“ ویسے تو آپ مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے کیا آپ چند منٹ تشریف رکھیں گے؟

”رکھ دوں گے“ میں نے کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

”لیکن وقت کم ہے ہمارے پاس“

”میں نے کافی منگوائی ہے“ وہ بولا اور ہمارے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ درمیان میں بہت خوب صورت کاشانی قالین تھا اور براس ٹاپ ٹیبل تھی۔ وہ کمراد فضا مت اور شان امارت میں توازن کا آئینہ دار تھا اور مجموعی طور پر بہت عمدہ آرائش تھا۔ اس میں ایک طرف بیڈ تھا۔ اسی کے ساتھ ایک ہی ڈیزائن کی ڈریسنگ ٹیبل اور ڈارڈر اب ایستادہ تھیں۔

”میں ایک ریسٹورنٹ چلاتا ہوں“ وہ کچھ دیر بعد بولا“ صبح سے شام تک یہاں سیکڑوں لوگ آتے ہیں۔

سب اپنی اپنی باتیں کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ کوئی کسی دوسرے کی بات نہیں سننے آتا اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کی بات بھی کوئی نہیں سنے گا۔ لیکن میں سب کی سننا رہتا ہوں۔ بولتا نہیں مگر کان کیسے بند کر سکتا ہوں؟

دیکھتے دروازے کو ابستہ سے ناک کیا اور پھر کافی کی ٹرے کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس نے برتن خاموشی سے

میز پر رکھے اور سوالیہ نظروں سے مالک کی طرف دیکھا کہ اور کوئی حکم؟

مجھے اچانک یاد آ گیا کہ میرے پاس سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ میں نے ویٹر کو دس کا ایک نوٹ دینا چاہا مگر ہمارے میزبان نے مجھے روک دیا۔

”بجٹ آئے والا ہے نا اور ان حالات میں بہت زیادہ ٹیکس لگ جانے کی امید ہے“ وہ بولا“ بازار سے اچھے سگریٹ غائب ہو گئے ہیں لیکن میں منٹ گوا دیتا ہوں“

اُس نے ویٹر کو سو کا نوٹ دیا اور کہا کہ جو بدری سے دو کارٹن لے آئے۔ ویٹر نے سر ہلایا اور غائب ہو گیا۔

”تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہاں بیٹھ کے جو کچھ میں ایک دن میں سن لیتا ہوں وہ دس اخباروں کے برابر ہوتا ہے جبوت سچ، افواہیں اور خبریں۔ مجھے راتے عائد کا بالکل صحیح اندازہ رہتا ہے۔ بیشتر لوگ کاروباری باتیں کرتے ہیں یا پھر سیاسی باتیں“

”حالانکہ آپ نے لکھ دیا ہے کہ سیاسی گفتگو سے احتراز کریں“

”وہ تو مجبوری ہے۔ ایک مارشل لا کو پہلے بھگت چکے ہیں۔ یہ دوسرا مارشل لا اُس کی ناجائز اولاد ہے“ وہ بڑی سے بولا“ ایک جہل جانتے جانتے یہ ملک دوسرے جہل کو تنے میں دے گیا کہ عیش کرو۔ لوگ خود نالاں ہیں مجھے ہونے جذبات اظہار کا راستہ مانگتے ہیں مگر ہم بزنس کر رہے ہیں۔ ریسٹورنٹ کو سیاسی اگناؤ نہیں بنا سکتے۔ اختلاف رائے بڑھ جائے تو جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں ترو باری اور تھل تو یہاں کامزاج ہیں نہیں۔ اب میں جانتا ہوں کہ رائے عائد کے طرح جٹی ہوئی ہے۔ اکثریت بیٹھ جیب کی مخالفت ہے اور اُسے غدار سمجھتی ہے۔ یہ جاہلی ہے کہ اُسے سرعام بھانسی پر لٹکا دیا جائے مگر سیاست میں غدار اور حُصَب الوطنی کے لیبل بدلتے رہتے ہیں۔ دوسرا گروہ ہیلز پارٹی کا حامی ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ اس نئی جماعت نے بہت جلد فنی قوانین مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ پھر ایک طبقہ سابق صدر ایوب خان کا حامی بھی ہے۔ ڈر رہتا ہے کہ ایک میز پر ہونے والی بحث

ہی خانہ جنگی کا سبب بن جاسے“

میں نے کافی پیٹے ہوئے کلائی کی گھڑی کو دیکھا۔

وہ میرا مطلب سمجھ گیا مجھے صرف یہ کہنا تھا کہ نہیں نے بارہا لوگوں سے آپ کا ذکر سنا ہے۔ نوجوان خاص طور پر آپ کے کارناموں کو زیادہ سراہتے ہیں“

”ہم نے تو کوئی کام نہ سرسرا سنا تھا“ میں نے کہا۔

”یہ کس نفسی ہو سکتی ہے حقیقت نہیں“ وہ بولا۔ سب اخلاعات میں اچکا ہے“

”ہمارے مخالف اور دشمن بھی تو آتے ہوں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا۔

”میں آپ کا کونسا ہے خبردار کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو اس طرح صدر جیسی جگہ پر لیٹ نہیں پھرنا چاہیے“ وہ بولا۔ جیسے میں نے آپ کو پہچان لیا ہے ہی آپ کے بغاوت اور اس ملک کے دشمن ہی آپ کو پہچان کر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ آپ اتنے غیر معروف اور گمنام نہیں رہے۔ یا پھر آپ کم سے کم چہرہ بدل لیں۔ ایسا ایک آپ کر لیں کہ کوئی بھی شناخت نہ کر سکے۔ نہ دوست نہ دشمن“

”کہاں سے کر لیں؟ میں نے کہا“ ”میں تو ہم کسی کو بھی نہیں جانتے جو ہماری مدد کر سکے“

”اچھا، آپ یوں کریں“ وہ بولا“ بالکل نیچے والی سڑک ایف بی اسٹریٹ ہے۔ وہاں ایک ہی لڑکھنڈ بڑا بیر ڈریسنگ سلون ہے۔ ڈارڈر، وہ بہت اچھا ڈریسٹ ہے اور بہت اچھا آدمی“

”کیا مطلب؟ ہم اس کے پاس جاکے کہیں کر دیکھو بھی نہیں سکند رحمت ہوں۔ تم مجھے میک اپ سے مدد کرنا دنا دو اور یہ محسن ہے اے نہ تم“

وہ شکر لایا۔ ”آپ میرا کارڈ لے جائیں اُس کے پاس“ اس نے ہمیں جیب سے اپنا کارڈ نکال کے دیا“ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہاں آپ کے مخالف کون لوگ آتے ہیں۔ ایک تو پولیس والے ہیں۔ سامنے ایف آئی اے کا دفتر ہے۔ سی آئی اے کے سینئر بھی صدر میں ہے۔ ہم تو انہیں صوف سے بھی پہچان لیتے ہیں۔ ویسے وہ اپنا تعارف خود کرنا دیتے ہیں تعارف کا مقصد اور یہ نہیں ہوتا اس کے سوا کہ خبردار جو ہمیں ملے سمجھنے میں کی غلطی کی“

”آپ انہیں بھی مفت کھلاتے ہیں اس طرح تو ہم اور وہ برابر ہو گئے ہیں“ میں نے کہا۔

”آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ گتے سے تو ہر بھی ڈرتے

ہیں۔ ہم تو طریت آدمی ہیں۔ ہمارے پاس خرافاتے ہیں۔ ہم گتے کو سمجھنے اور کاتنے سے اسی طرح روک سکتے ہیں کہ اسے بڑی ڈال دیں“ وہ بولا۔ ”مگر خشتہ دونوں لاہور سے کوئی ایس پی آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ یہاں تین ایف آئی اے کے کوئی بھی آئے تھے وہ آپ ہی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے“

”کیا نام تھا اس ایس پی کا؟ سراج؟“ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نام تو معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ ایس پی صاحب کہہ کے مخاطب کر رہے تھے“

”ایف آئی کے تینوں آدمی مقامی تھے؟ ان کو جانتے ہو تم؟ میں نے کہا۔

”اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ آتے رہتے ہیں جیب آپ آئے تھے اُس وقت وہ بھی بیٹھے ہوئے تھے“

”مجھے پریشانی لاحق ہونے لگی“ انھوں نے بھی دیکھ لیا ہوگا؟

”آپ لوگوں کی قیمت اچھی ہے“ وہ بولا۔ ”کہ ادھر سے آپ آئے اور وہ اٹھ کے دوسری طرف سے نکل گئے۔ ان کے علاوہ ایک ٹولی ہے سرکاری ملازمین کی۔ ان میں دو افسر ہیں۔ کلاس ورن اور دو مساحت ہیں۔ سب الگ الگ محکموں کے آدمی ہیں۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ سامنے پاک بیکر ٹریٹ ہے“

”میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پاکستان بیکر ٹریٹ کا صرف نام اُٹتا ہے“

”سب سرکاری دفاتر ہیں“ وہ بولا۔ ”مرکزی حکومت کے جو دفاتر اسلام آباد منتقل نہیں ہوئے وہ سب ہیں۔ ان دفاتر کا کھوڑا سا علاقہ بھی ہے جو منتقل کیے جا چکے ہیں۔ سو سو سو بیکر میں جو ادھر سمجھنا تھا اور چیف کورٹ سے لے کر عقب میں اسمبلی بلڈنگ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان دفاتروں میں آدھے بنگالی کا کہتے ہیں“

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔ ”وہ چاروں بھی بنگالی ہیں؟“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ بنگالی میں بات کرتے ہیں۔ میں خود تو بنگالی نہیں سمجھتا لیکن ایک ویٹر ہے میرے پاس جو بہت عرصہ مشرقی پاکستان میں رہا۔ ہمراہ پھیر کر آتا تھا۔ جیل گیا اور جیل سے بھاگا تو یہاں آ گیا۔ اب ٹھہر گیا ہے۔ اس نے ایک دن مجھے بتایا کہ یہاں آدمی ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے کہا کہ یہ غدار کر رہے ہیں۔ دفاتروں سے غائب لائے

37

میں اور فوٹو اسٹیٹ کرا لیتے ہیں۔ آخر کیا کرتے ہوں گے یہ فائلوں کی فوٹو اسٹیٹ نقول بنوا کے اس بات پر میں کھٹک گیا۔ میں نے اس وٹیرے کہا کہ یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ آئندہ وہ جب بھی آئیں ان کی باتیں سناؤں پھر کسی ایک کے پیچھے لگ جاؤں۔ دیکھو وہ باہر نکل کے کہاں جاتے ہیں۔ الگ الگ جائیں تو اس کا پیسلے تعاقب کرو جو ان کا سفر نہ ہو۔ وہ حکم چلانے کا مادی ہوگا۔ باقی سب اس کی باتیں ہوں گے۔ اس وٹیرے نے یہی کیا۔ تیسرے دن وہ پھر آئے اور وٹیرے نے اپنی وزدی اتار دی۔ وہ ان کے پیچھے والے کین میں جا بیٹھا۔ عام لوگوں کی طرح چائے پیتا رہا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کین الگ الگ نہیں ہیں۔ بس ہر میز کو تین فٹ الٹیجی پارٹیشن سے الگ کر دیا گیا ہے۔ جو بیٹھے ہوں ان کے چہرے ایک دوسرے کو نظر نہیں آتے۔ ایک میز پر چار آدمی بیٹھے ہیں آئینے سامنے دو دو۔ دونوں جانب پشت پر سینیٹے کی پارٹیشن کے پیچھے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔

”میں سمجھ گیا۔“ میں نے کہا۔

”جب وہ لوگ اٹھتے تو میرا وہ جاسوس بھی اٹھا اور اس نے دو ایم باتیں معلوم کر لیں۔ ایک تو یہ کہ فائلیں وہ کہاں فوٹو اسٹیٹ ہونے کے لیے دیتے ہیں۔ وہ جگہ یہاں سے قریب ہی تھی۔ جتنی دیر میں دستاویزات کی نقلیں بننی تھیں وہ یہاں بیٹھ کے چائے پیتے تھے پھر کھٹا بھر لیا جاتے تھے تو راستے میں ایک جگہ پاؤں کھلتے تھے۔ اسی سڑک پر آگے آئیڈیل لائف انشورنس کا دفتر ہے اس کے نیچے فوٹو اسٹیٹ شاپ ہے، سامنے پاؤں والا ہے۔ فوٹو اسٹیٹ مشین بھی ایک بیگلی نے لگا رکھی ہے اور پاؤں شاپ بھی اُسی کی ہے۔ اس کا بھائی بیٹھتا ہے۔ وہ فائلوں کو سامنے پینا دیتا ہے۔ اس کی فوٹو کاپیاں خود رکھتا ہوگا۔ وہ یا ان کی دکان سے فائلیں لیتے ہیں اور اپنے لیے گھر چلے جاتے ہیں۔ اگلے دن صبح آؤں جاتے ہوں گے تو فائلیں سامنے جاتے ہوں گے اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی ہوگی کہ فائلیں غائب ہوئی تھیں۔“

”اوہ مائی گڈنس۔ یہ تو بہت خطرناک کام ہو رہا ہے۔ تم کب سے دیکھ رہے ہو؟“

”تقریباً ایک مہینے سے۔“

”اور ابھی تک تم نے کچھ بھی نہیں کیا؟“ میں نے کہا۔

”میں کیا کر سکتا ہوں اور کیسے کر سکتا ہوں۔ اس کام میں تو بہت سے قانونی مرحلے ہیں۔“ وہ یولانہ اول تو پولیس کو یقین دلانا ہی مشکل کام ہے کہ اس طرح اہم ملکی امور پر مشعل دستاویزات نکالی جا رہی ہیں۔ میرے پاسر ثبوت کوئی نہیں ہے۔ پھر یہ کیسے بتاؤں گا کہ دستاویزات اہم ہیں یا کہ نہیں اور کہاں جا رہی ہیں مجھے تو پولیس پر بالکل اعتماد نہیں۔ یا تو وہ مجھے ہی پریشان کریں گے یا ان غداروں کو پکڑا بھی تو مال بٹورنے کے چکر میں پکڑیں گے انھیں تو خدا موقع دے، بعد میں وہ مجھے جھڑپیں لگے کہ شرفا بد بھوٹے الزامات لگاتے ہو شرفا الگ دشمن ہوں گے اور ظاہر ہے اپنا ٹھکانا بدل دیں گے وٹیران میں سے دو کے گھر دیکھ آیا ہے۔ دونوں انٹر میاں جیکب لائن کے سرکاری بنگلوں میں رہتے ہیں۔“

”نام پتے معلوم ہیں تمھیں؟“

”اُس نے اقرار میں سر ملایا اور جیب میں سے ایک نوٹ نکال دیا۔ اُس میں سے ایک صفحہ بھڑکے چند سطریں لکھیں۔ ”ایک انفر ہتایے مولانا احتشام الحق خاں صاحب کی مسجد کے پیچھے نمبر سیٹین میں اور دوسرا ہندو خاں کے پیچھے نمبر سیٹین میں دونوں ماتحت کے بھائی ہیں اور تعلیم کوارٹریز میں رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھے ہیں؟“

”جہانگیر روٹ کے کوارٹریز دیکھے ہیں۔“ میں نے اس بے باک اور نڈر عصائی کو یاد کیا جس نے اپنی جان ہم پر اور وطن پر قربان کر دی تھی۔

”بس وہ ہیں۔ آپ یہ نوٹاؤں مسجد کی طرف سے جائیں اس کے پیچھے سوک جا رہی ہے کوارٹریز نمبر سیٹین فوٹو۔“

”یہ نوٹاؤں مسجد کہاں ہے؟“ میں نے بولا۔

”مگر مندر سے سیدھے ہاتھ والی سڑک... کیا

”میں آپ کو پچا دوں اپنی گاڑی میں؟“

”نہیں شکریہ، افسوس یہ ہے کہ ہمارے پاس آج وقت نہیں ہوگا ورنہ ہم ان سے بھی مرٹ لیتے۔“ میں نے کہا۔

”سب معلوم کر لیتے۔ تم ایسا کرو کہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہو۔ ہم ایک شخص کو بھیج دیں گے۔ وہ ہمارے حوالے سے یہی کاغذ کار پڑھ لے کر آئے گا۔ وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے اور اس کا نام ہے اکرام بخش۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اُسے بتا دوں گا۔“

”کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے خطوط یا بیانات بھی تمھاری معرفت وصول ہو جائیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں ہاؤس میں تو نہیں لیکن میرے اس کمرے کا نمبر اور یہاں کاپی ڈون نمبر کارڈ پر ہے۔“ وہ یولانہ اگر یہ آپ کے کام آتا ہے تو مجھے خوش ہوگی۔“

وٹیران اندر آیا۔ اُس نے سرگٹوں کے دو کارڈز اور باقی پیسے میرے ہاتھوں میں ڈال دیے۔

”کیا یہی وہ وٹیرا ہے؟“ میں نے کہا۔

”آپ نے خوب پہچانا؟“ وہ خوش ہو کے بولا۔

”میرا اندازہ تھا کہ تم کسی اور پر اعتبار کرنا سگ نہیں ہو گے۔“ میں نے کہا۔ یہ بھی ایک مشکل کام تھا۔ ”میں نے سرگٹوں کے کارڈز کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لیے شکریہ۔ اب ایک اور مشکل کام ہے جس میں آپ بہتری مدد کر سکتے ہیں۔ ہمیں دو روزی میٹرو سوٹ مل جائیں۔ کوٹ پتلونا ٹرائیکل۔“

”جئے، آپ کے سائز کے؟“ اُس نے ہلوسی سے انکار میں سر ملایا۔ ”یہاں کون پہنتا ہے سوٹ اس موسم میں۔“

”یہ میٹروٹھ کے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ ان ارجنٹ چوبیس گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔“

”چوبیس گھنٹے نہیں ہیں ہمارے پاس۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ہیں۔“ میں نے بولا۔

”پھر... آپ ایسا کر کے لاٹھ ہاؤس چلے جائیں۔“

”لاٹھ ہاؤس، یعنی روشنی کے مینار پر؟“ میں نے کہا۔

”وہ ہنسنے لگا۔ یہ بند روڈ پر ایک سینما ہے۔ اس کے ساتھ لٹرا ہزار ہے۔ امریکن امپلو کا مرکز، ہر سائز اور قیمت کا سوٹ بھی مل جائے گا، پتلون بھی ملے گی۔ شاید سوٹ بھی نکل آئے۔“

یہ ایک اچھی تجویز تھی۔ میرے ذہن میں لاہور کا لٹرا ہزار بھی تھا جو سب کی ضرورت پوری کرتا تھا۔ اُن کی بھی جو کسی کمپلیکس کے بغیر لباس کے مسئلے کو کم آمدنی میں ایسے ہی حل کرتے تھے اور اُن کی بھی جولینے کلاس کمپلیکس کے ساتھ گاڑیاں دوڑ روک کے جاتے تھے اور سٹے فیشن کے لیڈیز کوٹ، کارڈیجن اور بے بی سوٹ یوں چھپا کے لاتے تھے جیسے چوری کا مال ہو، اور بعد میں اُسے گفٹ پیک میں سب کے سامنے رکھ دیتے تھے۔

”بس تو آپ، ہمیں وہیں پہنچا دیں۔ اگر آپ کے ہاں گاڑی ہے تو ہمارا وقت کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”میں نے کہا۔“

”میں آپ لوگوں کو گاڑی دے دیتا ہوں۔ اُس نے کہا اور پتلون کی جیب میں سے چابی نکال کے ہمارے سامنے ڈال دی۔ ساتھ والی گلی میں کھڑی ہے نئی کڑوا۔ ایک ہزار سی سی والا ماڈل، آپ لوگوں نے کم ہی دیکھا ہوگا، لاٹھ بیلو گھر میں ہے۔“

”تھینک یو ویسی جی۔“ میں نے کہا۔ کوئی حرج تو نہیں اگر ہم کار کورات آٹھ بجے کہیں چھوڑ دیں اور آپ کو فون کر دیں؟“

”کوئی حرج نہیں۔ میں منگوا لوں گا۔“ وہ بولا۔

”ہم ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے تو شام کے سامنے ڈھل چکے تھے۔ حد کے علاقے میں بہت زرخیز تھا اور خوش باش لوگوں کے، ہجوم ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہمیں کار تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن لاٹھ ہاؤس کا راستہ ہمیں پوچھنا پڑا۔

”میں نے کہا۔“

”لٹرا ہزار ایک پتلی لٹی گلی تھی جس میں زیادہ زرخیز نہیں تھا۔ کار کو ہم نے لاٹھ ہاؤس سینما کے سامنے پارک کیا اور آدھے گھنٹے میں اپنی مرضی کے کپڑے کوٹ پتلون بھی خرید لئے۔ دو پہلے بیٹ بھی، جو تھے بھی اور انیاں بھی۔ یہ سب خریداری دو سو روپے میں مکمل ہو گئی۔ کپڑوں میں سے بڑا کپڑا بھی لیکن ہم دو روپوں سے نہایت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پہلے میں لاٹھ ہاؤس سینما کے ٹائٹ میں گیا اور وہاں سے کپڑے بدل کے نکلا۔ اس دودی کو میں نے نڈل بنا کے بغل میں دبایا تھا۔ پچھری حرکت محسن نے کی۔ بیٹ لگا کے ہم دونوں مضحکہ خیز نظر آتے لگے۔ کیونکہ ہمارے اس پاس کوئی بھی پتلون کے ساتھ کوٹ پہن کے نہیں پھر رہا تھا۔ کچھ لوگ ہم پر ہنسنے مگر ہم اُنھیں نظر انداز کرتے ہوئے کار میں نکل گئے۔ اگلے مرحلے اس بڑے گیس سے میک اپ کرانے کا تھا۔ ہمارا یہ لباس صرف ہندو گاہ کے علاقے سے گزرنے کے لیے تھا۔ آگے ہمیں ماہی گیری کے سفر کرنا تھا چنانچہ محسن نے مجھے مشورہ دیا کہ ہم صرف واٹھی کا اضافہ کر لیں تو ہمارے چہرے پھر بے چارہ نہ ہو سکتے ہیں۔

”محسن کی بات معقول تھی۔ سمندری سفر میں سوٹ بوٹ ہمارے لیے بے کار تھا۔ پھر بھی یہ کپڑے پھینکے نہیں جا سکتے تھے۔ آگے وہاں کے کمان کس دیں کس کا بیس بنانا پڑے۔“

اب اکرام شیخ سے ملنے کا کوئی چانس نہیں رہا۔
 "ممن نے گھڑی دیکھ کر کہا۔
 "ہاں۔ بل جاتا تو اچھا تھا۔ اس سے رابطے کی بات
 کر لیتے کہ آئندہ کہاں ہوگا اور کیسے ہوگا۔"
 "دیکھو شاید وہ انتظار کرے۔" ممن بولا۔
 وہ بھی ملنا چاہے گا یہ جاننے کے لیے کہ ہمارے مشن
 کیا بنا۔

ایف بی سی میں داخل ہونے کے لیے ہمیں چکر لگنے
 آنا پڑا۔ ہم دو گھر سے روڈ سے سیدھے گئے اور پھر گھوم کے
 واپس آئے۔ اس میٹر ڈریسنگ سیلون کو ٹالہ کش کرنا
 مشکل ثابت نہ ہوا، لیکن وہاں کار پارکنگ کے لیے
 جگہ بنانا مستلزم گیا۔ بالآخر ایک گاڑی قطار سے نکلی تو ہم
 نے فوراً اس کی جگہ لی۔

سیلون ایئر کنڈیشنڈ تھا اور اندر سے پورا آئینہ خانہ
 تھا۔ چاروں طرف دیوار گیمرائز میں تھیں۔ انچنان گنت
 عکس دیکھیں اور بائیں متحرک دکھائی دیے۔ سیلون گنتا
 تھا جیسے ایک ہی قطار میں ایک سے لوگ ایک سا
 لباس پہنے کھڑے ہیں اور ایک مٹین ان سب کے
 فعل و حرکت کو کنٹرول کرتی ہے۔ صفت بستہ فوجیوں کی
 ڈرل پر بیڑیں بھی اتنی ہی آہنگی نہیں ہوتی۔

تین سرنگوں افراد نے جو خاصے فارغ البال تھے
 اور باقی ماندہ بالوں کو فیشن اور اسٹائل سے سرکا کچ چھپانے
 کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے، ہمیں حیرانی سے دیکھا۔
 شیونانے بنائے ایک کارنگ کا ہاتھ دکھایا۔ ان کے
 نزدیک ہم کارڈوں تھے یا بے حد مضحکہ خیز نمونے تھے۔
 مجھے احساس ہوا کہ یہ لباس تو ہمیں غیر معمولی طور پر توجہ
 کا مرکز بنا رہا ہے۔ کراچی میں اس موسم میں لوگ سوٹ
 پہنتے ہیں تو کسی علاوہ دیکھنے کے ہوٹل میں یا ایئر کنڈیشنڈ
 کار میں۔ لیکن وہ بھی عموماً بڑے بیوروکریٹ ہوتے ہیں
 اور ایسے لٹا ہاتھار کے کچھڑوں میں نہیں ہوتے۔

میں نے استقبال کے لیے آئے والے میٹر ڈریسر
 سے فریج میں کہا۔ "تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟ اور کافی ہاؤس
 کے مالک یا میجر کا دیا ہوگا کارڈ اسے تمہارا۔
 شیونانے والے شخص ایک دم اچھلا۔ "تم فریج ہو؟
 اس نے روال فرانسس میں کہا اور منہ پر ہلکے ہونے شیونانے
 کے صابن سمیت ہم سے گلے ملنے دوڑا۔ "میری ماں بھی
 فریج تھی۔ باپ پاکستانی ہے۔"

میں سوچنے لگا رہا تھا کہ اچانک فرانسس
 جانے والا کیوں مل جائے گا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ
 میں نے باربر سے کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔
 "میں دیکھیں پیدا ہوا تھا پھر میری ماں گئی۔ میں باپ
 کے ساتھ گیا۔ دوبارہ تعلیم کے لیے گیا۔ اب کیا تھا کیونکہ
 میرا باپ بیمار تھا۔ وہ بھی مر گیا۔ میں واپس جا رہا ہوں۔
 کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور تم یہ کیا حکم بنا سکتے ہو
 رہے ہو؟ یہاں یہ سب نہیں جانتا۔ اس شخص نے ایک
 ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

بالآخر مجھے بھی ہونے کا موقع ملا۔ "میں فریج نہیں
 ہوں۔" میں نے غمزے کے کہا۔ "نیسا کا رہنے والا ہوں۔ مجھے
 اس کی سٹی کم ہو گئی۔ وہ واپس اپنی جگہ جا بیٹھا۔ ہم زبردستی
 ہونے کے باوجود میں نے خود کو اس کا وطن قرار دیا تھا۔
 میٹر ڈریسر اب ہمیں ایک پارکر میں لے گیا۔
 "میں انتظار کر رہا تھا آپ لوگوں کا۔ مجھے فون آچکا
 تھا آپ کے دوست کا۔" اس نے کارڈ نکالنے کے کہا۔
 "انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ آپ لوگ لاسٹ ہاؤس
 گئے ہیں۔"
 میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر تو وضاحت کی ضرورت
 ہی نہیں۔

"بتائیے میں آپ لوگوں کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟
 وہ بولا۔

ہم نے اُسے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اس نے ہماری
 صورتوں کا غور سے جائزہ لیا اور پھر ہمیں دو کمریوں پر بٹھا
 کے دونوں کا باری باری دیکھا۔ اس نے ہمارے
 ہاؤس کو عجیب طرح سے پھیلادیا۔ اس طرح کہ ہمارے
 بال سیدھے اوپر اٹھنے ہو گئے مگر سامنے سے پشانی پر لگے
 ایک اسپرے سے ان کا رنگ سمجھورا ہو گیا۔ اس نے کہا
 یہ سمجھورا رنگ پندرہ بیس دن رہے گا۔ پھر رفتہ رفتہ
 اڑ جائے گا۔ اس نے ہاؤس سے رینگ کرتی ہوئی دائرہ
 بھی فراہم کی جو بالکل اصلی لگتی تھی۔ اس گلے میں ہم بالکل
 بیٹی نظر آنے لگے تھے مگر اسی دفعہ قلع کے ساتھ ہم
 لباس بدل کے ننگی باندھ لیتے اور میان چین لیتے یا ننگی
 کے ساتھ واسکٹ استعمال کرتے تب بھی فرق نہ پڑتا۔
 ہم اس وطن دوست شخص کی خدمات کے امتحان
 میں شکریے کے سوا اُسے کچھ نہ دے سکے۔ اُس نے
 معاوضہ لینے سے انکار کر دیا اور یہ بھی کہا کہ آئندہ بھی

جب اس کی خدمات کی ضرورت ہو اور ہم خود نہ آ سکتے ہوں
 تو فیس بولا لیں۔ مخصوص امریکن بیتی لوگوں کی طرح جو ان
 دنوں پاکستان میں ہر جگہ اپنی ہیڈت کو ان میں سڑکوں
 پر اور بازاروں میں گھومتے نظر آتے تھے، ہم بھی تماشا
 بنے مگر دیکھنے والوں نے صرف مسکراتے پر اکتفا کیا اتفاق
 نے عین اُسی چور لہجے کے موڑ پر ایک بیتی اپنا ہیڈت
 زمین پر رکھ لیا پھر اُٹھا اور لوگ اس کے ہیڈت
 میں سکے اور نوٹ ڈالتے جا رہے تھے۔ دوا بر غیر میں سے
 جہاں کوئی جانا ہو نہ پہچانتا ہو، خرم دھیا اور بے عزتی
 کا احساس بے معنی ہو جاتا ہے اور یہ بیتی جوتن کے ایک
 جوڑے میں دنیا دیکھنے نکل کھڑے ہوتے ہیں اس بات
 کی بالکل بدوا نہیں کہتے کہ دنیا انھیں دیکھ رہی ہے۔
 ان کے لیے مانگ کے کھانا یا فٹ پاتھ پر فخر کی طرح
 سوجنا بھی اس ایڈوینچر کا ایک حصہ تھا۔ تاہم کچھ عرصے
 سے اخبارات کے باریک میں صفائی ان آوارہ گرد نظر
 آنے والوں کی تعداد میں تشویشناک اضافے پر قومی سلامتی
 کے نقطہ نظر سے اظہار خیال کر رہے تھے۔ کچھ بیتی حساس
 نوعیت کے اداروں کے قریب اور ممنوعہ علاقوں کے
 آس پاس منڈلاتے بھی دیکھے گئے تھے اور ان کی پراسرار
 سرگرمیاں قیاس آرائی کا سبب بن رہی تھیں۔

کار میں بند گاہ کی طرف جاتے ہوئے میں نے
 ممن سے کہا کہ کیا تو نے غور کیا کہ آج دن بھر میں ہم نے
 کتنے بیتی دیکھے ہوں گے؟
 "ان کی اچانک یلغار کا کیا مطلب نکالا جا
 سکتا ہے؟" ممن نے جواباً سوال کیا۔

"عام خیال تو یہی ہے کہ... یہ لوگ جاسوسی
 کرتے ہیں۔ سیاہ بن کے آتے ہیں چنانچہ ہر رعایت
 حاصل کر لیتے ہیں۔ غلط مقام پر بھی پھلے جاتے تو یہ
 لاعلمی کا اعتراض کر کے معصوم بن جاتے ہیں اور
 ڈھیس بن کے ہر غلط کام کرنے سے شرماتے بھی نہیں۔
 مثلاً تو نے اس بیتی کو کیجا جو گیارہ بج رہا تھا؟

"اُسے میں نے بند گاہ کے علاقے میں بھی دیکھا
 تھا۔" ممن نے کہا۔ "اسی طرح ہیڈت سامنے رکھے خاموش
 بیٹھا تھا۔ بظاہر گٹار بجانے میں مگن تھا لیکن اس کی
 نظریں ہر سمت میں پھٹک رہی تھیں۔ پھر ایک عجیب
 بات ہوئی۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اُسے ایک رقعہ
 لاکے دیا۔ اُس نے رقعہ پڑھا اور ٹیکسی ڈرائیور کے

ساتھ چلا گیا ٹیکسی میں بیٹھ کے
 گاڑی نے چلتے چلتے جھٹکے لیے مڑنے کیے۔ میں نے
 فیول میٹر پر نظر ڈالی تو سوئی 'ای' کے نشان سے بھی نیچے
 کی طرف مائل تھی۔
 "پیٹرول ختم ہو گیا؟" ممن بولا۔

"ہاں۔ دھیان ہی نہیں رہا اس کا۔" میں نے کہا۔
 گاڑی کے انجن نے چند ہلکیاں لیں اور خاموش ہو گیا۔
 "اب پیٹرول پمپ تک دھکا لگے جاتا ہوگا؟"
 ممن بولا۔

پیٹرول پمپ کا روشن سائین بورڈ تین چار ڈالنگ
 کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ مارے گئے پھر تو... میں نے
 کوٹ آگے کے کار میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "بیچے آؤ
 آؤ شہزادے۔"

"یاد کسی سے پیٹرول کی بھیک مانگتے ہیں۔ آخر ہم بھی
 بیتی ہیں۔" ممن بولا۔ "اللہ کے نام پر ایک روپے کا پیٹرول
 دے جا یا یا۔"

"وہ تو ایک لیر بھی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔
 "پیٹرول پمپ تک تو پہنچ جائیں گے۔" ممن بولا۔
 "کو شش کرتے ہیں شاید کوئی دروند مل سکے والا
 رُک جائے۔"

لیکن اس کی کوشش ناکام رہی۔ ایک گاڑی والا رُک
 تو اس نے معذرت کی۔ اس کے پاس کار میں سے پیٹرول
 نکالنے کے لیے نہ پائپ تھا نہ ڈنڈا۔ تاہم اُس نے ہماری
 کار کو ایک موٹی ریش ناکال کے اپنی کار کے پیچھے باندھ لیا
 اور پمپ کی پیٹرول پمپ تک پہنچا دیا۔ پیٹرول بھروا
 کے پھر روانہ ہونے میں مزید آدھا گھنٹا ضائع ہو گیا جب
 ہم بند گاہ کے علاقے میں پہنچے تو رات کے نو بج
 چکے تھے۔

کار کو ہم نے بہت دور چھوڑا اور اپنے اسباب
 کے پکیٹ اٹھانے کے چل پڑے۔ ٹیکسی اسٹیل پر چھ سات
 ٹیکسیاں آڑی تھیں کھڑی ہوئی تھیں لیکن ڈرائیور ایک
 بھی نہیں تھا۔ ہمیں نے قریب سے سب کے نمبر دیکھے
 ان میں اکرام شیخ کی ٹیکسی نہیں تھی۔ مجھے اس کی توقع بھی
 کم تھی، پھر بھی مجھے مایوسی ہوئی۔

"میرا خیال تھا کہ وہ انتظار کرے گا۔" ممن بولا۔
 "معلوم نہیں بعد میں کیا حالات ہوئے۔ کہیں
 گداگری کے ٹھیکیدار اس کے خلاف تو نہیں ہو گئے

یا بھڑو نہیں گئے، میں نے کہا: وہی پیش پیش تھا پولیس اسٹیشن جانے کے معاملے میں۔

ہم آگے روانہ ہوئے ہی والے تھے کہ ایک ٹیکسی پیچھے سے آئی اور تیز بنا بہن چھوٹی ہوئی گزرمی، میں نے خود کو تیزی سے الگ کر دیا ہوتا تو شاید اس سے ٹکرا کے گر جاتا۔

”اٹو کا بیٹا، نشے میں ہے کیا؟“ میں نے کہا۔
”حسن نے کہا“ تو بے کچھ اور بھی دیکھا؟ اس ٹیکسی میں کون تھا؟“

”کون تھا؟“ میں نے اس کی سنجیدگی پر حیران ہو کر کہا۔

”وہی بہتی۔ جو ابھی ایک گھنٹا پہلے ایلفنٹین ٹریٹ کے چور ہے پر گنار بھار ہاتھ خیرات اکھی کر رہا تھا، حسن بولا۔ اور اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ اتنے اسباب کے ساتھ دوڑنا ایک مشکل کام تھا لیکن ٹیکسی ابھی رکی ہی تھی کہ ہم پیچھے گئے۔ اس بہتی بے نیازی سے ٹیکسی ڈرائیور کو چند نوٹ دیے اور باقی رقم لیے بغیر چل پڑا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک بڑا نوٹ پیر کا پھیلے جیسا لٹا دیا بھی تھا۔ وہ کسی کی طرف دیکھ کر بغیر اٹھے جھٹکا جا رہا تھا۔

میں نے اپنا سامان حسن کے حوالے کیا۔ میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں، آخر یہ پتی یہاں کیا لیتے؟ اپنے؟“ یہ کچھ دینے آیا ہے۔“ حسن بولا۔ ”مگر سبائی یہ سب بڈل میں کیسے جاؤں گا؟“

”جیسے چاہتے جا، میں نے کہا۔ میری جیب میں جس اچانک مجھے اس پڑا سارے پتی کے بارے میں خطرے کا سنگل دینے لگی ہے۔“

”میری ساتری میں جس نے یہ سنگل پہلے دیا تھا؟“ حسن بولا۔
”اس کا بیچھا کرتے ہوئے امریکا میں ملے جانا؟“
”اگر نہیں لالچ بڑا ڈالو...“ پھر مجھے اسی جگہ ملنا جہاں ہماری کار کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے کہا اور نگاہ اس بہتی پر رکھی جو اب ہم سے جالیں قدم آگے غاصے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں اڑاتا جا رہا تھا۔

”کتنے بچہ تک انخفا کروں میں؟“
”دس بچہ تک“ میں نے کہا۔

حسن نے کہا: ”آج رات شاید ہمیں روانگی بھی اختیار کرنی پڑے۔“

میں نے سر ہلایا: ”ہم آدھی رات کے بعد ہی نکلیں گے نا؟ کریم بلوے سے کتنا تیزی پوری رکھے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ شاید ایس ایس کرانتی تھرڈ آج بھی نہ جائے۔ ان کو جس ٹرک کا سامان لے جاتا تھا وہ ابھی تک نہیں پہنچا ہے اور غار سے پہنچے گا بھی نہیں۔ یہ دگ اس کا انخفا کریں گے۔ سمجھیں گے لاہور سے ہی روانگی دیر سے ہوئی یا راستے میں خرابی ہوگئی۔ صبح صوبہ حال کن کو صبح تک ہی معلوم ہوگی۔“

”اگر پہلے بتا دیا گیا تو ہو سکتا ہے جہاز فوراً سنگر اٹھا دے، کسی تخریب کار روانی سے بچنے کے لیے،“ حسن بولا۔ ”یہ لوگ بھی تو ڈر جاتے ہیں۔“

”ہاں مگر امکان کہ ہے کہ اتنی جلدی...“ اچھا میں اب اس کے پیچھے جا رہا ہوں، میں نے اس پتی کو دائیں جانب جاتے دیکھ کر کہا۔ حسن کے اور میرے راستے جدا ہو گئے۔ میں نے حسن کو سگریٹوں کے کارٹن، وردیوں کے بڈل اور کپڑوں کے پیکٹ وغیرہ دونوں ہاتھوں میں اٹھائے اس سمت میں جاتے دیکھا مگر ہماری لالچ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ بہتی کہاں جا رہا تھا ابھی اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ مسلسل چلتا جا رہا تھا اور گرد و پیش سے بے خبر دکھائی دیتا تھا۔ اس علاقے میں غیر ملکی جہازوں کے ساتھ ایسے آوارہ گرد اکثر نظر آ جاتے تھے۔ یہ لوگ کسی بھی مال بردار جہاز کے پہلے علی کے دروسے چھپ کر سز کرتے تھے۔ سبھی جہاز کے کرائے ہوائی جہاز سے بہت کم ہوتے ہیں مگر یہ بہتی دو چار سو ڈالر میں اپنا کارنگا لے گئے تھے اور سامان کے ساتھ آٹھ لکھ ہو جاتے تھے۔ سبھی جہاز کے کسی بھی جگہ لنگر انداز ہونے کے بعد انھیں باہر نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

مجھے اس بہتی کا تعاقب کرتے ہوئے صرف یہ اندیشہ لاحق تھا کہ وہ کہیں پلٹ کے نہ دیکھے اور اپنے ہی ٹیکے کے ایک اور شخص کو اتنا قریب پائے تو چونکا نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں بہت محتاط تھا اور خاصے فاصلے سے اس پر نگاہ رکھے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ کبھی میں کسی جگہ کی ادٹ میں ہو جاتا تھا تو کبھی اسباب کے کسی ڈھیر کے پیچھے رات کے وقت بھی وہاں دن جیسی چمک پھل تھی لیکن سونہر کی روشنی کے مقابلے میں مصنوعی روشنی اندھیرے کو بالکل غم نہیں کر سکتی تھی۔

مجھے نیم روشن اور تاریک حصوں میں چھپ کر آگے بڑھنے کے مواقع بھی حاصل رہے۔

آدھے گھنٹہ بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ بہتی کارنگ شہ پارڈ کی طرف ہے۔ اتنی دور آنے کے لیے اس نے پیدل چلنا منظور کیا۔ اگر وہ چاہتا تو ٹیکسی کو شپ پارڈنگ لے جا سکتا تھا لیکن شناخت کے بغیر وہ شپ پارڈنگ کسی گیسٹ سے نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسرا مشکل راستہ اختیار کیا۔ اب وہ سمندر کے گھٹے جتنے کی طرف سے داخل ہو گا۔ یہ بات میرے ذہن میں مزید شکوک پیدا کرنے کا سبب بنی۔ ایک بات تو یہی غور طلب تھی کہ اسے یہ راستہ کس نے بتایا۔ اگر خود اس نے دریافت کیا تو کیوں بگھومنے پھرنے کے لیے آنے والے کسی بہتی کا پھلور خاص ٹیکسی میں بیٹھ کے یہاں پہنچا اور شپ پارڈ میں داخلے کے لیے رات کے وقت ایسا پہنچا راستہ اختیار کرنا غلط عزائم کی نشاندہی کرتا تھا۔

بہتی کا خیال تھا کہ اس پر کسی نے شک نہیں کیا ہو گا چنانچہ وہ مطمئن تھا کہ اس کے پیچھے کوئی نہیں آ سکتا۔ اسے کیا معلوم کہ سب سے پہلے حسن اس کو دیکھ چکا تھا۔ جب وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کے کہیں گیا تھا۔ آج پھر وہ ٹیکسی میں آیا تھا کیا یہ وہی ٹیکسی تھی؟ میں نے سوچا لیکن مجھے کوشش کے باوجود اس کا نمبر یاد نہ آیا حالانکہ میں نے اس کا نمبر دیکھا تھا۔ شاید حسن کو یاد رہ جائے اور ہم اسے تلاش کر لیں۔

ایک جگہ پہنچ کے میں دگ گیدا اب میری نظر میں بہتی کو آگے بڑھتا دیکھ رہی تھیں۔ میں موشن میاں کی گٹنے کا رس نکالنے والی ریڑھی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اتنا ہی دور میں اس وقت بندھیں۔ شپ پارڈ میں جہازوں کی مزیت اور دیکھ بھال کی خدمات سرانجام دینے والے اپنے اپنے کال میں مصروف تھے اور میں متعدد دلوں کے روشن حصوں میں چلتے پھرتے افراد کو دیکھ سکتا تھا۔ کئی جگہ دیڑنگ کرنے والے تیز نیلی روشنی کی چمک جود پیدا کر رہے تھے۔ ایسی شہر کن روشنی ”ایس ایس کرانتی تھرڈ“ کے عرشے کو بھی متحرک کر رہی تھی۔

میری حیرت زدہ نظروں کے سامنے وہ بہتی سیدھا ایس ایس کرانتی تھرڈ کی طرف گیا اور ایک ریڑھی کے ذریعے اچھڑا۔ اوپر سے کسی نے اس پر نارنجی کی روشنی ڈالی۔ پھر وہ عرشے پر پہنچ گیا۔ وہاں تین افراد پہلے سے موجود

تھے۔ میں نے دھڑکن نکالی اور ایک ایسے حصے میں چلا گیا جہاں بہت سا کٹھ لپٹا ہوا تھا۔ کٹھنی کے ایک غلی گلیٹ کے پیچھے سے میں نے دھڑکن کو فوکس کیا۔ دیڑنگ نارنجی کی تیز روشنی نے میری مدد کی اور میں نے ان چار میں سے تین کو شناخت کر لیا۔

ان میں سے ایک وہی خلاصی تھا جس کی موشن میاں کی ریڑھی پر گٹنے کا رس لپٹے ہوئے مار پیٹ ہوئی تھی۔ اس کا مہم قاتل کے پنی کی کاٹریب ملازم شاہد ابھی تک تھکانے میں بند تھا۔ دوسرا شاہد جمیل تھا اور تیسرا وہ بہتی۔ چوتھے کے بارے میں میرے لیے یقین کے خاصے اسباب تھے کہ وہ جہاز کا کپتان آرا مرصا ہو گا۔ اسی کو میں نے اپنے علی کے ایک فروڈی گرفتاری کی خبر کے فوراً روانہ ہوتے دیکھا تھا۔

مرصا اس براؤن لفافے کے اندر سے کاغذات نکال کے دیکھ رہا تھا جو بہتی نے اسے لاکے دیا تھا۔ معلوم نہیں عرشے پر برائے نام روشنی میں اس نے کیا دیکھا مگر کچھ دیر کے بعد اس نے مطمئن ہو جانے کے انداز میں سر کو جنبش دی اور پلٹ کے غائب ہو گیا۔

میں اپنی کمرنگ گاہ سے نکلا اور آہستہ آہستہ جہاز کی طرف بڑھنے لگا، اس طرح کہ کسی کو بھی میری کسی جہاز میں دلچسپی اور پیش قدمی کا احساس نہ ہو۔ پھر میں نے ایک کمرنگ کے پیچھے سے دھڑکن کو اس وقت دوبارہ فوکس کیا جب درمیان نافصلہ سو گز کے لگ بھگ رہ گیا تھا۔ اب میں نے خلاصی کے ہاتھ میں خود کار مشین گن جیسی کوئی چیز دیکھی۔

اچانک کسی نے میرے پیچھے آگے کہا: ”اے... یو! واٹ آر یو ڈونگ، بیٹر؟“ اتر یہاں کیا کر رہے ہو؟ وہ کے پی ٹی کی ویڈیو میں کوئی آفیسر تھا میں چونک کر اس کی طرف پلٹا اور سسکا رہ گیا۔

”میرا دوست اس شپ پر کسی کام سے گیا ہے۔“ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرانسیسی میں کہا۔
”کاٹل یو اسپیک انگلش؟“ دیکھا کہ انگریزی نہیں بول سکتے؟

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”انگلش؟ اور پھر جہاز کی طرف اشارہ کیا۔“ می... فرینڈ... دیٹر... یو سی اپیل

نے دھڑکن اس کی طرف بڑھائی۔
وہ کچھ سمجھا۔ اس نے دھڑکن کے جہاز پر دیکھا

تو اسے میرے جیسا ہی دوسرا بیتی دکھائی دیا ہوگا۔
 "می... ویٹ... جی... میں نے یوں کہا جیسے
 میرے لیے انگریزی کے الفاظ یاد کرنا ایک امتحان سے
 کم نہیں۔"

"اچھا اچھا، تم اس کی دلیپسی کا انظار کر رہے ہو؟"
 اُس نے انگریزی میں کہا، دو درمیان مجھے تھائی اور واپس
 چلا گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ریدہ بود ملانے۔ اگر
 وہ مجھ سے شناخت کے کاغذات ہانگ بیٹھتا تو میں
 کیا کرتا؟

میں نے پھر دو درمیان آنکھوں سے لگائی۔ وہ بیتی ایک
 سفید لٹافہ اپنے کوٹ کے اندر چھپا رہا تھا۔ دسی بلڈی
 باسٹوڈ... میں نے خالص امریکی لباس میں گالی دی یہ غلام
 کی مدد کر رہا ہے۔ ان کے لیے رابطہ فراہم کر رہا ہے جو
 ملکی راز و مختموں کو بیچتے ہیں، صرف پیسے کے لیے۔ یہ
 سوچے بغیر کہ ایسا کرنا اخلاقاً اور قانوناً کتنا سنگین مجرم ہے
 مگر یہ بیتی اخلاقیات سے تو خیر دور کا واسطہ نہیں رکھتے۔
 لڑکے لڑکیاں مشترکہ میاں بیوی بن کے ساتھ رہتے ہیں۔
 لٹے کے اتنے عادی ہوتے ہیں کہ جس کے ایک سگریٹ
 کی خاطر عزت بیچ دیتے ہیں۔ انھیں کیا غرض کسی ملک
 کی سلامتی سے۔

بیتی اب واپس آ رہا تھا۔ حسب توقع اس نے واپس
 جانے کے لیے بھی سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا۔ میں نے
 دو درمیان کو واپس بیک میں ڈالا اور اُس کے پیچھے سائے
 کی طرح لگ گیا۔ اب میں زیادہ بے خوف تھا۔ میں اُسے
 کہیں بھی دبوچ سکتا تھا اور اُسے گن پوائنٹ پر اپنے
 ساتھ بھی لے جاسکتا تھا مگر اُس کو کم کر دینے کا خطرہ ہول
 نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے برعکس وہ کچھ خوف زدہ تھا۔
 اس لیے کہ پہلے اُس کے ہاتھ میں بے مصرف کاغذات
 تھے لیکن اب اس کو اپنی پڑھنے والی قانونی خدمات کا جملہ
 بل چکا تھا جو شاید سیکرٹوں ڈال رہا ہوگا وہ اس دولت
 کے ٹٹ جانے کے ڈر سے ہر طرف دیکھتا ہوا جا رہا
 تھا کہ کہیں کوئی چور اچکا تو اُس کے تقاب میں نہیں ہے۔
 جب اُس نے پہلی بار مجھے دیکھا تو وہ چونکا چند
 قدم چلنے کے بعد اُس نے پھر دیکھا تو میں بہر طور اس کے
 پیچھے تھا۔ وہ رک گیا اور اُس نے مجھے قریب آنے کا موقع دیا۔
 "سیلو، اُس نے ایک پرتش دوستانہ مسکراہٹ
 کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "یو فرام امریکا، تم امریکا

سے آنے ہو؟"
 میں نے نفی میں سر ہلا کے مصافحہ کیا۔ "آئی ایم فرام
 یو کے، ساؤتھ آف لندن" (میرا تعلق برطانیہ سے ہے،
 لندن کے جنوبی حصے سے،

ہم دونوں ساتھ چلنے لگے۔ اُس نے مجھے اپنا نام بتایا
 اور مجھ سے پوچھا کہ میں کب سے پاکستان میں ہوں۔ میں
 نے کہا کہ اب تک ہم نیپال میں تھے مگر ہمیں کالے چوریل
 نے ٹوٹ لیا۔ پسینہ ہونے کی وجہ سے ہمیں رکنا پڑا۔ جو
 لڑکی میرے ساتھ آئی تھی وہ یہاں کسی جہاز پر آئی تھی۔
 اُسے بچاس ڈالر مٹنے کی امید تھی لیکن وہ واپس نہیں آئی
 چنانچہ میں اُس کے بارے میں متشکر ہوں۔ اُس نے
 یہ بات کہیں پوچھا کہ وہ لڑکی بچاس ڈالر کیسے لائے گی۔
 وہ جانتا تھا کہ لڑکیاں سخت حالات میں کیا راز کار پیدا
 کر سکتی ہیں۔ میں نے اس اندیشے کا اظہار بھی کیا کہ وہ
 نکلتا ہے مجھے چھوڑ کر جہاز پر ہی نہ نکل گئی ہو۔

وہ ہنسنے لگا۔ "آج ایک جہاز پر تو میں بھی گیا تھا۔
 اُس کی روانگی کل پر متوی ہو گئی ہے۔ اس پر معلوم کرنا
 چاہو تو کرو۔"

"تم کس جہاز کی بات کر رہے ہو؟"
 "وہ ایک انڈین شپ ہے۔" اُس نے ہاتھ سے
 اشارہ کیا۔ "اس کا کپتان میرا دوست ہے۔"
 "ٹٹ اپ،" میں نے سخت برطانوی انداز میں کہا۔
 تم سمجھتے ہو کہ کم اتنے گھٹیا اور گرے ہوتے ہیں۔ صرف
 بچاس ڈالر کے لیے میری گرل فرینڈ کسی بلڈی بلیک
 اجڑین کے پاس چلے گی۔ وہ کسی فریج ویل پر ہے تین
 مہذب سیر اس کو لے گئے تھے۔"

اُس نے فوراً معذرت کر لی۔ "پھر تو تمہیں خود ہی
 معلوم کرنا پڑے گا۔ یہاں آج کل میں نہ جانے کتنے برٹش
 فریج اور دوسرے یورپین جہاز آئیں گے اور جاہلیں گے۔"
 اب ہم باہر آ گئے تھے اُس نے مجھے باقی باقی کہنا
 چاہا مگر میں نے کہا۔ "میرے پاس گاڑی ہے۔ میں تم کو کہاں
 چھوڑ سکتا ہوں؟ کم آن۔"

وہ حیران نظر آنے لگا۔ "یو گاٹ لے کار؟"
 "میری اپنی نہیں، کرانے کی ہے۔" میں نے وضاحت
 کی۔ وہ مطمئن نظر آنے لگا اور پھر میرے ساتھ ہوا۔
 "تمہارے پاس کرانے کی کار کے لیے پیسے ہیں اور
 تمہاری گرل فرینڈ بچاس ڈالر کرانے گئی ہے؟" وہ

ظفر سے بولا۔
 "بے شک ہم کچھ فضول خرچ بھی ہیں۔" میں نے
 تسلیم کیا۔ "تم کہاں تھوڑے ہو؟"
 "وائی ایم سی لے۔" میں کسی کو ساتھ رکھنا پسند نہیں
 کرتا۔ خصوصاً لڑکیوں کو۔ وہ بولا۔ "تم تو بوسل میں تھوڑے
 ہو کچھ فضول خرچ؟"

میں اُسے عمدہ جاکر دے کر اس طرف لے گیا تھا
 چہرے محسن کے آنے کا امکان تھا۔ اب ساڑھے دس
 بج چکے تھے اور میں نے اُسے دس بجے کا وقت دیا تھا۔
 اُسے میں نے اکرام شیخ کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھا ہوا دیکھا۔
 ٹیکسی بھی اسٹیڈ سے کافی دور اس لاکے قریب کھڑی ہوئی
 تھی جس میں مجھے اور اس بیتی کو جانا تھا۔ ہمیں ایک ساتھ
 واپس آتے دیکھ کر محسن نے ہنسا ہوا کہ اب کب
 موتی چل ہوگی اور اُسے کیا کرنا پڑے گا۔

میں نے کار کا دروازہ چابی سے کھولا اور بیٹھتے ہی
 آگے پیچھے کے دونوں گیٹ ان لاک کر دیے۔ ہاتھ لگے
 دروازے سے میرے ساتھ بیٹھا میں نے کار اسٹارٹ
 کی اور پیچھے دیکھا۔ محسن نے سر ہلا کے مجھے چلتے رہنے کا
 اشارہ کیا۔ میں نے رفتار میں تھوڑا سا اضافہ کیا ہی تھا کہ
 محسن نے دوڑتے ہوئے پیچھے والا دروازہ کھولا اور بیٹھ
 پر گرتے ہی بند کر لیا۔

بیتی نے چونک کر پیچھے دیکھا مگر جو کچھ اُسے نظر آیا
 وہ اُس کے حواس گم کرنے کے لیے کافی تھا۔
 "یہ... یہ کیا ہے؟... کون ہو تم...؟"

وہ ہلکا ہوا۔
 "پلیز سٹ کو اینٹ،" محسن نے کہا۔ "دب چپ کر کے
 بیٹھو (برو)"

"تم لوگ اغوا کر رہے ہو مجھے... کیوں؟"
 "معلوم ہو چلے گا،" میں نے کہا۔ "تم یہ کیوں بھول
 گئے تھے کہ تم کالے مزدور میں مگر ہماری اُنکھیں اُسی طرح
 دیکھتی ہیں، ہمارے کان اُسی طرح سنتے ہیں اور ہمارا دماغ
 اُسی طرح کام کرتا ہے جیسے تمہارے ملک میں الین بی آئی
 کے ایجنٹوں کا۔"

"تم... تم... مگر کاری کارنہ ہے جو؟ اُس کی
 حالت غریب کی۔"
 "ہمارے ملک میں اسے الین آئی لے کہتے ہیں،" میں
 نے کہا۔ "اور کار کو رکی کے اعتبار سے ہمارا معیار کیا ہے؟"

اس کا تم کو بخوبی اندازہ ہو چکا ہے۔ قہر بہت مطمئن تھے کہ
 کوئی تمہیں نہیں دیکھ رہا ہے۔ تم نے دستاویزات اس
 انڈین شپ پر پہنچانے کا کیا معاوضہ وصول کیا؟"
 "میں... بی بی ایسا کوئی کام نہیں کیا۔"

"تم ایک بڑا نڈا لٹافہ کر گئے تھے جو تم نے
 آر آر مصر کے حوالے کیا۔" میں نے کہا۔ "ایس ایس کرا تھی
 تھوڑا کافرست آفیر شاید جمیل بھی اس موقع پر موجود تھا۔
 ایک سیکورٹی گارڈ جو من لے کھڑا تھا۔ وہاں ویلزنگ
 ہو رہی تھی، اس لیے ہمیں فلیش گن کی ضرورت نہیں پڑی۔
 ہم نے بہت سی تصویریں بنائی ہیں۔ ویلے ہمارے پاس
 افراد کی تصویر تھی، اُس کی ایک تصویر میں تم مصر سے
 ایک سفید لٹافہ وصول کرتے نظر آ گئے۔ دوسری تصویر
 اُس وقت لی گئی جب تم نے وہ لٹافہ اپنے کوٹ میں چھپایا۔
 اس میں کتنی رقم ہے مسٹر؟"

"مسرواٹ؟...؟" محسن نے کہا۔ "اپنا پاسپورٹ
 میرے حوالے کر دو۔"

"نہیں۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس۔ پہلے مجھ پر اپنا
 شناختی کارڈ دکھاؤ۔" اُس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔
 "مجھے تم ایسے لگتے ہو۔"

بلیک جھپٹتے ہیں اُس نے گیٹ کھول کر باہر کوڑنے
 کی کوشش کی۔ کار کی رفتار بہت زیادہ تھی مگر اس سے
 بھی زیادہ برق رفتاری کا مظاہرہ محسن نے کیا۔ اُس نے
 بیتی کے سر پر رولر لود مارا اور میں نے اُسے بائیں ہاتھ سے
 واپس کھینچ لیا اور نہ وہ کھلے دروازے سے ٹک کر باہر جا
 گرتا تو اتنی رفتار سے سڑک پر گرنے سے اس کی گردن
 بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ اب میں نے رفتار کم کی اور محسن نے
 آگے ٹھیک کر بھولنا ہوا دروازہ کھینچ کر بند کر دیا۔

اکرام شیخ کی ٹیکسی ہمارے پیچھے تھی۔ میں نے اُسے
 روانہ ہوتے ہی بلیک ویلور میں دیکھ لیا تھا۔ اب وہ
 ہمارے برابر آ گیا۔

"سب ٹھیک ہے نا؟" وہ بولا۔
 میں نے مسکرا کے اُسے انٹوٹھا دکھایا جس کا مطلب
 تھا فائن۔

"اب تم آگے ہو جاؤ شیخ صاحب! تمہارے
 غریب خانے میں قدم رنج فرمائے اور حاضر تاول فرمائے۔"
 میں نے کہا۔
 اکرام شیخ نے کہا۔ "غریب تو حاضر ہے۔ غریب خانہ

کوئی نہیں ہے فی الحال۔

”کیوں، پھر اس لڑکے چھوڑو تو کہاں چھوڑ لے

تم نے؟“

”ڈاکٹر جھنگی والا کہے پاس“ اکرام شیخ بولا۔

نہیں اپنی کار کو اس کی ٹیکسی کے متوازی چلا تا رہا۔ اچھا

تم ایسا کرو گے کہیں ٹیکسی روک لو جہاں ٹھیلے ہو۔

شیخ نے ٹیکسی آگے بڑھادی تو میں نے اس بیتی

کی طرف دیکھا جو اب میرے قدموں میں مڑنے کی طرح

پڑا ہوا تھا۔ ایک ڈیڑھ میل کے بعد شیخ نے انڈیکٹر دیا

اور ٹیکسی کو ایک سائڈ پر کھڑا کر دیا۔ میں نے کار بچاؤس کے

متوازی لگا دی۔ محسن کی زبانی شیخ کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ

میں کسی بیتی کے تعاقب میں گیا ہوں، اس کے بعد کیا ہوا تھا؟

یہ جانتے کے لیے میں بھی بے چین تھا۔ میں نے افسانہ خنجر

الفاظ میں ساری بات سنادی۔

”پھر اب کیا کرنا ہے؟“ محسن بولا۔

”میری ایک تجویز ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن شیخ صاحب،

پہلے فرمائیے کہ آپ سے گھر کیوں ہیں۔ یہ کیا پکڑ ہے؟“

”یاد پڑنا پکڑ ہے۔ اب میں جہاں رہتا تھا وہاں بھی

دی شنگ اور تجسس کے مارے ہوئے لوگ تھے۔ انھیں

سخت پریشانی لاحق تھی کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کے گھر میں

دو جوان اور عجب صورت عورتیں کیوں ہیں جو کسی طرح بھی

اس کی بیویاں نظر نہیں آتیں۔ غرائین کو موہنی نے مطمئن کیا

یہ بتا کے کہ وہ میری بیوی ہے اور زیب النساء میری بہن ہے

لیکن اسی دن ایک بیان میں نے جاری کر دیا جس کی رُو

سے موہنی تو خیر میری بیوی ہی تھی مگر زیب النساء کو نہیں

نے سالی کہہ دیا یعنی موہنی کی بہن۔ ایک گھر میں میاں بیوی

کے درمیان اختلاف رائے ہوا تو بات پھیل اور کچھ چرین

پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی جو تصدیق کے لیے میرے پاس آئی۔

میں نے بیان کو قابل قبول بنادیا کہ دونوں باتیں درست

ہیں۔ بیوی میری خالہ کی لڑکی تھی۔ اب اس کی بہن سے دھرا

رشتہ ہو گیا تو کیا غلط بات ہے اس میں۔ خالہ زاد بھی بہن ہی

ہوتی ہے اور سالی بھی ہے مگر اس کے بعد بھی کچھ شراب سند

عناصر مطمئن نہیں ہوئے۔ معلوم نہیں کیسے ایک نوجوان کو

لاہور کا دہر سال بل گیا جس میں زیب النساء کی تصویر چھپی

تھی اور ایک بوگس انٹرویو چھپا تھا کہ وہ فلاں فلاں فلم میں

کا کردار رہی ہے۔ لوصاحب نے محلے میں تو سنسنی پھیل گئی۔

فلم ایکٹریس ہے تو پھر ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ کیوں

ہے، ضرور بھاگ کے آئی ہے معلوم کرنا چاہیے دوسری

کون ہے۔ ایک بار پھر تصدیق و تفتیش کے لیے مجھے بلا دیا

گیا تو میں نے اس نوجوان کو پچھلایا۔ سخت مشتعل ہوا کہ

اُس نے میری بہن کو فلم ایکٹریس کہنے کی جرأت کیسے کی اگر

کسی سے صورت ملتی ہے اس کی، تو کیا وہ ایٹریس ہو گئی؟

لاحول ولاقوة۔“

”تنتے انٹوس کی بات ہے یا ر“ میں نے کہا۔ ”نلم

ادا کارہ کو ہمارے معاشرے میں کیا تھا ادا کیا گیا۔ ہے کہ

اس کا نام اب بھی گالی بن کے رہ گیا ہے حالانکہ اداکاری کو اب

فنون لطیفہ کا درجہ حاصل ہے۔ کتنی عزت ہے دوسرے

ممالک میں اداکاروں کی۔ ہمارے پڑوسی ملک میں

پر تھوڑی راج، فرنگس اور دیسپ کار، نہ جانے کتنے اداکار

اسمبلی میں گئے اور کتنی عزت پائی۔ خود امیر کا۔۔۔“

”لیجے یا ر اب کیا قصہ لے بیٹھے۔“ محسن جھنگلا کے

بولا۔ ”بات عجم کرو پھر کیا ہوا؟“

”پھر یہ کہ انھیں لاہور جانا پڑا تو میں نے وہی کیا جو

پہلے کرنا آیا ہوں۔ پوریا ستر سمٹ لیا۔ ابھی اسباب ایک

اپنے ہی ہم پیشہ ٹیکسی ڈرائیور کے گھر میں پڑے۔“

”اچھا، میں اس پتی جاسوس کو ٹیکسی کی ڈکی میں ڈالتا

ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کار اس کے مالک کو واپس کر دینی چاہیے

اس کے بعد ہم کہیں کھانا کھا لیں گے۔ ہم میں سے ایک

واپس لالچ بر جائے کالعدم محسن۔“

”قرعہ خاں میں میرا ہی نام کیوں؟“ محسن نے احتجاج کیا

”حکم ہے میرا۔ بحیثیت چیف۔۔۔“

”بھائیں لالچ چیف مع حکم۔“

”خود دتا ہے اُس سے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کھا جائے

گئی تجھے؟“

”ضرورت کیا ہے کسی کو واپس جانے کی؟“

”وہ اکیلے ہے اور یہ کام دو آدمی ہی کر سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔

”دو کی جگہ تین ہوں گے تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

اس کے ساتھ کریم بلوچ ہے، محسن نے فیصلہ سنایا۔ میں

اُسے بتا کے آیا تھا کہ شاید والیبی میں دیر ہو یا بسج ہو

جائے تو فکر نہ کرے۔“

مجھے مجبوراً اس کی بات ماننی پڑی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ

محل بانو کے ساتھ تنہائی کے خیال سے گزریاں تھا۔ اُس

نے شیخ کی مدد سے بیتی کو ایسے بانڈھا کہ وہ حرکت بھی نہ

کر سکے۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ مدد کے لیے کسی کو

پکارنا چاہے تو اس کی آواز بھی نہ گئی۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد ایک ایک گریٹ ہو گیا

سہم اس ترتیب سے روانہ ہوئے کہ نہیں اکیلا کار میں مانگے

چلتا رہا۔ ٹیکسی میں شیخ کے ساتھ محسن بیٹھ گیا۔ میں نے

بستر ہی سمجھا کہ جب صند سے گزر کے جانا ہے تو کار کو

بھر دیں کیوں نہ چھوڑ دوں جہاں سے میں نے کر گیا تھا۔

رات کے سوا گیارہ بجے بازار کی رونق ماند پڑ چکی

تھی۔ صرف ریستورنٹ اور شراب خانے آباد رہ گئے

تھے۔ پیراڈائز سینما کے سامنے بھی مجھے ایک عام قسم کا

شراب خانہ نظر آیا جس میں لوگوں کی آمدورفت جاری

تھی۔ کراچی کے سوائے پاکستان کے کسی شہر میں ایسے

ہا نہیں دیکھے تھے جہاں صلائے عام ہو۔ پہلے نہیں

بہت حیران ہوا تھا کیونکہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان

میں شراب کے عام ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اب مجھے حدم ہوتا تھا۔ آخر اس ملک کے رباب اقتدار

و اختیار کو ابھی تک احساس کیوں نہیں ہوا کہ اسلام کے

نام پر حاصل کیے جانے والے اس ملک میں یہ شراب

خانے ہمارے قومی کردار پر بدنامی داغ ہیں۔ کون ہے جو

اختلاف کہے گا کہ یہ کاروبار غیر اخلاقی اور حرام ہے۔

پھر انھیں لائسنس کیوں ملے ہوئے ہیں کہ لائسنس اور

بلا روک ٹوک نے فروشی کر دیں۔

کار کو نہیں نے عین اُسی جگہ بارک کر دیا۔ دن کا

وقت ہوتا تو مجھے یہ جگہ خالی نہ ملتی۔ پھر میں نے اکرام شیخ

سے کہا کہ وہ کافی باؤس جائے اور چابی کاؤنٹر پر

بیٹھے ہوئے شخص کو دے دے۔

”وہ کون ہے؟ مالک یا منیجر؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ سیزل کافی باؤس دیکھا

ہے نا؟“

”ہاں ہاں، کچھ اور کہنا ہے اُس سے؟“ شیخ نے

اپنی ٹیکسی سے اترتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں، شکریہ ادا کر دینا اور کھانا بھی لیتے آنا۔

مگر نہیں، وہ میرے نہیں لے گا۔“ میں نے کہا اور ٹیکسی

میں محسن کے ساتھ جا کے بیٹھ گیا۔

”تو نے اپنی اس گل بانو کو تسلی دے دی تھی نا؟“

”وہ بھی عجیب چیز ہے۔ مار جھپٹوں پتوں پتے پھر

رہی تھی۔ سر کے بال تو لیے ہی ترلے ہوئے ہیں انھیں

کر کے۔“

کیپ میں بچھا لیا تھا۔ میں تو سمجھا کر اپنا کیپٹن کریم بلوچ

ہے۔ میں نے پیچھے سے ہاتھ مار دیا کہ واہ استاد۔ اور

بس جب اُس نے ہٹ کے تیج ماری نا تو میرے

ہاتھوں کے کیوٹر اڑ گئے، جیسے انارکلی کے ہاتھ سے

اڑ گئے تھے۔“

”یہ اُٹا کیس ہو گیا۔ کیوٹر شراب دے کے ہاتھ سے

اڑ گئے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ڈرگنی ہو گی؟“

”ڈری تو تھی، مگر اس سے زیادہ ناراض تھی کرشاد

توڑ دیا۔“ محسن بولا۔ ”حالانکہ میں نے کوئی بہت زیادہ

قوت سے ہاتھ نہیں مارا تھا۔ کریم بلوچ سمجھ کے دستاد

بے تکلفی کا مظاہرہ کر گیا تھا۔ وہ تو میرے پیچھے بڑھ گئی کہ کریم

بلوچ کے بھی ایسا ہاتھ رسید کرنا کون سی اچھی بات

ہے۔ ہنستے تھے کہ دیکھو۔۔۔ کیسا لال نشان پڑ گیا ہے

پانچوں انگلیوں کا۔“

”پھر۔۔۔ تو نے دیکھا خطرے کا لال نشان؟“

میں نے کہا۔

”لیجے جا۔ سالی خواہ خواہ۔۔۔ زبردستی گلے پڑی ہے“

وہ جھینپ کر بولا۔ ”خزے دکھائی ہے مجھے کہ تم بڑے

بے رحم ہو۔ اتنا زور سے ہاتھ مار دیا۔ اب اخلاقاً سہلایا

دو، حد ہو گئی۔“

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ اس وقت تیری یہ حالت

ہو رہی ہے تو گل بانو کے سامنے کیا ہوئی ہوگی۔ خشک

ہی تو کہا تھا اُس نے کہ مجھے شادی کرنی ہے کسی دے۔“

”بھائی آپ مردین جائیں نا۔“ محسن جھنگلا کے بولا۔

”مجھے کیوں قربانی کا بجسا بنانے جھکا کر لیتے ہیں میرا۔“

اکرام شیخ آقا تو ہم پھر رہا نہ ہوئے۔ میں نے اُسے

محسن کے ساتھ گل بانو کی زیادتی کا حال سنایا تو وہ بھی

بہت ہنسنا۔ محسن کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ٹیکسی بندر

روڈ پر آنے کے لیے ڈپسٹن کافی باؤس کے سامنے سے

گزری تو ایک دم میری جھوک جاگ اُٹھی۔ اکرام شیخ نے

مجھے مطلع کیا کہ اس وقت ہم بندو خاں کے مسمان

ہوں گے۔

”کون بندو خاں؟“ محسن نے کہا۔

”کسی کراچی والے کے سامنے ایسی جہالت کی بات

کرے گا تو مار کھا لے گا۔“ شیخ نے کہا۔

”شیخ صاحب! میں نے روکے کہا۔“ مانا کہ استاد

بندو خاں عظیم سارنگی نواز کافی نہیں۔ لیکن خالی پیٹ

47

"یہ بندو خال سارنگی نہیں سمجھتے مگر پڑا ٹھاکا بپا بنانے میں وہی کمال دکھاتے ہیں" شیخ نے کہا۔

اُس نے ٹھیک کہا مقدار رات کے بارہ بجے بھی ان کی دکان کے سامنے کاروں کی قطاریں اُن کی مقبولیت کا ثبوت بولتا ٹھوت تھیں۔ چھوٹ سے بھی زائد قد والے بندو خال شاندار سفید طرہ دستار کے ساتھ سب کو خوش آویز کہہ رہے تھے اور سب کے درمیان گھوم بھر کے دیکھ رہے تھے کسی کو کوئی شکایت تو نہیں۔ جب ہم ہیٹ بھر کے روانہ ہوئے تو تین نے اُن سے مصافحہ کیا اور فریج میں کہا "بہت عمدہ"

شیخ نے اس کا ترجمہ کیا اور بتایا کہ ہم غیر ملکی مہمان ہیں۔ اُن کا جذبہ مہمان نوازی ایک دم بیدار ہو گیا۔ وہ ہمیں مدعو کرنے پر مصر تھے مگر ہم شکر یہ ادا کر کے بھاگ آئے۔

شیخ نے اپنی ٹیکسی عام جگہ سے دوڑ کھڑی کی تھی تاکہ کسی وقت ہمارا قیدی ہوش میں آجائے تو کسی کو متوجہ نہ کر سکے حالانکہ ہماری احتیاطی پیش بندی کے باعث اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ شیخ نے ڈکی کھول کے دیکھی تو بیٹی کی آنکھیں کھلی دکھائی دیں۔

میں نے جیب میں سے وہ کاغذ نکالا جس پر جیکب لائن کے دو اور کھیتی نوادر لڑ کا ایک نمبر لکھا ہوا تھا۔ یہاں جانا ہے۔

"یہاں کون رہتا ہے؟" شیخ نے ڈکی بند کر کے مجھ سے وہ پوچھ لے لیا اور ٹیکسی اسٹارٹ کی۔

"دو کوارٹر تو جیکب لائن میں ہیں" میں نے کہا۔ "جیکب لائن یہ تھچے کا سب علاقہ ہے" شیخ نے کہا۔

"یہ غداروں کا ایک ٹولا ہے جس میں چار افراد شامل ہیں" میں نے کہا۔ مجھے شک ہے کہ اس قیدی کا اصرار سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے جو اہم سرکاری راز چرائے دشمنوں تک پہنچا رہے ہیں۔ یہ چار جنگلی فتنہ کالم کے لوگ ہیں جو اس قسم کی صورت حال میں ملک کے اندر رہتے ہوئے ملک کی سلامتی کے خلاف مکرر عمل ہو جاتے ہیں۔ یہ چاروں بھی علیحدگی پسند عناصر کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں یا پھر لائٹ میں غداروں کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ ان کی رسائی

ٹاپ سیکرٹ انفارمیشن تک ہے جو یہ آگے پاس کر رہے ہیں۔ یہ بیٹی بھی ایسے ہی کاروبار میں مگوث تھکا لیوں نہ اسے اور انھیں اُسے سامنے بٹھاکے پوچھیں۔

آدھی رات کے بعد کوارٹر والوں کے نمبر پر ہٹا دینا کام تھا۔ نمبر منٹ گئے تھے۔ سفیدی کرنے والوں نے دباؤ یہ غیر لکھنے یا کھولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایک کوارٹر میں روشنی دیکھ کر شیخ نے کال بیل بجائی۔ اُس نے یہ ظاہر کیا کہ کسی ٹین میں رہنے والوں کے مہمان آئے ہیں ہم ٹیکسی سے باہر ہی نہیں آئے۔ شیخ چند منٹ کے بعد آیا اور ٹیکسی کو گھما کے پیچھے لے گیا۔

سی ٹین خاصا بڑا سیرک فٹ کوارٹر تھا جس کے ایک حصے میں لائن نظر آ رہی تھی۔ ہمیں اور محسن ٹیکسی سے اتر کے ایک طرف اندھیرے میں کھڑے ہو گئے۔ شیخ کی دستک کے ساتھ ہی اندر چلنے والی وہ لائن بچھڑ گئی جو کھڑکی کے شیشوں سے باہر بھی پہنچ رہی تھی۔ دو تین منٹ کے بعد کوئی دھوئی پہننے باہر آیا۔

"شیخ مطیع الرحمن صاب! ادھر رہتے ہیں؟" شیخ نے بالکل ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرح پوچھا۔ "رہتا ہے یا نہیں رہتا ہے؟ تم کیا مانگتا؟ اس ہنگام نے تمہارے میں کہا۔

"ہم کیا مانگتا؟" شیخ نے کہا۔ ہم یہ پتا مانگتا۔ یہ کوارٹر میں کون رہتا ہے؟

جنگلی نے وہ رقبہ لے لیا۔ "مسیح الرحمن" پھر لے احساس ہوا کہ نام لے کر اُس نے غلطی کی ہے۔ بابا ادھر کیوں آتا؟ وہ کوارٹر ادھر ہے ہمارا خیر خراب کرتا تھا۔ مغز خراب ہے۔

اس سے زیادہ بولنے کا موقع ہم نے نہیں دیا۔ وہ واپس جانے کے لیے پٹائی تھا کہ میں تیزی سے نکلا۔ اور میں نے اسے یوں دبوچ لیا جیسے پھپھکی کسی چمپر کو دبوچتی ہے۔ وہ پھپھڑا یا مگر نہ وہ خود کو جھڑا سا اور دھق سے آواز نکال سکا۔ یہ سب کارروائی بیرونی برآمدے میں ہو رہی تھی۔ مگر اتنی رات کو وہاں دیکھنے والا کون تھا۔

میں اُسے گھسیٹ کر اندر لے گیا۔ محسن ہاتھ میں ریلواریلے میرے پیچھے آیا۔ اکرام شیخ اپنی ٹیکسی کو اس کوارٹر کے سامنے سے شا کے دوڑ کھڑی کرنے کے لیے لے جانا چاہتا تھا مگر شاید اُسے خیال آ گیا کہ اس میں استغاثہ

کا ایک اہم گواہ موجود ہے۔ اندراج تک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ہمیں نے ایک کمرے سے دوا فراد کو نکال کر محسن کی طرف بھاگتے دیکھا۔ "دیکھ کوئی نکلنے نہ پائے" میں نے محسن کو نڈھار کیا۔ محسن کمرے کے دروازے سے سیدھا نکل گیا۔ خبردار میں گولی بار دینا۔ محسن نے کہا۔ دو قوں سامنے دلو اور کے ساتھ منجمد ہو گئے۔

اکرام شیخ نے ادھر ادھر دیکھا اور سوچا بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھ کے لائن اُن کر دی۔ میں نے مطیع الرحمن کو دھکاک دے کر دیوار کی طرف پھینکا۔ اُس کا سر دیوار سے پک لگا کر ناک سے خون بہنے لگا۔ وہ چکر اڑے وہیں بیٹھ گیا۔

محسن ان دونوں کو اندر اسی کمرے میں لے آیا۔ "اور کون ہے ادھر؟" میں نے شیخ سے کہا۔ "جو بھی ملے اُسے یہاں لاؤ۔ ذرا بھی گڑبڑ کرے تو اُسے گولی مار دو۔"

محسن نے ذرا کی کوشش میں ناکام ہونے والے دونوں ہنگاموں کو دیوار کی طرف مڑ کر کے کھڑا دیا اور اُن کی تلاش لی۔ وہ جرم نہ ہوتے تو ہماری اس کارروائی پر مشعل ضرور ہوتے لیکن اُن کی تو حالت ہی اتنی خیر ہو رہی تھی کہ اُن سے اعتراف جرم کرنا پڑے عقہ تھا۔

شیخ دو خشک چھوڑے جیسے مرل جان لڑکوں کو گدی سے پکڑ کے لایا۔ یہ دونوں چارپائی کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ تیسرے کمرے میں عورتیں اور بچے سو رہے ہیں؟

"سوئے دو انھیں" میں نے کہا۔ اگر یہ ہم سے تعاون کرتے رہے تو اُن کی نیند خراب نہیں ہوگی ورنہ یہ نہیں بھڑا سا توقف کر کے کہا۔ "ورنہ انھیں بھیسے گتوالیں گے۔"

"تم کون لوگ ہو؟" مطیع الرحمن اب ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ "جاننا نہیں ہم گورنمنٹ کا افسر ہے۔" "ہم تو سب کچھ جانتے ہیں تمہارے بارے میں اور جو نہیں جانتے وہ معلوم کر لیں گے مگر تم ہمیں نہیں جانتے" میں نے کہا۔

"تم اندر آیا۔ وارنٹ کا بغیر۔ آرڈر دکھاؤ ہم کو" مطیع انہن نے کہا۔ "شریف لوگ کے گھر میں گھسنا ہے رات کو" میں نے اُس کے ایک ہاتھ پر مارا۔ وہ نیچے گر گیا۔

"یہ تھا آرڈر۔ وارنٹ یہ ہے" میں نے دیوار پر دکھا کے کہا۔ "اس میں جہنم کے چھ پاسپورٹ ہیں۔ تم سب شریف آدمی اتنی رات کو اکٹھے ہو گئے کیا کر رہے تھے اور جب ہم نے دستک دی تو اس کمرے کی لائن کیوں آف ہو گئی تھی؟ ان دونوں نے بھاگنے کی کوشش کیوں کی تھی؟" شیخ نے کہا۔ "ان کو وہیں لے چلو جہاں سب ثبوت ہیں۔ ان کے تمام جرائم کی شہادتیں پھیلی پڑی ہیں۔"

"اچھا! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ان میں سے ایک ایک کو اندر لاؤ۔ لیکن پہلے ان کے خلاف دعوہ معاف گواہ کو تولے آؤ۔"

وہ سب بزدل اور کم ہمت لوگ تھے۔ اُن میں سے دو تو ایسے کانپ رہے تھے جیسے سچ انھیں چارٹا سجار چڑھنے والا ہو۔ یہ وہی دو نورما تھے۔ جو چارپائی کے نیچے چھپ گئے تھے باقی دو جو فرار نہ ہو سکے تھے، مجھ بنے خاموش کھڑے تھے۔ اُن کے لیے انکار کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ جو کچھ ہوا اچانک ہوا اور ایسے وقت میں ہوا تھا کہ وہ سب ایک ہی جگہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ انھیں اندازہ تو ہو گا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے مگر جو سب تک پکڑا نہ جانے میرا پھیر ہی سے نہیں جانا اور غرضی قسمتی سے اپنی اُمیدیں وابستہ رکھتا ہے۔

شیخ اور محسن نے اپنی کو ایک گٹھری کی صورت میں سب کے درمیان رکھ دیا۔ اس وقت میں اپنی کی طرف نہیں ایک ہی صفت میں کھڑے ہوئے غداروں کی صورتیں دیکھ رہا تھا۔ مطیع الرحمن کی صورت پر صدرے کا رد عمل اتنا شدید تھا کہ مجھے کچھ بے چینی کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ یقیناً اس بیٹی کو جانتا تھا۔ باقی چاروں کے چہرے سپاٹ رہے اور انھوں نے مطیع الرحمن کی طرف دیکھا بھی تو نگاہوں سے یہی سوال کیا کہ یہ کون ہے؟

ایک چارپائی کی رسی کھول کے محسن نے چاروں طرہوں کے ہاتھ اُن کی کمر کے نیچے باندھ دیے۔ ان میں سے ایک پھوٹ پھوٹ کے رونے اور معافی مانگنے لگا۔ "ہم سے گولتی ہو۔"

"چپ۔ غلطی کا بچہ" محسن نے اس کے سر پر ہتھ مار کے کہا۔ غلطی کر کے روتا ہے۔ ابھی تو سزا مافی ہے۔ اُس نے سب کو دیوار کے ساتھ بٹھادیا۔ اور اُن پر واضح کر دیا کہ جس کے حلق سے مخرجی کے چوڑے جتنی بھی آواز نکلی اُسے وہ مرغابنا سے گا اور پھر اُسے اٹھ دے دیں۔ پر

مجبور کر سکے گا۔

مطیع الرحمن کو میں گردن سے پکڑ کر دھکیلتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں وہ صوبہ ہمارے آنے سے پہلے جمع تھے۔ اس نیشنل وسیع ہال جیسے کمرے کی ایک دیوار پر شیخ مجیب الرحمن کی بہت بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دوسری تصویر بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی تھی۔ مقابل کی دیوار پر ایک فریم میں مجیب کے چہرے کی تصویر لگے ہوئے تھے۔ میں بنگالی زبان سے ناواقف تھا مگر میں نے اندازہ کر لیا کہ چھ مختصر پیراگراف جن پر ترتیب کے خبر بھی تھے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

”شیخ مجیب کے چہرے کی تصویریں ہیں؟ میں نے تصدیق کے لیے مطیع الرحمن سے پوچھا۔ اس نے ہارے نام اثبات میں سر ہلایا۔
”اس کے ساتھ دلے دوسرے فریم میں کیا ہے؟“
”بنگلہ دیش کا قومی گیت“

میں نے پلٹ کر اس کے منہ پر اتنی قوت سے اٹا ہاتھ مارا کہ وہ ٹھوکر کے دیوار سے جا لگا۔
”میرے سامنے یہ لفظ پھر استعمال مت کرتا۔ ابھی تک وہ مشرقی پاکستان ہے۔“ میں نے کہا ”ساری دنیا کے لیے۔ اب بنیادی کیا ہے؟“
”ٹیگور کا گیت“ وہ ٹھوکر لے کر بھاگ گیا۔

اب میں نے کمرے میں پھیل جوتی دوسری چیزوں کا جائزہ لیا۔ ایک سادہ قسم کے ریک میں مختلف کتابچے رکھے تھے۔ میں نے ایک کتابچہ اٹھایا۔ ”مجیب کے چہرے کی تصویریں۔ حقیقت کے آنے میں“ یہی کتابچہ انگلش میں بھی موجود تھا۔ لکڑی کے تختوں کے پریشان میں جو کتابچے، پمفلٹ اور پوسٹر چھبے ہوئے تھے، وہ باہر سے شائع ہو کر آئے تھے۔ ”دو قومی نظریہ۔ ایک سرب۔ پاکستان ایک غیر فطری ریاست۔“ استعمال کی کافی۔ بنگالی کیوں غریب ہے؟۔ ہم کھاتے ہیں تم آڑھے ہو۔ بڑے صوبے میں کچھ نہیں۔ اقلیتی صوبہ حاکم ہے۔ کیا ہم اب بھی غلام ہیں؟۔ بنگلہ دیش ہماری منزل۔“ یہ چند عنوانات تھے۔

”یہ زہر بھیلار ہے جو تمہیں ہلاک کرے گا۔“ میں نے کہا۔
”جیسے تم زہر کھاتے ہو، وہی ہمارے لیے آبِ حیات ہے۔“ اس نے رواں انگریزی میں کہا۔ میں اس کی بے خوبی

پر حیران رہ گیا۔ یکنخت وہ مجھ پر اعتماد اور بھروسہ ہو گیا تھا شاید اس لیے کہ وہ انتہائی سب سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ دیکھا کہ سے گزرتا ہے دوا دھاتا۔ جب تک پکڑے جانے کا ڈر تھا وہ چھپ چھپ کے ہر کام کرتا رہا اور اپنے جرائم کی پردہ پوشی میں مصروف رہا مگر اب وہ ہر شے کی جرم کے ساتھ، بغیر اور شہادتوں کے ساتھ عین ارتکاب جرم کی حالت میں پکڑا گیا تھا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب سزا ناگزیر ہے۔ اس احساس نے اسے ہلکی جنت عطا کی پکڑے جانے اور سزا پانے کی صورت میں اس کے جسم پر طبع میں وہ سچا، قوم پرست غلام اور بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے لیے استعمال ہونے والوں کے ہاتھوں مصائب بھینے والا مجاہد بن جا رہا تھا۔

”یہ اب حیات کہاں سے آتا ہے؟ میں نے طنز کرتے ہوئے سارے کتابچوں کو نیچے گرا کر خروا کر دیا۔
”بنگلہ دیش سے۔ اب تم میری زبان کاٹنے بغیر مجھے اس مقدس نام کے استعمال سے نہیں روک سکتے۔۔۔“

وہ ہلکا۔
”زبان کاٹنے کا وقت تو بعد میں آئے گا پکھلے زبان کھلانے کا مرحلہ آئے گا۔“
”تم مجھ سے کچھ نہیں معلوم کر سکو گے۔“ وہ ہلکا۔ تم مجھے ہو کر میں لینے ہی ساتھیوں سے غداری کر دیا گا۔ ان کے نام اور پتے تمہیں بتاؤں گا۔“ وہ تلخ لہجے میں ہلکا۔
میں نے سامنے کتابچے فرش پر گر کر دیے۔ ”میرا خیال ہے کہ تم زیادہ مزاحمت نہیں کر سکو گے اور اس کے علاوہ تمہارے دوسرے شریک جرم بھی تو ہیں کیا وہ بھی اتنے ہی بہادر ہیں؟ لیکن پہلے ہم تمہیں کیوں نہ دیکھ لیں۔۔۔“

”میں نے آواز دے کر کہا۔
”میں دروازے میں نمودار ہوا۔ میں باس۔“
”دیکھو دوسرے کمرے میں جہاں عورتیں سو رہی ہیں وہاں کتے بچے اور کتے کیوں نہیں ہیں؟“
”دو عورتیں ہیں، ایک بوڑھی اور ایک جوان، تین بچے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”سو رہے ہیں صوبہ؟“
”عورتیں جاگ اٹھی ہیں۔ میں نے ان کو خاموش رہنے کو کہا ہے اور سمجھا دیا ہے کہ انھوں نے کہا تو کیا تو کچھ نہیں ہوگا؟“
”ان دونوں کو یہاں لے آؤ۔“ میں نے کہا۔ پہلے

ان کے ہاتھ پیچھے باندھ دینا، انہی کے ازار بندھے، اور منہ بند کر دینا، انہی کے کپڑوں سے۔“
”تم۔۔۔ عورتوں کے ساتھ۔۔۔ ایسا سلوک کرو گے؟ وہ مشتعل ہو کر چلانے لگا۔ اتنا گر گیا ہے

تمہارا اخلاق؟“
میں نے اس کو بڑی بے رحمی سے مارا۔ مسلسل لاقین اور نکتوں سے۔ میں نے اس کو اودھ توڑ کر دیا۔ میں نے کئی بار اسے اٹھا اٹھا کے دیوار پر پھینکا اور فرش پر بیٹھا۔
”وہاں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے کارکن اور غڈیے ہر روز سیکڑوں عورتوں کی عزت سے کھیل رہے ہیں کیونکہ وہ پاکستان اور دو قومی نظریے کے حامی ہیں۔ وہ مجرم یا باغی نہیں ہیں، غصہ وطن میں جن کے لوہے تم نے خود روہے ہو۔ تم ہندوؤں کے زخم پر دیکھتے۔ اپنے بھائیوں کی لاشوں کے تاجر۔ تم مجھے دیہاتیوں کے رہے ہو۔۔۔۔۔۔“
جو کچھ دوسروں کے ساتھ کرتے آئے ہو، دیکھو کہ اب وہی تمہارے ساتھ ہوگا۔ تم خود یہ عذاب بھیل کے دیکھو۔“
”میں دونوں بڑ بڑتی چلتی عورتوں کو دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔

”اب تم بتاؤ گے یا میں ان سے پوچھوں؟“ میں نے کہا۔ ”کس کے لیجنٹ؟ جو تم؟ اور یہ لڑکچہ کہاں سے آتا ہے؟“
”ماٹھیں۔۔۔ کچھ معلوم نہیں۔“ وہ ہلکا۔

”پہلے سب ہی کہتے ہیں۔ میں نے سر ہلایا۔ ہمارے تقیہ میں مرکز میں بہت کچھ ہے۔ حریت یافتہ کتے ہیں، چوہے ہیں، من کے دانت بہت تیز ہوتے ہیں اور جو ہمیشہ بھوکے رہتے ہیں۔ آٹھ دس بچوں کو ہم کسی مرد یا عورت کے ساتھ شیخے کے کاس میں ڈال دیتے ہیں تو وہ منظر ڈال دھپ جوتا ہے جب آدم خور چوہے اپنی بھوک مٹاتے ہیں اور آدھے کھنے میں جیسے جانتے آدمی کی جگہ ہڈیوں کا بچہ رہ جاتا ہے۔ ان سے لڑنا اور ان کے دانتوں سے خود کو بچانا ناممکن ہوتا ہے۔ کوئی کتا ہی چہنچہ جلائے ہمارا اس کی آواز بائبل سنائی نہیں دیتی لیکن اس کی جلد و جھڑا آخری سانس تک صاف نظر آتی ہے۔“

”بوڑھی عورت ایک مہرے جان ہو کر فرش پر گر گئی اور ساکت ہو گئی۔ دہشت سے اس کے اعصاب جواب دے کر حیرت یافتہ کتے صرف جرم عورتوں پر چھوڑے

جاتے ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں؟ اس کی کچھ فلمیں بھی بنا تی ہیں ہم نے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر یہاں ہم خالی ہاتھ آگئے تھے۔ تقیہ سے کچھ معلوم نہ ہوا تو ہم وقت ضائع نہیں کریں گے۔ جاتے وقت ہم عورتوں کو لے جائیں گے۔ باقی سب کی لاشیں اسی ترتیب کا لڑکچہ کی چتا پر آگ لگا کے چھوڑ جائیں گے۔“

”تم نہیں مار سکتے ہو۔ ہمارے جذبے کو نہیں مار سکتے۔“ مطیع الرحمن نے کہا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک جنوبی شخص ہے۔ جنون مشق کا ہو، مذہب کا یا سیاست کا، انسان کو موت کے خوف سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور وہ جان دینے کو مقصد حیات سمجھ لگتا ہے۔ اس سے کچھ معلوم ہونے کی امید نہیں تھی۔ میں نے دوسرے نمبروں کو بلائے کا فیصلہ کیا۔

پہلا جرم قدر سے ہمت والا تھا۔ اس نے کمرے کا نقشہ دیکھا اور سمجھ گیا کہ صورت حال کتنی سنگین ہو چکی ہے۔ ”میں تم سے تین سوال کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اور ہر سوال پر خود کرنے کے لیے تم کو ایک منٹ دیا گا۔“

”پہلا سوال۔ تمہیں کس طرح روایا انگریزی میں یاد ہے؟“
”اور اس کے بعد؟“ اگر نہیں جواب نہ دیا پتہ
”تم سزا سے موت پانے والے پہلے عذاب ہو گئے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔۔۔ اور ہم سب خیر ہوں گے۔“ مطیع الرحمن نے کہا۔
”پہلا سوال۔۔۔ یہ سب لڑکچہ کہاں سے آتا ہے؟“

میں نے کہا۔
”دوسرا جرم جپ کھڑا رہا۔ دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی سوئی آگے بڑھتی رہی۔ ایک منٹ پورا ہو گیا۔ مطیع الرحمن کے ہونٹوں پر افتاح مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
”دوسرا سوال۔۔۔ تم سب لوگ کس کس سرکاری محکمے کی فائلوں سے کس قسم کی دستاویزات چراتے ہو؟“
”ایک بار پھر سب کی نظر کلاک پر گئی۔ ایک لمبی سی شاٹل میں سینکڑی سوئی کے جڑھنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی رہی۔ دوسرا منٹ زیادہ اعصاب شکن سکوت میں ختم ہوا۔ مطیع الرحمن کی مسکراہٹ میں میرے لیے نفرت کا زہر اور تھکر کا انداز شامل ہو گیا۔

”تیسرا سوال۔ وہ دستاویزات تم کے ارسال کرتے رہے ہو؟ اس کا مکمل اہلور پتا؟“

اب نہیں نے جرم کے قریب جاکے بائیں ہاتھ لگائی
کی گھڑی پر نظر رکھتے ہوئے دایاں ہاتھ ایک ضرب کاری
کے لیے اٹھایا۔ اس نے جرم کو دھشت زدہ کیا۔ شاید وہ
سمجھ رہا تھا کہ اسے گولی ماری جائے گی اور وہ بڑا امید تھا کہ
ہم ایسی گولیاں نہیں کریں گے۔ فائر کی آواز تو اسے سونے
والوں کو جگا دے گی۔

سیکڑی کی ٹوٹی اجنبی گماہ کے ہنسنے کو کراس کر کے
آگے بڑھا ہی تھی کہ میرا ہاتھ حرکت میں آگیا۔ اس بچہ کی کے
ساتھ ایسی ہلاکت خیزی کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جب
اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹی تو یہ جیسا ایک آواز خف و اجل کی
ظن سب نے سنی۔ وہ کھڑے کھڑے گر کر سیدھا اُسے
گناہوں پر جو فرش پر ڈھیر ہوئے پسے تھے۔ عورت چلی
اور اُس نے محسن کی گرفت سے اپنی حاصل کرنے کی کوشش
کی۔ مجھے اُس کی دہشت زدہ آنکھوں میں الجھناظر آئی۔ مطیع الرحمن
بے یقینی سے اس شخص کو دیکھتا رہا جو شیک بین منٹ
پورے ہوئے ہی مر گیا تھا۔ اُسے ایک سیکڑی کی حملت
فین ملی تھی۔ گرنے کے بعد اس کا جسم پھنسی پانے والے
کی طرح تڑپتا رہا تھا اور نزع کے کرب میں اٹھتا بل
کھاتا رہا تھا۔ محسن نے بہت حاضردماغی کا ثبوت دیا
اور دوسرے مجرم کو لے آیا تاکہ وہ بھی ایک مجرم کو مرنا ہوا
دیکھ لے۔ میں نے اس دفعے میں عورت کو پکڑ لے رکھا۔
"میں نے اس سے تین سوال کیے تھے" میں نے
کہا۔ "اور ہر سوال کے بعد ایک منٹ سوچنے کے
لیے دیا تھا۔"

"ہم کچھ نہیں جانتا۔ ہم اللہ پاک رسول کا قہم کھانا"

وہ چلانے لگا۔ "ہم کو مت مارو۔"
محسن نے اس کا منہ دبا لیا۔ میں نے کہا "معلوم ہوتا ہے
کہ تم تین منٹ کی مہلت بھی نہیں جانتے۔ بخاری رضی
ایک اور گردن کی ہڈی چٹنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ
ذبتا جوان عورت بھی ہے۔ ہوش ہو کے گر گئی جس کو میں نے
ایک ہاتھ سے ہٹا کر رکھا تھا۔ پہلے میرے دوسرے ہاتھ میں
ریو اور ہتھکڑیاں میں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ مطیع الرحمن
اب مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو
سکتا تھا۔ اُس نے میرے جیسے مرد خون دل لے ٹھنڈے
مزان والے اور حقیقی پیشہ ور قاتل پہلے نہیں دیکھے ہوں گے
اب وہ بھی نروس ہو چکا تھا۔ اُس کی منگیٹیاں سختی سے
بند تھیں اور دانت ٹوٹ دے ہوئے تھے کہ جڑوں کی

ہڈیاں ابھرنے لگیں۔
تیسرا طرم انداز آتے ہی بالگوں کی طرح ہاتھ بھر
چلانے لگا۔ اُس نے ایک لاش کو سرد ہوئے اور دوسری
لاش کو بھڑکنے دیکھا۔ وہ دونوں ایڑیاں رگڑتے ہوئے اپنے
کناچے اور بھٹل فرسٹ پر پھیلاتے اور پھاڑتے رہے تھے۔
اُس نے میرے ایک سوال کا ہی جواب دیا یعنی نرن
یہ بتا کہ ان چاروں کا تعلق کس کس محکمے سے تھا اور وہ
کس قسم کی ٹاپ سیکرٹ انفارمیشن اکٹھی کر کے لاتے تھے۔
باقی دو سوالوں کا جواب اُسے نہیں معلوم تھا۔ مطیع الرحمن
نے اُسے جنگالی میں پکڑ لیا جو میں نے اندازے سے
سمجھا۔ وہ اپنے ساتھی کو بزدلی اور خداری پر زور مار کر رہا
تھا لیکن موت کو سامنے دیکھ کر تیسرے جرم کا سارا جذبہ
جماد ہو گیا تھا اور اُس کی دھڑکیاں کو گیلیاں کر گیا تھا۔ جینٹ
بعد وہ بھی کیز کردار کو پہنچا۔ مطیع الرحمن کی کیفیت کسی
باغی کتے جیسی ہو گئی۔ وہ مجھ پر دیوانہ وار حملہ آور ہوا۔ مجھ پر
میں نے پہلے اس سے فٹے کا فیصلہ کیا۔

میں نے اُس کی گھائی کو گرفت میں لے لیا اور اس کے
پریٹ میں ٹھکانا مارا۔ وہ در کی شدت سے ڈھرا ہو گیا اور اُس
کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے دوسرا ٹھکانا مارا تو اُس کی
جیسے سانس رک گئی اور اس نے ہوشیار کھول دیا۔ جب میں
فساں کے ہاتھ کو موڑا تو وہ خود ہی گھوم کر میرے سامنے
آگیا۔ اُس کے ہاتھ کو کمرے لگا کے میں نے اُسے آگے
دھکیلا اور دیوانے لگا دیا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ کو
پکڑ کر میں نے گھٹانا کمر پر رکھا اور دایاں تو اس نے کر لیا
خروج کیا۔ اُس کی سانس رکنے لگی۔

"تم نے میرے تین سوال کتنی بار سنے ہیں باب تو
یقیناً تمہیں ازبک ہو گئے ہوں گے" میں نے کہا۔ "یہ تین ہیں
اُن کا جواب دے سکیں کیا تم۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں تجھ پر۔" وہ چلا یا۔ "مجھے مار ڈالو
مگر میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"ان سب کی موت آسان تھی۔ گردن ٹوٹنے ہی جاس
کا جسم سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ بے شک جسم ٹھنڈا ہونے
میں دیر لگتا ہے مگر درد و کرب کے احساس کا تعلق دماغ
سے ہے۔" میں نے کہا۔ "تجاری موت بہت بُرا عذاب ہوگی۔"

"تم ہوجا کرو۔"
"او کے مسٹر مطیع الرحمن" میں نے اس کے سینے
ہاتھ کی ایک انگلی کا اپنی دو انگلیوں میں پھنسا کے دیا۔

ابھی ایک چوڑے پاس سے ایلے فوٹ میں جیسے پینل
ڈھنکی ہے۔ وہ بلبلاتا مگر میں نے اُس کا منہ دبا لیا۔ وہ
پکڑ دیا اس ہاتھ کو جھٹکا رہا اور میرے گھسنے کے دباؤ
اور دیوار کے درمیان بل کھاتا رہا۔

پھر میں نے اُس کے منہ سے ہاتھ ہٹا کے کہا۔ تم
چٹنا جانا ہو تو بیچ سکتے ہو۔ کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہو
تو میری طرف سے احادیات ہے۔ لیکن میں نہیں یقین
دلاتا ہوں کہ سونے والے تجارتی پکار میں بھی لیں گے تو
نہیں گے نہیں اور نکلے تو ہم انھیں لوٹا دیں گے۔ یہ تاکہ
کہ مطیع الرحمن گمے یا پینڈکس کے دوسرے تڑپ رہا
ہے۔ اب پھر وہی سوال کہ تم کچھ بتاؤ گے۔ یا۔۔۔ نہیں
نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوسری انگلی بھی توڑ دی۔ ہر بار
میں نے اُسے دو منٹ کا وقفہ دیا۔ ایک ایک کر کے
دس منٹ میں اُس کی پانچ انگلیاں ایسے ٹکے۔ ٹکے جیسا
کہ درمیان میں ہڈی ہی نہیں ہے۔

وہ اب چلا رہا تھا اور تڑپ رہا تھا میں نے اس
کا منہ دیوار سے لگا دیا تھا۔ اس طرح کہ وہ چرہ۔

کرنا تھا تو اُس کے ہونٹ اور ناک دیوار پر مڑو کھلتے
تھے۔ میرے لیے اُس کو بیٹھانا مشکل ہوتا تھا۔ ہاتھ چٹنا پچھ
میں نے محسن سے کہا کہ وہ آخری آدمی کو لے آئے اور
اس رسی سے مطیع الرحمن کو باندھ دے جس سے پہلے
چار افراد باندھے گئے تھے۔

"اس بچی کو اور اکرام شیخ کو بھی بیٹھ لالوں؟
" ہاں۔ انھیں دوسرے کمرے میں رکھنا اب
بے مقصد ہے۔ میں نے کہا۔

بہتی نے انداز آتے ہی پانچ لاشیں دیکھیں۔ ان دو
عورتوں کو بھی دہرہ ہی سمجھا جو درحقیقت بے ہوش
تھیں۔ اس کی آنکھیں خوت سے پھیل گئیں اور اُس کا رنگ
بلا ہوا لگا۔ اکرام شیخ نے اُسے ایک کونے میں بٹھا دیا۔
جو ہاتھ جنگلی جواب رستی سے بندھا ہوا اس بکرے کی
طرح برمایا آ رہا تھا جسے قصائی چھری پھیرنے کے لیے
چار پاؤں اس منظر کو دیکھتے ہی خوت سے مفلوج ہو گیا۔
وہ کچھ دیر جھوٹا رہا اور پھر منہ کے بل گر گیا۔

لیکن یہ اس کی منگاری تھی۔ محسن نے اُس کے حلق
کوئی گرفت لگائی تو وہ بلبلاتا کے تڑپا۔ محسن نے اُسے بٹھا دیا۔
اب وہ پھٹتی دونوں اُس کے ریو الو کی زد میں تھے۔ اکرام شیخ

نے میری ہدایات کے مطابق مطیع الرحمن کو باندھ دیا۔
میں نے پھر مطیع الرحمن کی قوت برداشت اور
محامت آزمائے کا مشاہدہ شروع کر دیا۔ وہ ایک خنثی اور
حیرت انگیز حوصلہ رکھنے والا شخص تھا۔ میں نے اُس کے
دوسرے ہاتھ کی انگلیاں بھی توڑ دیں۔ وہ سس سے سس نہ ہوا
لیکن آخری طرم کھنچتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

میرے گھسنے پر محسن نے بہتی کے منہ سے پکڑا نکال
دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور پھر بولا۔ "یہ... بہت
ظلم ہے۔"

"ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ ظلم ہے۔" میں نے کہا۔ لیکن
ہم ظلم کے جواب میں ظلم کر رہے ہیں اور ظالموں کو خنثی
مواضع رہے ہیں۔
"سزا دیتے ہوئے بھی انسان کو رحم دل ہونا چاہیے۔ مرنے
سے تو فوراً مار دو۔"

محسن نے اس کے بال پکڑ کے سر کو پیچھے دھکا دیا اور
ٹھکرایا۔ "مسٹر عمل، تم مشرقی پاکستان جا کے دیکھو۔ کس
طرح ان ملیشیا کی پسندوں کے چھوڑے ہوئے سمجھو کے
بھڑے ہمارا ہوس کا ننگا کھیل کتنے انسانیت کو زخمی
پر کھیلے ہیں۔ تم نے دہشت و دہریت کا ذکر تاریخ میں
چھیڑا۔ خان اور ملا کو سے منسوب کر رکھا ہے یا پھر اسے
خون ریزی کی برائت و ظلموں میں دیکھا ہے۔ مگر مشرقی
پاکستان جا کے دیکھو۔ وہاں عورتوں کو کیسے جیسا سوز طریقے
پر سر بازار اذیت دے دے کر ہلاک کیا جاتا ہے۔ بچوں
کے ٹکڑے کس طرح کٹی اپنی کے سوراخوں کے نیردوں
پر نظر آتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن اُس کا
جواب۔۔۔"

"ہمارے مذہب اور تجارتی تعلیمات میں فرق
ہے۔ تم کہتے ضرور ہو کہ کوئی ایک گاں پر ملا پتھر مارے تو اُسے
دوسرا پتھر کوڑھیں علماء ایسا نہیں کر پاتے۔ یہ گاندھی کے
اہنسا کے فلسفے کے خاصا قریب ہے۔ مگر کیا بندہ اپنے
باپ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں؟ تعقیب کے وقت وہ
باپ کو بھول گئے تھے اور خون کی بولی میں ممدون تھے۔
ہم مسلمان منافق نہیں ہیں اور نہ ہماری تعلیمات میں منافقت
ہے۔ ہم بتایا گیا ہے کہ قصاص کیا ہے۔ خون کا بدلہ خون،
آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان۔ جو کچھ میں کر
رہا ہوں یہ عین انصاف ہے اور میں اس لیے کر رہا ہوں کہ

انصاف کے ہاتھ ان کی گردن تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان ہاتھوں کو نظام انصاف کے پورے سرچے اور قانونی... ٹوٹ گئی ہیں۔

محرم کی کوشش سے جو تھانڈم بھروسہ ہو گیا مگر وہ پلانڈ ہونے کے قریب تھا۔ وہ ان میں سب سے کمزور دل کا مالک تھا۔ باقی سب کے لیے نرلے موت تو پہلے سے طے تھی لیکن وہ پہلے آجاتا تو اس سے امتزاج برآں اور اپنے ہاتھوں کے سامنے کتا ہوں کی روداد سننے اور مرنے سے پہلے اس اذیت سے بھی گزرے کہ غداروں کے ساتھ بھی کسی نے عقاری کی۔

جو تھانڈم رو رہا تھا اور کانپ رہا تھا اور ہٹا کارانہ طور پر سب کچھ بتا دینے کی پیش کش کر رہا تھا مگر میں طبعاً کڑا کمزور تو نہ تھا مگر ضروری سمجھتا تھا۔ جسمانی اذیت اس کی ضد کو شکست نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے دوسرے آدمی کو آواز دے کر کہنا کہ اس کی

”محرم! ان عورتوں کو ہوش میں لائے کہ بندوبست کرنا نہیں ہے۔“ ابھی کافی وقت ہے۔

”دو بجنے والے ہیں؟“ محرم بولا۔ ”زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں ہمیں سب کام نکلنے کے واپس جانا ہے۔“ حکمران نے کہا۔ ”یہاں اب صرف آدھے پون گھنٹے کی ضرورت ہے۔ جب یہ عورتیں ہوش میں... اٹھائیں تو ان سے کہنا کہ کچھ چائے وغیرہ بنائیں۔ ان کو بھی پلانا۔ بہتر ہوگا کہ ان کو دوسرے کمرے میں لے جاتا کہ یہ ہوش میں آئیں تو میدان کارزار نہ دیکھیں۔“ میں اتنی دیر میں مسرتی سے بات کرتا ہوں۔

”محرم! دو عورتوں کو واپس اتھی کے کمرے میں لے گیا۔“

میں نے بتی سے کہا۔ ”اب تم بتاؤ۔“

”میں سب کچھ بتا دوں گا کیونکہ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں، سوائے مالی نقصان کے۔“ وہ بولا۔ ”میں نہ تھا اور نہ ہوں اور نہ ان کا دوست۔“ میں صرف پیسے کے لیے کام کرتا ہوں۔

”یہ لوگ کس کام کا پیسہ دیتے تھے؟“

”دستاویزات لے جانے کا۔ تم نے دیکھا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کی کیا اہمیت تھی اور اس لحاظ سے کیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”وہ مہر بند لاف تھا اس لیے میں صرف انہماک کر سکتا تھا کہ اس میں کاغذات ہیں۔“

”کب سے کر رہے ہو یہ کام؟“ میں نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیا اور ایک اسٹول پر ٹک گیا۔

”یہ دوسرا بچہ اچھا۔“ وہ بولا۔

”پہلی بار بھی دستاویزات لے گئے تھے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، شاید اس میں کچھ تصویریں بھی تھیں۔“ وہ بولا۔

”اور اس کام کا تمہیں کیا معاوضہ ملا تھا؟“ میں نے کہا۔

”ایک ہزار ڈالر۔“ اس نے کہا۔

”کس نے دیا کیا تھا۔“ انڈین شپ کے کپٹن نے؟

”جپتی نے نفی میں سر ہلایا۔“ وہ صرف رسید دیتا تھا اور کوئی لاف۔“

”وہ لاف کہاں ہے تمہیں آج ملا ہے؟“ میں نے ہاتھ بڑھا کے چٹکی سے اشارہ کیا۔

اس نے کوٹ کے اندر سے سینڈ لاف نکالا اور مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اسے کھول کے دیکھا۔ اس کے اندر ایک ہزار ڈالر تھے۔ میں نے رقم نکالے بغیر لاف قریب رکھ لیا۔

”کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ اس میں کیا ہوگا؟“ میں نے کہا۔

”اُس نے نفی میں سر ہلایا۔“ جانا تو بتا دیتا میں نے تو لاف ہی تمہیں دے دیا ہے۔“

”یہ لاف تم کسے واپس لا کے دیتے تھے اور کہاں؟“

”یہاں۔ اس کو۔“ جپتی نے مطیع الرحمن کی طرف اشارہ کیا۔

مطیع الرحمن اُسے گالیاں دینے لگا۔ ”تم بے غیرت کتنے، ملک حرام۔“

لاف دینے کے بعد کیا ہوتا تھا؟ میں نے کہا۔

”مجھے اس کمرے میں بٹھا دیا جاتا تھا۔ دس بندہ منٹ کے بعد فرم لے جاتی تھی۔“ وہ بولا۔

”تم کسی فوڈ اسٹینڈ شاپ سے واقف ہو؟“

میں نے کہا۔

”اُس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔“ یہ لوگ بنگالی بیبات کرتے تھے اور نہیں بنگالی نہیں سمجھتا۔“

”پہلی بار تمہارا ان سے کیسے رابطہ ہوا تھا؟“

”میں تلاش ہو چکا تھا۔“ وہ بولا۔ ”مجھے صرف ایک کام آتا ہے۔ میں ایک اچھا شگر ہوں۔ ایک گروپ میں بھی رہا ہوں۔“

”شیطان کے جیسے۔“ صبح نام تھا اس گروپ کا۔ میں نے طنز سے کہا۔ ”سب شیطان کا کام ہی کرتے ہوں گے۔“

”ہم نے میاں اور ٹیکس میں کامیاب ہو گئے۔“

”یہ روٹوں اور چاروں کون کا گروپ تھا۔ ہم ایک کام نہیں تھے۔“

”سب کے شوہر سب۔“ سب کی بیویاں مشترک بچے کس کے کھاتے میں جاتے تھے؟

”ہمارے بچے نہیں تھے۔“ وہ بھی نہیں سکتے تھے۔

”ہوتے تو ہم ہار ڈالتے۔“ میں بھی ایک شگر تھا۔ یہاں میں نے گاہک کے ساتھ گئے گاہے اور بہت پیسہ اکٹھا کیا۔

”تمہاری قوم کے افراد بہت زیادہ رحمدل ہیں، خراج دلایا بے وقوف۔“

”سب کچھ میں بس بے غیرت اور بے غیرت نہیں ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تمہاری شناختی دستاویزات میں؟“

اس نے سب پاگل میں سے ایک بلاسٹک میں لپٹا ہوا بلیکٹ سا نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ اس پر جپتی کا پورا نام پتا اور اس کے بارے میں تفصیلی معلومات درج تھیں۔

”میرا خیال ہے کہ اب یقیناً ان کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔“ میں نے کہا۔

”کیوں؟“ ان کے بغیر میں واپس کیسے جاؤں گا؟

”جیسے سب کو ایک دن جانا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو وہاں کے لیے پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ مدد کار نہیں ہوتا۔“

”کیا... تم مجھے... لیکن میں نے تم سے پورا تعاون کیا اور میں... دشمن بھی نہیں تھا۔“ وہ چلائے لگا۔

کے ٹکڑے کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے دشمنوں کا ساتھ دینے والے بہر حال میرے دشمن ہیں تاہم میں تم کو وہ رعایت دوں گا جو تم ان کے لیے ایک رتبے تھے۔ میں تمہاری موت کو بہت آسان بنا دوں گا۔ اور تمہیں آخری دھماکے کے لیے موقع بھی دوں گا۔“ ایک منٹ۔

”تم... نہیں کر سکتے... میرے ساتھ... میں تم کو قتل کر دوں گا۔“ یو باسٹرڈ۔ وہ ایک دم اٹھ کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں ہی جا رہا تھا جیسے ہی وہ میرے قریب آیا میں نے اس کے ایک بھر پور ہاتھ رسید کیا۔ اُس نے ایک جھٹکا لیا۔ اُس کے حلق سے دھماکے کی آواز نکلی اور اس کے ہاتھ اپنی گردن کی طرف بڑھے۔ میں نے دوسرا ہاتھ لہرا تو وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گیا۔

”مطیع الرحمن! تم نے ہمارے نظام انصاف کو دیکھا۔ اس میں کسی مجرم کے بچے نکلنے کا ایک فیصد امکان بھی نہیں۔ لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو گے، گناہ گاروں کے اعمال کا خمیازہ انہیں بھی بھگتنا پڑ جاتا ہے جو معروف عام میں لوہا نہیں کھاتے ہیں۔“ محسن! میں نے آواز دے کر کہا۔

”دو منٹ باس،“ محسن نے کہا۔ ”چائے تقریباً تیار ہے۔“

”اب میں وہ کر دوں گا جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔“

لیکن تم نے مجھے اس انتہا تک پہنچا دیا۔“ میں نے مطیع الرحمن سے کہا۔ ”اب ان دونوں عورتوں کے سامنے،“

خالیا ایک تمہاری بیوی ہے اور دوسری اس کی ماں یا تمہاری ماں، ان کے سامنے باری باری تینوں بچے پہلے اندھے کیے جائیں گے گرم سلاخوں سے۔“

”نہیں۔“ مطیع الرحمن چلا آیا۔ ”کیا تم حیدر ہو گئے ہو؟“

”تم انسان بن کے انہیں بچا سکتے ہو؟“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”وہ میرے لیے جنگ میں سب جانز ہے جب دشمن کہیں ہم گرا تا ہے تو کیا اس سے بچنے ہلاک اور زخمی نہیں ہوتے، معذور نہیں ہوتے، یہاں تک کہ وہ جواؤں کے پیٹ میں ہوں، انہیں بھی مرنا پڑتا ہے۔ امریکا کے اٹیم بم نے تو آئے والی نسلوں تک کو ذہنی و جسمانی طور پر معذور اور بے ہوش کر دیا تھا۔ چنانچہ دوسرے مرحلے میں ان کو آری سے چیر دیں گے۔ آری ہم لائے ہیں۔ درمیان سے ان کے دو کروں گے ان کی آؤں کے سامنے۔ اس کے بعد

عورتوں کی ہادی کٹنے کی اور اُدھے گھٹنے میں ہم سب لاشیں اس کوڑے پر ڈال کے آگ لگا دیں گے۔ بیڑا دل بھی ہے ہمارے پاس۔ اس وقت کون آئے گا بچانے تجھیں بلا لاشیں تو کسی کو بچانے سے پہلے ہی تل جلا جائیں گی اور جب تک آگ پھیل کر اس گھر کو اپنی لپیٹ میں لے گی اور فائر بریگیڈ پہنچے گا تب تک مرنے ہو جائے گی، یہاں کچھ نہیں ہوگا کوئی کہہ کر موتا بنے والا نہیں ہوگا کہ یہ سب کیسے ہوا تھا۔"

میں مطیع الرحمن کے جبرے کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ رہا تھا جب محسن جانے لے کر آیا تو مجھے اپنی کامیابی کا ناطقین ہو چلا تھا۔

"دو دن عورتوں کو لے آؤ اور سامنے باغ دو۔ ان کے منہ میں بڑے ٹھونس دو۔" انہیں نے سفاک لہجے میں کہا۔

"اور سب سے چھوٹے بچے کو لے آؤ۔"

مطیع الرحمن دھڑاڑ مار مار کر رونے لگا۔ "تم کو خدا رسول کا واسطہ۔ ایسا علم مت کرو مجھے اندھا کرو مجھے جڑوں میں اطمینان سے چائے پیتا رہا۔ محسن دو دن عورتوں کو ہیر و خولیں کر دیاں لے آیا۔ وہ چلتی پھرتی لاشوں کی طرح تھیں۔

اکرام شیخ ایک چورسات سال کے بچے کو اٹھا کر لایا۔ وہ مینڈے پوری طرح جاگا بھی نہیں تھا اور کچھ نیند سے جگائے جانے پر دوڑتا ٹھٹھکتا آ رہا تھا۔ کمرے کے اندر آ کے بھی وہ معصومیت سے ہم سب کو دیکھتا رہا۔ اس کے نزدیک یہ کوئی بد شہرت زدہ کرنے والا منظر نہیں تھا۔ اس نے فرش پر چڑھے ہوئے افراد کے بارے میں فرح کیا ہوگا کہ وہ سب سو رہے ہیں۔ وہ بے اختیار ماں کی طرف لپکا۔

اکرام شیخ نے اُسے پکڑ لیا۔ جان مروت میرے طرح تڑپنے اور بل کھانے لگی۔ مطیع الرحمن اپنے ٹوٹی ہوئی انگلیوں والے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کچن میں کوئی سلاح ہو تو بہتر ہے ورنہ کوئی نوکیلی چھری ضرور ہوگی۔ اسے جو لٹھے پر خوب گرم کر لاؤ۔" انہیں نے کہا۔

مطیع الرحمن کی مزاحمت دم توڑ رہی تھی۔ اُس نے مزاحمت آسان جانا تھا۔ یہ موت سے شدید تر عذاب تھا جس کا اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ تاہم ابھی تک وہ فرح اور محبت کی کش کش میں مبتلا تھا۔ ایک طرف اس کا عہد اور من تھا۔ اس کے نظریات اور عقائد تھے جو قربانی مانگتے تھے۔ اس نے کسی جذباتی لمحے میں یقیناً جان و مال کی

ہر قربانی دینے سے دریغ نہ کرنے کے عزم کا اعلان کیا ہوگا اور آج تک شاید اس کے ایمان میں خلل نہ پڑا ہوگا لیکن اب ایک باپ اور ایک شوہر کے جذبات اس کو رسوا کن شکست دے رہے تھے۔ ایک ایسی شہادت جس کے بعد وہ خوشی بھی کر سکتا تھا کیونکہ وہ وقت آنے پر بزدل ثابت ہوا تھا۔

محسن ایک نوکیلی سلاح کے ساتھ اندر آیا۔ اس سلاح سے شاید درجن یا پانچ دہائیہ کھولے جاتے ہوں گے۔ لانگ دیک کر لال تو نہیں ہوئی تھی مگر اس پر سے دہشت زدہ کر دینے والا دھواں اٹھ رہا تھا۔

"آخری موقع مطیع الرحمن! میں نے کہا۔" میں دس ملک گئوں گا۔ اس کے بعد یہ معصوم بچہ تمہاری سیاست پر قربان ہوگا۔ اس کی ایک آنکھ بے نور ہو جائے گی۔ ایک منٹ کے بعد دوسری۔"

ابھی محسن آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک کے بعد دوسری عورت کا سب تر پناہ چلنا ختم ہو گیا۔ مطیع الرحمن پاگلوں کی طرح بلبلائے لگا۔

"میں... میں بتاؤں گا... میں سب بتاؤں گا... اس کو جوڑ دو،" وہ سر کو اچھڑا دھڑکنے لگا۔ محسن پیچھے ہٹ گیا۔

"بولو... کہاں سے آتا ہے یہ سب لہجہ؟" "مکین سے نہیں۔ ہم خود چھاپتے ہیں۔" وہ بولا۔ یہ دو آدمی رائٹر ہیں۔ ایک ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات کا پروفیسر ہے جو بدھ مگر ہے۔ دوسرا کلکتہ سے آیا ہے۔ لاجپت رائے یہ انگلش کے ایک مشہور اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ انہیں ایک کے بلٹی سیل پرانے مغربی پاکستان کا شیروں گویا۔

اس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ ان دونوں یکنون کو کیسے ادائیگی ہوتی تھی۔ اس نے اپنے بارے میں اور دوسرے ساتھی کے بارے میں بتایا کہ وہ سیکشن افسر ہیں اور فوجی نقل و حرکت کے بارے میں اور اہم منشیات کے بارے میں فوجی ساز و سامان کی نوعیت کے بارے میں اور اہم منشیات خصوصاً خنزیروں کے بارے میں مفصل معلومات آگے فراہم کرتے تھے۔ تمام سرکاری دفاتر میں ہم خیال لوگوں سے رابطہ رکھتے تھے اور انھیں یہ لٹریچر فراہم کرتے تھے۔ ان کی مشینوں مختلف مقامات پر ہوتی تھیں جن میں سب سے عمدہ لیا جاتا تھا کہ وہ بنگلہ دیش بنائے گئے تھے۔ ان کے لیے جان و مال

کی قربانی دیں گے اور جس دن ان کی جدوجہد کامیاب ہوگی وہ مغربی پاکستان کے آقاؤں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے نکل جائیں گے۔ اس نے ہندوستانی فوج کے لوگوں سے رابطے کا ذکر بھی کیا اور بھارتی خفیہ پولیس "را" کا بھی جو انھیں فنڈ اور اسلحہ فراہم کرتی تھی۔ تاہم وہ کسی کے نام سے واقف نہیں تھا۔

جو تھے ملزم کا بیان ہم نے الگ لیا اور اس سے تصدیق ہوئی کہ مطیع الرحمن نے غلط بیانی نہیں کی تھی اور اسے جو کچھ معلوم تھا وہ سب بتا دیا تھا۔ اس کا بھائی پٹیل ہی مارا جاتا تھا۔ وہ دونوں حساس نوعیت کے ایک ادارے میں ٹائپسٹ اور اسٹینوگرافر تھے چنانچہ ہر قسم کی رپورٹ جو انھیں ٹائپ کرنے کے لیے دی جاتی تھی وہ اس کی ایک اضافی کاپی بنا لیتے تھے۔

میں نے جو تھے ملزم کا نقشہ بھی پاک کیا اور من سے کہا "اب ہمیں جلد از جلد نکل جانا چاہیے۔ مطیع الرحمن کو باہر ٹیکسی میں ڈالو۔"

"اور ان عورتوں بچوں کو؟" "انھیں جاتے وقت باہر نکال دیں گے۔" میں نے کہا۔ "فرح سے کوئی قریب لے آئے۔ اس میں سے کچھ بیڑا لے لیا جاسکتا ہے؟"

"کچن میں ٹیکسی کا تیل خاصی مقدار میں موجود ہے۔" محسن نے کہا۔

"بس پھر بیڑوں کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اے لے جاؤ اور ڈکلیں میں ڈال دو۔"

محسن نے اپنا کام بہت خوبی سے کیا نہیں نے اور شیخ نے اسی وقفے میں کچن سے مٹی کا تیل لاس کے اس لٹریچر اور لاشوں پر ڈال دیا دوسرے کمرے سے ہر آگ پکڑنے والی چیز ان کے اوپر ڈھیر کر دی جس میں سے ہر دے، فریج، کچن کے مینر وہ شامل تھے۔ آخری وقت میں ہم نے دونوں عورتوں کو باہر ساتھ لے کر لڑکے برائے میں لٹایا۔ رات کے تین بجے ہر طرف اندھیرا اور سناٹا تھا چنانچہ ہماری اس کارروائی کا شاہدہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک بچہ پہلے سے جاگ رہا تھا۔ باقی دو کو ہم نے کھینچ کر جگایا تھا اور ان کو ڈانٹ کر کہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس چپ کر کے بیٹھیں ورنہ ہم ان کے گلے کاٹ دیں گے۔ کوئی ہم ڈاکو ہیں۔ دونوں بڑے بچے نسبتاً سمجھدار تھے۔ انھوں نے چھوٹے والے کو بھی خاموش کر لیا۔

جب ہم اس تجویز کا ردی کے ایک ٹھکانے کو اور اپنے دشمنوں کی لاشوں کو آگ دکھانے کے فرار ہوئے تو ہماری ٹیکسی کے روانہ ہونے سے قبل ہی بچوں نے جینا شروع کر دیا تھا اور آگ کے شعلے کھڑکیوں سے باہر اور کھلے صحن کی طرف سے صاف نظر آنے لگے تھے۔ ہم نے ٹیکسی کی رفتار کو کم رکھا اور ایک ہلاک کا پتھر کاٹ کے پھر کھرے گھوڑے کو روک دیا۔ نواح میں آخری پھیل چکی تھی۔ گھر کی چھت کے نیچے بھی ہلائی کڑی کے شہر تھے اور کینوس کی چھت تھی جو اوپر کنویں چھت کی بدنامی کو بھی چھپاتی تھی اور گری کے آخر کو بھی کم کرتی تھی۔ ہر چیز آگ پکڑ چکی تھی اور شعلے چھت سے اوپر تک بلند ہو چکے تھے۔ کراچی میں مغرب کی جانب سے مسلسل چلنے والی تیز ہوا اس آگ کو بہتر کر رہی تھی۔

مطیع الرحمن کو ہم نے کافی دور آگے ڈکی سے ٹیم بے ہوئی کی حالت میں پرآمد کیا۔ محسن نے اُسے پچھ والی سیٹ پر ڈالا تو وہ شکست انگلیوں والے ہاتھ کی اذیت سے بے حال تھا اور بڑی طرح کراہ رہا تھا۔

"تم... تم نے جھوٹ بولا، دھوکے باز... تم نے ان عورتوں بچوں کو مار دیا۔" وہ بولا اور اس کے آس پاس بے اختیار رہنے لگے۔

"جھوٹ، بد عمدی اور بے ایمانی سب کچھ تھا اے ساتھ جائز ہوگا کیونکہ ہم اور تم دشمن ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمہ حال میں جنگ کے وہ اخلاقی اصول نبھاتے ہیں جو ہمیں ہادی برحق، خلفائے راشدین اور صحابہ کرام نے سکھائے تھے۔ اور جن کو فتح مکہ اور اس کے بعد ہر عسکری فتح کے موقع پر مسلمانوں نے کبھی پامال کرنے کی جرأت نہیں کی۔ عورتوں اور بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کو پیدائش امان حاصل رہی اور ان پر ہاتھ اٹھانا آج بھی ہمارا شیوہ نہیں تھا۔ بے ہوشی بچے بالکل محفوظ ہیں۔"

"میں جب تک انھیں دیکھ نہیں لوں گا یقین نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، والی میں تم ان کو دیکھ سکو گے۔" میں نے کہا اور پھر ہادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آخری بار۔" پہلے یہ بتاؤ کہ تمہاری فوٹو اسٹیٹ مشین شاپ کدھر ہے؟ محسن نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہا۔

"وہ... صدر میں... لیکن اُس کی چابی... اُس کے پاس تھی۔" وہ بولا۔ "جس کو تم نے مار دیا۔"

مجھے اس پر غصہ آیا جمیٹ وہاں نہیں بولا۔ مگر قصور میرا بھی تھا کہ میں نے اُس سے وہاں نہیں پوچھا۔ اب تک تو اس کی پتا بھی پٹنڈی ہو رہی ہوگی خیر ایک فوٹو اسٹیلٹ شین سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ شائع ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ جو لوگ جاسوسی کے اس ایکٹ میں شامل تھے وہ تو سب اپنے انجام کو پہنچے۔

”جلو اس پر اس کا راستہ بتاؤ۔ جہاں تمہارا لہجہ چھپا جاتا ہے“ میں نے کہا۔

”میں اُس کی ہدایت کے مطابق چلتا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ ہماری صحیح راہنمائی نہیں کر رہا ہے اور یہ شک مجھے ایک چوک سے دوسری باگزرنے کے بعد ہوا۔ میری جگہ اگر کم ریش ہو تا تو بہت پہلے تازہ ہوا مگر وہ پیچھے مطیع الرحمن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میں ابھی کو اپنی کسٹروں سے اتنا زیادہ آشنا نہیں ہوا تھا۔

میں نے ٹیکسی روک کے ریش کو آگے بلایا۔ گاڑی تم چلاؤ، یہ سو رکابچہ چکڑوے رہا ہے۔“

”اچھا، میں نے غور نہیں کیا ورنہ اسے جلیبی کی طرح سیدھا کر دیتا۔“ ریش نے میری جگہ بیٹھے ہوئے کہا۔ ”ہاں جی، یہاں سے مجھے سمجھا دو کہ کدھر جانا ہے بڑے مطیع الرحمن سے مخاطب ہوا۔“

”گاڑی میں پیڑول بھی ختم ہونے والا ہے۔“ میں نے کہا۔

”راستے میں لے لیں گے۔“ ریش نے کہا۔ ”بول بھی مٹر مطیع وہاں بروار۔“

”اُس نے کہا۔“ میں کچھ بھول گیا۔“

”ٹھیک ہے۔ تمہاری یادداشت ہم نغمی فارمولے کے مطابق سجال کریں گے۔ ایک مددے سے مچی، دوسرے مددے سے دالیں اگئی۔ چلو جیسی دالیں جلیں۔ اس کی فیملی کو بھی ساتھ ہی لے لیں۔“

”مٹر چکرم، تم ہی مدت سمجھو کہ اب وہ ہماری دسترس میں نہیں رہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے پاس تمہارا سہ ساتھیوں کے تین چتے اور بھی ہیں۔ ہم نے اُن کی فیملی کو معاف کر دیا تھا کیونکہ اُن سے ہمیں کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ تمہارا سہ بیوی بچے کل ہمیں اٹھنی کے گھر میں ملیں گے باؤن کے ذریعے معلوم مقرر ہو جائے گا کہ وہ کہاں گئے۔ پھر تم وہی دیکھو گے جو آج.... تم نے نہیں دیکھا اور تمہارا کیا ہے، اُن عورتوں کا کیا حال ہوگا جب...“

”جلو... میں بتاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے بعد تم مجھے بھی مار ڈالو گے۔ میں اپنے ہی بچوں کو تمہاری سفاکی سے بچانے کے لیے غدار کی سزا کا بوجھ اپنے معمر پر اپنے ساتھ لے جاؤں گا مگر کیا تم کسی طرح مجھے قتل کر سکتے ہو کہ... انھیں کچھ نہیں ہوگا۔“

”تم کو کس طرح یقین آ سکتا ہے؟“ میں نے بولا۔

”میں خدا کی اور اس کے رسول کی قسم کھا سکتا ہوں اور اس کے بعد اپنے ضمیر کی قسم کو سب سے بڑی قسم سمجھتا ہوں میں نے کہا۔“

اب اُس نے ریش کو بتا دیا۔ ریش کچھ دیر سر ہلاتا رہا اور پھر ٹیکسی کو دالیں موڑا۔ رات کے ساڑھے تین بجے ہر سڑک سنسان تھی لیکن کہیں کہیں ریسیورنٹ اب بھی کھلے ہوئے تھے۔ ہم ٹیلی ویژن اسٹیشن کے سامنے سے گزرے اور ایک پیڑول پمپ پر ذرا سی دیر کے لیے رُکے۔ زمین نے رنگائی کے منہ کو دبا کے رکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا اور یہ ایک ایسی غلطی تھی جس نے ہمارے لیے پریشانی پیدا کی۔ وہ اچانک چلانے لگا۔ ”مرڈر... مرڈر... سچاؤ۔“

پیڑول پمپ کا لازم جو بوز پمپ کو واپس پمپ پر لگا رہا تھا، ایک دم چونکا۔ پیڑول پمپ پر اور کچھ غلط دونوں پولیس مین ہل بڑا کے اٹھنے تو ان میں سے ایک کی رائلز گر گئی۔ میں نے فوراً صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر لیا۔ پیڑول پمپ کے ساتھ ہی نوٹاؤں کا پولیس اسٹیشن تھا۔ میں نے سب عادت ٹیکسی کا انجن بھی بند کر دیا تھا اور اپنے موزے میں سے پیسے نکال رہا تھا۔

جب ایک پولیس مین ”خبردار... خبردار! کرتا ہوا میری طرف لپکا۔ اب میرے سامنے ایک راستہ تو یہ تھا کہ میں انجن اسٹارٹ کروں اور فرار ہو جاؤں، لیکن اس میں خزان زیادہ تھے۔ وہ چپے سے خائز کر سکتے تھے۔ اُن کی انکارانہ اور دقتاؤسی رانظوں کو ڈاکو عموماً خاطر میں نہیں لاتے۔ پیکاس فی صدمہ کمانا تھا بھی یہی ہوتے ہیں کہ کوئی نہیں نکلے گی۔ پھر اونگھتے ہوئے محافظوں کا نشانہ بننے کے امکانات بھی فضفی ففضی تھے۔ پھر بھی رسک اپنی جگہ تھا چنانچہ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

میں اطمینان سے باہر نکلا اور ہاتھ اٹھا کے کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے سنتری صاحب؟ ہم کوئی بھلا گئے

میں ایک طرف سے باہر نکلا اور زمین دوسری طرف سے، پھر مطیع الرحمن باہر آیا۔ ایک فوری خیال کے تحت جس کو میں اپنی جھٹی جس کا معجزہ بھی قرار دے سکتا تھا، میں نے ہلٹ کے اُس کو دبوچ لیا۔ میں اُس وقت جب وہ پیچھے والا تھا اُس کی آواز میرے ہاتھ کے دباؤ سے ٹھٹ کے رہ گئی۔

معلوم نہیں وہ گولی کس سمت سے آئی تھی اور کس نے چلائی تھی لیکن میں مستعد نہ ہوا تو مطیع الرحمن مارا جاتا۔ گولی اُس کی ٹانگ میں لگی۔ زمین یا اگر کم ریش میں سے کسی نے جوابی فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی تین طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ پھر شب کے سکوت میں گونجنے والی گولیوں کی آوازیں کسی حاذیجک کا نقشہ پیش کرتی تھیں۔ اندر سے میں ہالے حریف کوئی نشانہ لیے بغیر فائرنگ کر رہے تھے جس سے ان کی ہڈیاں کا اندازہ ہوتا تھا۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خائف نہیں تھے اور انھیں ہمارے آنے کا پتا چل گیا تھا۔ مطیع الرحمن اب بے ہوش ہو گیا تھا اور مجھے اس کی جان چنی نظر نہ آئی تھی۔ وہ پہلے ہی نیم جاں تھا اور گولی گرنے کے بعد اس کے زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا مگر اسے روکنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

مراعت کرنے والوں کی قوت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ ابھی تک انھوں نے صرف دیواروں سے گولیاں چلائی تھیں مگر ان کے پاس مشین گن یا دستی بم بھی ہو سکتے تھے جب کہ ہمارے پاس بہت عموماً اسلحہ تھا۔ ہم تینوں کے دیوار اور اندھا دھند فائرنگ میں بہت جلد خالی ہو سکتے تھے۔

میں نے اشارے سے من کو قریب بلا کے اپنا ہلان بھایا اس نے ایک دھتک کی آواز سے من کے سامنے ہاتھ رکھ کے اعلان شروع کیا۔

”میں تم کو دس منٹ دیتا ہوں۔ مقابلہ بند کر دو اور خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ تم کو پولیس نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ تمہارا سر نہ مطیع الرحمن ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کے باقی ساتھی بیک لائن سے گرفتاری کے چاہتے ہیں۔ وہ سارا لٹریچر پکڑا جا چکا ہے جو تمہارے ساتھی تقسیم کرتے تھے۔ یہیں انھوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم لوگ مقابلہ کر کے تو مارے جاؤ گے۔“

میں آواز کو بہت بھاری جبرم اور بات دار بنا کے بول رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اعلان کا ایک ایک لفظ غور سے نہیں گئے۔ عام طور پر پولیس عمارہ کرنے کے بعد عموماً جرم کو ہی قسم کی وارننگ دیتی ہے۔ اگر وہ لوگ تیاری سے جائیں تو ایسے

اعلامات میگا فون پر نشر کرتے ہیں مگر عام حالات میں کوئی نئے دار
المنزوحی میگا فون بن جاتا ہے۔

مجھے اور اکرام شیخ کو پیچھے پیچ کر پوزیشن نبھانے کے لیے
اتنی صحت کافی تھی۔ محسن کی آواز ہم تک بھی بالکل صاف پہنچ رہی
تھی مجرم جو درمیان میں تھے اسے زیادہ واضح طور پر سن رہے
ہوں گے۔ میرے اور اکرام شیخ کے درمیان تیس گز کا فاصلہ ضرور
ہو گا۔ اس طرح اب ہم تینوں ایک ایسی منٹ کے تین کوٹوں
پر بیٹھے ہوئے تھے جس کے تینوں اصطلاح تقریباً برابر تھے اور
ہم اپنے دائیں بائیں اپنی دوسرے دیکھ سکتے تھے کہ چاروں طرف
سے کوئی بھی اس صدارت کو توڑ کے نہیں نکل سکتا تھا۔

چند منٹ کے وقفے سے محسن نے اپنا اعلان کر دیا اور اس
بار زیادہ تفصیل کے ساتھ اس نے مطلع الزمان کے ساتھیوں کے
نام اور پتے ٹھکانے بھی بتائے۔ یہ بھی بتایا کہ ان دونوں بھائیوں
نے وعدہ معاف گواہ بنا قبول کر لیا ہے جن میں سے ایک بھائی
صدا و صیانت کی فوٹو اسٹٹ لٹھیں بناتا تھا اور دوسرا پان کی دکان
چلاتا تھا جہاں سے ایک انگریز بچہ کبوتری رگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہے۔
اس دوسرے اعلان نے حضور مجرموں کا رہا سہا وصلہ بھی
ختم کر دیا وہاں کہ انھوں نے عقبی راستے سے نکل کر رات کے
اندھیرے اور جنگل میں گم ہو جانے کی کوشش کی ہیں نے ایک وقت
چار افراد کو دسے پاؤں اپنے اور شیخ کے درمیان سے گزر کے
فرار ہوتے دیکھا۔

میں نے نشانہ لے کر دو فائر کیے اور آگے دوڑنے والے
دونوں مجرم ایک پیچھے مار کے زمین پر گر پڑے۔ باقی دو رک گئے
اور انھوں نے رہنا کارزار طور پر ہاتھ اور پاٹھا دیے۔
"خبردار جگہ سے ہلنے کی ذرا بھی کوشش کی تو میں نے
گرج کے کہا۔

شیخ میری نظریے اور جھل تھا جب اس کی طرف سے ایک
فاخر ہوا اور گولی کا نشانہ بننے والے کی بھائی کاٹنے سانی دی
تو میں بھی گرا کر فرار ہونے والے دو گروہوں میں بٹ کے دو
مختلف سمتوں سے نکلنا چاہتے تھے۔

"ہاتھ اوپر..." اکرام شیخ نے دباؤ لگائی دی "ہاتھ نیچے
آیا تو اگلا سانس نہیں آئے گا۔"

دس منٹ کا وقفہ پورا ہونے سے پہلے ہی ہم ان سب
کو ایک جگہ اکٹھا کر چکے تھے۔ وہ کل پانچ آدمی تھے جو ہاتھ سر پر
رکھے تھے کہ کپ رہے تھے۔ ارتکاب جرم کے وقت ہر مجرم بڑی
بے غوثی کا اور حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتا ہے اور شاید یہی ہم سب کیوں
نہ ہو اسے رواں دواں رکھتی ہے مگر جیسے ہی وہ پکڑا جاتا ہے سزا

کا خوف اس کے اصحاب پر سوار ہو جاتا ہے۔
یہ پانچوں اب مقابلے سے بھی دستبردار ہو چکے تھے
خود کو بچانے دم و دم پر چھوڑ چکے تھے۔ میں نے ان کے
رہتے ہوئے انھیں آگے بڑھنے کو کہا۔ دائیں جانب سے
نے اور بائیں جانب سے شیخ بے حد قاتلانہ انداز میں انھیں
کی زد پر لیے رہا۔

وہ منہ صبح خانے کی جانب ہٹکے جانے والے کمر
پر حیلہ سے ہونے آگے پیچھے چلنے لگے اور ہمیں اس دھڑ
سمکھ لے گئے جہاں سے ایک زہر پیچھے جا رہا تھا۔ زہر
فٹو گرافز کے ڈارک روم کا سالن تھا۔ مکمل اندھیرے میں زہر
واٹ کے گھر سے سڑاؤ ٹھک کے ملک کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جہاں
میرے عیاض زیادہ بڑا سار نظر آتی تھیں۔

زہر کے آخر میں پھر ایک دروازہ تھا۔ میں نے گھر
کیا کہ یہ سب عامی انتقام تھا جو ضرورت کے تحت جلدی
کیا گیا تھا۔ چنانچہ اسٹریچر کی فرش پر قوت اور روایہ ضائع نہیں
گیا تھا۔ اس جگہ نہ خانے کی موجودگی کا کوئی حراز نہ تھا۔ اگر
عمل ہوتا یا قدیم عمارت ہوتی تو اس کے نہ خانے کو بھی ملاحظہ
رنگ سے متنبہ کیا جاتا اور بجلی کی تاریں بھی ایسے کشی ہوتی
چھوڑی جاتی۔

نیچے والا دروازہ کھلتے ہی میں نے اپنے سامنے ایک
ہال دیکھا۔ اس کے ایک حصے میں پرنسٹن کے دیوار کے مابین
ساتھ شیلٹ مٹیوں اور دیوار میں کام آئے والے کالہ
جھرسے پڑے تھے۔ وہیں دوسری طرف کپوریشن کپوریشن تھا۔ وہ
اپنا سارا لہجہ انگلش میں چلا جاتے تھے۔ ہال کا ایک حصہ کھلم
بائیں ٹھک کے کاموں کے لیے مختص تھا۔ ایک الگ حصہ ٹھیں بنا
اور پڑوس کرنے کا تھا۔ جنی دیر میں اکرام شیخ اور محسن نے مجرم
کی تلاش کی اور ان کے ہاتھ باندھے عاتقی دیر میں میں نے ان پر
اشامی ادارے کا جائزہ لے لیا۔ کہتے ہیں کہ آدھی فتح پر پکڑے
حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح ہماز جنگ پر کام آتا ہے۔ سیاہ
پر رائے عامر کی حمایت حاصل کرنے اور بین الاقوامی سطح پر دباؤ
امدادی حاصل کرنے کے لیے تحریک و تقریر کا ذریعہ بھی نوٹر ٹائپ
ہوتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کے رجحان کو دھڑکا
واہوں کے بھی دو دھماکے۔ ایک حماد پر دلا اور ایڈمنسٹری ان کی
مدد گار تھی اور وہ ملکی دفاع کو کمزور کر رہے تھے۔ دوسرا حماد
جس میں یہ نام نہاد وائٹ پریش پیش تھے جو اس تجویز کا کار
احساس غری کا روتھن "جنگ واپس کی تحریک کو آزادی کی جدوجہد

مذاہب کو مجاہد قرار دے رہے تھے۔ جو احتمال کا فوہ لگائے مظلومیت
کا دھندلا پیٹ کے اور جھوٹے اعدا و شمار پیش کر کے حوالم کو اور
عامی برداری کو گمراہ کرنے میں اپنی تمام تر ذہنی استعداد صرف کر رہے تھے۔
میں نے تاہم نے معصومہ کو بچے دیکھے۔ زیر تعینف کا بوں
سے سونے دیکھے اور وہ سب اخبار و رسائل دیکھے جس میں بیلا شائع
ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا کہ علیحدگی پسندی کی اس تحریک
سے پیچھے کتنے قابل رشک دماغ کام کر رہے ہیں۔ یہ دماغ اگر
قوی یک جہتی کو فروغ دیتے تو حالات مختلف ہوتے مگر ان کی
ملاوت کو فروغ دیا گیا تھا۔ بین الاقوامی سیاست کا اثر تھا کہ ایک
قوم کا حضور ایک تائید اور حقائق سے منکر ہو گیا تھا۔ لنگر اور برج کو
بدلی دینے والی یہ جنگ اسلحے کی اور طاقت کی جنگ کے ہیں زیادہ
مزدور سال اور خطرناک تھی۔ ایک گولی اگر ایک دشمن کو نہ مار گرتی ہے تو
ایک ہتھ نذر آنے والے جھوٹ پر مبنی پوسٹر میں ذہنوں کو سوسم کرتا
ہے اور انھیں صفت دشمنان میں شامل کر دیتا ہے۔ ہم اگر ایک گھر
تھا کہ تارے کو تو شہر انداز میں لٹھے جانے والے ایک پھنٹ سے
ایک آبادی میں نفرت پھیلتی ہے۔

پکڑے جانے والے سب مغلوں مشرقی پاکستان کے رہنے والے
نہیں تھے۔ ان میں دو مغربی پاکستان کے رہنے والے بھی تھے۔
ان میں ایک سرخ و سپید چرسے والا جوان آدمی بھی تھا
جس نے سہرے فریم والی بینک لگا رکھی تھی۔

"اس نے کہا "تم سکندر تخت ہونا ہے خدا کی فوجدار"
میں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ اس نام کی دہشت تم جیسے
ہر خدا پر قائم ہے۔ تم صورت سے تعلیم یافتہ اور آموہہ حال لگتے
ہو۔ تم کسی مجرمی کے تحت ان وطن دشمن عناصر کے ساتھ مل گئے۔
صرف پیسے کی خاطر؟ یہ تو مشکل ہے کہ تم نظریاتی طور پر ان کے
ساتھ اتفاق کرتے ہو؟

"نظریات نہیں سمجھتے ہوتے۔ کتابی باتیں اور اصولی۔ سب
آدھی کو خوار کرتے ہیں۔ وہ قحطی سے بولا "زندگی کو معرفت پیدا کرنا
ناتا ہے۔"

"تھانے پیسے پیسے ہی یہ شکل بھی پیدا کی ہے کہ آج
میں تم کو عام بھائی شیخ کے لوگوں اور خداؤں کی صف میں دیکھ رہا
ہوں " میں نے کہا۔

وہ قحطی سے سکھایا جب میں مجرب وطن اور اصول پرست
بنا تھا تب بھی یہی ہوا تھا جو سلوک تم میرے ساتھ کر کے وہی
پہلے میں ہوا تھا۔ اگر مجھے حب الوطنی کی سزا مل جاتی تو میں اسے بھی
کافی سمجھا اور میں ہوتا مگر میں نے اس کا بہت نقصان ہوا تھا۔
آج میں ایسا ہی نہیں "میرے جیسے ان گنت تعلیم یافتہ اور باخیر

لوگ ایسے ہیں جو تمام اقدار سے محروم ہو چکے ہیں۔ وہ مجرمی حقوق
نظام انصاف۔ چار آف بیرون راض۔ آئین جواں مردان حق
گوئی دے باقی اور اقبال کے فلسفہ خودی سے لے کر قائد اعظم کے
فروشات تک سب کو مسخوش شدہ نوٹ کی طرح ہے۔ کار اور بے صرف
بگھٹے ہیں۔ سکھ رائج الوقت پچھ اور ہے جس نے مجھے فریاد کیا۔ یہ س
سای عمر کے فلسفہ کو اور میرے نظریات کو خیرہ لیا۔ اب تم مجھے
جو سزا چاہے دو۔ مجھے مرنے کا بھی انھیں نہیں ہوگا کیونکہ میرے
بعد میرے اہل خاندان کے لیے زندہ رہنے کے وسائل بہت ہیں۔
مجھے اس شخص کی ذہنی شکست اور افواہات پر انھیں ہوا صلہ
نہیں کس عادت نے اس کی سوچ کی راہیں بدل دی تھیں۔
"تمھارے ساتھ جو کچھ ہوا " کیا اس کے ذمے دار عوام تھے،
یہ ملک تھا؟ " میں نے کہا۔

"عوام " وہ زہر پھر سے مجھے میں بولا " کہاں ہیں وہ
عوام جن کو تم اس ملک کا شہری کہتے ہو اور وہ ملک کہاں ہے
جن کا ذکر کٹن میں تھا۔ تو ارادہ مقاصد میں تھا۔ جو قائد اعظم نے
بنایا تھا اور علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر تھا۔
"مجھے حیرت ہے کہ تم ساخو آدمی..."

"رہنے دو یہ طفل استیلاں۔ مجھے بہت ملال ہے اپنے باشعور
ہونے کا۔ کاش میں بے شعور ہوتا۔ پھر یہ طعن تو نہ سنتا اور میرا
شعور میرے لیے بار ملک تو نہ ہوتا۔ وہ نفرت سے بولا " تم
نے کچھ نہیں دیکھا مگر نہ رنجت۔ تم نے تو قانون اپنے ہاتھ
میں لے لیا ہے نا؟

محسن اور شیخ بھی سب سن رہے تھے۔ ان کی طرح میں بھی
سچ کا یہ زہر پیچھے پر مجبور تھا۔ بے شک حالات کچھ لوگوں کو مجرم
بنادیتے ہیں۔ سب سنا رہے ہیں ہوتے کہ خوشی خوشی زہر کا پالہ لپی
لیں۔ رشتوں کی جذباتی زنجیریں بکڑا ہوا آدمی تو بہت کمزور ہو
جاتا ہے۔ یہ پروفیسر قابل رحم مزدور تھا۔ اس کے جرم کی گنجی ان
حالات کے تناظر میں کمزور ہوا جاتی تھی تم نہیں ہوتی تھی۔

"مجھے انھیں بے پروفیسر صاحب اگر تم ہار گئے تم نے
اپنی اخلاقی شکست تسلیم کر لی۔ میں نے کہا "عوام کچھ بھی ہوں،
تم خود فیصلہ کرو کہ تم مجرم آج ہو یا پہلے تھے؟ وقت کو "مورخ
کو اور نظام انصاف کو چھوڑو۔ اپنے منہ سے پوچھ کے مجھے بتاؤ:
"میرا کوئی ضمیر نہیں۔ اسے میں بہت پہلے متل کر کے اس
کی لاش بھی بچ چکا ہوں " وہ بولا " اور فیصلے کو ہمیشہ خارج کرتے
ہیں۔ افراد کے اقوام کے اور تاریخ کے فیصلے انھی کے ہاتھ
میں رہتے ہیں۔"

"دوسروں کو الزام مت دو " میں نے کہا " آج کے دن

کا فیصلہ خود تم نے اس وقت تحریر کر لیا تھا جب تم نے اپنی شکست قبول کی تھی۔ پھر بھی جیسے عدالت کسی مجرم کو سزا دیتے ہوئے حالات سے صرف نظر نہیں کرتی ایسے ہی میں بھی تمہیں فوراً سزائے موت نہیں دے رہا ہوں۔ تمہارے کیس پر ہم سب غور کریں گے۔ تم ادھر آ جاؤ۔

پروفیسر نے کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے باقی چاروں ساتھی اسے کینہ پرور اور جارحانہ نظروں سے گھور رہے تھے۔ مغربی پاکستان کا دور باہمی البتہ پرکھ کر نظر آنے لگا تھا۔

”عرض یہ ہے“ اس نے بڑی لمبا جھٹ سے کہنا شروع کیا کہ ”عرض مذدوی کی بھی جلی جانے“

”یہ سالہ مذدوی کون ہے؟“ میں نے کہا۔

”جی... وہ... میں... اس نے گڑبڑا کے کہا... میں... کتنا یہ چاہتا تھا کہ آپ رحمدلی اور مغف و درگزر سے کام لیں۔ دراصل یہ حالات ہی ہوتے ہیں...“

وہ ایک چالاک آدمی تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ پروفیسر نے کس طرح اپنے حالات کا حراز پیداکر کے ہم سے رعایت حاصل کر لی تھی اور شاید اتنی دیر تک وہ بھی اپنے لیے مناسب حالات گھڑنے میں مصروف رہا تھا۔ اس نے خاصے رقت انگیز پیرائے میں ایک دردہری کمانی سنائی جس کا مکرزی خیال کی حد تک پروفیسر کی مرکز شکت سے ملتا جلتا تھا۔ پس اس نے اپنا بیٹا بدل دیا۔ اس نے کہا ”جناب میں پولیس افسر تھا۔ میرا قصور یہ تھا جناب کہ میں رشوت نہیں دیتا تھا اور دوسروں کو بھی حرم حلالنے سے روکتا تھا کیونکہ جناب آخر ہم مسلمان ہیں اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو تمہیں بھی دکھانا ہے مگر جناب زمانہ ایسا ہے کہ نیکی کرنے والا ہی بُرا بن جاتا ہے۔ چنانچہ مجھے ہی بدخواہوں نے مجرم بنا دیا۔ میرے خلاف پورا حکم ہو گیا جناب مگر ہم درخواست انھوں نے پبلک سے دوائی کہ یہ شخص رشوت خور ہے۔ میں اور رشوت! نفوز بالظلم! لیکن اس دھاندلی کے دھڑ میں شریف آدمی کی شنوائی کہاں ہوتی تھی جناب! مجھے تحقیقات کے بغیر ہی رطرف کر دیا گیا۔ میرا قصور یہ بھی تھا کہ میں نوکرائی کے ظالمانہ رویے کی حمایت نہیں کرتا تھا۔ مجرموں کی پشت پناہی نہیں کرتا تھا اور بے گناہوں کو جیل میں نہیں ٹھہراتا تھا۔ کئی بار میں نے بے گناہوں پر لاشی چارج کرنے سے انکار کیا۔ کیونکہ جناب عوام کی آواز کو طاقت سے نہیں دیا جاسکتا اور جو کام پبلک جنت کے لوگ سے ہو جائے، اس میں تشدد سے کام لینا کوئی اچھی بات تو نہیں جناب“

”بالکل بالکل جناب“ میں نے سر ہلا کے کہا ”تم بہت کرتے ہو گے کہ جب کوئی چور پکڑا جاتا ہوگا تو تمہارے میں اس کی خاطر تواضع چاہئے اور ایک سے کرنے کے بعد پوچھتے ہو گے کہ بڑا پیسہ بچا دو کہ تم نے چوری کی ہے؟ اور جب وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے پچ بول دیتا ہوگا کہ میں نے فلاں فلاں واردات کی تھی تو آپ پیار سے اس کے چپٹ لگاتے کہتے ہوں گے جناب کہ بھلا ہو گا۔ آئندہ مت کرنا ایسی حرکت۔ چوری کرنا بڑی بات ہے“

”اور جناب کوئی قتل کا مجرم لایا جاتا ہوگا یا میں نے پیری بات آگے بڑھائی۔ تو آپ اسے پرن میں پکڑیں بریلی اور قور کھلنے کے بعد اس کی پیچھے پڑھیں دیتے ہوئے کہتے ہوں گے کہ بھلا ہو مجھے بتا دو کہ تم نے اپنی بڑی کو کیوں قتل کیا اور کیسے کیا۔ اور جناب جب وہ اعتراف جرم کر لیتا ہوگا تو آپ اسے بھی نصیحت کر کے رخصت کر دیتے ہوں گے کہ پھر مت کرنا ایسی حرکت۔ جاؤ ددوی شادی کی تیاری کرو“

وہ محسن کی طرف ہٹا ہٹا کھڑا دیکھ رہا تھا اور مجھ پر چکا تھا کہ اس کا جھوٹ نہیں چلا۔ میں نے اسے اچانک آڑے ہاتھوں لے لیا۔ میں نے اسے بڑی بے رحمی سے مارا کتے مار مارا کے میں نے اس کا چہرہ بگاڑ دیا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے اور ناک سے خون بہنے لگا۔ وہ بہت چلا کر جناب مجھے معاف کر دیں۔ مگر میں نے اسے اٹھا اٹھا کے دیوار پر مارا فرش پر پڑا اور اس کو ٹھوکوں مار مار کے اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی۔ اس کا پیچھا چلانا، بجلانا، امت ساجت کرنا اور گالی گلوچ کرنا سب رنگاں گیا۔ چند منٹ میں وہ آدمی کی جگہ ایک ٹوٹا چوٹا، خستہ حال اور لمبا آؤٹیم جاں لاشہ رہ گیا۔

پروفیسر نے میرے زچمل کو خاصی حیرانی اور ناپسندیدگی سے دیکھا لیکن وہ خاموش ٹھہرا۔ بیٹوں بنگالیوں کی حالت اتنی اہتر ہو گئی کہ ان میں سے ایک تو بیچ گیا۔ وہ لرز رہا تھا اور اچھے انجام سے اتنا خائف تھا کہ اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ اس نے اپنے کپڑے ہی خراب نہیں کیے تھے فرش پر بھی غلاظت پھیلا دی تھی۔

میں نے محسن سے کہا ”جناب کو ہمارے جاؤ۔ دیکھو“

مطیع الرحمان زندہ ہے یا مگر کیا زندہ ہو تو جناب کے کندھوں پر اٹھا لاؤ“

محسن نے جناب کو ایک جھگے سے پیروں پر کھڑا کر دیا اور گھسیٹا ہوا باہر لے گیا۔

میں نے باقی تین بنگالیوں میں سے پہلے کو مخاطب کر کے

کہا ”تم میں سے جو زیادہ قیادون کرے گا، وہ رعایت کاستحق ہوگا۔ پروفیسر نے پچ بولنا تھا ”اسے رعایت مل گئی لیکن دوسرا شخص جھوٹ بول کر نہیں بے وقوف بنا چاہتا تھا۔ اسے ہم میں ذہن کر جائیں گے۔ پچ بولنے والے کے لیے مفید دفعتی چانس ہے کہ اسے نکل جانے کا ایک موقع عطا کر دیا جائے“

”ہم... ہم... تمہارے گا... جو ہم جانا ہے“ وہ بولا۔ اس کے ساتھی نے بنگالی میں بولنا شروع کیا۔ اس کے لیے سے صاف بتا چنا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کو اس کی بزدلی پر راور خود غرضی پر شرمندہ کر رہا ہے۔ ایک غدار کا ایمان کچھ نہیں ہوتا۔ وہ لاپٹ میں وطن کا غدار بن سکتا ہے تو خوف کے تحت اپنے ساتھیوں سے بھی غدار بن سکتا ہے۔ وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے۔ یہ اس کا مسک نہیں ہوتا۔

جب محسن اندر آیا تو جناب نے مطیع الرحمان کو کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ مگر اس بوجھ کے ساتھ چلا بھی جناب کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ مطیع الرحمان کے ساتھ ہی فرش پر گرا کر گر پڑا۔ اٹھ کے دوڑا بیٹھا۔ میں نے کوئی سوال کیے بغیر مطیع الرحمان کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ وہ بے رحمی میں ہی تڑپا اور سناٹ ہو گیا۔ دراصل مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ مطیع الرحمان اب نفوذی دیر کا مکان ہے۔ میں نے اسے مار کے ایک نفسیاتی فائدہ حاصل کیا۔ اس کے دماغ سے اُڑنے والے خون اور مغز کے جھینٹے جناب پر پڑے اور وہ دہشت سے پاگل ہو کے بھاگا۔ میں نے اس کا بھی نشانہ لیا اور اگلے لمحے وہ دیوار سے ٹکرا کے گرا اور فرش پر پڑا۔ لڑکھٹنے لگا۔ یہ دونوں قتل میں نے بڑے سکون سے کیے تھے کسی تیاری اور تذبذب کے بغیر۔

آپس میں جھگڑنے والے بنگالی سہم کر خاموش ہو گئے تھے۔ پروفیسر کی نظروں میں خوف سے زیادہ نفرت کے جذبات نمایاں تھے۔

”ہاں۔ تو تم کیا جانتے ہو؟“ میں نے بنگالی سے مخاطب ہو کر کہا۔

اس نے بہت مفید معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ہماری راہنمائی بھی کی۔ مثلاً اس نے ترخانے میں ایک غیر راستہ دکھایا جس کا ہم سراخ نہیں لگا سکتے تھے۔ اس میں ایک باقی باور ڈھنڈھ نصب تھا۔ اس کے اندر دیوار میں نصب الماری کئی ٹوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس بنگالی نے یہی ہمیں تمہوں والے تالے کو کھولنے کا طریقہ بتایا۔ الا محسن پاکستانی اور انڈین کرسی کے ساتھ ڈال دیے گئے اور یہ رقم ان سب کو ادا کی گئی کہ یہ تھوڑی سی نفی جو لڑائی کا فائدہ دے گا اسے ملے گا۔ اس کی تحریک میں شامل تھے۔

”نار تو میری عالمی کرسی تھی، پاکستان کے دونوں حصوں میں ہر قسم

کی وطن دشمن مرکزیموں میں طوٹ افراد کو پاکستان کی کرسیوں ادا کی جاتی تھی۔ انڈین کرسی کی ہر جگہ موجودگی یہ ثابت کرتی تھی کہ مغربی بنگال کا زندہ ویلنگڈ کی پسندی کے اس رجحان کی حوصلہ افزائی میں کس حد تک پیش پیش ہے۔ مجھے چالیس چھک ایسے طے ہو گئے کہ مختلف ٹیکوں کے تھے۔ باہج ہزار سے پچاس ہزار تک کی مالیت کے یہ چیک دستخط شدہ تھے مگر ان پر تاریخ نہیں ڈالی گئی تھی۔ یہ سب، نیز چیک تھے اور کسی کو بھی دیے جاسکتے تھے کہ وہ نقد رقم لیتے ہوئے ڈرتا ہو تو یہ کاغذ کا پرزہ لے کر لگتے چلا جائے اور کیش حاصل کر لے۔

مجھے ایک ڈائری بھی ملی جس کے سب اندراجات بنگالی زبان میں تھے۔ اس میں ناموں اور پتوں کی ایک طویل فہرست تھی۔ اس کے علاوہ ادا کیوں کا حساب تھا۔ بنگالی نے بتایا کہ یہ ان لوگوں کے نام ہیں جو مغربی پاکستان بھارت اور شرقی پاکستان میں مددگار شہرت ہو سکتے ہیں۔ پناہ فراہم کر سکتے ہیں اور تحریک کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان سب ناموں اور پتوں کو اردو یا انگریزی میں منتقل کرنا ایک لمبا کام تھا چنانچہ میں نے ڈائری کو بغیر حفاظت اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اب صبح قریب تھی۔ ہمارے لیے یہاں زیادہ وقت گزارنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ باہمی مشورے سے ہم نے ایک انفرمل مرتب کر لیا۔ بیٹوں بنگالیوں کے لیے سزائے موت پر ہم سب کا اتفاق تھا۔ اگر ہمارے پاس پریشک پریس اور خفیہ ٹھکانے کو بناہ کرنے کے لیے کچھ ہوتا تو ہم اسے ایک دھماکے سے اڑا دیتے، سب دشمن جو انداز اور باہر تھے ساتھ ہی فنا ہو جاتے۔

اکرام شیخ نے ایک زیادہ مؤثر اور مفید طریقہ بتایا۔ ان کیوں نہ یہ مال غنیمت حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔

”وہ کیسے؟“ محسن نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

”بھئی ایک فون کر کے شیر وانی صاحب...“ میں نے کہا۔

گننام رہ کے ہم پہلے بھی نیک کام کرتے رہے ہیں اور فون کرنے کا آلہ ہمارے پاس ہے۔

”فون نمبر کس کا ملائیں گے؟“ آپ نے پوچھا ”آئی کی جیب کے گھر کا۔ وہ اس وقت خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے۔“

”تو پکڑا جائے گا کسی دن“ اکرام شیخ نے افسوس سے سر ہلا کر کہا ”آئی جی صاحب کو خرگوش کتنا ہے؟“

”کو تو اب شہر پر الزام لگا تا ہے نا بکا کہ وہ سو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اتنے بڑے افسر کو کم سے کم اوٹ کے برابر تو بھجنا ہی

”اور اگر ہم نے فیصلہ اسی وقت نہ کیا، عمن نے کہا۔
تو یہ لوگ اور ان کی ہشت پناہی کرنے والے ہاتھ تھکے
نظام انصاف کو خرید لیں گے۔ ناکارہ بنادیں گے۔“

”تم لوگ باہر جاؤ“ میں نے جانے جاتے چلا کر کہا۔
 پروفیسر تہ خانے سے بھی نکل چکا تھا۔ میں نے اسے
 دیکھا تو وہ آخری دروازے پر تھا۔ میں نے اسے آواز دی کہ
 پھر گولی چلائی۔ اس نے اوپر سے ایک بھاری پتھر اڑھکا دیا۔
 کئی من درزی چٹان کا ٹکڑا اٹھا اور شاہید اور ولے دروازے کے
 قریب ہی موجود تھا کہ پروفیسر کو فوراً زخمی کر گیا۔ زندگی کے دانا

دیکھنا! تم اے لے کر نیکی تک چلو۔ میں نے آگے
نکلنے ہوئے کہا: میں ذرا اس پرو فیسر سے ٹٹ لوں گا
باہر خاصا اٹھال تھا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔
لیکن پرو فیسر اس ملت سے فائدہ اٹھانے کے نکل گیا تھا۔ میرے
چاند طرف بھاڑیاں تھیں اور پتھر ملی چٹانوں والی زمین تھی۔

میں واپس آیا تو عنمن اگلی سیٹ پر سر کو تہچھے رکھنے
آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا۔ اکرام شیخ نے نیکی اشارت

6'

6'

”جو سیٹیاں میرے کانوں میں بچ رہی ہیں، میں نے کہا:“

ہوئے۔ ریڈیو مارک کی حصص ماریکیٹ سے کلکتہ کے قحبہ خانوں تک

”اسے تو میں بتا دوں گا کہ کافذات شہر پر روگئے ہیں اور ہم وہی

لینے ہا ہے میں مگر تھا ایہ ساعلی رشوت مانگے ہے، پانچ سو ڈالر۔ ہم پاپس کے پاس جانا پسند کریں گے اور اس بدعاشی کی پورٹ کونسلٹ کو بھی دیں گے۔ دیکھنا اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ میں نے کہا: لوگزی کے لئے پڑ جائیں گے۔

میرے مقابل کھڑا ہوا شخص دو فٹ غلط چوکا، ایک پولیس کے نام پر اور دوسرے کونسلٹ کے ذکر پر دھڑکے دوسرے اس کا ماتحت ایک اور شخص کے عہدہ آؤ دکھائی دیا۔

”اوکے“ ٹوٹتی خامیوں ڈالر یہ وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ایک قراب میں سے ڈالر نکالے اور اسے پانچ پانچ ڈالر کے پانچ نوٹ تھا دیے جو اس نے بڑی صفائی سے جیب میں ڈالے اور اس عمل میں اتنی بیڑنی دکھائی کہ زمان صاحب کو قریب آجائے کے کا جو دو کا پتا نہ چلا۔

”کیا ہو گیا جی؟“ اس شخص نے قریب آکے کہا جو فروغ جانتا تھا اور زمان صاحب کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

”کچھ نہیں“ یہ فرانسیسی تیار ہیں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں شاید یہ لوگوں کے بارے میں... رشوت خوردہ بات ختم کرنے کے لیے مسئلہ پیدا کیا۔ لیکن زمان صاحب بھی اسی تالاب کی چھلی تھے اور اتنی آسانی سے نہیں مل سکتے تھے۔

”اس شخص نے آپ کو لوگوں کو پریشان تو نہیں کیا؟ وہ زمان صاحب نے فرانسیسی میں سوال کیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا: ”اس شریف آدمی نے تو چارہ دہکے کے آپ کو بلایا ہے۔“

”آپ بتائیں کہ کم کرنا کچھ کس کس پوئل میں قیام کریں جس میں فروغ شراب اور لڑکی آسانی سے اور سی لی جاتے“ عمن نے کہ زمان صاحب خاصے مایوس ہوئے۔

”میں کوئی پوئل گا نہیں ہوں“ وہ بے زحی سے بولا ”اور تم سے شریف آدمی کہہ رہے ہو یہ ایک نمبر حرام خد ہے تم نہ جانے کیسے بچ گئے روزیہ تو اپنے باپ کو نہ بخشے“

”کوشش تو اس نے کی تھی مگر ہمارے پاس تمام دستاویزات ہیں اور ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔“ میں نے کہہ

اجانک میں نے لوگوں کے درواں دواں جھوم میں ایک اشتنا چہرہ دکھا۔ یہ دوست محمد کا چہرہ تھا جو ایک پراسرار شخصیت رکھتا تھا اس کو راجعہ نے اپنا محافظ اور مددگار قرار دیا تھا مگر وہ چاند بھائی کا بھی معتد خاص تھا چاند بھائی کی شخصیت مجھے سننا زحمت میں نہیں تھی۔

غلے کرنے سے قاصر تھا کہ راجہ کو اپنی تحویل میں رکھنے پر کیوں ہند ہے۔ اس لیے کہ وہ راجہ کی چاہت میں گرفتار ہو گیا ہے؟ یا بیچ بیچ دلاور اینڈ بھائی کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ راجہ اس کی قید میں

ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جہاں ساعلی ہے یا نہیں دوست ہے یا قریب۔ اس نے سامنے آئے بغیر ہار کی مدد کی تو اس کا مقصد یہ تھا۔ یہ مقدمہ ایک نئی پڑی تھا یا اس کے کسب پر ذاتی مفاد تھا۔ اگر وہ ہمارے مقاصد سے اختلاف نہیں رکھتا تھا

پھر لاؤریشیہ شخص کے ساتھ کاروباری مراعات کیوں رکھتا تھا۔ یہ ایک الزام تھا جس کا پہلے میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن تحقیق میں موت اور ناک میں کا جذبہ دیکھ کر میں اپنے خیالات بدلنے پر مجبور گیا تھا۔ اگر ایک ڈاکو غیبی دین ہو سکتا ہے تو ایک سنگسار کو بھی نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے یہ نامک نظر نہیں آتا تھا کہ چاند بھائی کے کاروباری تعلقات دلاور سے ہوں لیکن وہ دلاور کے ملک دشمن عزائم میں شریک نہ ہو۔

دوست محمد ایک کرولی کی بیٹی پر ہانگن لڑکے سے بڑھا ہوا تھا آتے جاتے بہت سے لوگ اس سے دعا سلام کر جاتے تھے۔ نصف صدی انہی لوگوں میں گزارنے کے بعد وہ مایوس تیار ہوئی لیکن جو ہم

قسم کے جہانزیں بالاجوں کے علمے اور ہندو رگہ کے علاقے میں کام کرنے والوں کے لیے امینی نہیں رہتا تھا۔

میں نے زمان صاحب اور ان کے ساعلی کو جاتے دیکھا اور اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ وہ ایک عارضی تیرنے کے پیچے

غائب نہیں ہو گئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہمیں دوست محمد سے بات کرتا دیکھیں اور بعد میں دوست محمد کے پیچھے پڑ جائیں کہ وہ

فروغ ساجوں سے کیا بات کر رہا تھا جس نے دوست محمد پر بھی دگاہ رکھی کہ کہیں وہ اپنا ایک اٹھنے کے نہ چل پڑے

دوست محمد ایک سے عیوں والے دواور کو اپنے مقابل دیکھ کے حیران ہوا جو غیر ملکی نظر آتے تھے۔ دوست محمد کے پاس کڑا

ہوا ایک نوجوان لڑکا ہنسنے لگا۔

”استاد“ ابھی یہ کیسا کارٹون آتا پڑا ہے باہر سے۔“

”یہ بچی ہیں“ دوست محمد نے اسے کھجایا۔

”ایک مالک بھولا ڈاڑھی، اتنا مال مال یہ بقیہ لوگ ہے استاد“ اجمل کا کامیہ نہیں ہے؟ لڑکا بولا: ”سالہ کیسا بدعاش لگا ہے دو دنوں، جس مرس کا بات کرے گا“

”دوست محمد“ میں نے آرام سے کہا: ”کیا حال ہے؟“

دوست محمد تو حیران چوکا مگر وہ لڑکا اس طرح اچھیں پڑا ہے اس کو بھڑنے کا ٹالیا جو کچھ کے بغیر وہ رفو کچھ ہو گیا۔

”تم... سکندر ہے؟“ دوست محمد نے عقوڑا سا غور کرنے کے بعد کہا اور پھر عمن کی طرف دیکھا۔

”ہاں، میں عمن ہوں۔ تم نے کیسے پہچانا؟“

”تھراؤ آواز سے“ دوست محمد بولا۔ ہم سکندر کا دگ ہے

مدون کو بھی آواز سے پہچانتا ہے۔ طوفانوں کو بھی۔ آواز شفا ہے اور بتاتا ہے کہ ان میں خرابی کیا ہے۔ آواز سے ہم سکندر کا سب حقوق کو پہچانتے۔ تم تو اسان ہے بابا۔“

چاند بھائی کہاں ہے دوست محمد؟ میں نے اس کی خورستی کو نظر انداز کر کے کہا۔

”ابھی یہ کیسا سوال ہے۔ ہم کیا چاند بھائی کا سیکریٹری ہے؟“

”تم سیکریٹری سے زیادہ ہو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”تم اس کے دوست ہو۔“

”چلو بابا“ دھر کون کس کا دوست ہے۔ سب یا مطلب کا ہوتا ہے... چاند بھائی، سورج بھائی... وہ بلاوجہ ہنس پڑا تب مجھے اندازہ ہوا کہ اس پر تھوڑا سا شرف غالب ہے۔ اس نے شراب یا چرس بھری سگریٹ لی تھی۔ مجھے وہ کچھ بیار اور کڑو بھی لگا اس کی شبیہت بڑھی ہوئی تھی۔ سفید ہال اس کے کرخت نقوش والے سیاہ چہرے پر بد نما لگتے تھے۔

”دوست محمد! اگر تم شرافت سے نہیں بتاؤ گے...“

”ارے باؤنی، بڑا شرافت مراقت کا بات کرتا ہے، وہ چلاتے لگا۔ تم سالہ بڑا شریف ہے“

دی لڑکا دھلنے کے دھر سے دوڑتا ہوا آیا: ”اے استاد ابھی چلوں میرا ساتھ۔ ایک کام ہے“

”چن دھر سے...“ دوست محمد نے اسے گالی دی: ”ہم سے اہم کا بات کرنے کے تو تیرا فوٹو لگا ڈیو کا سالہ...“

”استاد، کام نہیں کریں گا تو... بڑا کیسے ہوئیں گا۔ لڑکا دھلی لہجے میں بولا: ”آخر تک میں نہیں کریں گا کام؟ یہ نشہ مجھے کیسے ہوئیں گا کھائیں گا دھر سے؟“

”میرے کو کام ہے کا کچھ ہے...“ دوست محمد نے اس ایک اور گالی دے کر کہا۔

”استاد، تم کو کچھ ہے۔ کب سے کام نہیں کیا تم... تمھارا بوسہ نقصان ہو گیا۔ دوسرا لوگ تمھارا کام لے لیا۔ ابھی جو کام ملتا ہے تم نہیں کرتا۔ وہ جی پی تم ہو جائیں گا پھر کوئی انہیں پوچھے گا تم کو،

ایسا تم کھوکھو کا دنیا کا دھندہ تمھارے بغیر نہیں چلے گا۔ سب بھلیں گا اس کو کام نہیں کریں گا کسی کا یہ تم کیا کریں گا جیکب انجین کا؟“

دوست محمد مشتعل ہو کے اٹھا: ”تیری...“ وہ جھجکے بولا۔

”کچھ بھائی کریں گا تم کون ہے سالہ؟“

”ہم بیٹا ہے تمھارا تم خود بولا۔“

”بھگ! ہا... دفع ہو جا...“ دوست محمد نے مارنے دوڑا۔

”سالہ! اپنا لڑا اپنا نہیں پھر کر کیسے ہوتا ہے کہ میرا بیٹا ہے؟ اس لیے کہ بھگ! تمھارے ماما کو وہ لڑکا بچ کے قرار ہو گیا۔ مجھے دوست

کی یہ حالت دیکھ کر انہوں ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کتنا اچھا ایکٹنگ ہے اپنی مدد اور تجربے سے فائدہ اٹھا کر وہ بہت کم رہا عقابین اب شاید نشے کی حالت میں وہ خود کو تباہ کر رہا تھا۔

”سیدھے سکندر ابھی تم کو ایک بات بتائیں گا؟“ وہ پھر اس خطرے پر بیٹھ گیا: ”تمھارا مطلب کا بات ہے مگر ایسے نہیں بتائیں گا۔

پسیدہ دس گز تو بتائیں گا۔“

”کتنسا پسیدہ چاہیے تمھیں دوست محمد؟ میں نے کہا۔

”کتنسا ہے تمھارے پاس... ہلو سو سے دو... وہ بولا۔

”صرف سو؟“ میں نے خیرانی سے کہا اور اسے سو کا نوٹ تھا دیا: ”بات بتاؤ۔“ وہ مجھے ایک دیوان گوشے میں لے گیا۔

”تمھارا وہ دلبر جوانی ہے؟“ راجہ... وہ ہم کو ملا تھا۔ دوست محمد نے نوٹ کو سختی سے ہانکے کھ دیتے ہوئے کہا۔

”میرا دل سینے میں اچھلا۔“ راجہ... راجہ دل بھی تم کو... کہاں... کب؟“

”کل... نہیں... پرسوں... ہاں پرسوں... وہ سچ کے بولا۔

دوختہ دیواروں کے درمیان کھڑا ہوا وہ مجھے ایک بدروح لگا۔

”میں...“ وہ نفی میں سر ہلایا: ”یہ ہم نہیں بتائیں گا کہ وہ کدھر تھا... لیکن ادھر نہیں...“

”اکیلی آئی تھی وہ...“ میرے صبر کا پیمانہ پھٹنے لگا۔

”نہیں... چاند بھائی تھا اس کا ساتھ اور وہ بولا کہ دوست محمد ہم تیرے کو ایک بات بولتا۔ سکندر نے تو اس کو بولا: ”اب ہم

بھینسی میں لگے گا۔ وہ بیڑی چلا گیا۔“

”بھینسی میں کہاں لگے گا وہ؟“ میں نے اس کی گون دلیج لی۔

”غیبت پوری بات کیوں نہیں کرتا؟“

”بتانا ہے... بتانا ہے... وہ خود کو پھڑکے بولا: ”تم مار لگا ہم کو تو ہم چاہیں گا۔ ابھی کرنا دبا کے پوچھیں گا تو ہم کیسے بتائیں گا؟“ وہ بھلی بھلی سانسیں لینے لگا۔

”اچھا اچھا... غلطی ہو گئی مجھے...“ میں نے کہا۔

”ایسے زبردستی مت کر بار...“ عمن نے کہا: ”دیکھتا نہیں کس کی حالت کیا ہو رہی ہے؟“

”کبھی تم ہی نہیں کیا ہے؟“ دوست محمد نے میلی قمیص کی جیب میں سے ایک مڑی مڑی سگریٹ نکال کے سیدھی کی۔

”میں نے نفی میں سر ہلایا۔“

اس نے عجیب جلا کے ایک لمبا کش لیا۔ ادھر مایوسی صاحب کا دگاہ ہے سکندر میں، وہ ادھر لگے گا تم کو جبرأت والادون؟

”کون سی جبرأت؟ ایک جبرأت تو مل ہے۔“

کاٹھن کے کہ باقی دنیا میں مقفل تھیں۔
 عرش پر کسی نے زور نہ دے جتنا شر و عکاس! ابھی کون ہے اہل
 باہر آؤ۔
 یہ اسی لڑکے کی آواز تھی جو دوست محمد کو ماضی کے لہجہ مختار
 میں کہہ کر بیویوں میں لے گیا۔ دیکھو باہر کی لڑکا کیا ہے۔ دوست محمد
 کو لے کر۔
 مکان دوست محمد کا

پیش کرد، پیسہ بی دو اور جوئے بھی کھاؤ۔ سچے عاشق ہونا، میرا غصہ ابھی
 ٹھہر نہیں چکا تھا۔
 لیکن سچ میں دوست محمد بول پڑا، "او بابا میرے کو ادھر کیوں لیا"
 میرے کو جانے دو!"
 "دوست محمد کچھ مجھے پہچانو۔" میں نے نرم لہجہ اختیار کر کے کہا۔
 "میں سبکدستی ہوں، میں لیاں لیا ہوں تم کو کیاں اب تم آبی بل کر جو گئے
 بدلے ساتھ۔"

اس کے لئے ہی کوئٹہ کی سرحد پر لے گیا۔ وہ بولا تھا۔
 ”میں نے کہا۔“ وہ کوکاس کرتا تھا۔ تمہارا پوتا ان کے پاس نہیں ہے۔
 ”اے کی! میں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔“
 ”ہاں لے گیا تھا۔ تم۔۔۔ تم کو ملام ہے؟“ اس کی آنکھوں میں
 بے یقینی کے ساتھ خوشحالیان اتر آ رہی تھیں۔

میں نے سوچا کہ میں اس کے پیچھے گیا تھا۔ اس نے مان لیا کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ وہ دم کو ڈولنے کے لیے تھا کہ تم ان کو میرے بارے میں بتا دو۔ میں اور عمن دونوں سامنے پہنچ گئے۔ اچانک اوپر بچھا کر کیا بات ہے کیوں تلاش کر رہے ہو مجھ کو؟ اس کی حالت خراب ہو گئی۔ پھر ہم اس کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اب کچھ اور پریشانی کو کوئی بات نہیں۔ وہ پھر بھی نہیں آئے گا۔ ”میں نے ایک ہفتے لمبا جھوٹ بولا۔

”ہمیں نہیں آئے گا... دوست محمد نے اپنی حبیب ٹول کے مگر یہ
 ہائیٹ لگا لے تم مارو اس کو یہ
 میں نے اقرار میں سر ہلایا۔
 ”لیکن وہ اکیلا نہیں ہے، دوست محمد اڑتے ہاتھوں سے
 گولٹ جلاتے گا، لیکن اعلان میں نے اسے روکنا نہیں ہرگز نہیں

تم کو ڈنڈے لے لیا کرتا ضرورت ہے۔ یہاں کوئی منہیں اٹائے گا بلکہیں نہ کیا۔

تم... تم سب بولتا ہے نا... اچھی طرح فالام کر لیا ہے کہ وہ...
بھلا کچھ ناں کا پاس نہیں ہے، وہ بوہت خالام لوگ ہے وہ عورت بھی
بوہت خالام ہے۔ سہارا دینا ہے نا... جب اس کا دیکھا حال، منہ مگر گتہ

1

3

١١١

٢١١

64

ن
ظ
و
ل

U
b

;

一、

44

سے مغلوب ہو کے وہی کرتی جو اس کے بھائی نے کیا تھا۔ میں نے کافی کے ساتھ ہائی ڈولن وئی کو ایک کچھ کے کیا۔

ایک ہنگامہ پر دہلے خواب رات کا صلیکھن، بوجھل آنکھوں اور ہماری سر کی صورت میں ملا۔ اس کا علاج نیند بھی صرف دو گھنٹے میں مل جاتے تو میں سو جاتا اور تازہ دم ہوجاتا جیسا کہ میں ایک چمکنے کی صحت من بھی نہیں تھا۔ میں ہانوکا سلسلہ سبب زبردستی تھا پھر کرام راج کی بڑی عزت و اعانت واپسی کی خبر سچی اس کے بعد یہ معلوم کرنا تھا کہ اس ایک رات میں غالب اور ناز ویر کی گزری۔ دشمنوں کے حصار میں ان کی پوزیشن سب سے زیادہ ناکام تھی۔ ان کے ڈاکو ڈاکو ان کے اعصاب پر سوار رہتا ہوگا کہ ہم سے رابطہ نہ ہونے کا احساس ان کو زیادہ بے بس اور تنہا کرتا ہوگا۔ اگر ہمارے اچانک منگنا تھا تو یوں تو خبر نہ ہونے تک وہ نہ جانتے کہ کتنی دیر پہنچ جائیں گے۔۔۔۔

ان حالات میں محسن کے خیالات بھی مختلف نہیں ہو سکتے تھے اس نے اچانک کہا: "یا زاس کریم ہونج کی عقل پرکس مدرک بھر و سا کیا جا سکتا ہے؟"

"صرف عشق کے معاملے میں اس کی صحت ماری جاتی ہے جو سب کی ہی ماری جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر اسے ہم جاسوسی کے لیے بھیج دیں۔ یہ معلوم کر لے کہ ایس اس کر تھیڑ؟ وہیں موجود ہے یا راتوں رات نکل گیا؟ محسن نے کہہ

"کہا تو مشکل نہیں۔" اسے سمجھا پڑے گا کہ روشن مایاں سے پریر

کے اور نہ سب حالت میں جائے گا اس سے بدتر حالت میں واپس آئے گا۔

بشوڈ زندگی میں نے کہا۔

"تم اسے اچھی طرح پرکھ کر کے رواد کرو۔ میں اس فتنہ مشترکو

جگاؤں؟"

"اچھا... اگر آپ کو بے حد دوسری ہے اس کا رخصتے اور آپ

چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے دفع ہو کے غلیہ فراہم کروں تو میں دفع ہو جاتا ہوں۔" میں نے نکتے نکتے کہا: "وہ یہ کہ تو نہیں بھی کر سکتا تھا؟"

محسن جھینپے کے سکریا میں ایک شادی شدہ شخص ہوں جو بیرو قابل اعتماد ہوتا ہے؟"

کافی گام تھا کہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ خود ہی کافی کی ہے۔

میں انھیں کھول کر پلوں شاہ اس نے کافی کا گام لگ ہانوکا لہلہ

سے لگا: "ہیو..."

میں ہانوکا کی گنگنی کی: "ہاں... یہ... تو... کبڑی ہے..."

"ہو پو میں آؤنگ۔ اس سے تھری طبیعت خشک ہو جائے گی؟"

اس نے گنگ بول سے لگایا اور اسے ایک اور گھونٹ نکتے پر غور کر لیا۔

میں ہانوکا نے بڑا سانس دیا: "کیا... یہ کیا کرتے ہو؟ مجھے سونے

دو... مرنے دو مجھے..."

"نہیں، میں نہیں مرنے دوں گا تجھیں۔ تم کو زندہ رہنا ہے۔ اور

تم زندہ رہو گی۔" یہ کہنے اس نے مزید کافی لگ ہانوکا کے من میں ان کے

ہاتھوں میں سوجھی تجھیں مرنے کی؛ میرا بھی خیال نہیں آیا تجھیں میرا شکیلا

کرتا...؟"

میں نے محسن کی کوشش کو دل ہی دل میں سراہا۔ وہ کسی عاشق

صادق کا رول کرنے پر مجبور تھا اور یہ کام بہت حوصلہ طلب تھا۔ کچھ لوگ

تو پیشہ ور عاشق ہوتے ہیں اور کسی کو بھی پاہت کا تعین طانا ان کے لیے

محض دل لگی ہوتی ہے مگر محسن جیسے شخص کے لیے جس نے کسی کسی

کو جانتے ہو مجھے دھوکا دینا پوڑا اور اگر یہ بہت مشکل تھی تاہم وہ اپنا

فرض پھرا تھا۔

ہلا تڑنگ ہانوکا نے انھیں کھول کے اسے دیکھا اور کچھ دیر تک

بھپکاتے بیروں کو کھتی رہی میرے ذہن سے کسی گم کشہ یاد کو دیکر

یا۔ محسن... معلوم نہیں... کیسا ڈراؤنا خواب تھا وہ... میں نے کچھ

کر اخبار میں ایک جیڑی ہے... کوئی لڑکی کو بیوی نام کی تھی... اس کی

تصویر کے ساتھ؟"

"کوئی کی تصویر؟ میرے دماغ کو جیسے برقی جھٹکا لگا۔

"ہاں... مجھے یاد ہے... اسی کا بیان تھا یہ..."

میں ہانوکا سے کہہ رہا تھا: "تم نے اسے اسے مجھ بڑے کہا۔ وہ

خوب نہیں تھا... تم نے اخبار میں کچھ دیکھا تھا کہاں سے آیا تھا وہ اخبار

کہاں تھا کچھ پڑھنے کے بعد... یاد کرو؟"

"مجھے ایسے مت دکھاؤ... میں نے کچھ نہیں کیا... کریم گیا تھا ناشا

لے... وہاں جا رہی ہے آیا تھا... وہ اب پوری طرح پوٹ میں لگی تھی۔

"اس نے کچھ تھا کچھ پور پور ہوئی ہوں..."

"یہ سب مت بتاؤ... اخبار کہاں ہے؟ میں نے اس کے ستر

کے اوپر نیچے لگتے اور چادر کو ہٹا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ اخبار مجھے نیچے

کے نیچے نہ کیا ہوا ملا۔ میں نے اس کے دونوں صفحے الگ کیے محسن نے

ایک صفحہ جھڑے لے لیا۔

"یہ... یہ کوئی کی تصویر ہے یہ محسن نے کہا۔

میں نے وہ صفحہ چھین لیا اور چند سیکنڈ کو کوئی کی صورت پر نظر

جملے بیٹھا۔ پھر میری نگاہ تیری شری پوٹ تھی۔ پولیس کی تحویل میں

چھٹی جاؤں حسینہ کی پڑا سر پر ہلاکت، اگر یہ افغانا میری آنکھوں کے

ماننے دھنلا رہا ہے تھے محسن میں نے خبر کا متن پڑھنا شروع کیا۔

فرار ہو گئے جو انھوں نے تھانے کے باہر کی کھڑکی کی تھی۔

فائرنگ سے ایک سہیل شہید نہ ہو گیا ہے اسیتل

میں داخل کر دیا گیا ہے۔ ہرے غنائم سے اس کا علاج کے مطابق

بھارتی جاسوس حسینہ کو بیوی نے امر لکھا کہ وہ جیڑی اور غنائم

محلے کے کسی ذمے دار فرد کی موجودگی میں بیان دینا چاہتی ہے۔

لیکن چھٹی کو سلیٹ نے اس الزام کو مسترد کرتے ہوئے مبتدئ

جاسوس عورت کو بھارتی شری تسلیم کرنے سے بھی انکار کیا اور

کہا کہ اس عورت کو جبر دلائے کے ذمے لے کر یہ بنیاد بیان

دینے کے لیے لایا گیا ہے بلکہ حقیقت وہ پاکستان کی عورت ہے

جس کا نام رضیہ ہے۔ پولیس کے اعلیٰ حکام وزارت خارجہ کے

ایک انسداد تجزیہ کی کو تو دیکھیں اس عورت نے جو بیان

دیا اس سے اخبار نویسوں کو بے خبر رکھا گیا اور ان کے کسی سوال

کا جواب دینے سے صاف انکار کیا کوئی وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔

پولیس نے صحافیوں کو پولیس اسٹیشن کی حد میں بھی داخل ہونے

سے روکا۔ اس بات سے بھی انکار کیا گیا کہ کو بیوی نہ کی اس

جاسوس حسینہ کو کسی نے زبردستی سے جانے کی کوشش کی تھی

جب کہ عینی شاہدوں کے مطابق وہ افراد تھانے سے فائرنگ

کرتے ہوئے ایک بغیر فزری جیپ میں بیٹھ کر فرار ہوئے تھے

پولیس نے ایسے کی واقعے سے اعلیٰ کا انکار کرتے ہوئے سب

اسپیکلے زخمی ہونے کو حادثہ قرار دیا جو ایک سیاسی سے تعلق

گوئی میں جانے کے باعث پوٹ آیا تھا لیکن تھانے کے محلے کے

کسی فرد کو زخمیت کے الزام میں معطل کیا گیا ہے اور مذکی

کے خلاف زبردستی سوسات مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ رات

گئے ملنے والی اطلاعات کے مطابق بغیر جاسوس حسینہ اپنی بیان

دینے کے کچھ دیر بعد پراسرار طور پر ہلاک ہو گئی پولیس کے

ایک اعلیٰ ذریعے نے جس نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی درخواست

کی ہے، یہ بتایا ہے کہ اس پر پوچھ گچھ کے سلسلے میں کسی قسم

کا جاسوسی نشہ تو نہیں کیا گیا تھا۔ وہ عورت خوشی کا مقصد ارادہ

کرنے کے بعد بیان دینے کی غرض سے اس کی سوانح کے قتل کا تعین

تھا اور وہ کبھی بھی پولیس کی تحویل میں بھی اس کی جان بخشی

غیر محفوظ ہے۔ بیان پر دستخط کرنے کے بعد اس نے کھڑے

زودا خڑیڑ سے اپنا فائر کر لیا جو اس کے ہاتھوں کے دھان

کسی غلامی ایسے ہی وقت کے لیے بھرا ہوا تھا۔ اس واقعے

سے پولیس کے اعلیٰ انسداد کی نامی بھی ثابت ہوتی ہے جو ایسے

کسی امکان سے بے خبر ہے حالانکہ دنیا میں ایسے واقعات

کی کمی نہیں جب انتہائی مایوسی کی حالت میں جاسوسوں اور

مزلے موت پانے والوں نے کسی طرح پناہیم سنا پڑا نہ لگ

دورہ بھی جس میں کوئی قانون اور ضابطہ نہیں چلتا۔ پولیس کو دوست محمد سے کیا لینا دینا۔ انھوں نے اُسے قاتل کے فرار کی جھوٹی گواہی کے مال دیا۔
 کیا نام تھا اس طوائف کا؟ بٹن نے خاموشی کے اس طویل وقفے کو ختم کیا۔

دوست محمد چونکا۔ پہلے تو گولی تھا۔ ابھی شادی کا بعد شریفان ہو گیا تھا۔
 گولی۔ اربو لور کی بندوق کی، مشین گن کی یا بار جن کی آدمی کی جان اسی طرح بنتی ہے۔ اس کا نام شریف النساء یا انارکل رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہست ہست میرا تین بختہ ہوتا جاہل ہوتا کہ وہ عورت تلاش کرنے پر گناہوں کی کسی بستی میں ضرور مل جائے گی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ابھی اس کو کراچی سے کہیں اور بھیج دیا گیا ہو اور پولیس کو مال غنیمت سے اسٹال کیا ہو کہ جو سابق ان کے مشترکہ مفادات کا معاہدہ برقرار رہے۔

میں دوست محمد کو تسلی دے کر لوٹا تو کرم بلوچ بہ بوتور غائب تھا اور یہ بات خاصی تشویش کی تھی۔ کہیں میں گل باواؤد اکرام شیخ اپنے اپنے خیالوں میں گم چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ شیخ کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ اُسے موہنی نے مہر غم دیا تھا۔ ایک جہاد کا اور دوسرا ہلکاشان کر کے کر اُس کا انتقام ایک غریب تھا۔ وہ جسے ہمارا کا اندازہ سمجھتا تھا وہ اس کے جذبات کا انتقامی انداز تھا۔ انتقام وہ مجھ سے لینا چاہتی تھی اور اُس نے شیخ کو آکھار بٹالیا تھا۔

گل بانو نے شاید اکرام شیخ سے موہنی کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تھا اور اب افروہ میٹھی تھی۔ وہ بھی ایک عورت تھی اور موہنی کی محبت کے انجام نے اس کی نظر میں مجھے قائل بنا دیا ہوگا۔ اس کی نظر میں میرے لیے لامنت تھی لیکن میں نے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا۔ وہ انصاف کو سستی تو شاید مجھے سب سے زیادہ مظلومانہ لیتی ظلم تو مجھ پر موہنی نے کیا تھا۔
 "کرم بلوچ نہیں آیا؟" میں نے انصاف کو تکرار کرنے والی خاموشی سے جھرا لیا۔

"میں دیکھ کے آتا ہوں۔" اکرام شیخ نے کہا۔
 میں اور گل بانو تنہا رہ گئے۔ اُس نے کہا۔ "تم موہنی کو بچا سکتے تھے"

"میں ہی نہیں، ہم سب نے پوری کوشش کی تھی۔ میں نے ہر دم کے کہا۔" ہم سب چاہتے تھے کہ وہ زندہ رہے اور خوش رہے۔ گروہ کچھ اور چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے محبت کروں جو میرے اعتقادات میں تھا۔ اختیار کی بات ہوتی تو

وہ اکرام شیخ کی محبت کا جواب محبت سے دے سکتی تھی۔ وہ اُس نے اکرام شیخ پر بھی کیا کہ اُسے محبت کا فریب دیتی رہی اور وہ ہم سب کی طرح اسے محبت سمجھتا رہا۔
 "تم نے اعتقاد نہیں کیا اس پر۔۔۔"

"یہ غلط ہے۔ اب ایسا نہیں تھا۔ شروع شروع میں ہم اعتقاد کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ غریب کاری کے ایک ٹھکانے سے بکری لگتی تھی۔ ہندو تھی اور بھارتی تھی۔ ان سب باتوں کو میں کیسے نظر انداز کر دیتا۔ بچپن کے تعلق کا آہنگی سیاست سے کیا تعلق بہت تھے میرے جاننے والے گروہ صہ آج میرے دوست نہیں رہیں۔ میں کہے مان لیتا کہ بائیس سال سے وہ ایک ناقابل یقین قسم کے عاشق و عشق میں مبتلا تھی میں نے اسے فساد نہ سمجھا تو میرا قصور حقیقی دنیا میں نہیں ہے اس وقت کسی بچہ ہی نہیں تھا۔ بعد میں اُس نے سب کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ ہم اسے اپنا ہی سمجھتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی اس وقت کی تھی کہ قبول کر لیا ہے کہ میں اُسے رابعہ کی جگہ کرنے کے بعد بھی نہیں دے سکتا۔ کے معلوم تھا کہ دیوانہ گی میں وہ اس حد تک بڑھ چکے تھے۔ وہ مجھ پر ہی نہیں، رابعہ پر بھی نہایت کا وہ دار چھوڑ گئی ہے جسے ہم ساری عمر چھپانے کی کوشش کرتے رہیں گے لیکن اُس کے لوہے جو چھپتے میرے دامن پر آئے ہیں اُن سے میں کیسے نظر چھڑاؤں گا؟

اس وقت گل بانو نے ایک عجیب حرکت کی۔ اُس نے اپنے کمرے کے پاس بیٹھ کر میرا سراپے شانے پر رکھ لیا۔ جلو چھوڑا۔ اتنا دیکھ مت کرنا اپنے آپ کو۔ اُس نے میرے سر کو تھمتے ہوئے کہا۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تم مجبور تھے میرے دیر۔ مجھے لوں گا جیسے میں اپنی بڑی مرنے کی ضرورتوں سے غرض محبت کی ٹھنڈی چھاؤں میں پہنچ گیا ہوں۔ اس شفقت اور غمگساری نے میرے دل کو وہ سکون دیا کہ خود بخود میرے سانسو بھنے لگے۔ وہ مجھے تسلی دیتی رہی۔

"مرد ہو کے روئے ہو۔ یہ تو زندگی ہے۔ دیکھو اُس نے کس طرح مجھ سے سب کچھ سمجھنا اور پھر کیا دے دیا۔ جو میرے بھائی کو دل کا وہ کچھ لے گیا۔" اُس نے اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو صاف کیے۔ "وہ سب رشتے اب میرے ہیں جن کے منہ سے میں نا آشنا تھی"

میں نے اتنے سے سراہا تھا یا۔ پھر تم نے یہ کیا حماقت کی تھی؟
 میں ڈر گئی تھی بھائی۔ میں سمجھی۔ کہ میں بھرا کیلی ہو گئی ہوں وہ وہ بولی۔

"کیا وہ زندہ نہیں رہتے جو کیلے ہو جاتے ہیں؟ اور پھر تم ایک خاندان میں ہو۔" میں نے کہا۔ "جو بہت بڑا ہے۔ اس میں صرف میں اور میں ہی نہیں، اکرام شیخ، غالب اور نازک، شملہ اور اُن کا بیٹا، دوست محمد اور کرم بلوچ۔ یہ چند نام ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں جن سے تم واقف نہیں ہو لیکن وہ سب بھی تم سے ہی رہتے رہتے ہیں، انسانیت، شرافت، محبت اور اصولوں اعتماد اور بھائی کے رشتے"

مجھے عجیب نام ہیں ان رشتوں کے۔ وہ بولی۔
 "وعدہ کرو۔ آئندہ ان رشتوں کو تجھ میں نہیں پہنچاؤ گی۔" میں نے کہا۔ "تو بعد کے فیصلے کو قبول کرنے ہی پڑتے ہیں لیکن تم میرے تو اپنا اختیار رہتا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کا سہارا ہیں، ایک دوسرے کی حماقت ہیں جیسے نظام کشی کے سارے آپس کی کشش کے توازن پر قائم ہیں اور گروہ کی سرپرستی۔" "تم بہت عالم فاضل ہو۔ کہیں بد فیروہ نہ بن جائے تھے قائم کو؟" وہ سکرائی۔

"میں نے کیا کہا ہے، وعدہ کرو نہیں تو بیچ پر کھڑا کروں گا۔" میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔
 "وعدہ کرو وعدہ،" وہ کان پھڑکے بولی۔ "آئندہ میں خود کشی کروں تو مجھے جان سے مار دینا"

"پڑاؤں جا کے نہ اچھو لو، کچھ طبیعت ہلکے ہو چلے گی۔" اور یہ کچھ۔۔۔ خبر۔۔۔ ہو گی کہ تم گل بانو خواہ نام اپنا گل خان رکھ لو اور گل خان گل محمد کا بنالو۔" میں نے کہا۔
 "گل خان، یہ ٹھیک ہے۔" وہ ہنس پڑی۔ "جب تک میں گل بانو نہیں بن جاتی۔۔۔ گل خان"

"لیکن محسن تو اوپر کا نقطہ نیچے لگا کے بولے گا۔ ایسی ہی گڑبڑ پھیلا آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔
 وہ خدا دیر سے سمجھ کر اس طرح وہ گل جان ہو جائے گی۔ پھر اچانک اس کے رخسار دمک اٹھے اور میں نے ہلٹ کے دیکھا محسن دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔ شاید اس نے کچھ گفتگو نہ کی تھی گل بانو باوجود کہ دروازہ کھول کے غائب ہو گئی تو وہ آگے آیا۔

"تو آجھا نہیں کر رہا ہے یا؟" وہ سنجیدہ ہو کے بولا۔ اس آگ کو ہوا مت دو جو تھاری پھینکی ہوئی چنگاری سے لگی ہے۔" میں حالات کا تقاضا ہے۔

"گل اگر میری کوئی موہنی حالات کے تقاضوں پر قربان ہو جائے تو مجھے الزام مت دینا۔" وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ "تم لوگ مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں اس خطرناک کھیل میں فریقین میں جاؤں

جس کے نتائج سب کے حق میں خطرناک ہوں گے، میرے لیے بھی، شملہ کے لیے بھی اور گل کے لیے بھی۔"
 "میں تم سے مجبور نہیں کر رہا ہوں۔ تو انکار کر سکتا ہے۔ آج بھی اُس نے خود کشی کی ناکام کوشش کی تھی۔ کل یہ کوشش کامیاب ہو جلتے گی، اللہ اللہ خیر سلا۔" میں نے کہا۔ "اولیٰ مرنا آخر مرنا۔ اُسے مرنے ہی ہے جو جینے کا موقع فراہم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"شاید تیرے لیے یہ کام آسان ہو۔"
 "ہاں، میں یہ کر سکتا تھا بشرطیکہ اس نے مجھ سے جذباتی سہارا مانگا ہوتا،" میں نے کہا۔ "اور میں رابعہ کو بھی بتا دیتا۔ نہ بتا تا تب بھی کسی اندیشہ کا شکار نہ ہوتا اس لیے کہ میں رابعہ کو سمجھتا ہوں اور اتنا ہی وہ مجھے سمجھتی ہے۔ وہ میرا ساتھ دیتی کسی کو زندگی کی طرف سے جاننا تو کاروبار ہے۔ پھر یہ امید کی جاسکتی ہے کہ جب اُسے مینا جانے کا تو وہ خود اپنے سہارے پر بھی جی لے گی جیسے بچہ پہلے واکر کے سہارے چلتا ہے۔ پھر واکر کے بغیر چلنے لگتا ہے۔"

"ذیب السادہ! میں نہیں پہنچی۔" محسن نے دُور مری جانب پھیر کر کہا۔ وہ گل بانو کے موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔
 "میں نہیں پہنچی۔" میں نے کہا۔ "کسی سے بات ہوئی؟"

"شملہ سے اور آئی سے،" وہ بولا۔
 اُس کے جذبات میں منفی خیالات کی رو کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ "یہ تو کوئی لمبا کچر ہو گیا۔"
 "اکرام شیخ نے غلطی کی۔ وہ لاہور سے بھاگ کے کراچی آئی تھی۔ اُسے واپس بھیج دیا۔ میرا قیاس ہے کہ وہ دونوں ہی آدھے راستے سے لوٹ آئیں، محسن بولا۔

"مگر انھیں نہ جانا ہوتا تو وہ شیخ کے سامنے انکار کر سکتی تھیں۔ شیخ انھیں زبردستی تو نہ بھیجتا۔" میں نے کہا۔ "اُس نے اپنی طرف سے ٹھیک کیا تھا۔ اب غلط ہو گیا تو انرا اُسے دینے سے کیا فائدہ دیکھنا ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اب۔"

"ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ پولیس کو اس کی گمشدگی کی رپورٹ ملے نہیں دے سکتے، محسن نے تلخی سے کہا۔ "میں نے شملہ سے کہا ہے کہ اخبارات دیکھ، حادثات کی خبریں اور رٹا امرار جرائم کی خبریں اور کچھ نہ لے تو منتظر کو بتا دے۔ وہ بھی کیا کر سکتا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اُس کے پاس کیا اختیار ہے کہ وہ ایک اجنبی لڑکی کے بارے میں کسی سے کچھ کہے۔ اور کہے گا کبھی کیا، ایک لڑکی کراچی سے لاہور جانے کے لیے سوار ہوئی مگر لاہور نہیں پہنچی۔ آئی بھی لاہور سے ہی تھی وہ لاہور کا شہر اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ لاہور میں رو پڑی تھی، پھر رو پڑی ہو

سکتی ہے اس کا والی وارث کوئی ہے نہیں۔ وہ خوب صورت ہے اور پڑھی لکھی ہے، بالتحہ، اکیلی سفر کر رہی تھی۔ راستے میں بھی اُتر سکتی ہے۔ کوئی کہاں تلاش کرنے جانے لے اُسے اور کہاں جانے خود میں کہاں فرصت ہے؟

نہیں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا لیکن یہ میرے ہی خیالات میں تھے۔ محسن کی سوج بھی مختلف نہیں ہو سکتی تھی۔

”اگر اکرام شیخ کے سر پر کر جائیں گے یہ معاملہ تو محسن بولا۔

”ہاں، وہی رہ جائے گا۔ کچھ، اکیلا، نہیں کئے گا۔

”ہمارا اس سے رابطہ کیسے رہے گا؟

”ستھر و پراپ جینل۔ ہم شملہ کو عبدالودود منظر کو باخبر رکھیں گے اور اسی کے ذریعے خبریں حاصل کرتے رہیں گے۔

کریم بولچہ اُسی وقت عرصے پر نمودار ہوا۔

”کہاں مگر گئے تھے تم؟ ہاں نے برہمنی سے کہا۔ ایک معمولی سا کام تھا۔“

”ابھی صاب، کام تو چھوٹا تھا پر اپن کیا کیا کرے۔ وہ سالا

”موشن میاں...“

”موشن میاں، تم پھر موشن میاں کے پاس گئے تھے ہاں میں نے دہرائے اس کی بات کاٹ دی“ شادی کی تاریخ لینے...“

”نہیں صاب! ایسی بات نہیں۔ ہم خود نہیں گیا۔ وہ مل گیا ہم کو۔ ہم کیا کرتا تھا۔ ہم اس کو قتل کیا اس واسطے تھوڑا ٹیم لگ گیا۔“ اُس نے محدثت آمیز انداز میں کہا۔

”میں نے محسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کیا تو نے بھی وہی سنا جو میں نے سنا ہے؟

”کس لیے دیر ہوئی واپسی میں؟ کیا کہا تھا تم نے؟“

”ہم ٹھیک بولا تھا۔ ہم اس سالا موشن میاں کو... کیا بولتا آپ... کراچی...“

”کر دیا؟ وہ بولا اور اُس نے نیٹ میں اُڑا ہوا خبر نکالا۔ آپ فکر مت کرو کوئی نہیں کیجے۔“

”کریم! تم نے نہیں ہو، یہ کیا کو اس ہے؟“

”میں نے اسے غور سے دیکھ کے کہا۔ اس کی آنکھیں مجھے عجیب نظر آئیں۔ ان آنکھوں میں وحشت کے سلسلے بہت ابھری تھے اور نہ اپنے جیسے اور نہ کسی سے کریم بالکل نا آشنا تھا۔

”ابھی یہ بچو اس تم آپ کو بولا صاحب... آپ کو کچھ بولتا تم اس کو بکرا کا ٹکڑی کر دیا؟“ اس نے خبر گیری طرے بڑھایا۔ آپ دیکھو، ابھی ہم صاف کر رہا ہے اس کو“

”میں اسے ہاتھ سے جڑ کے اندھ لگاں۔“ تم قتل کر کے آئے ہو۔ کیا بات ہے تم پر ہاں ہو گئے تھے۔ کیوں مارا تم نے اسے؟

”ہم ایک دہائی ہو گیا صاب! وہ سالا... وہ ہم کو بولا کر میرا ساتھ چل۔ تیرے کو ایک بات بولے گا۔۔۔۔۔ میں بولا کہ چل سالا تو پھر وائے کا سحراب تیری خبر نہیں میرا اماں آگیا ہے وہ بولا کہ نہیں کریم، تم تیرے ساتھ ایک رات کاٹ کرین گے؟“

”یہ گفتگو کمال ہو رہی تھی؟“

”مذہر یہ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ ہم کو رستے میں ملا بولا۔

”ہم تیرے کو تلاش کرنا چڑھا۔ تیرا بھائی ہمارا ہزار روپیہ اپنا پاس ہے یہ لے اور جا۔ ہم بولا کہ صبر چاہو؟ ہم یہ پیر تیرے کو شادی بنانے کے واسطے دیا۔ ہم تیری کو ساتھ لے کر جانے گا۔ وہ بولا کہ کریم! ابھی تیرا شادی مادی نہیں ہو سکتا۔ میں پوچھا کیوں نہیں ہو سکتا کیا اس کا باپ کا مرضی نہیں ہے۔ وہ بولا کہ ایسا ہی بات ہے۔ اس کا شادی ہو گیا۔ بس صاب میرا دام خراب ہو گیا۔ وہ بولا کہ تیری کا شادی ہو گیا آپ وہ تیرے ساتھ کیسے شادی کر سکتے ہیں۔ میں پوچھا کہ کیسے ہوا تو وہ بولا کہ ہلائی بی بھگ گیا۔ ہم آپ کو بتانا تھا صاب کہ اس کی بی بی پاگل ہے۔ تیری کا بڑا بہن سنی، جب موقع ملے تھے کھلے کھلے جاتے تھے۔ موشن میاں کا بات پر ہم بولا کہ تیرا بی بی تو رزحاک جانا ہے اور پھر آتا ہے۔ وہ بولا کہ نہیں، ابھی وہ نہیں آئے گا۔ ہم اس کا علاج کر دیا اور اس کو ایک فطیر لے گیا پانچ سو روپیہ میں میں نے کہا کہ تو نے قریبی کو کچھ دیا صرف پانچ سو روپیہ میں تو وہ بولا کہ ہم نے چار سو میں لیا تھا۔ سو روپیہ زیادہ دلا اور جان چھوٹ گیا۔ میں نے کہا کہ تیرے پر ریلنٹ اور میری پر بھی ریلنٹ، یہیں یہ بتا کہ اس بات کا مستری کی شادی سے کیا تعلق، میرا شادی اس سے کیوں نہیں ہو سکتا۔ وہ بولا کہ اس سے میں شادی بنایا۔ تو پھر میرا ساتھ کھڑے تیرا پیسہ واپس کرے گا۔ تو صاب! اس وقت ہم سب بھول گیا کہ آپ ہم کو کس کام واسطے بھیجا تھا... ہم فیصلہ کیا کہ اب اس کو پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اور پھر اس کو کچھ نہیں بولا۔ ہم اس کو مبارک دیا۔ اور وہ پہلو پہلا قسمت میں مستری نہیں تھا۔ ہم اس اور سے شادی بنا کے گناہنا ہم وہ جو کو گھر لے گیا۔ اور مستری بھی تھا وہ بہت روتا تھا صاب۔ ہم بولا کہ ابھی تم دو، تیرا ساتھ یہ زبردستی شادی کیا۔ وہ بولا کہ ہاں! میرا باپ کو دس ہزار دیا۔ موشن میاں اندر گیا اور صندوق میں سے پتھر نکالتا تھا کہ ہم بھی اندر گیا اور اس کو ادھر ہی کاٹ دیا۔

”مستری کے سامنے ہوا ورت کتے ہو کہ کسی نے نہیں کیجیا؟“

”میں نے نہ پچھڑے کئے گا۔“

”نہیں صاب وہ چلا گیا تھا! اپنا باپ کا گھر ہم بولا کہ تم جاؤ، ابھی تم بود ہو گیا جب ہم واپس آئے گا تو تم سے شادی بنانے کا ابھی چارہ بند دس دن آتا تھا نہیں بیٹھو“

”ہاں! وہ وقت پولیس سب سے پہلے اسے پکڑ لے گی۔ محسن نے کہا: اسے قتل کر کے تو خیر نہیں چھک کیا۔“

”ہاں! وہ شیطان اسی سزا کا مستحق تھا سحراب مستری کا کیا ہوگا؟“

”میں نے زکوہ مندی سے کہا۔ تم ایسا نہیں کر سکتے کہ اسے لے آؤ اور ابھی اسی وقت اس سے پہلے کہ پولیس اس تک پہنچے۔ تم اسے کال لاؤ۔“

”ہم لائے گا صاب! آپ بولے گا تو ہم لائے گا۔ ہم جانتا تھا! آپ ہم کو پکڑ لے گا۔ آپ مستری کو بھی پکڑ لے گا۔ ہم آپ کا غلامی کرے گا صاب!“

”ہاں! مت کرو اور جاؤ جلدی جاؤ۔“

”وہ پٹا ہی تھا کہ محسن اصل بات یاد آئی۔ اپنے انوکھے سچے وہ جس کام سے گیا تھا تو اس کا کیا بنا؟“

”... وہ ہاں صاب! ہم مایوس کیا۔ وہ جہاں چلا گیا کل رات ابھی اصر نہیں ہے۔ کریم بولچہ نے کہا اور پلیٹ کے روانہ ہو گیا۔ میں نے وہ ڈکر اسے پکڑا۔ جہاں چلا گیا، کس وقت؟“

”رات دو بجے۔ وہ بولا۔“ ہم سب مایوس کیا۔“

”یہ تو معاملہ کڑ ہو گیا۔ محسن نے سمندر کی وسعت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اب تک تو وہ زمانے تھے روز نکلا ہوگا۔“

”بدقسمتی ہلائی۔ ہم نے بہت وقت گنوا دیا۔ ہم صبح سے ہندو گاہ کے علاقے میں ہیں۔ سب سے پہلے میں جہاز کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے تھا لیکن ہم دوست محمد کے پکڑ میں پڑ گئے پھر گل نے ہمیں پکڑ میں ڈال دیا۔“

”اس سے زیادہ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ جو وقت ہم نے موشن کو یاد کرتے کر دیا تھا وہ اس کا حق تھا۔ ہم نے اس کے لیے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ ابھی اس کی لاوارث لاش کسی مردہ خانے ہی میں پڑی تھی اور ہم اس سے بے تعلق ہو گئے تھے۔ ہم اس کی آخری رسوم کسی بھی عقیقے کے مطابق ادا نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ یادیں عقیق جن پر ہم نے آنسوؤں کے دیے روشن کیے تھے۔ میں کہیے کہہ سکتا تھا کہ اس میں بھی وقت ضائع ہوا۔“

”محراب کیا کرنا ہے؟ محسن بولا۔“

”ہم اب مزید تاخیر نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا۔“ جیسے ہی کریم آنے لگا گل کی تیاری کرنا ہے۔ وہ سارا حساب کتاب تو غلط ہو گیا۔“

”کلن صاحب کتاب؟“

”شاہد خیل نے ایک نقشہ بنا کے دیا تھا کہ کس وقت وہ کہاں ہوں گے۔ تو وہ گھنٹے کا فرق پڑ گیا ہے اور ابھی شام کے چھ بجے سے پہلے تو ہم نکل بھی نہیں سکتے۔ میں نے کہا۔“

”وہ نقشہ دوست محمد کو دکھانا چاہیے۔ ممکن ہے وہ اس سے

مدد لے کر ہماری راہنمائی کر سکے؟ محسن بولا۔ تیاری تو سب ہے۔ ہم دو گھنٹے بھی کیوں ضائع کریں؟“

”اسی وقت میری نگاہ ہندو گاہ کے جوم میں اکرام شیخ پر گئی۔ وہ واپس آ رہا تھا سحراب! میں اندر گیا۔ اس کے ساتھ سحراب پولیس بھی جس نے اس کے ہاتھوں میں پھنسی ڈال رکھی تھی۔“

”قیان! یہ کیا ہوا؟“ میں نے پریشانی کے ساتھ محسن سے کہا جواب میرے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ شیخ کس پکڑ میں پڑ گیا؟“

”تم تو کریم بولچہ کا پتا چلائے کیا تھا؟ محسن نے تشویش سے کہا۔

”مکیا وہاں کس سے جھگڑا ہو گیا؟“

”اس وقت اچانک میرے ذہن میں وہ خیال آیا جو کسی لہمی کیفیت میں نازل ہونے والی وحشی طرح تھا اور میری عقل نے اس خیال کی روشنی میں اصل حقیقت کو دیکھا اور دیکھا۔ اگر اکرام شیخ کا کسی سے جھگڑا ہوا تو وہ اکیلا ہی زنجیر پر دست کیوں نظر آتا؟ پولیس تو نقص اس کے الزام میں ابھی بھی سمیٹ کر لے جاتی ہے تو کیا اس کے لیے کوٹاں ہوں یا محسن تاشانی ہوں۔ گواہ ہندو گاہ اور مدعا علیہ تعداد میں جتنے زیادہ ہوتے ہیں تھا تیار صاحب کو خصوصی اختیارات کے تحت معاف کرنے کا نذر دیا جاتا ہے زیادہ ملتا ہے۔“

”اب اگر اکرام شیخ اکیلا چلا گیا تھا تو اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی آتی تھی کہ شامت اعمال اسے جانے واروات ہرے گئی تھی جتنی تک وہ ہونے کے باوجود وہ غلط وقت پر موشن میاں کے گھر جا پہنچا اور بدقسمتی نے اسے گرفتار کر دیا۔“

”اب کیا کرنا چاہیے؟ محسن نے کہا۔“

”ہم اکرام شیخ کو اپنے جھوٹے نہیں جاسکتے۔“ میں نے کہا۔

”اگر وہ قاتل ہے تو سچ گیا تو معاملہ بنا ہوا ہے گا۔ یہ انوکھا پتہ کریم کہاں جاسکے مگر کیا؟“

”لغت بیچ کریم پر... فیصلہ کر کے شیخ کو اس مصیبت سے کیسے بچایا جائے؟“

”فیصلہ کیا کروں؟“ میں نے جھنجھلاہٹ میں کہا۔ پلر کھیتے ہیں کہ معاملہ کیسے؟ شیخ کو پھڑکانے کے بس دو جی طرے ہیں بے زور بازو یا بے زور زور؟“

”طاقت کا استعمال بعد میں اکرام شیخ کے لیے مسابہدہ کر سکتا ہے۔“ محسن بولا۔ وہ جاسے جانے کے بعد پکڑ لیا تو اس کے الزامات کی فہرست بہت لمبی ہو جائے گی اور اُس وقت وہ اکیلا ہوگا۔“

”بس تو پھر سودا کر لیتے ہیں؟“ میں نے کہا۔ الزامات کے غامد ہونے سے پہلے ہی الزام لگانے والوں کو خرید لینے ہیں۔ یہ

نسبت کم قیمت لوگ ہیں اور تلواریں بھی کم ہیں۔
 محسن نے تانیں میں سر ملایا۔ اگر وہ ہمارے قوت خرید سے
 باہر ہوئے تو کیا ہوگا؟
 ”ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ شیخ کو ہم ہر حال لے آئیں
 گئے۔ تو فٹافٹ مال لے آئے۔ میں نے کہا۔

جب وہ نیچے کپڑے میں جانے کے لیے غائب ہو گیا تو میں
 نے گل ہانک دیکھا جو بیسے نمی پوز میں کہہ رہا تھا۔ رکھنے کھڑی تھی۔
 ”یہ اچانک کیا پروگرام کر گیا ہے؟ وہ مانتے پر بل ڈال
 کے پوئی اور میرے سامنے قریب آگئی کہ مجھے ایک قدم پیچھے ہٹنا
 پڑا۔ گل ہانک نے انداز و اطوار میں اچھی نیک پرانے وقتوں کی خود اعتمادی
 اور بے باکی کا جارجانہ انداز بانی تھا۔ میں اس کے حالات اور ماحول
 کے پس منظر سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ایسے ماحول میں اگر وہ
 سوانیت کے آداب سے بے بہرہ رہی تو قصور اس کا نہیں۔ اس
 کے لیے روایتی فحش کی شرم و حیا کا مظاہرہ کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔
 اس وقت وہ مردانہ پیروں میں تین غنی۔ زمانہ باس بھی اس نے
 غامضی بے تکلفی اور بے پروائی سے پسنا تھا۔ لیکن اسے بالکل لڑاکا
 نہیں تھا کہ رسمی ستر پوشی کے اس انداز میں بے حجابہ نمائش کے
 کتنے اسباب نظر آتے ہیں۔ ایک اجنبی اسے بے شرم دیکھ دینا بھی
 قرار دے سکتا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے۔ کوئی غلط سوال کیا ہے میں
 نے؟“ وہ بولی۔

”نہیں... میں نے چونک کر کہا۔“ وہ دراصل ہم تباہیہ
 ہیں اگر کم شیخ کو چھڑانے کے لیے۔“
 ”اور تم خود دھر لے گئے تو پھر؟“

”تمہارے اندیشے اپنی جگہ مگر بلی: یہ بھی تو نہیں ہو سکتا
 ہا کہ ہم اپنے دوست کو اس کی تقدیر کے سپرد کر کے نکل جائیں؟“
 میں نے کہا۔

”میں کب کہہ رہی ہوں کہ اس کے لیے کھرت کر دیکھیں
 یہ بھی تو جو کر پولیس نے تمہیں پہچان لیا تو پھر کیا ہوگا؟ میں کیا اپنی
 جانوں کی غلاب اور ناز و کی مدد کے لیے تم اور میں ہی جانتے ہو کہ
 تمہیں کیا کرنا ہے تمہیں یہ رسک نہیں لینا چاہیے اس وقت۔“
 ”پھر کیا کرنا چاہیے؟ میں نے طنز اور سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ہم
 دونوں کو یہاں چھپ کے بیٹھ جانا چاہیے۔ شیخ کو چھڑانے کے
 لیے تم جاؤ گی؟“

”اچھا ہوا تم جلدی سمجھ گئے؟ اس نے سپاٹ لیے میں کہا۔
 میں جو بوجھ کا رہ گیا۔“ تم سیس ہو؟“
 ”کیا تم مذاق کر رہے تھے؟“

”مگر یہ... یعنی کیا تم بہت آسان سمجھتی ہو اس کو؟
 ”ہاں“ اور اس لیے جانتی ہوں کہ یہ کم تر کر رہا۔ یہ اس
 کا ہے۔ نا مجھے کہہ دے دو، وہ طنز یہ اپنے میں بولی۔ ”اب اس
 سامنے مشکل کام تم کرتے آئے ہو۔ آئندہ بھی کر گے کیونکہ
 مرد اور برہنہ تھے میں ہوں عورت۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو گل۔“ میں نے کہا۔
 ”نہیں، میں تم کو بالکل صحیح سمجھ رہی ہوں۔ تم عام مردوں کی
 طرح یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ جو کام تم کر سکتے ہو وہ کوئی عورت بھی
 کر سکتی ہے۔ حالانکہ جس طرح رالہ نے تمہارا ساتھ دیا اور اب ہم
 طرح ناز و غلاب کے ساتھ جلی جی ہے انعام کی پروا کیے بغیر اس
 کے بعد تمہیں تو یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ مجھے دیکھتے تم اس وقت
 جب میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ اسی کے ایک مکان
 کی حیثیت سے جاتی تھی سردار میرا بھائی تھا تو کیا؟ وہ میرا محافظ
 بن کے تو میرے ساتھ نہیں رہتا تھا۔“

”ٹھیک ہے میں مانا ہوں کہ تم کسی سے کم نہیں ہو، مگر
 مجھے بتاؤ کہ تم یہ کیا کام کر رہی ہو؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ وہ بولی ”یا تو میں اگر کم کر دوں
 آؤں گی، تمہارے سے بھی لے آؤں گی اور نہ واپس نہیں آؤں گی؟“
 ”تمہارے واپس نہ آنے سے مسائل ڈگنے ہو جاتے ہیں
 گل۔“ محسن نے کہا جو تیار ہو کے اٹھ گیا۔ ”غل نہیں ہوتے۔“

”پتھر محسن! مجھے جانے دو۔ تم لوگ ہر دھڑکے تو دیکھو
 پر۔“ وہ محسن کے گیس میں یوں ہانپیں ڈال کے کھڑی ہو گئی کہ اس کا
 چہرہ محسن کے مقابل آگیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ محسن کی آنکھوں میں
 آنکھیں ڈال کے کچھ نہا چاہتی ہے لیکن محسن میں اتنی بہت ہی نہیں
 تھی کہ اس سے نظر ملاتا۔

اس نے گل ہانک کے ہاتھوں کو ایک جھٹکے سے الگ کر لیا
 ”یہ بازار کی طریقہ مت اختیار کیا کہ اپنی بات منوانے کے لیے۔“

”تم آکر کیا سمجھتی ہو...؟“
 وہ محسن کے الفاظ کی پروا کیے بغیر میری طرف پلٹ گئی۔ ”کہنا
 خدا کے لیے تم لوگ مت جاؤ۔“

”ہاں اس کی آنکھوں میں یقین کا وہ کون سا جادو تھا جس
 نے مجھے موک کر دیا۔“

میں نے سہلہ کے کہا: ”ٹھیک ہے ہم اگر کم شیخ کی زندگی کو
 داؤ پر لگا کے چلا آگئے ہیں۔ یہ مجھ کو کہہ رہی صورت تسلیم نہیں کر
 سکتے۔ دوسری کوشش میں خود کریں گے اور پھر کیا سیالی کی جو کمی قیمت
 ادا کرنا پڑی... وہ ہم کر گئے اور حال سے ساتھ تم بھی چکاؤ گی...
 محسن... اسے دے سب رقم تم۔“

”مگر باگل ہو گیا ہے...؟ محسن نے احتجاج کیا مگر اب اس
 میں شرت نہیں تھی۔

”مجھ پر بحث، ہم سب باگل نہیں تو اور کیا ہیں؟
 محسن نے ایک رومال میں لٹی ہوئی رقم گل ہانک کو بھاری۔

”یہ پوسٹے ایک لاکھ ہیں، کم پڑ جائیں تو محنت کرنا سو دیا کر لینا
 اصرار پڑا اور واپس آکے لے جانا۔ میرا خیال ہے کہ اتنی رقم بہت
 ہو گی۔“

”جل ہانک سکوئی۔ اس نے ایک نظر اپنے لباس کو دیکھا
 اگر یہ میرے نقطہ نظر سے مہربان تھا مگر اس نے ایک دوپٹے کا
 انداز ذکر کے سوا کچھ نہیں کیا۔

”خدا حافظ اور گڑبگڑ؟“ میں نے کہا۔

”تم کبھی کبھار دو سو سکائی دو۔“ اس نے محسن کے گالوں
 پر پھٹی لے کر کہا۔ ”آئندہ پھلانے کھٹے ہو؟ اور اس سے پہلے کہ محسن
 گالی دیتا وہ پلٹ کے لالچ کے آخری حصے میں پہنچ گئی۔ آخری بدل
 اس نے ہماری طرف دیکھ کے ہاتھ ہلایا میں نے جواب میں ہاتھ
 ہلایا۔ آخری حرکت گل ہانک نے کی کہ اپنی دوا انگلیاں ہونٹوں پر رکھ
 کے غافل و غافل انگلیاں لمبی اسٹائل میں ایک ہوائی پورس محسن کی طرف
 ارسال کر دیا۔

”تو کی جی؟ محسن نے دانت نہیں کے کہا۔“ واپس آجائے
 پھر میں اس کا داغ درست کروں گا۔“

”تو کسی انگریز یا رکی طرح خرم و حیا سے لال لگائی ہو رہے
 مجھے محسن کی حالت پر بے اختیار ہنسی آئی۔ اور وہ ہے کہ دست داری
 پلاز آئی ہے۔... بازار کی عورت۔“

محسن اسے بھوم میں گم ہوتا دیکھتا رہا۔ ”عجب ڈھیٹ نے
 پہن کوئی اور ہوئی تو میرے منہ پر پھٹ پڑی۔“

”کہنے کو کہنا تو وہ چڑک ہے۔ وہ عورت کیوں پھٹ رہا ہے
 گی جسے یقین ہو کہ یہ حصے میں دی جانے والی گالی کے سوا کچھ نہیں۔“

گالی کا مقصد تو ہوسکا ہے مطلب کچھ نہیں ہوتا۔“
 ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تو اس کی طرف داری میں مدد سے چھٹتا
 رہا ہے۔“ محسن ابھی تک غصا تھا۔ ”ایسے غلط فیصلے دیکھتے پڑ جاتے ہیں۔“

”کی غلط فیصلہ کیا میں نے؟“

”اس کی بات مان کر۔ جھلایے عورتوں سے سننے والے معاملات
 میں اس نے کہا کہ میں مردوں سے کم نہیں آپ نے کہا کہ جب
 ارشاد کیا ہوگا اگر معاملہ اور مجھ کو کیا؟“

”پھر ہم باہیں گئے۔“
 ”ایک سبب دھماکا نے۔“ محسن بولا۔ ”لہذا اتر لیا گیا۔“

”قائدہ کیا ہوگا...؟“

”آئندہ وہ بھی نہیں کہہ سکے گی کہ میں کسی طرح بھی تم سے کم
 نہیں ہوں۔“ میں نے بڑا بے نیازی سے کہا۔ ”کچھ باتیں بھانے
 سے مجھ میں نہیں آتیں۔“ مجھ پر کھانا ہے۔“

”ڈاکہ ڈالنا سوتا تو میں بھی کتا کہ قانون طے آپ کا تجربہ زیادہ
 ہے۔ ہم آپ کے تابعدار ہیں لیکن میرا ملتا تھا محنت قسم کا محسن نے
 کہا۔ ”کسی اور موقع پر وہ ثابت کر سکتی تھی اپنی برابری کے دعوے
 کو۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ اس نے تھوڑا سا جذباتی ڈول کیا اور
 آپ کی عقل آڑ گئی۔“ بھارت بن کے۔“

”کیا کروں اپنے شرف وانی صاحب بقول شاعر مزاح
 اور کہیں سے عاشقانہ ہے؟“ میں نے ایک سرد آہ بھری۔ ”ہم تو
 خود اڑ جاتے تھے۔ بھارت بن کے، شاید آپ کو یاد ہوگا ولایت
 کا زمانہ، یہ قصہ ہے جب کہ آتش جواں تھا تو ناباکار بھائی
 وہی ہے۔“

”محسن کی سبیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ
 میری بات سن ہی نہیں رہا۔

”اچانک اس نے کہا۔“ سکندر، میں جانتا ہوں۔“
 ”کہنا؟ یعنی اتنی سنی دیر میں... دل کا یہ حال۔“

”جو اس مت کر۔“ وہ برہنہ سے بولا۔ ”اسے ڈھٹا کہہ کر کہیں
 جائیں گے۔ مجھے خیال کیوں نہیں آتا کہ وہ بھی گرفتار ہو سکتی ہے۔

اس کے بھائی شیش ناک کے گروہ کا خاتمہ ہو گیا مگر کیا پولیس
 کو پتا نہیں چل گیا ہوگا کہ ناک سنی نکل گئی تھی۔ اور کیا انھیں
 انداز نہیں ہوگا کہ اب بھائی کا بدلہ لینے کے لیے ناک نڈی ڈاکوؤں
 کا ناک گروہ بنائے گی۔ ریکارڈ پر سب کچھ ہوگا۔ سامنے ڈاکوؤں کی
 تصویریں بھی ہوں گی۔ ناک سنی تو شاید ویسے بھی مشہور ہوگی کہ کیا
 دو دھاری تلواریں۔ مال و زر کے ساتھ عقل و ہوش بھی لوٹ
 لیتی ہے۔“

”میں متنا محسن کے دلائل سے قائل ہوتا تھا۔ اتنا ہی اپنے
 غلط فیصلے پر پشیمانی اور پریشانی کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ شاید
 میں نے بہت محنت سے کام لیا۔ اس کی بہت اور مذہبات اڑنے
 کا یہی تو ایک موقع نہ تھا۔“

”میں نے کہا۔“ تو غصہ غلطی میری تھی تو...“

محسن نے مجھے تو بخار نظروں سے دیکھا اور ہاتھ پھڑکائے
 لنگ لگا۔ میری بات پھر غلط ہوئی تھی۔ اس کا ہرگز مقصد یہ نہیں
 تھا کہ میں اپنی غلطی کا اعتراف خود ادا کروں۔ غلط فیصلہ کسی سے بھی
 ہو جانا کوئی عزم نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس کا خیال سب کو جھلکتا پڑا
 تو کوئی کسی کو الزام نہ دیتا۔ سوال اس وقت فوری طور پر کچھ
 کہنے کا تھا۔ یہ سب سوچنے کا نہیں کہہ کر نہا ہے۔

”ہم بولا کہ مجھے جادہ ہے، مگر تم نے سر جھانکے کہا؟ غلط تو نہیں بولا صاحب؟“

”اسے کھانا پکا کھانا آتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”ابھی دیکھو گا صاحب، ہم کھانے کا آپ محرمات کرو؟“

لیکن یہ خیال زیادہ جھل افراس نہیں تھا کہ مشتری نے کھانے پکانے میں کریم کی شاعری اختیار کی اور اولین تجربات کا تذکرہ مشرق میں بنانا تو ایک طرف سمندری سفروں میں ہی نظام ہجرت کا بیڑا غرق ہوتا ہے عقل بھی ماری جا رہی تھی۔

جب کریم بولچ چلا گیا تو میں نے تاہداتی پھیلے ہوئے سمندر کی وسعت پر دنگہ کی اور اس اسی کراچی تھڑکے کا تصور کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بہر حال گراں کے ساتھ وہ فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا جو غالب اور نازک کے اور ہمارے درمیان مائل ہو چکا تھا۔ وہ اس یقین پر دشمن کے ہتھار میں سرکھٹ جانیے تھے کہ ہم ایک لمحے کے لیے بھی ان کے خیال سے غافل نہ ہوں گے۔ اور ہم سے وابستہ امیدوں نے ہی انھیں یہ عزم سرفراختیاں تھیں یہاں ہم ساحل پر اپنے ہی مسائل کی زنجیروں میں الجھے ہوئے تھے۔

آدھے گھنٹے میں شاید میں نے احساس کی اذیت کی آدھی صدی گزار دی۔ رہ رہ کر مجھے اپنے آپ پر غصہ آتا تھا، آخر کیا ضرورت تھی مجھے کریم بولچ کو پھر جیسے ہی کہ وہ جانے اور اس معیبت کو اٹھالائے۔ عشق اسے تھا، جھگڑا ہم سب سے نہ آتی مشری تو کیا وہم جانا چہند میں سب عشق کا بخارا رہتا اور وہ اس کے ساتھ ہی پھانسی پڑھنے کے لیے دنگ جاتا تھا، تب بھی کیا فرق پڑتا تھا۔ ہمارے ساتھ دوست محمد بھی تھا جو کریم سے کہیں زیادہ تجربہ کار ملحق تھا۔

میری سوچ میں خود غرضی کا عنصر غریبی انتشار کی پیداوار تھا لیکن یہ کریم بولچ کے لیے ضرورت سے زیادہ خلوص کے جذبے کا مظاہرہ ہی تھا جس نے انہیں شمع کے حالات کے گرداب میں پھنسا دیا۔ اور اسے پہلے ہی کوشش میں مل جانا بھی ڈوب سکتی تھی۔ سب سے گٹ کر اسے غرضیات اور خوش آمدنگیوں کا بیڑا بچھ کر دے والے غائب اور نازد انتظار ہی کہتے رہ جاتے۔ ابھی دس میں کاٹھیری کے شکست کے اور اکیسے پن کے احساس کی اذیت جھیلے اور خود اپنی دوا مانگی سے سوال کرتے کہ ان کی اور ہم سب کی خواہم آرائیس کا عنوان سمجھنے سے لاج حاصل اور اس کا رزیاں سے ثابت کیا ہوا ہے؟ اس کا رزم گاہہ و شورشیں اس تائید بھی مجرم ہے۔ اور تائید بھی بھی انھی کے ساتھ ہے جو غمزدہ سے بڑھ کر خدائی کے دعوے رکھتے ہیں۔

لاٹخ کے پچھلے حصے میں اچانک شورش اٹھا۔ اس میں دوست محمد

کی آواز نمایاں تھی لیکن کریم بولچ کی زبان بھی شامل تھی اور اسے آزاد اس کے متعلق کی ملک مشرقی کے سوا کسی کی نہیں پہنچتی۔ وہ تیز بیٹی جیسی آزاد میں زندہ لغت کی منتخب گالیاں کو سنے دے رہی تھی۔ بچہ یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ مخاطب کریم ہے میں پک کر جانے اور دات پر بیٹیا تو دل میں عجیب نقشہ دوست محمد ایک عالم وحشت میں کریم بولچ سے پڑا ہوا تھا اور اسے اپنے سر سے مخبریں مار مار کے گرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی میں بولتا تھا کہ... سالاحری... ہٹ جا رہا راستے سے... جانے دے میرے کو بابا“

کریم بولچ جسمانی طور پر کمزور تھا لیکن اس کی قوت ارادی شکست دینا آسان تھا۔ وہ زخمی تھا اور تھکا ہوا بھی تھا لیکن اس نے دوست محمد کو روک لیا تھا اور یہ صورت اسے راستہ پر تیار نہ تھا۔ وہ مجھے سے پیچھے جاتا تھا اور مجھے پلٹ کے آنے کا گرتا تھا تو ایسے اٹھ کھڑا ہوتا تھا جیسے کسی اسپرنگ پر گرا کر پوچھ رہا ہو دوست محمد کی ٹانگ سے لپٹ جاتا تھا تو بھی کمرے۔

”ارے ہم جانے گا... لیکن تیرے کو جانے نہیں دیں گے! استاد... صاحب ہم کو مار ڈالیں گا، ابھی ہم صاحب کو پلا تے ہیں خدا کا واسطہ... وہ مجھے چلا جانے کے پکڑنے لگا۔ استاد یہ استاد اپنا طلبہ کر دیا آہ... کیا تیل کا ٹانگ بھرا تے ہیں، مال قسم استاد ہم بھی بہت تیزی ہے۔ تم بے شک ہمارا سر پھوڑو، ہمارا دل توڑ دو، ہڈیاں توڑ دو، پیٹ پھاڑ دو، مگر صاحب بولا ہے تو ہم جانے نہیں دے گا...“

درمیان میں مشری ایسے ہدایت دے رہی تھی جیسے وہ اسٹنٹ فلم کی فائنٹ انٹرکٹ رہو۔

”ارے کریم کم بخت... ادھر... ادھر نفل میں ہاتھ دھو کر مار گڑی پر... آفت... اسے تو مار کھائے چلا جا رہا ہے... ہاں... ایسے... اب ٹانگ مت چھو ڈیو... نہ تو کچھ سے ٹانگ اور اسے منہ کے بل گرا دے... اسے تیرا ستیا ناس ہو... کیا اچھا موٹے تھا... میں کتنی ہول کاٹ... کاٹ لے اس کا بازو یہ سب کچھ میں نے چند سیکنڈ میں دیکھ اور سن لیا پھر میں نے درمیان میں اس کے دوست محمد کو کریم بولچ سے جھگڑا اور گرج کے کہا کہ آخر کیا ہو رہا ہے؟ میں نے ایک ہاتھ سے کریم کو جھٹک دیا۔ وہ سیدھا اپنی دلڑیائی طرف گیا اور اس کے ساتھ دو بار پر زنجیق ہو گیا۔

”دوست محمد! میں نے اسے دونوں شانوں سے بچ کے جھونٹا دیا کیونکہ مسہ یہ ہا“

اس نے خود کو پھرنے کے لیے مزاحمت جاری رکھی نہ

ابھی جانے دو ہم کو بابا، ہم ادھر نہیں رہے گا اپنا کوئی کام نہیں ہے ادھر، تم نے یوں قید کیا ہے ہم کو... ہم جا نہیں گے“

”کیوں جاتا جاتے ہو تم یہاں سے انٹر کمرے کے لیے؟“

”م کو چوں کی طلب نے پاگل کر رکھا ہے دوست محمد! میں نے اسے آدم لاک سے قابو کر لیا۔ مگر تم آخری سگریٹ پی چکے ہو۔ اب تم جو بیمار ہو جانا اس دنیا میں واپس جانا ناممکن ہے جہاں تمہارے دشمن تمہیں یہ زہر فراہم کرتے ہیں تمہیں اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے وہ تمہاری جان لینا چاہتے ہیں تمہیں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ راستہ ضرور صاف ہے گا انھیں لیکن تمہاری جان نہیں جانے گی۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کی طرف ہماری رہنمائی کے لیے“

وہ چنگار مارا اور گالیاں دیتا رہا۔ ”تم اس کا باپ ہے میرا“

”م کو ن ہوتا ہے میرے کو روکنے والا، اپنا سب کچھ کریں گا،“

”نہ بھی کریں گا، قتل بھی کریں گا، خودکشی بھی کریں گا“

میں نے اسے کئی بار ڈیڑی بے رحمی سے پیچھے پھینکا۔ اس کی مزاحمت بہت جلد ختم ہو گئی۔ نشہ نہ لے کر اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور وہ جھوکار پنے کی وجہ سے کمزوری کا بھی شکار تھا۔ آخری بار وہ غیٹے کا کھوپڑی نہٹھ سکا۔ وہ فرش پر کسی پاگل ہو جانے والے کی طرح پڑا پائپا رہا، کانپا رہا اور سکودہ آوازیں نکالتا رہا۔ اس کا روناد دھواقت منت سادیت کرنا سب رازیاں گیا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا کہ وہ واپس نہیں جاسکتا اسے چڑی والی ایک سگریٹ بھی نہیں دی جاسکتی اور اگر اس نے زیادہ دوا مانگی کا مظاہرہ کیا تو میں اسے ہاتھ کے ڈال دوں گا۔

میں نے دروازے کو باہر سے کھنڈی لگا دی کریم بولچ کے ساتھ مشری ایک کچھ سچی ہوئی کھڑی تھی۔ اس نے میرے زور بار اور جاہ و جلال کا پہلا نمونہ دیکھا تھا۔ میں نے دوست محمد کے ساتھ جنت آمیز سختی برتی تھی۔ میرا دل اسے نقصان پہنچانے کا نہیں نقصان سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ دوست محمد کی جگہ کوئی دشمن شکاری ہوتا تو میں اپنی ہمارا زہر قوت اور پھر لوہا پکت نیز قوت کا استعمال کرتا تاہم اس نمونے کا بھی مشری پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

”تو دیکھا صاحب کو کیا؟ اٹلیٹ بنادیا اس کا... ابھی تو کہہ... مگر میں نے کہا۔

”جہاں میں“ مجھے کیا بھجا رہا ہے۔ تو خود سیدھا ہوجا میں تو اچھا طرح کا بول ہوں مجھے کہنے کی ذمہ ہے بالکل، مشری نے ہاتھ ہلائے کہا۔

اک وقت دوست محمد نے دروازے کو کھڑکی ماری۔ سال

سکندر کا بچہ، بیڑا غرق ہو رہا تھا، جھوٹا میرے کو... اس نے پھر دروازے سے سر نکال دیا اور مجھے گالی دی۔

”صاحب جی! آپ تو باندھ ہی دولے۔ یہ تو باؤلا ہو رہا ہے، مشتری نے کہا؟ دروازہ توڑ دے گا؟“

”دروازہ نہیں ٹوٹ سکتا، کریم بولچ نے پورے یقین سے کہا۔

مشری نے اسے گھور کے دیکھا۔ ”مجھ سے تو پا پڑ بھی نہ ٹوٹے ہے“

میں نے کہا؟ جاؤ کوئی رستی لے کر آؤ۔ ایسے تو دوست محمد خود کو ہلاک کرے گا۔“

میں نے ہال ناخواستہ دوست محمد کو لیے پس کر کے اس کمرے کے ایک کونے میں ڈال دیا۔ اس کی کیفیت وقتی تھی، مجھے معلوم تھا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھلنے لگے گی۔ جسم جو زہر سے لذت کشید کرنے کا عادی تھا عموماً کے آزار سے گزند جانے کے بعد پھر جینے کی خواہش سے توانائی حاصل کرے گا اور سرختر حیات سے پھر پاک صاف رہے آلائش و بے نداشت، پر محرم اور پر مسرت زندگی کا دھارا بہنے لگے گا۔

دوست محمد سے غصے کی حد جہد میں میں منٹ صرف ہو گئے تھے جو انتظار اور اندیشوں کی بنیاد میں کاٹے نہ سکتے۔ اب میں نے پھر گھڑی دیکھی گل کے بعد میں کو گئے ہوئے ہیں منٹ ہو گئے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح منٹ بعد مجھے کھنڈ نہ چھ کرنا ہوگا۔ بولے کا رینچ کے انتظار کی بے عمل ندرت میں متبادل ہناسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔

میرے لیے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ میں ان میٹوں یعنی شہ، گل اور محن کو بھول کر یہ سمندری مہم سر کرنے کے لیے اکیلا ہی لاٹخ لے کر روانہ ہو جاؤں اور یہ بھی ناممکن تھا کہ غالب اور نازک کے خیال کو بھول کر اس قسم سے ہی تائب ہو جاؤں۔ مجھے ایک خاص عشق اور غیر جذباتی فیصلہ کرنا تھا۔ میرے سامنے وہ سوال تھا جو ابھی کے اصولوں کے مطابق ہی حل کیا جاسکتا تھا۔ ایک طرف میرے دو ساتھی تھے جو ایک بھری جہاز پر بیٹھوں کی قید میں تھے اور وہ جہاز ایک ایسا قلعہ تھا جس پر حفاظتی انتظامات بھی انتہائی سخت تھے۔ دوسری جانب میرے تین ساتھی دوسرے دشمن کی قید میں تھے۔

میرے بچپنے جانے کے امکانات دونوں طرف برابر تھے۔ ہر صورت میں اہم آرائیس کا مقدس مشن ناکام و ناتمام رہتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہر دشمنی محال میں غالب اور نازک کی مدد سے ایسا کرنا تھی بھڑک کر غریب کہنے میں کا صیاب ہو جانا تو پھر نہ تو

اپنی آزادی سے اور کامیابی سے باقی بین ساتھیوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اس وقت تک وہ بے رحم قانون کی آنکھ سے زنجیروں میں جڑے ہوئے کسی ماسوم زندان کی بلند و ناقابل تخیل دیواروں کے پیچھے پھنس جاتے اور ہمارے لیے ان کو منزل و آمدن تک نہ پہنچنے دینا فقط آرزو اور فریب آرزو کی بات ہو جاتی۔

لیکن دوسری جانب ہر فرض حال میں پولیس کے قبضے سے نکل کر عرصہ دراز میں جیلوں کو چھلانے میں کامیاب ہو جاتا تو کامیابی ہماری نیم کو چھلانے میں ہم کے لیے جادہ پتیا کر سکتی تھی۔ اور ہم اپنی منظم قوت کے ساتھ شہر پر گرام کے مطابق اور بروقت کارروائی کر کے غالب اور ناز کو بھی بازیاں کر سکتے تھے اور اس سے اہم آرائیں کی اسٹرائیٹنگ فورس یعنی مزید کارروائی لگانے کی قوت بحال ہو جاتی تھی۔

ایک السطوہ جانے والے بحری جہاز کے مقابلے میں ایک تھانے پر حملہ اس لیے بھی قابل عمل تھا کہ تھانہ میرے لیے کوئی اجنبی جگہ نہ تھی۔ میرے ذہن میں ہر تھانے کا وہی ایک نقشہ تھا جو میں نے بار بار دیکھا تھا۔ دو چار بجاری پیٹ والے غیر مستعد سب انسپکٹر جنم کے افسر کرسیوں میں دھنسنے ہوئے یا چھتے ہوئے کچھ کھاتے پیتے یا گھوم و چوروں پر اپنی فرعونیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چند حوالیہ ادا دیکھتے تھے کہ رولڈار دینے اور کچھ گانے گھر سوتے یا انٹیلیجنس انویسٹیگیشن کے ذریعے قاتلوں کا ایک بحری جہاز کے حملے کو قابو کرنے سے کہیں زیادہ آسان تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ازکار رفتہ انٹیلیجنس کے لیے انھیں یا اختیار کی علامت کے طور پر آؤڑاں دیو اور کی جانب ہاتھ بڑھائیں انھیں لائن حاضر کیا جاسکتا تھا۔

پانچ منٹ بعد میں تیار تھا۔ میں نے ایک خود کار دیو اور اپنے ایک جوتے کی تجربات میں ڈال دیا تھا۔ دوسرا میری جیب میں تھا۔ مجھے ابھی علوم نہیں تھا کہ بندہ گاہ کی حدود سے نکل کے میں کس سمت میں جاؤں گا اور کس سے ملوں گا۔ وہاں پر ایک کرام شیخ کو کاماب بھی گئی ہے۔ شیخ جانتا تھا کہ میں جیسے جرم پر تمام کو ان غلطیوں کا مرتکب تھا۔ چنانچہ میری بند گاہ کے علاقے میں تھانے کے لیے کے صورت حالات دیکھ سکتا تھا۔ وہاں بھی ان کی آزادی کی قیمت نقد چرکانے میں ہر موقع مل کے مطابق مجھے طاقت کا جبر پور

نہی والا تھا تاکہ اسے تباہی کا شکار نہ کر دے۔

جاتے ہی گل یا محسن آجائیں تو انھیں کچھ نہ بتائے۔ میں اس ہی لوٹ آؤں گا لیکن ہم میں سے کوئی بھی نہ اسے تو وہ دوست مہر کے ذریعے چاند بھائی سے رابطہ قائم کر کے کہیں بات اس تک پہنچا دے کہ ہمارے جو کرنا ہو گا وہ خود کس کا اور کس ہو جائے گا کہ وہ کس مذمتک ہمارا طرف دار ہے۔

کریم بولچ لاٹخ کے منقرضہ کہن میں مشنری کو... اور غداروں کی سمجھنے کی سزا اٹھتے رہا تھا۔ شاید اس نے مشنری سے پوچھنا چاہا تھا کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے اور اب تو اب میں مشنری کی زبان بولوں کے ویڈیو کی زبان سے زیادہ تیز چل رہی تھی جو ایک سانس میں پورا میٹرو پٹھ جلتے ہیں اور گاہک بے چارہ ہر گاہک کا بیچارہ رہتا ہے۔ مشنری کو اس لحاظ سے فوجیت حاصل تھی کہ اس نے غلطی انگلیش، چینی کے علاوہ اپنی فہرست میں ایسے کھلے بھی شامل کر لیے تھے جو ہم نہیں کھا سکتے تھے۔ شاید افریقہ کے آدم تو بھی نہیں کھا سکتے تھے۔

میری دخل اندازی سے پہلے ہی ایک دھماکے سے لاٹخ ہل گئی اور میں نے ہلٹ کر بلا اور دیو اور کی طرف ہاتھ بڑھا کر مگر پھر میں نے محسن کو دیکھا جس نے شرافت سے اترنے کے بجائے لاٹخ چھپ ماری تھی اور اندازے کی غلطی کے باعث سیدھا عرش پر لہڑتہ کر رہا تھا۔ گل ہالواس کے پیچھے ہنسی ہوئی آئی اور محسن کو اٹھانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا کے چکی۔ سخت نفقت زدہ محسن اپنی چوٹ کو چھپانے کے لیے زبردستی مسکراتا ہوا خود اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے یہ میٹرو دوسرے دیکھا اور اطمینان کا گلاب گراہاں لیا۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے کمرے تھے۔ چہرہ پر کامیابی کی خوشی کے دھنکے شوخ رنگ سب بتا رہے تھے کہ ان کا خطرناک مشن بغیر خون و پورا ہوا۔

”خوش آمدید گل و ببل۔“ میں نے اوپر اس کے گل میں پڑی۔ ”میرا انویسٹری نام ہے مگر یہ میں ہوں؟“ ”کیونکہ صورت سے ان کو نظر آتا ہوں میں۔“ محسن نے کہا۔ ”میں سے کہیں شیکر گزرا ہو نا چاہیے کہ میں نے اپنی غلطی استعمال کر کے تمہیں بھی بچایا۔“

”اوہ نہ...“ آخر میں آگے جب کوئی کام نہیں رہا تھا لوگوں کے شہیدوں میں شامل ہو گئے۔ ”وہ اچھا ہے۔ بولی۔“

”اچھا جی۔ ابھی میں بتا دوں گا ساری بات۔“ ”بتا دو۔“ ابھی بھی بتا دوں گی ساری بات۔ ”گل نے اس کی بات کاٹ کے کہ...“ ”اچھا اچھا۔“ محسن گھبرا کے بولے۔ ”تم جاؤ۔“

میں بات کرتا ہوں سکندر سے۔ ”میں نے کہا۔“ ”وہ کریم اور اس کی بیوہ آگے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”جا کے اس سے بڑی دلچسپی باتیں کرتی ہے۔“ ”جب گل جی جی تو محسن نے مجھے منتظر اس کی بے شری کاحال ستایا گل نے خود کو شیخ کی بیوی ظاہر کیا تھا اور اسے گرفتار کر کے لے جانے والے سپاہیوں کے سامنے دیدہ و داشتہ ایسا بدھ اختیار کیا تھا کہ وہ گل کو ایک آبرو ہانتہ عورت سمجھے تھے تو شکایت سمجھے تھے۔ جب معاملے کی بات چلی تو گل نے ہر ایک غلط پیش کش کر دی۔ وہ مجھے کہ مال کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی پیش کر رہی ہے۔

شیخ نے دیکھ لیا تھا کہ گل پیچھے آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ چار پولیس مین تھے وہ انتظار کر رہے تھے کہ کوئی ٹیکسی ملے تو مزید کو کھانے لے جائیں۔ اتفاقاً یا خوش قسمتی کہ وہاں صرف شیخ کی خالی ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ شیخ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ وہ دوسری چالی کمال رکھتا ہے۔ میں سیدھا ٹیکسی کی طرف گیا اور آگے بیٹھے کے قریب جیسے کس کے ساتھ بندھی ہوئی وہ چالی لالہ ملی۔ میں نے دوسری سے گل کو پولیس والوں کے پاس جاتے دیکھا مگر خود ٹیکسی سے دور کھڑا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گیارہ پچھا جاؤں گل ان سے کیا بات کر رہی ہے اس کا اندازہ میں اتنی دوسرے نہیں کر سکتا تھا کہ میں خود ہی دیر بعد جب انھیں ٹیکسی ملی اور سب اس میں بیٹھ گئے تو میں شیخ کی ٹیکسی کے قریب میں چل پڑا۔ گل کی کامیابی کا مجھے اس وقت یقین آیا جب میں نے دیکھا کہ پولیس والے مزید کھلے کر کھانے نہیں چارے ہیں۔ میں ان کے اوپر اپنے دریا ضے فاصلہ رکھتے ہوئے چل رہا تھا۔ میں قریب روکے بھی پھینکا کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں انھیں شک نہ ہو جائے۔ مجرم سب ہی ضرورت سے زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔ زیادہ فاصلے کا نقصان یہ ہو سکتا تھا کہ کہیں وہ وہاں میں نظر ملے اور میں نہ دیکھ پاؤں گا کہ بتا سکے کہ میں نے جو جتنا بھی وہ بندہ گاہ کے علاقے میں رہا تھا کہ وہاں تک کسی ایک گئی۔ انہوں نے اکرام شیخ کو باہر دھکا دے کر گرا دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ چلی گئی میں سے نہیں لڑھکا یا اب تو خود سوچ کر اس وقت میں پیچھے نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ شیخ کو ڈراپ کرتے ہی ٹیکسی چھروان ہو گئی تھی۔ میں نے پیچھے تو رفتار بڑھانے کا سوچا لیکن پھر اس خیال سے رک گیا کہ شیخ کو باہر بھیجے ہوئے انھوں نے آگے پیچھے ضرور دیکھا ہو گا۔ انھیں یہی ٹیکسی نظر آئی ہو گی مگر انھوں نے ٹیکسی کو بہت اس لیے نہیں دیکھا کہ مسافروں کے ساتھ کوئی ٹیکسی ڈرائیور اپنا

راستہ چھوڑ کر مجرموں کے پیچھے نہیں دوڑتا خواہ وہ کتنی ہی عین جرم ہو یا تو میں نہ دیکھے۔ اول تو یہاں رضا کار بطور پر قانون کی مدد کرنے کا جذبہ ہی نہیں۔ لوگ جانتے ہیں کہ اس قسم کے معاملات میں انصاف کی مدد کرنے والے کتنی نا انصافی کا شکار ہوتے ہیں۔ جرم کرنے والے کو جک جاتے ہیں مجرم کے گواہ بننے والے سزا کا نہیں۔ پھر یہ ٹیکسی ڈرائیور تو ویسے ہی۔۔۔ برلوات پولیس کی منسوب رہا میں شمار ہوتے ہیں۔ انھیں کیسے علوم ہو سکتا تھا کہ پیچھے آنے والی ٹیکسی خالی ہے۔ انھوں نے تو فرض کیا ہو گا کہ اس میں جو دو چار مسافر ہوں گے وہ اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی میں ہوں گے۔ چنانچہ ٹیکسی ڈرائیور کے مجاہدہ جذبات میں ہال آیا بھی تو وہ اس کو پھینچ کر لے دیں گے اور کہیں گے کہ ہم یہاں چھوڑا اس پکڑ کر پھرانے چھٹے میں ٹانگ اڑا کے ہمیں تھانے نہیں جانا۔ خیر یہ سب سوچ کے میں نے رفتار کچھ کم اور اکرام شیخ کے قریب جا کے اس سے کہہ کر دروازہ کھول کے پیچھے جانے میں ٹیکسی روکوں گا نہیں۔ اکرام شیخ سخت مشتعل تھا اور پولیس والوں کو اٹھ کر زبان میں گالیوں دے رہا تھا۔ آخر تھا تو اسی خاک سے اٹھا ہوا خیر کیا کہا ہے وہ چپا غالب نے۔ گھر وال نہیں پر وال سے نکالے ہوئے تو ہیں۔ میں نے اس کو کچھ ٹھنڈا کیا تو اس نے تیار کر پولیس والے گل کو کسی کوارٹر میں لے جانا چاہتے ہیں۔ گل نے تو انھیں معاوضے کی پیش کش کی تھی مگر انھوں نے گل کو ہی معاوضہ نہ کیا۔ چنانچہ مزید کوارٹر کے ٹیکسی سے خارج کر دیا گیا۔ وہ کہہ میں ہڈی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ٹیکسیوں بدعاش نہ صرف یہ کہ گل کی عزت نوٹ میں گے بلکہ بد میں اس سے وہ سب رقم بھی چھین لیں گے جو ہم نے گل کو شیخ کی رہائی کی قیمت چکانے کے لیے دی تھی۔ میں نے ٹیکسی کا نمبر تو پہلے ہی نوٹ کر لیا تھا۔ اور براہ راست نظر رکھے ہوئے تھا۔ شیخ نے اتنی دیر میں ایک کمال دکھایا۔ اس نے پیچھے والی سیٹ کی ایک بٹائی تو جانتا ہے کہ اس کے پیچھے فلا ہوتا ہے جس میں سے ڈنگی نظر آتی ہے اور یہ وقت ضرورت اس پور دروازے سے ڈنگی میں داخل ہونا بھی کوئی مشکل کام نہیں۔ شیخ نے اس کے اندر ہاتھ ڈال کے ایک پینٹ ڈکالا جو بلا شک میں لپٹا ہوا تھا۔ پینٹ میں اس کی پڑائی سب انسپکٹر کے دور کی ورنی کو جو دھنکی ہو چکی تھی۔ قابل استعمال بلکہ بہتر حالت میں تھی۔ شیخ نے چپٹی ہوئی ٹیکسی میں ہی اپنے پڑے آ رہے اور وہ ورنی پٹی۔ اتنی دیر میں آگے جانے والی ٹیکسی ایک کوارٹر کے سامنے ٹھہر گئی تھی۔ وہ خیر آباد رہائشی علاقہ تھا اور کوارٹر ماحمت غلے کے لیے تھے دو یا تین کمرہ کے چھوٹے چھوٹے کوارٹر۔ وہ مین بدعاش تھے میں نے

انہیں گل کو زبردستی گھسیٹ کر اندر لے جاتے دیکھا۔ مجھے اس ٹھیکسی ڈرائیور کی کتنی اور بے عزتی پر پیش آنے کا جو یہ سب کچھ دیکھ کے صفا خاموش تھا۔ ظاہر ہے اس نے بہت کچھ ٹھیکسی میں مناجا ہو گا گل کو آسانی سے قابو کرنے والی لڑکی تو نہیں ہے۔ اس نے شور مچایا ہو گا اور مزاحمت کی ہو گی لیکن ٹھیکسی ڈرائیور نے اس کی مدد کرنے کے بجائے بڑا امتداد دیکھو۔ بڑا متد، منور، بڑا مت، کہو، کے مقولے پر لاٹھیل کیا اور اپنی جان بچا کے نکل جانے کا سوچ کے خاموش ہو گیا۔ اب جیسے ہی وہ ٹھیکسی واپس ہوئی تو اپنے ریشہ صاحب نے اسے روک لیا کہ سواری کہاں سے آ رہی ہے؟ مجرم تو وہ تھا ہی پولیس کو دیکھ کے اور بدتماس ہوا۔

”سواریاں چھوڑنے آیا تمنا جناب...؟“ وہ بولا۔

”کیسی سواریاں؟“ شیخ نے کہا۔ ”زمانہ یا مروانہ؟“

”جی... وہ ایک عورت تھی...“

”کیا ہو گیا؟“

”سودا ہو گیا جناب... لڑائی نے کہا کہ اس کے شوہر چھوڑ دیا جلتے تو وہ ان کا جی خوش کر دے گی۔ ان دنوں ایک نے کہا کہ چھوڑ کیسے رس، قتل کا الزام ہے اس پر یہ لڑنے دیکھ لے کہ یہ جانے دار دات سے پکڑا گیا تھا۔ دیکھنے کی بجائے والے اب کہاں ہیں کہ تم ڈرتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم ملزم پکڑ کر لے آئے ہیں اور اپنا ایک بندہ وہاں چھوڑ آئے ہیں کہ کسی کو لاش کے پاس نہ آئے۔ ہم تھلے سے سفری سڑک پر آئیں گے، کسی انٹرکے ساتھ بڑی کشتی کے تم کو لینا دینا ہے واپس جانے کی بجھا رہا جو ساتھی ہے اسے بھی بیٹا بھجوا کر وہاں سے نکل آئے یا لاش اٹھا کر کسی اور جگہ ڈھونڈ کر دوسرے تھلے کے علاقے میں قتل ہو کر تو لاشوں کو ٹھکانے لگانا جانتے ہو۔ یہ دوسری تجویز ان کو لینا دینا آئی مگر انھوں نے کہا اچھا اگر تم بھاری گھر والے کو چھوڑ دین تو تم کیا ہو گی کہ عورت نے کہا کہ جو مانگو گے۔ بس جناب۔ اس کے بعد ایک نے ملزم کی پٹھوڑی کھولی اور اسے وہیں چلی گاڑی سے سڑک پر گر آیا۔ عورت چلتے ہی کہ یہ تم نے کیا کیا اس پر دوسرا کہ ہم نے تمھاری بات مان لی اور ملزم کو چھوڑ دیا۔ پہلے نے کہا اب تم اپنا بندہ پورا کرو۔ ہم اب تم کو مانگتے ہیں۔ ہاتھائی توں کر دو بس عورت نے جب شوہر یا تو ان دونوں نے اس کا منہ بند کر دیا۔ اور....“

”اور تم اُنکے بچھوڑ کی طرح سب دیکھتے رہے سب نے رہے۔“ شیخ نے اس کی منی والے کے دوسرا چھاپا مارا۔

”میں کیا کر سکتا تھا جناب... ان کے پاس ریلواریچھ اور پولیس سے ہم کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں؟“

شیخ نے اسے میرے حوالے کیا اور کہا کہ اگر یہ بدعاش بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے گولی مار دوں میں نے اپنی چیچی کو اڑ کر سامنے میں روکی تھی جو اسے نظر نہیں آ رہی تھی میں ایک طرف تو ان کی گنگوٹس رہا تھا۔ دوسری طرف کو اڑنے بندہ دروازے کی بھری سے اندر جھانک رہا تھا۔ وہوں پولیس میں کے ساتھ فریڈا ملی شتی لڑ رہے تھے گل کو باقاعدہ لڑنا تو نہیں اس نے بے قاعدہ مقابلے میں جھانک کر مال خراب کر رکھا تھا۔ انہوں نے کئی بار گل کو بچھڑنے کی کوشش میں لایں کھائیں گل کے گرفت سے پھیلنے کی طرح ٹرپ کر نکل گئی اور پلٹ سے اس کسی کو ہاتھ دیا۔ کسی کو کاٹ لیا۔ وہ ایک بھری ہوئی شتی طرح مقابلہ کر رہی تھی۔ مجھے حیرانی تھی کہ اس نے شوہر کے کو ہلانے کا کیوں نہیں سوچا۔ شاید وہاں دونوں بدعاشوں:

نہایت کرنا چاہتی تھی کہ جسے وہ کوئی عام قسم کی کمزور عورت سمجھ بیٹھے تھے، وہ ناگ منی ہے اگر وہ اپنا نام بتا دیتی تو ان کے ویسے چھوٹے بھوت مٹانے، اپنی بار بار کی ناگامی انھیں شرمندہ دہشتی کر دیتی تھی اور آتش شوق کے ساتھ آتش غضب کو بھی ابھار کر دیتی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ معاملہ دسے بڑھ گیا تو وہ ناگ منی کو ریواؤنک کے دستہ دار کے ہاتھ آؤٹ کر دیں گے۔ اس وقت وہ قانون کے محافظ نہیں تھے۔ جوں کے مارے ہوئے سب کو بھی میرے پیچھے لے چکے تھے۔ ناگ منی کے پیڑھے بھی اس جدوجہد میں بیٹھ گئے اور اس کے ہم چہرے خنڈیں آنی تھیں مگر پولیس والوں کی تو دوری چھٹ گئی تھی اور ان کے چہروں اور دھڑکن پر خراشوں کے نیل الگ تھے اور گل کے دانوں سے کاٹھے جانے والے لمبے اور وٹاٹاٹاٹ الگ۔ جب اکرم شے نے ان کی ڈرائیو کو میری تحویل میں ریواؤنک لے ریواؤنک لایا اس کی ڈرائیو کو سمجھا دیا کہ اب وہ قانون کا ساتھ دے کر رہی رہنا سکتا ہے۔

”جناب... مجھے معاف کر دیں... میں غریب مٹی کی چلائے والا... کسی گڑی میں نہیں پڑ سکتا“

اب میں نے اس کے ہاتھ رد کر دیا۔ ”غریب! اب غریب بن گیا، تیری تو... تو سوتیلی ہے مجرموں کا سب کے ساتھ مل کر تو یہی خواہشیں شریک تھا... تو نے اپنی نیکی واردت میں استعمال کی۔ اب تو ایک ہی صورت ہے تیرے بچنے کی، تو کو کوئی گواہ بن جا، ورنہ ان کے ساتھ تو کبھی کم سے کم سات سال کے لیے اندر پھوگا“

جب اکرم شے نے دروازے پر رنگ دی تو اندر سے آنے والی سب آوازیں ایک دم معدوم ہو گئیں۔ جیسے کہ ابجد میں گلے نہ بتایا، ان دونوں پر تو سخت طاری ہو چکا تھا۔ گلے نے پہلی کی طرح ایک کے گڑھی کھول دی ہیں اور اکرم شیخ اس نئی ڈرائیو کے ساتھ اندر داخل ہوئے تو دونوں کا ٹیبل خود اپنے ہی قزم کی تصویر بنے ہوئے کھڑے تھے۔ انھیں ایک منٹ کے لیے بھی ٹنک نہیں ہوا کہ اپنا کاک اندر آجائے والے اسلاب انسپکٹر دی ملزم بھی ہوسکتا ہے جسے وہ پتھری ڈال کے لائے تھے۔ اور ابھی مشکل سے دس منٹ پہلے سڑک پر پھینک چکے تھے۔

”سیدھے کھڑے ہو جاؤ، ہاتھ اوپر اٹھاؤ“ کے شیخ نے کرکے کہا۔ ”بے اختیار تو... بے اختیار... کھٹو... کون ہے یہ عورت؟“

اس وقت گل نے خوب اوکاڑی کر لی۔ وہ ایک دم شیخ کے پاؤں پر ٹپکی اور رونے لگی۔ ”تھانیدار صاحب! یہ مجھ اور میرے شرم کو گھر سے پوری کے ادا میں رکھ لائے“ تھے۔

”جھوٹ... جھوٹ کبھی ہے یہ...“ ایک نے ہرکلا کے کہا۔

”اپنی جواس بند رکھو“ شیخ نے گرج کے کہا۔ ”میں امد آنے سے پہلے سب دیکھ چکا تھا کہ کہاں کیا چور ہے“

”انھوں نے میرے شوہر کو راستے میں مار کے چھینک دیا“ حضور اہل نے زار و قطار رونے کی کوشش کی اور ناکام رہی۔

”اس کی لاش چلتی گاڑی سے گرادی...“

”اجی صاحب! اوّل مہر کی جھوٹی ہے یہ... تیرا ذوق، مہر کا عورت“

”دوسرا پولیس میں دانت پیس کے بولا۔ ”وہ تو خود ہی چلتی گاڑی سے کود گیا تھا“

”اور تم اس کے نقاب میں جانے کے بجائے اس عورت کو بیل لے آئے؟“ شیخ نے خاص پولیس اسٹائل میں اس کو بترتی گاڑیوں سے نواز کے ایک ہاتھ مارا۔ ”کیوں...؟ کیا تمہیں قتالے کا راستہ معلوم نہیں تھا؟“

”دونوں پولیس والے صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے منت سہاحت پر اتر آئے۔ ان کے لیے اپنے برہم سے اٹا کر نیا عماما نامن ہو گیا تھا۔

”سر، یہیں معاف کر دیں... ہم...“

”اپنی بیٹی اُمارو“ شیخ نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”تمہارے خلاف بہت تحقیق چارج ہیں۔ اعدا، اقدام، قتل، ورائض میں غفلت، مجرم جھٹکے کی سازش۔ یہ سبھی دلائل تو گواہ ہے تمہارے سب جرائم کا...“

”چلو... درمست کرو...“ بیٹی امارہ کے میرے توالے کرو“

”انھوں نے آخری بار ہاتھ پٹنے اور پاؤں پٹنے کی کوشش کی مگر شیخ کے سخت رویے کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنی بیٹی بیٹی امارہ کے مجھے تقاضی دی۔

”یہ ریوالور کہاں سے آیا تمہارے پاس؟“ شیخ نے ریوالور لے کے ریوالور کو غور سے دیکھ کر کہا۔ ”تم ریوالور رکھنے کے مجاز نہیں۔ اور یہ تو سروس ریوالور بھی نہیں ہے۔ گویا تم پر ناپائز اسلحہ رکھنے کا الزام بھی بنتا ہے اور میری وارڈ اینس کی ہول کی قسم نے اس سے“

”مجھ رہ مجھ سے غلط ہوا“ ان دونوں کو تھکلی ڈال دو۔

”دونوں کے سیدھے ہاتھ ایک ساتھ باندھ دو“ ایک ہی تھکلی سے پھر تم قانون کو لے کر پولیس بیڑا من چلو“

”ہڈ آفس کے نام پر وہ چلے جانے لگے۔ ان کا خیال ہوگا کہ یہ معلوم سب ایکٹو پورٹراٹور ہو کر پورہ ہو کے ملنے جاں کی طرح چھٹ گیا ہے ان کے اپنے قتالے شیخ کے ٹھیک ہو جانے کا اور اس کے بعد ان کا خارج صاحب کو دیکھ کر کی گئے

تاکر تھلنے کی نیک نامی پر حریف نہ آئے۔

”تو کوئی بلو راست دکھائی جی کافر کے سامنے پیش کروں گا۔“ شیخ نے اعلان کیا۔ تاکر تھیں صبح سڑا لے کوئی پھر دھن انداز کر کے دیکھے۔

ابھی تک ان دونوں آؤ کے پھٹوں نے یہ نہیں سونا تھا۔ یاسو جاتا تو پوچھا نہیں تھا کہ آخر پوس ار کا ب جسم سے بھی پہلے کیسے پہنچ گئی؟ پولیس کو رپورٹ کرنے سے دی اور یہ.... سب انسپٹر کماں سے نازل ہو کر پکڑ چڑھنے کے شیخ کی ہدایت کے مطابق انھیں ایک ساتھ قفل کیا اور زنجیر شیخ کو تھام دی۔ ان کی بیویوں میں سے شہنشاہ کا رڈ اور کچھ مال غنیمت بھی برآمد ہوا تھا جو یوں نے اپنی ٹول میں لے لیا۔

”تم چپ لے کر جاؤ۔“ شیخ نے کہا وہیں اسی جگہ میں پیتا ہوں جیپ وہیں چھوڑ دینا۔“

جیپ کے حوالے نے انھیں چت کر دیا۔ انھوں نے فرض کر لیا ہو گا کہ راستے میں جیپ گل نے شور کیا تھا اس وقت یا جیپ انھوں نے ملزم کو نیکی سے خارج کیا تھا تو پیچھے سب انسپٹر جیپ میں آ کر اٹھ اور وہیں سے پیچھے لگ گیا۔ آؤ کی جب شامت آتی ہے تو بلا میں آسمان سے بھی نازل ہو جاتی ہیں اس کے بعد میں تو گل کے ساتھ باہر آ گیا۔ وہاں شیخ کی نیکی موجود تھی ہم اس میں بیٹھ کے بھاگ آئے۔

محسن کی بات ختم ہوئے تک میں نے کہیں مداخلت نہیں کی تھی اور اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن اب مجھ پوچھا پڑا۔

”وہ شیخ صاحب اب کہاں ہیں؟“

”مجھے کیا معلوم، محسن نے کہا۔ اس کی نیکی کو ہم نے وہیں کھڑا کر دیا تھا جہاں پہلے تھی وہ آئے گا تو لے جائے گا۔“

”یہ کسی قدر عقلمندی کی بات ہے کہ آپ نے جہاں نہیں پوچھ رہا ہوں کہ ان دونوں پولیس والوں کو لے کر وہ کہاں گیا؟“

”کچھ بتایا تھا اس نے؟“

”محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ سب کے سامنے کیسے بتا سکتا تھا لیکن پڑا وہ اسی کا باپ۔ ان سے ٹھنڈا جانتا ہے۔“

”وہ پھنس کیسے گیا تھا؟“

”آپ نے اس کی عقل کو گھاس چرے نہیں جھپٹا تھا، محسن بولا۔“

”اس کو کم دیا تھا کہ میاں جاؤ، پہلے پھنسنے میں ٹانگ اڑاؤ۔“

وہ سالانہ جوں کا پتھا کریم، خود تو آگیا خیریت سے، شیخ صاحب اس کو تلاش کرتے کرتے جا پہنچے لیکن اسے قتل تک، جہاں ان کا کشہ ستم خدا نے مجازی مقول پڑا ہوا تھا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ جالے دار واد پر رپورٹ

کر اور پچھلے جاؤ یہ میں نے کہا یہ کریم نہیں ملا تھا تو پھر آجاتا۔“

”کیسے آجاتا۔ پولیس والا ہے نا جرم کا سراغ لگنے پر سیدھا وہاں جا پہنچا کریم کے کسی جاننے والے نے کہا کہ وہ وہاں ابھی ادھر گیا ہے۔ پوس میاں کے ساتھ۔ وہ پہلے کی بات کر

تاجب کریم اسے قتل کرنے گیا تھا شیخ سمجھا کہ وہ بے وقوف ہوا۔ میاں کے گھر جا پہنچا ہے اور معلوم نہیں کیا ارادے رکھتا ہے۔ وہ اندر گیا تھا کریم کو لانے کے لیے مگر باہر نکلنا خود کو نسیب ہوا۔ اچانک وہ اندر اندر آگئے۔ میں ایک تو تھا۔ پوس میں بھی خسر جس کی اس عرصے پر توجہ ہو چکی تھی۔ دوسرے کو تو پوس کا قرض خواہ تھا۔ انھوں نے کریم کو پکڑا اور شور مچا رہا اور اگر کی جھگڑوں اور کڑاؤں سے لوگ کپڑے کھڑوں کی طرح نکلے اور جمع دیکھ کے کوئی آدمی پولیس والوں کو بلا جو ڈیوٹی ختم کر

لوٹ رہے تھے۔ آگے آپ جانتے ہیں تفصیلات کے لیے پھر فرمائیے۔ اکرام شیخ صاحب خود آپ کو ریفٹ کریں گے۔“

”اسے ساتھ لے کر آتا تھا یار، میں نے کہا۔“ اب یہ بنا انتظار، آخر وہ کیا کرے گا ان کے ساتھ؟“

”وہ جو سکند نے پورے کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ وہ ان کا ہاں بنا کے چھوڑ آئے گا۔ یا بہت خفتے ہیں ہوا تو کریم کی زبان میں کا جنازہ بنا کے جاک آئے گا مگر کوئی کوئی بات نہیں۔ شیخ کہا کرنے والا نہیں ہے۔“

محسن کی بات کچھ دیر بعد صبح ثابت ہو گئی۔ شیخ اس پولیس سب انسپٹر کی وردی میں کپڑے وقار کے ساتھ چلتا ہوا سیہ علاقہ پر آگیا۔ ہم دونوں اسے کھورتے رہے۔

”گل کہاں ہے؟“ اس نے ہاتھ مار کر پوچھا۔ ”مجھے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے۔۔۔ اور اسے بہادری کی سند بھی دینا ہے۔“

”پہلے اسے کچھ سے سند جاقت تو وصول کر لیں۔ محسن ہاتھ گھما کر کہا۔ مگر شیخ غوطہ ماریا۔“

”یار مگر تو کوئی کشتی بھی مگر کچھ تو نہیں اپنی خوشی تو نہیں گیا تھا۔ مجھے بھی بھاگایا تھا اور اگر میں جس گیا تھا تو اس میں سے نکل بھی آیا، اپنی پراویٹ لیاقت و ذہانت اور دلدادہ ہمت کا ملے کر۔“

”شیخ نے ذہانت نکال کے کہا۔ تم نے کیا کیا؟“

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ محسن چراغ پا ہو کے بولا۔“

”تم نے صرف میری نیکی چرائی۔“ شیخ نے اسے ڈانڈا کر کے بولا۔ ”اور سب تو گل کہیا۔ اس نے بات کی پولیس والوں سے۔“

کا مقابلہ کیا اور باہل اکیلے ہونے کے باوجود ان کے قابو میں آئی، کسی کو مدد کے لیے نہیں بلایا اس نے۔۔۔“

میں نے پلٹ کے دیکھا تو گل کا چہرہ خوشی سے دمکتا نظر آیا۔ میں بھی گراقتی تعریف شیخ اسے سامنے کے لیے کر رہا تھا۔

”لوگ سامنے والے نہیں ہیں جہاں جی یا گل نے قریب کے کہا۔ ان کی کھوپڑی میں تو وہی ایک بات ہے کہ عورت ذات کچھ نہیں کر سکتی۔ ناخن اٹھل پھٹتی ہے۔ ناخن ہی ہسی عقل تو ہوتی ہے اس کے پاس۔“

”اچھا ہاں، ہم دونوں عقل مند ہم لوگوں کے پیٹے۔“ میں نے جتنا بے کرا۔ اب یہ بتا کر وہ دونوں کہاں میں؟“

”وہیں اسی کوارٹر میں۔“ شیخ نے قہقہہ مارا۔ ”میں نے ان دونوں کی زچہ پکڑ کے کہا کہ ملو۔ وہ بھی ایک قدم ہی لگے بڑھتے تھے کہ میں نے پیچھے سے دونوں کی کھوپڑی پر تانکے لٹا دیے اور ملا۔ وہ وہیں بے بیٹ گئے۔“

”اس شیخی ڈرامیور کے سامنے؟“

”نہیں۔۔۔ وہ میں بتانا بھول گیا۔“ شیخ نے سر ہمایا۔ ”اسے میں نے پہلے ہی چلا کر دیا تھا۔ خوب ڈانٹ ڈپٹ کے بعد کہ جاؤ، آہ تیرے گلے میں چھوڑ رہا ہوں، گلہ ان دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ کسی سے کچھ کوئے تو خود چھوٹو گے۔“

انھیں تو میں صرف ناچار ملو رکھنے کے الزام میں اور مار پیٹ کے جرم میں اندر کر دوں گا۔ ان کا کہیں بنایا تو وہ بیچا سے میاں بیوی خواہ خواہ لپٹ میں آئیں گے۔ شیخی ڈرامیور تو میرے ہاتھ چوم کے بھاگ گیا تھا۔ وہ دونوں کچھ ڈرامیور ہو چکے تھے کہ شاید ڈانٹ چھڑک کے بعد میں انھیں بھی چھوڑ دوں گا اور شاید میں نے ڈرامیور کو ایسے لیے ڈرامیور ہے کہ اس کے سامنے ملزموں کو رعایت دینا ایک پولیس افسر کے لیے مناسب نہ ہوتا۔ انھوں نے بعد میں کہا کہ میں کچھ جھگڑے کا کیا کر رہا۔ میں نے ان کو مزید ذہل کیا کہ تم بہت اچھا نیل رکھتے ہو گئے۔“

اب میں سے ایک کہنے لگا کہ اب آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ ہم نے کوئی جرم کیا ہے۔ دوسرا بولا کہ آپ آئے کدھر سے ہیں۔ اور اب ہم نے کیا کیسے جانی گئے۔ میں نے کہا کہ میں تو اتفاق سے آگیا تھا۔ اپنی جیپ میں ہیڈ کوارٹر واپس جا رہا تھا کہ میں نے کسی سے ایک آدمی کو باہر گرتے دیکھا اور کسی کے پیچھے لگ گیا۔ میں مادی کی جی صاحب کے ساتھ ہوں اور کسی لیے تم کو تھامے تھے۔ تم نے جہاں جا رہا ہوں۔ وہاں ثبوت وغیرہ تم خود بنائیں گے۔ جیسے تھے تم نے تم جانتے ہو۔ انہی اہل بنیلا اسٹن کا ریا اور،

تھامی ہوئی ہوئی وردیاں اور یہ غلیظ یہ تھا کہ جرم کا فاصلہ ثبوت ہے۔ میں ان کو لے کر تم نے ایک دوسرے کو مارا اور اگر میں اتفاق سے وقت پر نہ پہنچ جاتا تو ایک معذور مارا جاتا۔ لے جاؤں گا میں تم کو ہیرا، جلوس کی صورت میں تاکہ خلق خدا بھی تماشا دیکھے اس

کے بعد وہ بالوں ہو گئے تھے۔ انھیں ناک آؤٹ کرنے کے بعد میں نے ان کے پیٹے سے یہی یونیفارم جوتے وغیرہ سب آمار لیے تھے اور ان کو اچھی طرح ہانڈھ کے اور سیل کر کے ڈال دیا تھا۔“

”کس کا تھادہ کوارٹر؟“

”معلوم نہیں، لگت تو کسی کا بھی نہیں تھا۔“ شیخ نے کہا۔

”وہاں کوئی نہ آیا تو۔۔۔ وہ مر جائیں گے۔“

”مر جائے تو جس کد جہاں پاک۔“ شیخ بولا۔ ”دیسے میرا خیال ہے کہ کوارٹر کو کھلا پاکے کوئی جھانکے کا ضرور آج نہیں توکل۔“

”اچھا میاں تھا نیدار اب تم خیر سے سدا رہو۔ محسن نے کہا۔“ ہم بھی چلے پوریں۔ آج نکلنا ہے۔“

”ہاں تم پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئے تھے۔ تم ہی عام موجودگی میں ہو کر سدا رہنا۔“ میں نے کہا۔ اس علاقے میں اگر کسی نے لے کر آؤ تو بہتر ہے۔“

”فی الحال تو میں ہفتہ دس دن رپورٹ رہوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ نیکی کو کہیں بند کر کے لا پور عطا ہاؤں تب وہ دونوں کا شہل پوس میں آئیں گے اور رہائی پائیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ ان کے ساتھ کیا شرناک ڈراما ہو گیا۔ سب انسپٹر جیپ تھا کوئی بے ملک آمار کے لے گیا۔ ظاہر ہے وہ میری ہی نہیں گل کی اور محسن کی تلاش بھی کر رہے گے۔ تم دونوں کو محفوظ رکھو گے، ہفتہ دس دن بعد میرے لیے بھی خطرہ کم ہو جائے گا۔ پھر بھی میں کسی اس طرف نہیں لاؤں گا۔“

میں نے کہا کیا انھیں معلوم ہے کہ تم ایک شیخی ڈرامیور ہو؟ شیخ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ابھی تعینش کہاں شروع ہوئی تھی۔ اب وہ جاہل گے موش میاں مڑ دیکھیں کی تعینش کے لیے تو انھیں بہت سے مزلوں کے نام معلوم ہوں گے مثلاً کریم بلوچ اور اس کی ٹوٹی حسد، کیا نام ہے اس کا؟“

”مشری وہ پہنچ گئی ہے یہاں ہمارا کھلنے اور یہیں اپنا پکا ہوا کھلنے کے لیے۔“ میں نے کہا۔ ”لوگ؟“

”ذرا بلاؤ اسے یار، پھوڑی سی دل لگی ہو جائے۔“ شیخ بولا۔ ”ابا ہاں ذرا کریم کو سمجھا دینا کہ ساتھ نہ آئے۔“

”اچانک میں جلتے۔“ محسن نے چند قدم کا فاصلہ کے مسند نیکی کی طرف کیا اور ہانک لگا کر۔ ”اے مشری، مشری اچاں اور پولیس آئی ہے۔“

”نچے سے ایک اسی بیخ سانی دی جو اسٹیم انجن کی سیٹی محسوس ہوئی تھی۔ چند منٹ انتظار کرنے کے بعد محسن خود نیچے گیا اور اسے پکڑ لایا۔ کریم اس کے پیچھے رہا۔“

”پل ادھر جواب دے تھا نیدار صاحب کو۔“

”مشری غرق کراپ رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ ایسے ہی

لڑتے ہوئے پٹ سے گر کر مر جائے گی۔
”سید بھٹی ہو گیا، کیا نام ہے تیرا؟“ شیخ نے کہا ”نویسوی
ہے ناؤٹن میاں کی“

”ہائے ہائے تھا نندار صاحب، اللہ کا عذاب نازل ہوا
پر، وہ کہاں سے ہو گیا میرے قصم؟“ مشتری نے ہاتھ اٹھائے کہانی
دی؟ وہ تو رُک کا میاں تھا... ہے... میری سن کو باگل کر دیا ہے
میں کھا یا اب کچھ پر نظر فرما اس کی۔ اسے کریم نام ہو، جو بھی نوکچہ بول
بتا، انھیں کہ وہ بدھا چوس، کیا وہ میرے لافنی کتابچہ میں پیر کا نے
بیٹھا تھا۔“

”اور تم نے اسے قبر میں دھکا دے دیا قتل کر دیا۔“
مشتری نے ایک چٹن ماری ”میں نے، قسم لے لو تھا نندار
صاحب، خراب ناما ہوا ہے۔ وہ خود مر گیا ہو گا کسی اور کی
اسے اتنی ہوئی۔ اسے ناس پیچہ کریم، بتا، کیا تو نہیں کہ تو لایا ہے
مجھے بیاہ کرنے کے لیے؟“

”ابھی میرے کو کیوں چھناتی ہے، کریم منہا یا، تو خود بولا
میرے کو کریم مجھ سے شادی بنا۔ میرے کو بوجھ کے چلے۔“
”اسے بے سہا ہے خیرت، مشتری کے ہاتھوں کے ٹوٹے
اڑ گئے۔“ میں نے کہا تھا تجھ سے اسے میں تو تیرے ساتھ ہی تھی
کل سے... نہیں نہیں... پر سول سے... کیوں صاحب جی ذرا
آپ ہی بتاؤ تھا نندار صاحب کو۔“

”بھی میں تو اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا، میں نے کہا۔
”اسے تو کیا اب مجھ بوجھ کو... چھانسی ہوگی؟ وہ جلاتے
لگتی تھی۔“

”بوجھ؟ ابھی شادی ہوئی نہیں تیری، بوجھ کیسے ہو گئی تو؟“
شیخ نے کہا ”مان یا کر موشن میاں تیرا گھر والا تھا؟“
مشتری نے ایک دم ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ اسے اپنی غلطی
کا احساس ہو گیا تھا جس سے سہی ضبط نہ ہو سکی اس کے ساتھ ہی
محسن ہنس لگا مشتری نے تیرا ہونے کے کریم کی طرف دیکھا۔

”پہل اب شیخ جا۔ ابھی تیرے کو سامن کر دیا ہے۔ اپنے
اس تھا نندار نے، کریم نے سب کچھ بھی کہتے ہوئے کہا۔
مشتری کی کچھ گئی کریم کا ہنسلے سبب نہیں ہو سکتا۔ ار۔

کارا ایک دم جڑھ گیا۔ کریم اس کے بدلے ہوئے تو رو دیکھ کے
بھاگا۔ وہ کریم کے پیچھے مڑی۔ اسے ندانی خوار، ستیا ناس ہو تیرا
مجھے آؤ تیرا ہاتھا... مجھے چھانسی چڑھا تھا... بھڑک رہی ہو،
تجھے چھانسی کیسے... مجھے کہتا ہے... میں بھگے کے لائی ہوں تجھے
ہم سب کا ہنستے ہنستے بہت مرال ہوا ہو گیا مشتری کو غصہ
ہم سب پر کیا ہو گا سگرا اس کا نشانہ بنا کریم بولیں۔ ہم سے اسے جو

کہنا تھا، وہ سب کریم کو سنا پڑا۔ ان کی فتح فتح نسبت دینے کے
سے سنا دیتی رہی۔
”دو بول عجیب چیز ہیں۔ میں نے کہا۔“

”رب نے ملائی توڑی۔“ میں نے کہا اور یوں محسن کیلور
کے لیے ہو جیو۔ سی ہو کر کیا خیال ہے اپنے اور میرے باسیر
ی حد تک اس کے جذبات کا یہ انداز پڑی لائی ایک طرف تھی
تھا ان حالات کا جن سے گزر کر وہ دھچک لگا، بانو تھی، عکس لگا
سفر کا آغاز بھی ایسا ہی تھا، مصمم خواہشات اور انمول خوشیوں کا
وہ دور جب چاہت ہی بہت تھی اور چاہنے والے بھی بہت تھے
شفقت محبت اور غصہ سب حاصل تھا۔ مجرورہ ناگ کی تھک
زیر پٹ پڑنا زلفت مجھے راستوں پر سرگرداں رہی۔ اور یہ
عمر تھی جس میں رنگ، خوشبو اور خوشیوں کے جاوگر خواب لگا
دلے لے لے لگاتے آتے تھے۔ جذبات کے سات رنگ لگا
دل میں ایک روشنی کو جگا دیتے تھے، آنکھیں منظر کرتی تھیں
دل کسی کے نام پر دھڑکتا چلتا ہے، مگر یہ سافت کیوں کی
بو جھاڑ، موت کے خوف، انداموں کے آزار اور تنہائی کے غم
سے لڑتے گزر رہی تھی کہ اچانک ہم نے اسے اپنا لیا اور
نے اسے بھر لیا، ہاں بونے کے اس پران خوابوں کے بند دیتے
کر دیے جو ناگ کی کے لیے شجر موعود ہو چکے تھے۔ ابدال کے بار
ان در یوں کو بند کرنے کی بہت کس میں تھی۔

اچانک شیخ نے کہا ”تو اب میں بولوں؟“
اور غامضی کی وہ بوجھل چٹان جس کا بار ہم سب آنے لگا
لٹھے اور پھر اس کے بعد والے لٹھے کو منتقل کرتے جا رہے تھے
لیکھت ہمارے اوپر لگتی۔

”ہاں...“ میں نے کہا اور دوسری جانب دیکھنے لگا ہم
سمندر میں وقت کی طرح ناقابل تصور مدت تک پھلنا ہوا تھا۔
”میاں ایلانہ کے میاں کی کریم گا یارو؟“ شیخ نے اٹھنا
انداز میں کہا۔

”تم یہاں کی فٹے داریاں سنبھالو گے؟“ محسن بولا ”میاں
کے حالات اور سائل سے یہاں باخبر رکھو گے؟“

”میاں مجھے نہیں، تم کو مگر گنا چاہیے۔ تمہارے بڑے بچے
ان کو تھا کر زیادہ ضرورت ہے؟“ شیخ نے کہا۔

”دیکھ تو ہم سب ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔“ محسن
بولا ”مگر میں سمندر کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ شملہ کا خیال مجھے
ہے لیکن وہ بہت محفوظ ہے۔ اس کے ساتھ رہ کر میں بھلا کر
ہوں۔ میری ذات اسے قربت کے احساس کی خوشی تو دے
ہے اس سے زیادہ محفوظ آرام نہیں کر سکتی جو اسے پہلے ہی حاصل

”جہ تو یہاں ہو۔“
”میں ایسا خیال رکھنا اور محتاط رہنا۔“ میں نے کہا ”وہاں کتے
رہا کہ ہر زندگی کی آخری سرحد تک ساتھ چلتے رہیں اور یہ جو خالص
آن در میان ہیں مکہ نہ ہوں۔“

”مگر ایلانہ کھو گے نا؟“ وہ اب داس سوچتا تھا۔
”ہاں، تم یوں فون کرتے رہنا، شملہ اور منظر کے ذریعے تمہیں
بہر خیریت معلوم ہوتی ہے گی۔ ہم جہاں بھی ہوں گے تمہیں
ہمارا پتالے گا کسی نہ کسی ذریعے سے۔“

”مجھے ناز کی محسوس ہے،“ وہ بولا ”آج کئی دن سے اس کے
خیال نے سو نہ گائے اٹھتے بیٹھتے میرا لقب شروع کر دیا ہے
اور اس خیال سے اندیشہ کا اشتہ ہے خوف میرے تصورات
میں شال ہے اور میرا دشمن ہے۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے کہ ایک
بھائی کی حیثیت سے شیش ناگ نے اپنی بین کے لیے بہت زیادہ
کیا، یہاں تک کہ اپنی زندگی بھی اسے دے دی۔ میں نے کیا کیا؟“
”ایسی خیریت کی باتیں مت کرو۔ وہ ہماری ذمے داری بھی
ہے، خدا وہ وقت نہ لائے لیکن کبھی ایسا ہو گا کہ مجھے رالہ اور نازو
میں سے کسی ایک کو بچانے کی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ تو میں یہ
ہانا بول کر رالہ کے لیے کچھ نہ کر سکوں گا خود رالہ بوجھے پٹ
جائے گی اور کے کی ناز کو لے جاؤ ورنہ ہماری محبت پر خوشخبری
کا ازام آجائے گا۔“

”ہم میں سے کون ہے تو ایسے الزام کے ساتھ زندگی سے
مکھو تا کرے؟“ محسن بولا ”ہم سب کچھ ہیں مگر خود عرض نہیں ہیں
صرف اپنے لیے جینے کا سوچتا نہیں جانتے۔ مجھے پورا اعتماد ہے
کہ شملہ کی حفاظت مجھ سے بہتر طور پر کر سکتے ہو اور ایسی ہی
صورت حال سے تم کو وہ چار پونا پڑے تو تم مجھے اور سکندر کو،
غالب کو نازو اور گل کو یہاں تک کر کریم اور مشتری کو پہلے
پکاو گے۔“

الزام شیخ چپ کھڑا رہا پھر اس نے کہا ”ناز کے ساتھ
غالب بھی تو ہے۔ وہ ایلی جیسے ہے، تم بھی نیچو کے تو رالہ بھی
ل ہائے گی، تم سب کچھ ہو جاؤ تو مجھے بالائینا، میں شملہ کے
ساتھ آبا دل گا۔“

”شملہ کے ساتھ؟“ محسن نے کہا ”اس کا وہاں کیا کام؟ نہ
ہم اسے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں نہ لگا۔“

”میاں بھی تو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ اس کے رہنے
کا نظام وہاں کیوں نہیں ہو سکتا۔“ منجی اتنا برا شرم ہے ہر شملہ
تو امرد مذہب کے لوگ رہتے ہیں۔ انھی میں شملہ بھی رہ سکتی
ہے۔۔۔۔۔

”لیکن اس کا فائدہ؟“ محسن نے پڑے کہا۔
”فائدہ یہ کہ ہم سب ایک ہی سرحد میں ہوں گے۔ سرحد
ہمارے درمیان حامل نہیں ہوگی تو ہم نے بھی رہیں گے۔“ شیخ
نے کہا۔

”اچھا... دیکھیں گے بعد میں۔ ابھی سے کیا کہہ سکتے ہیں کہ
کی ہو گا اور کیا نہیں ہوگا۔ تم جاؤ۔“ محسن نے کہا ”خدا خدا...“
”خدا حافظ،“ میں نے کہا ”ہم کامیابی کے معجزہ وار جا رہے ہیں،
ہمیں کبھی دل کے ساتھ رخصت مت کرو۔“

شیخ چلا گیا، ہم سے گلے مل کے اور بہت جلد پھرنے کی امید
دے کر۔ وہ خاصا قوی ہو رہا تھا چنانچہ اس نے میں بھی افسرہ کیا۔
گل نے تو باقاعدہ روکے او داعی منظر کو لنگا بنا دیا۔ اس کی
ہم سب سے وابستگی کی عمر زیادہ دھڑکی سگرا سنی زندگی کے نئے
دور کا سہرا بنا تجر پر لائی گا بانو پر بھی ہوئی ہے سہی، نفرت اور ایلی
کی گرد کو صاف کرتا جاتا تھا اور اس کے وہ دوسرے پسینی ہوئی
تاریکی کو مٹاتا جاتا تھا جس کے نیچے اس کی شخصیت کا سارا اجلا پن
تھا۔ ڈالو ناگ مٹی کے اندر کی عورت تو گل بانو تھی جو کسی طرح بھی
رالہ، شملہ یا نازو سے مختلف نہ تھی، جب وہ ہماری بے عرض
دوستی، ہماری بے یار زندگی اور بے پایاں بھونکوں کے جذبات کو
دھکی مٹی تو اپنے جذبات پر قابو رکھنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا
تھا کیونکہ یہی اس کی زندگی کے پھڑے ہوئے خواب تھے۔

دوہر کا کھانا بہت دیر سے کھا گیا اور بڑا...
گی۔ اس سے سنا مشتری کی غامضی دل لگی ہوئی جس...
وقت میں داروین ملجی کی حیثیت سے پڑنے والیاں سنبھالیں تھیں۔
اور بہت اچھا سنبھال گیا تھا۔

”صاحب جی کیا کھانا اچھا نہیں پکا تھا؟“ اس نے برتن
سمیٹتے ہوئے بچ جانے والی کھانے کی وافر مقدار کو باؤں سے لکھا۔
”کھانا تو اچھا تھا ہم کھاتے ہی کم ہیں۔“ میں نے کہا۔
”ہم دوسری چیزیں بہت کھاتے ہیں مثلاً فوگم، دھکے، زنجیر جڑو
دل پر چوٹ... وغیرہ۔“ محسن نے غور و فکر کے سمندر سے سر نکال
کے کہا۔ ”وہ ٹرانسمیٹر اور دوسرے مواصلاتی نظام کی کارکردگی کو
بہتر اور موثر بنانے میں مصروف تھا۔“

”اتنا کھانا ضائع کیا؟“ مشتری نے دکھ سے کہا۔
”میں نے کہا۔“ یہ کوئی بولس یا میں نہیں ہے جو کھانا بچے
اسے سنبھال کر کھو۔ شام کو کھانا جمانے گا۔“

”اور پھر بھی گنا کی تو بیاد مرنے کے محسوسات بارہ بجے سے
پہلے سب کھانا پڑے گا۔“ محسن بولا۔
”لو... انعام کی بات کوئی نہیں، سزا پہلے۔“ مشتری نے احتجاج

کیا "میں کیوں کھاؤں گی...؟"

"اس لیے کہ ناز سے میں اتنی غلطی قابل معافی ہے اور میری تمھاری ذمہ داری ہے کہ ضرورت کے مطابق کھانا یہ شہانہ اختیار کرو۔ ہم کوئی چیز خالص نہیں کر سکتے ہیں نے اسے سمجھا۔

کریم بوج ایک گھنٹے کے لیے بازار گیا تھا اور دو گھنٹے بعد واپس آیا تو ایک موبی کی قیادت کر رہا تھا جس میں وہ ضرور شامل تھے جو بولیاں، کنستہ رگتے کے ڈبے اور ڈرم اٹھائے ہوئے تھے۔ اس نے سفر کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے شاپنگ کی تھی اور پتھر اس عرصے میں وہ ہلاری عادات ناپید سے واقع ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ مگرٹ اور کائیٹ کے ساتھ

میں نے اس وقت میں گل بانو کے ساتھ بیٹھ کے دیگر انتظامات کو آخری شکل دی۔ وہ سب حمل رستا ویزا بنانے کا سامان جو پہلے خرید کر مار کے ایک کمپ کو تیار کرنے کے لیے ملتا تھا ابھی تک ہمارے پاس محفوظ تھا۔ میں نے گل بانو کو اس میں اس کی تھوڑے سے مختصر اشعار کرنے کے لیے یہ بتایا کہ ناز اور غالب اس جہاز پر لڑتے اور چارلس کے ناموں والے پاسپورٹ کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔

وہ ہنسی "میرے لیے بھی کوئی پاسپورٹ بناؤ گے تم؟"

"ہاں، اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ بین الاقوامی سندھیں اور پھر آگے بھارت سے گزرتے ہوئے ہیں کوئی بھی چیک کر سکتا ہے،" میں نے کہا۔ "سوال یہ ہے کہ تمھاری تصویر کیا بنے گا؟"

"تصویر تو نہیں ہے میرے پاس،" وہ بولی۔

"ہمارے پاس پورٹریٹ نہیں ہے،" میں نے کہا۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟" وہ دہری سے بولی۔

"وہ کیمو جس سے تصویر کھینچی جاوے گی بلکہ نکل لی۔ بالکل تیار،" میں نے کہا۔ "لیکن میرا سوال کچھ اور تھا عزیز، تمھارے نام میں نقطہ اور پوگا یا سچے؟"

وہ ذرا دیر کے لیے گڑبڑا گئی "جو کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم گل جان بونگی یا گل خان۔ ویسے تو پھر بدو؟"

خدا نے تھیں جو بنایا ہے خوب بنایا ہے، اسے لگا کر اچھا نہیں لگتا۔ "میں نے کہا۔

وہ کچھ شہانہ، کچھ خوش ہوئی۔ "لیکن میں گل خان بن کے تمھارا ساتھ دوں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے، مجھ کو ساتھ گل جان بن کے دینا،" میں نے کہا۔ اور لالچ کے خفیہ خانے سے پورٹریٹ ڈیکورنگ نکل گیا۔ مجھے گل بانو کو صبح مردانہ گیٹ آپ میں ملانے کے لیے خاصی محنت کرنا پڑی کیوں کہ کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر اس کی سوانیت کو چھپانا

مشکل کام تھا۔ میں نے تصویر کھینچنے سے پہلے اس کے بالائی ہونٹ پر سیاہی سے جو ٹھیک بنائیں جو تصویر میں بالکل اصلی نظر آتی تھیں۔ سیاہی کی بارہا صابن کرکٹ کے لیے بھی ہائی رہی اور صحنے سے نشتر رہا کہہ کے چھڑتا رہا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی عادات و اطوار میں مردانگی کے جوہر دکھانے کا اس رول میں ڈٹ ہو سکے۔

موتھوں کی کوئی بات نہیں۔ یہ کیا جاسکتا ہے کہ پہلے عتیں بعد میں منڈوا دیں۔ کچھ لوگ شرط پر لگا کر لیا کرتے تھے۔

"مجھے ہمارے جیت کو کرنا پڑا،" میں بولا۔ "یہ مجھ سے شرط لگا بیٹھے تھے ایک دن۔ پوچھو شرط اس بات پر تھی؟"

"کس بات پر تھی؟"

محبوبہ لندن میں تھے تو ان کے تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہمارے لیے گوری پمپری ناز کرنے والوں کی تحقیر ہوتا تھا۔ "میں نے کہا۔" وہ ایک تنگ نظر اور متعصب قوم ہے۔ ہم بھی کم ہتھے ان کے غلات ایک تھوہہ مافز بنا رکھا تھا۔ بولیاں اکثر پمپری بن جاتی تھیں۔ ہم تو یہ کام ایک پلان کے تحت کرتے تھے۔ ناٹال کی جو کرل فریڈ ہے اسے اسے مفت کر دو بات ہے پھر ہم بان کی بازی لگا دیتے تھے اور اس کے لیے پمپری ملاتے تھے کہ وہ لڑکی اپنے گوسے ہوائے فریڈ سے بھن بھنی ہو جاتی تھی اور ہم دونوں میں سے کسی ایک کو مرٹھ دے دیتی تھی۔ اکثر تو ایسی ہی شیطانی ہوتی تھیں جس نے کسی کو ملقت کر لیا۔ چنانچہ دے کر وہ جیت گیا لیکن ایک بار محالہ ہوا۔ سنگین ہو گیا۔"

گل ہنسنے لگی "کیا پمپری مارگریٹ پر شرط لگا لی تھی؟"

"نہیں، یہ ایک دن کسی سے اچھڑ گیا۔ وہ ایک اسٹیج ایکٹر تھا جو خود کو شہسپر سے منسوب کرتا تھا کہ وہ میرے نانا کے دادا کے سسر کے والد تھے۔ کچھ ایسا ہی رشتہ بتاتا تھا۔ چنانچہ وہ ڈراے پر اپنی رائے کو حزب اکثریت تھا۔ سکندر سے کہنے لگا کہ تم جا ملی انڈین سپیروں کی اولاد اور ہمتوں کی ناک صاف کرنے والے، تم کیا جانو اداکاری کو۔ چار فلاں اداکاریاں ہے کہ تمھارا فلاں ہرواس کی جوتیاں صاف کرے۔ سکندر نے کہا کہ اس کو تم لوگ اداکارا ملنے ہو۔ ہمارے ملک میں جو تو جوتیاں ہیں۔ اس نے کہا کہ ہمارا سر لائٹ اداکار۔ سکندر نے کہا کہ ہمارے دلپ کاہ سے اس کا کیا مقابلہ غیر خوب جھگڑا ہوا۔ یہ جب آیا تو سب شغل تھا کہنے لگا کہ اس سال نے میری غیرت کو لگا لگا ہے۔ کہا ہے کہ تم کیا جانو اداکاری کس جانور کا نام ہے۔ اب مجھے ثابت کرنا ہے کہ میں اس سے بڑا ایکٹر ہوں۔ میں نے اسے سمجھا کہ جہان کی ثابت کرنا بہت مشکل ہے یہاں۔ اگر تو اس سے بہ زور بازو منوالے تو لوگ بات ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں، میں اس کو اسٹیج پر شکست دینا دلا

گاہی اداکاری سے اس کے مقابل مرکزی کردار ادا کرول گا اور اس کا بہاروں گا۔ میں بہت ہنسنا۔ میں نے کہا کہ کورچم، مختصر مرکزی کردار تو کیا اس کے مقابل کسی ڈرامے میں بھی کورڈرنگ کوئی نہیں ہے۔ میں ہمارے سکندر کا نظم جو ش میں آگئے۔ انھوں نے موتھوں پر تازہ کے کرکما کر میاں حسن، ایسا نہ ہوا تو ہم یہ موتھیں منڈوا دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کو موتھیں منڈوا کر پڑیں۔"

محبوبہ ہنسی میں اس پر لائی بات کو یاد کر کے سکھارہا۔ وہ

بہا کی دل تھا۔

کچھ دن بعد ایک نیا ڈراما اسٹیج ہونے والا تھا۔ میں نے کہا۔ سکندر بھی پہنچ گیا آڈیشن اور اداکاری کا ٹیسٹ دینے کے لیے آکر ٹیسٹ کیا۔ وہ اس ٹیسٹ پہلے لے لیا تھا کہ وہ اور پھر جو اس رول کے لیے ہوزوں ہوا اسے طلب کر لیا جاتا ہے۔ وہ غلبہ کو اپنا مرکز جھگڑا اور دینے والا ٹیسٹ مقابلے پر تھا۔ وہ پڑا تھا ہمارا اسٹیج تھا اور اسے بلا کر منتخب ہونے کے یقین تھا۔ ہمارے سکندر عقلم نہ ہریت کار کے سامنے زبردست پرفارمنس دی۔ فائنل سلیکشن ہوا تو اس نے سکندر سے کہا کہ تم بھی کے بچے کا رول دیا جا رہا ہے اور اس کے حریف سے کہا کہ تم لوگ لڑو میرے بچے کا رول۔ میں جناب، سکندر نے ایک شہانہ ٹیچر جہان کی تقریر کی کہ تم گزرتے ہو اور ایسی کی تمہیں ملے گی کہ بچے کا رول کرنے والے کی اس پر ہریت کار کی ٹیسٹ پر رول آٹ کر لیا اور دوسرے دن موتھیں منڈوا دیں۔

"لیکن... میں نے بچے کا رول تو مل گیا تھا،" گل نے ہنستے ہنستے جاں ہو کر کہا۔

"میں تو فلاں سے عزیز،" میں آہ بھر کے بولا۔ اگلے دن انکشاف ہوا کہ اس ڈرامے میں مرکزی کردار بھی مجھے ہی دیا تھا۔ ملازمت اور ملازمت کی بنا پر لندن کا لارڈ میئر منتخب ہوتا ہے۔ ہریت کار نے بعد میں یہ رول سکندر کے حریف کو دیا اور وہ فلاں بے مد کا سیاب رہا۔ لارڈ میئر کے بچے کا کردار تو بولے نام اور ان کی ذہنیت کا تھا۔"

"اب فضول باہیں بند کرو اور چلنے کی تیاری کرو۔ بیٹری ٹھہراؤ اور پھر چیک کرلو،" میں نے کہا۔

"لارڈ میئر کے لیے رول سب ٹھیک ہیں،" میں نے اعلان کیا۔

"ہیڈن کی بھی جان ہے، جب انہیں ملے گا تو حیرت ہو جائے گی،" میں نے کہا اور ہنسی رہا ہوں۔ "میں نے کہا۔ کیا اس لالچ سے تم اس کی ہریت کار کو چھوڑیں گے جو چھوڑے ہوئے سفر کا آغاز کر چکا ہے؟"

"نہیں، جہان نے اسے رشتہ دیا ہے،" میں نے بولا۔

"اگر کوئی زیادہ طاقتور لالچ ہوتی تو زیادہ تیز رفتار ہوتی؟"

میں نے کہا۔

"مجھے نہ کیا ہے؟" میں نے بولا۔ ہمارے پاس جیٹ سیل کا پٹر ہوتا تو ہم سیدھے اس جہاز پر جاتے۔ وہ بچے سے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتے مگر جبکہ فکسوں میں ہوتا ہے، ایک گولی نہیں چھو کے ہی نہ گزرتی اور میں ہر اسٹوٹ کے بغیر جہاز پر کودتے، ڈز... ڈز... ڈز... ڈز... میں نے سب کو بھونڈا ڈالنے اور اس جہاز پر قبضہ کر لیتے مگر انھوں نے کہا کہ اس میں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

"اس لالچ سے کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے حسن کی بات کا بڑا مانے بغیر کہا۔ یہ کہ ہم بلوچ تارے کا گنگو ایک مسئلہ ہے۔ اس بحری جہاز کا صبح سمت میں تاقب، صحرانی جہاز تو نقش قدم چھوڑ جاتا ہے۔ بحری جہاز کے نقش بر آب کا نشان نہیں ملتا۔"

"ایک چیز ہوتی ہے قلمب نما حرفت کس..."

وہ جو اس کا استعمال کرنا کہ آتا ہے، سوائے دوست محمد کے؟ میں نے کہا۔ اور دوست محمد کی اہلی اپنی عقل اور تجربے سے ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ اس کی ذہنی وجہی حالت ایسی نہیں ہے۔"

"اس کی یہ حالت کب تک رہے گی؟"

"نہ چھوڑنے کے لیے چند دن بہت صبر کرنا ہوتے ہیں،" جب طلب دیوا ذکر کی ہے پھر آدمی سبیل جاتا ہے اور کوشش کرے تو چند دن میں عام گولوں کی طرح زندگی کے معمولات ملنا شروع دینے لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مشکل تو یہی ہے کہ ہمارے پاس چند دن نہیں ہیں۔"

"ہاں، بھارت کو آپ کی ٹیسٹ ہے،" میں نے بولا۔

"اگر دوست محمد کی زندگی کو خطہ لالچ نہ ہوتا تو ہم اسے ساتھ ہی نہ لے جاتے۔ ہمارے قومی کام نہیں آتا وہ۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے،" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ہم اس کے علاج کو مختصر کر دیں، چند دن کے لیے۔ اس سے نشے کی لہر چھڑانے والا کام فرصت سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ جب تک اس کی پیشہ ورانہ مہارت کی فوری ضرورت نہ ہو چند دن سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"تیرا مطلب ہے... کہ ہم اسے نشہ فراہم کر دیں؟"

"ہاں، اگر اسے کارآمد بنانا ہے تو یہی کرنا پڑے گا۔ اس کی حالت فوراً سنبل جائے گی،" میں نے کہا۔ بلاشبہ یہ زہر ہے لیکن ابھی دو کا کام کرے گا۔ دو چار دن میں وہ مرے گا۔ میں جو دجانے کہ سے یہ زہر ہی رہا ہے۔"

میں کچھ قائل ہونے لگا تھا " لیکن جس کے سگریٹ کہاں سے لائیں گے ہم؟ "

کریم سے بات کرتے ہیں " اس کا بول کھوتا پھر ناٹیک نہیں مجھے معلوم ہوا جاتا تو میں اسے سامان لانے کے لیے بھی بازار نہ جانے دیتا " میں نے کہا " موشن میاں کے قتل اور شہر کے غائب ہونے کی سستی نیز کہاں کی اس علاقے میں سب نے سن لی ہوگی سب جانتے تھے کہ کریم ہی ایک امیدوار شہر کے گورنر کے اور اس نے اپنے عشق کا ڈھنڈورا بھی خوب پیٹ رکھا تھا " وہ پڑا گیا تو ہمارے لیے بھی مسائل کھڑے ہو جائیں گے "

" وہ ہوشیار لڑکا ہے " باتوں سے اور صورت سے جو نفوذ ضرور رکھتا ہے لیکن مجھے اس کی عیاری اور ذہانت میں کوئی شبہ نہیں یہ یمنی بولتا " کسی آسانی سے اس نے موشن میاں کو ہجوم کر دیا پھر مشہور کو نکال لایا اور اب خود بازار سے آیا ہے ظاہر ہے وہ اپنی مخالفت کے خیال سے خائف نہیں تھا " وہ پچھڑا جانا وہ چور دروازوں سے واقعہ ہے "

" یہ تو میں جانتا ہوں اسے چوروں کا اور چور بازار کی کرنے والوں کا بھی علم ہے " میں نے کہا " میں دیکھتا ہوں وہ کیا کر رہا ہے میرا خیال تھا کہ وہ اسٹوڈیو میں ملے گا اور سفر کے انتظامات کو آخری شکل دینے میں مصروف ہوگا لیکن وہاں مشہور کی لگی سے چل رہی تھی "

" کیا کہا تم نے... کیا بدل گیا ہے؟ " "جس بدل گئی ہے میری شکل بانو نے کہا " عورت سے مرد بن گیا ہوں میں " اسی لیے گل خان نام رکھا ہے میں نے " "ارے چلو نام بگلا رکھنے سے کوئے کی فحشیت بدلتی ہے کہیں " "اوہ رسوا " یہ کوئی اپنے اختیار کی بات ہے " "ہاں " میں نے کہا " یہاں ایسا ہوتا رہتا ہے " گل نے کہا " ہم چاہو تو کریم بھی لو کی بن سکتا ہے "

" ہائے ہائے عقل کے ناخونو... " " ناخون... وہ کہاں ملتے ہیں؟ اور ان میں کیا خرابی ہے؟ " گل نے ہاتھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "

میں آگے نکل گیا " اب صرف ایک ہی جگہ دیکھنی رہی تھی جہاں کریم کا ملنا ممکن تھا " ادیبہ آخری کیمین تھا جس میں دوست مر قید تھا " میں کوئی آہٹ کیے بغیر اور درنگ دے بغیر دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا تو کریم کھنکھناتے ہوئے دروازے کے پاس بیٹھا ہوا تھا " وہ بڑی طرح چور کا اور ایک دم پلٹ کر میری طرف مجھے نیکیوں دھونیں کا غبار نظر آیا اور جس کی مخصوص بو محسوس

ہوتی " دوست محمد اس طرح دست و پا بستہ بڑا ہوا تھا کہ اس کے منتقلوں سے خارج ہو رہا تھا " اس کی آنکھیں سرسبز بند تھیں "

جلتی ہوئی آدھی سگریٹ کریم بلوچ کے ہاتھ میں تھی " خود اپنے ہاتھوں سے دوست محمد کو شگوارا بنا رہا " " یہ تم کیا کر رہے ہو کریم؟ " میں نے سخت لہجہ میں بے خبری میں پوچھا " جانے کی دشت اتنی بھی کہ وہ بڑا بنا کھڑا تھا میری بات پر اس نے منگلتی ہوئی سگریٹ پھینک دی " غلطی کیا... "

" میں نفاس کی گردن دہو چلی " بات غلطی کی نہیں " تم نے عدولی کی " وہ کام کیا جس کی تمہیں اجازت نہیں تھی " " تم کیا کر رہے صاب... وہ ہمارا استاد... ہم کو کھڑا کرنا اس کا حال تو بہت خراب تھا صاب " کریم بلوچ کا کہنے کا لہجہ ہم کو سوچنا مارا... " دن میں تین ٹائم... "

میرے لیے سرسبز رہنا مشکل ہو گیا " دن میں تین ٹائم کی بیچ وقت کیوں نہیں " میں نے کہا " کریم اس لالچ پر شرفش روز مرضی نہیں چلا سکتا " تم کو شکی بھی کرنا تھی اپنے استاد کے ساتھ مجھ سے پوچھ کر کرتے " ایسے تو بالکل دلچسپ نہیں رہے گا اور " تم پر کیسے اعتبار کروں گا تم میری کرگے جو تم سے کہا جائے " " اچھا " میں نے کہا " بات ہمارا سفر میں ایک دم بیٹھ گیا ہے صاب " پھر میری غلطی کرے تو حرامی " " چلو دوست محمد کو کھول دو " میں نے نرمی سے کہا " اس سے کچھ ہائیں کرنا نہیں " مجھے اس کی حالت کا پیچہ لگتا تھا " دم لگا گیا صاب تو دم آیا " کریم نے خوش ہو کر کہا اور دوست محمد کے ہاتھوں پر دل سے چلی ہوئی رسی کھولنے لگا " یہ ہائی سگریٹ بھی دے دو اسے " میں نے کہا " کریم بلوچ نے بے یقینی سے مجھے دیکھا " پھر آؤ گی " " ہاں ہاں " میں اجازت دے رہا ہوں تم کو " کہاں لائے تھے یہ سگریٹ اور کب؟ "

" ابھی ہم مارکٹ گیا صاب... سامان لایا تو... " پکیٹ... نہیں... ہم جھوٹ بولا " تین پکیٹ اس کا دل لایا صاب " " کہاں ہیں وہ تینوں پکیٹ؟ " میں نے کہا " مجھے دو دیکھو " اب کیا دیر ہے؟ " " کوئی دیر نہیں صاب " آپ بولو تو ہم اپنی چالوکی باہر جاتے جاتے ٹوک گیا "

" میں نے کہا " ہمارا کیا خیال ہے " ہم اس بڑی جگہ پر

کھینچے ہیں؟ " " ایک دم پکڑیں گا صاب " بچی کے کھرچاؤں کا سلا " " کریم نے خوش سے کہا " اپنی ایسا لیں کریں گا " " وہ جہاز بہت آگے نکل گیا ہے " اسے روانہ ہونے چودہ منٹ ہو چکے ہیں " میں نے کہا "

" پھر کیا ہو صاب " میں ابھی استاد ہم کو راستہ بتا رہے تو ہم اس کو بالکل پکڑیں گا " کریم نے کہا " رات کا ٹائم میں غلطی کاں فیروز ہوتا ہے اپنی " " کہاں فوڑ ہو جاتا ہے؟ " میں نے حیرانی سے کہا اور پھر اس ہر مطلب مجھے کہہ رہا تھا " ہمارا مطلب ہے کہ تم کفیور ہو جاتے ہو جو کوئی بات نہیں " استاد راستہ بتانے لگا " انجن تو دھوکا نہیں دے گا راتے ہیں؟ "

" دیکھ دھوکا دینا صاب " انجن کا باپ ہو رہا تھا " اس نے دوست محمد کی طرف اشارہ کیا " ایسا بڑا جہاز بنایا اس نے تو ایک دم کھلوتا ہے " " وہ نکل گیا تو میں دوست محمد کے پاس بیٹھ گیا جواب اپنے ہاتھوں پر دل کو کل رہا تھا " " دوست محمد " میں نے کہا " ساتھ یہ سلوک کرنا نہیں چاہتا تھا میں نے کہا " لیکن مجوری تھی " " لے لے ہا " مجبور تو ہم ہے " وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا " اس کا بغیر جی نہیں سکتا رہی نہیں سکتا " ہم جانتے تھے تم اچھا آدمی ہے لیکن ہم ابھی کٹم ہو گیا ہے " تم ہمارا ساتھ کیوں نہیں لگاتے؟ "

" میں تمہاری ضرورت ہے دوست محمد اور ہوشیار رہے گی " ہم کٹم نہیں ہو سکتے " میں نے کہا " اگر ہم تم کو یہاں چھوڑ دیتے تو تمہارے اور تمہارے دشمن کی تمہیں مار ڈالتے " " پھر کیا ہوتا " ہم جانا " " نہیں تم کو جینا ہے " اپنے لیے اور ہمارے لیے اور ہم تھکنا نہ دیکھیں گے " تم سب سے بڑے ہونے میں بھی اور جڑے میں بھی " ہم تمہارے بچوں کی طرح ہیں " " تم بولو ایسا بات " وہ چلاتے رہا " جیسا ہمارا بچہ لوگ سے دبا سکا نہ ہووے " ابھی سلام ہم کچھ نہیں کر سکتا " ورنہ ہم بولنا کہ ہاؤم کی کا باپ نہیں ہے مجھ جانتا ہے کہ ان کا باپ ہم سے کتنا رعبا ہوتا ہے... تو جیسا تھا کہ کیوں اٹھا تا " ایسا مالک خوار کیوں ہوتا؟ "

" میں نے دیکھا کہ میرے ایک غلط غلط نے اس کے زخموں کو دوبارہ شعلہ کی طرح کھوج دیا تھا اور وہ دیکھ کر اس کی

کھینچے ہیں؟ " " ایک دم پکڑیں گا صاب " بچی کے کھرچاؤں کا سلا " " کریم نے خوش سے کہا " اپنی ایسا لیں کریں گا " " وہ جہاز بہت آگے نکل گیا ہے " اسے روانہ ہونے چودہ منٹ ہو چکے ہیں " میں نے کہا "

" پھر کیا ہو صاب " میں ابھی استاد ہم کو راستہ بتا رہے تو ہم اس کو بالکل پکڑیں گا " کریم نے کہا " رات کا ٹائم میں غلطی کاں فیروز ہوتا ہے اپنی " " کہاں فوڑ ہو جاتا ہے؟ " میں نے حیرانی سے کہا اور پھر اس ہر مطلب مجھے کہہ رہا تھا " ہمارا مطلب ہے کہ تم کفیور ہو جاتے ہو جو کوئی بات نہیں " استاد راستہ بتانے لگا " انجن تو دھوکا نہیں دے گا راتے ہیں؟ " " دیکھ دھوکا دینا صاب " انجن کا باپ ہو رہا تھا " اس نے دوست محمد کی طرف اشارہ کیا " ایسا بڑا جہاز بنایا اس نے تو ایک دم کھلوتا ہے " " وہ نکل گیا تو میں دوست محمد کے پاس بیٹھ گیا جواب اپنے ہاتھوں پر دل کو کل رہا تھا " " دوست محمد " میں نے کہا " ساتھ یہ سلوک کرنا نہیں چاہتا تھا میں نے کہا " لیکن مجوری تھی " " لے لے ہا " مجبور تو ہم ہے " وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا " اس کا بغیر جی نہیں سکتا رہی نہیں سکتا " ہم جانتے تھے تم اچھا آدمی ہے لیکن ہم ابھی کٹم ہو گیا ہے " تم ہمارا ساتھ کیوں نہیں لگاتے؟ "

" میں نے دیکھا کہ میرے ایک غلط غلط نے اس کے زخموں کو دوبارہ شعلہ کی طرح کھوج دیا تھا اور وہ دیکھ کر اس کی

آنکھوں میں رُسکے ہوئے آنسوؤں کو سینے پر مجھ کر دیا تھا " " تم مجھ کو تم ہی تمہارے بچے ہیں " ہم خدمت کریں گے تمہاری " جب تک زندگی کے مہلت دی " یہ رُسکے کھینچا کر آج تمہاری ضرورت ہے تو میں تمہیں سلام ہوں " آنے والا وقت خود بتا دے گا کہ اس خاندان میں " جس میں ہم سب شامل ہیں " تمہاری حیثیت بزرگ کی ہے یا نہیں " " اس کی آنکھوں میں پھیلی ہوئی ناامیدی نے کسی اور دل شکستگی کے ورلے میں اسد کا ایک دیوار ڈال دیا اور مجھ کیلئے میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور اسے بالآخر یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ ہمارے غلوں میں خود غرضی کو ختم کر دینا اور ہم ان میں سے نہیں جو ضرورت کے وقت گدے کو بھٹے باپ بنالیتے ہیں "

" اس نے کہا " ہم... یہ چھوڑ دے گا " اس نعتی حادث کو ایک ماہ میں چھوڑ سکتا... چھوڑا تھا... " کم گے گا... تم ہمارا مدد کرے گا " ہم بچہ بچہ ٹیک ہو جائے گا... " " اسی وقت کریم نے ابن اشارت کیا " دوست محمد چور کا اور غور سے کچھ ٹھننے لگا پھر وہ ایک دم اٹھا " سالہا کھل کا بچہ " انجن کا بغیر لڑائی کریں گا " آں کم جانا ہے تو انجن چلاتا ہے " ہا ہا آں دو " کریم ہل رہا ہو گیا ہے " اس نے باہر جا کے چلا نا شروع کیا " " اوہ " وقف بند کرنا ان کو " آں کال لائی بند پڑا ہے " ابھی ابن خلاص ہو جائیں گا "

" میں اس کے پیچھے گیا " میرے پیچھے ایک وہ کریم کے ایک بھانپڑ مارچا کھڑا تھا اور ابن بند کر کے نہ جانے کس پڑے کو کھول رہا تھا اور بڑا بڑا رہا تھا " حسن اور گل نے ایک لالائی شاگر کو پٹنے دیکھا تھا اور میری طرح خوش ہوئے تھے " دوست محمد نے اپنی اسادی کا ثبوت بھی دے دیا تھا اور ہماری سر پرستی قبول کر لی تھی " اس کی دلچسپی ایک خوشگوار تبدیلی کی آئینہ دار تھی " صرف مشہور کو کریم پر بتاؤ کہ ہمارا کھانا کھانے کے شہر ہوئے کے بھلے بڑی ڈھنکائی سے مسکرا رہا تھا اور اپنا کالے مسلا جا رہا تھا "

" ارے کیسے زور سے چانٹ ماری ہے ظالم نے... اور اسے دیکھو بے عزت کو... " ہٹا کر اسٹنڈا... پلٹ کے مڑو توڑ دے اس بڈے چھوٹے کا " مشہور نے بڑبڑاتے ہوئے کہا " " معلوم ہے یہ بڑھا چھوٹے کون ہے؟ " میں نے کہا " تم کو ٹوڑنا چاہیے اس سے " " حسن بولا " " صاب جی ڈرتی ہے میری جوتی یہ مشہور نے ہاتھ لہرا کے کہا "

" میں اس کے پیچھے گیا " میرے پیچھے ایک وہ کریم کے ایک بھانپڑ مارچا کھڑا تھا اور ابن بند کر کے نہ جانے کس پڑے کو کھول رہا تھا اور بڑا بڑا رہا تھا " حسن اور گل نے ایک لالائی شاگر کو پٹنے دیکھا تھا اور میری طرح خوش ہوئے تھے " دوست محمد نے اپنی اسادی کا ثبوت بھی دے دیا تھا اور ہماری سر پرستی قبول کر لی تھی " اس کی دلچسپی ایک خوشگوار تبدیلی کی آئینہ دار تھی " صرف مشہور کو کریم پر بتاؤ کہ ہمارا کھانا کھانے کے شہر ہوئے کے بھلے بڑی ڈھنکائی سے مسکرا رہا تھا اور اپنا کالے مسلا جا رہا تھا "

" ارے کیسے زور سے چانٹ ماری ہے ظالم نے... اور اسے دیکھو بے عزت کو... " ہٹا کر اسٹنڈا... پلٹ کے مڑو توڑ دے اس بڈے چھوٹے کا " مشہور نے بڑبڑاتے ہوئے کہا " " معلوم ہے یہ بڑھا چھوٹے کون ہے؟ " میں نے کہا " تم کو ٹوڑنا چاہیے اس سے " " حسن بولا " " صاب جی ڈرتی ہے میری جوتی یہ مشہور نے ہاتھ لہرا کے کہا "

" میں اس کے پیچھے گیا " میرے پیچھے ایک وہ کریم کے ایک بھانپڑ مارچا کھڑا تھا اور ابن بند کر کے نہ جانے کس پڑے کو کھول رہا تھا اور بڑا بڑا رہا تھا " حسن اور گل نے ایک لالائی شاگر کو پٹنے دیکھا تھا اور میری طرح خوش ہوئے تھے " دوست محمد نے اپنی اسادی کا ثبوت بھی دے دیا تھا اور ہماری سر پرستی قبول کر لی تھی " اس کی دلچسپی ایک خوشگوار تبدیلی کی آئینہ دار تھی " صرف مشہور کو کریم پر بتاؤ کہ ہمارا کھانا کھانے کے شہر ہوئے کے بھلے بڑی ڈھنکائی سے مسکرا رہا تھا اور اپنا کالے مسلا جا رہا تھا "

" ارے کیسے زور سے چانٹ ماری ہے ظالم نے... اور اسے دیکھو بے عزت کو... " ہٹا کر اسٹنڈا... پلٹ کے مڑو توڑ دے اس بڈے چھوٹے کا " مشہور نے بڑبڑاتے ہوئے کہا " " معلوم ہے یہ بڑھا چھوٹے کون ہے؟ " میں نے کہا " تم کو ٹوڑنا چاہیے اس سے " " حسن بولا " " صاب جی ڈرتی ہے میری جوتی یہ مشہور نے ہاتھ لہرا کے کہا "

”میں قن کرچکا ہے“ میں نے زار زار لہجے میں بتایا۔
 ایک اپنے منہ سے کہہ کر، ایک داما کا اور ایک ہوا کا اور ہے
 کریم کا باپ بیٹا تھا اور بچے والا مشر۔
 مشر کی کارنگ فنی ہو گیا۔ ”مگر کریم... اس نے تو کہا تھا
 کہ اس کا کوئی باپ نہیں ہے۔“
 ”وہ بغیر باپ کے بھی کوئی ہوا ہے،“ معن بولا۔ ”دراصل
 اس نے باپ کو کافی کر رکھا تھا۔ اس کی اپنی حرکتوں کی وجہ سے
 کریم کو بھی ایک دن شادی تو کرنا ہی پڑی۔ تم سے نہ ہوئی کسی
 چیز میں سے ہوتی۔ پڑھا اسے بھی مار ڈالتا ہے۔“
 مشر کی کامو خراب ہو گیا۔ حساب جی بھر تو کسی چیز میں
 سے ہی کرادو اس کا بیاہ۔ لوہی کیا ایسی گزری ہوں خود
 کریم سے بیعت کا بچہ تو میری جان کو چٹ گیا۔ ایک سے ایک
 گہروں کے ساتھ تو ان میرے پیچھے بھرتے تھے۔
 میں نے ایک سرور عاشقہ آہ بھری ”اں میں ہمارا نام ہی
 شامل ہے یا نہیں۔“
 ”ہاں کل ہوگا،“ معن بولا۔ ”میں بھی ہائے سیلے چھیل چھیلے،
 گہروں میں اور اس کے پیچھے بھرتے ہی ہوتے ہیں۔“
 مشر کی سمجھتی کہ ہم اسے بے وقوف بنا رہے ہیں اور
 غصے میں پاؤں پٹختی واپس چلی گئی۔
 دوست محمد نے اپنی اشارت کیا اور چند کیڑاں اس کی
 آواز سننا رہا۔ پھر اس نے اپنی کو پیار سے پکارتی دی ”ہاں ابھی
 ایسا فلک چلے گا خراب ہوئیں گے تو یا با دوست محمد نے ہر
 خیال رکھنا... ہاں“ وہ انجن سے ہائیں کر رہا تھا پھر وہ کریم
 کی طرف پلٹا۔ ”ابھی میں دو تلوں کا کھولنے کے اس کا آواز سن۔
 تیرے کو فرق لگتا ہے کہ نہیں؟ پہلے اس کا ایسا فلک آواز تھا
 جیسے... پچھڑتا ہے جھوک میں... ابھی کیسا ہنسا پڑا ہے۔
 ہنستا ہے نا؟“
 کریم نے نرم دہنی اقرار میں سر ہلایا ورنہ اس کو ایک اور
 جھانپا بھی بنا پڑتا۔ آواز میں کوئی بہم محسوس نہ ہونے والا فرق
 پڑا تھا تو ہمارے کان اسے کیسے محسوس کر سکتے تھے۔ پوسے
 لگنے کے بولوں میں ایک غلط مرگ جالے تو وصف کسی
 موسیقار کے کان ہی اسے نوٹ کر سکتے ہیں۔ بیٹھتی موسیقی
 مٹی جس کو دوست محمد کے کان میں چاہیں سال سے مٹی ہے
 تھے۔ وہی کسی ایک پڑنے کی آواز کے فرق کو محسوس کرنے
 پر قادر تھا۔
 ”ابھی کا حکم ہے اُستاد؟“
 ”حکم کا بچہ؟“ دوست محمد نے بڑی سے کہا۔ ابھی تیرے

کو کیا سمجھا تھا سکندر صاحب، ڈسپلن مانگتا اور جہاں جہاں
 کا حکم چلتا ہے اور کسی کا نہیں۔ ہمارا باپ بھی جوتا تو ہم
 یہی بولتا۔“
 غلطی ہوا اُستاد، ”کریم نے کہا اور ہنسنے کو لا رہا
 ہوئے دیکھتا رہا۔ دوست محمد خشک مزاج اور سخت
 تھا۔ شاید ایسے لڑکھنوں کے ساتھ اس کی زیادہ جی جی
 ان لوں کے مقابلے میں زیادہ نظم و ضبط، اصول اور قاعدہ
 کے مطابق چلتی تھیں اور اس کے کنٹرول میں رہتی تھیں۔
 ”اگر سب ٹھیک ہے کریم تو چہرہ جلد ہی ہنسنا شروع کرے گا۔
 نے کہا۔ مزید دیر کی تنہائیں نہیں۔“
 کریم ایک دم قبل رو گیا۔ سورج اب مغرب کی جانب
 ڈھل گیا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کے بلند آواز میں کہا
 ”ابھی رات العالین، تیرا بھوت مہرانی، کریم بول
 اپنا فضل کیسا لالہ لالہ شکر کشا۔ ابھی ہمارا خاص دروہا تیرا
 اپنے رسول کا واسطہ پاک پروردگار۔ جیسا مانگ تو ہے
 کاشی کو بچایا ابھی پھر چھوٹا سلاخ کا بیڑا لڑی ہوئے
 اس کے شورش و غضب اور استغراق کی کیفیت میں
 کا اعتراف تھا، ”عمر تھا، غلوں تھا۔ اس کے الفاظ جیسے
 صدق دل کے ترجمان تھے۔ میں نے کئی بار زیر لب کہا
 معن کے ساتھ گویا دیکھا جو اس ڈھکی المائی کیفیت میں
 طرح ڈوبے ہوئے تھے۔ شاید وہ ہر بار سندر کی سرود ہا
 سے پہلے ایسے ہی ڈھانکنا ہوگا اور یہ دم خود اس نے
 کی ہوئی۔ یہ شیعہ ایمانی تھا۔ اس نے آباد اور کو بھی آتی تھی
 کے ساتھ خدا کے سامنے دست بردھار دیکھا ہوگا۔ آؤں گا
 کر دوسرے وہ خود کو مٹی کا پیلا، پانی کا بلب اور جس دھانک
 کرتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کا اور گت تب ہوتا ہے جب
 اس کے قدوں کے نیچے بھی ہوتی زمین کو جس ہنس کر رہی
 اور آسمانوں سے آگ برستی ہے تو بیتیاں خاک ہو جاتی
 آتش فشاں سر زمین ہوتے اور سمندر میں طوفان لگتا
 تو فو لادی قلعے جیسے جہاز بھی تکیوں کی ناؤ کی طرح بکھرتے
 کریم بلوچ کی دھماکی سا دھکی کی مٹھتی مٹھتی
 میں بھی حقیقت پسندی کا شعور تھا۔ جب اس نے کہا کہ
 ”ماں قسم پروردگار! ہم کو مگو مجھ سے بوجھ ڈر لگتا ہے
 ہم کو شاکر کا بیڑی میں جالے سے بھی بچا... ابھی تو بھوت
 لالہ ہے۔ اس کا راستہ کلیر کر۔“ طوفان کو دشمن کا طرف
 ... ہم وعدہ کرتا کہ تو میرے کو ایک دم ٹھیک ٹھاک
 لڑیں گا تو ہم بھی حرام نہیں پیں گے۔ ہم سالہ مشر کی

موتیرے سے بہت ڈر لگتا لڑن کو...“
 میں اور معن مسکراتے بھی رہے اور میں بھی کہتے رہے۔
 ہاں اس نے ہاتھ پیر اور ایک نعرہ لگے لالہ کو لکھنے
 لگا۔ میں نے دن کے ساحل کو دیکھا کیا میں پھر لوٹ کے اس
 مٹی کی طرف آؤں گا میں نہیں جانتا۔ آدمی کی مٹی اسے وہاں
 لے جاتی ہے جہاں وہ سفر ختم کرتا ہے مگر میں یقین اور امید
 کے زوارہ پر پکیرتا ہوں کہ دیار غیر اور اجنبی دس کے راستوں
 نے غم کے جنبل سے اور دشمنوں کے حصار سے مجھے حفاظت
 کے ساتھ واپس لانے والا خدا میرے ساتھ ہے۔
 ساحل دور ہونے لگا تھا۔ اپنی کا آخری کنارہ چیل گیا تھا۔
 ہلوم مسافروں سے آگے کہیں اب ایک خیال کی روشنی نہ گئی
 ہے۔ پہلے آپ پر اس کا عکس قائم نہیں رہتا۔ میرے تصور کا آئینہ
 باد بار دھنلا جاتا ہے عجیب سمندر کی موجیں جھگڑا لاتی ہیں۔
 یہ سواری کی دھلتی سر ہر ہے۔ ابھی کچھ دیر میں سورج کا آستین
 گول پانی میں بچھ جائے گا۔ رومنہر کی پڑھیت اور لالہ رات ہر
 شوشا ہوگی۔ اس رات کے بعد بھی دورا میں آئیں گی۔ جمہرات
 کو ماہی علی کی درگاہ پر میرا انتظار کرنا۔ میں آؤں گا۔ زندگی نے
 وفائی تو میرا خیال آئے گا، ”جیسے تمہارا خیال روز آتا ہے مجھے
 تسلی۔“ میں نے کیلے۔ اور ابھی ایک موج آب کے دھڑ پہ
 تیرتی ہوئی قریب آگے ہنسی۔ تمہارا خیال تو اس وقت بھی
 میرے ساتھ ہے۔ میں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے
 پانچ بج رہے تھے۔ ٹھیک ہے، میں پوچھوں گا دوں آگے۔
 گل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”جہاں جی، تم تو لیلہ
 کے خیال میں گم ہو، یہ معن کسی کی یاد میں ڈوبا ہوا ہے؟“
 میں نے تھپک کے اسے دیکھا اور زبردستی مسکرایا۔ ”ڈوبا
 ہوا ہے تو کال لو، کہیں بالکل ہی نہ ڈوب جائے۔“ میں نے
 بات بنائی میں جانتا تھا کہ وہ شہلا اور اپنے پچھتے سے دوری کے
 دھڑ میں تنہا ہے۔ اس وقت وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا اور میں
 نہیں جانتا تھا کہ اسے اپنے خیالوں کی غلط گاہ سے باہر لاکے
 تعذرت سے ملنے والی جہان کی آسودگی سے بھی محروم کروں۔
 ”تم کو اپنے... جہاں کی یاد نہیں آ رہی اس وقت؟ میں
 نے گل کو دیکھ کر کہا۔
 ”یاد تو لیتا تھا میں نے اسے، مگر اس نے کہا کہ گل، تو
 ہمارا جہاں کی ہمارا رہن ہے، کہیں مجھے شرمندہ مت کرنا۔ میں
 نے زندگی میں کوئی نئی مشورہ کی ہوگی جس کے بدلے میں خدانے
 تجھے بکول دیا ہو پناہ دیا۔ اپنے تو میرے سوا کون تھا میرا پناہ
 لسنے بہت سے پیادے کے رشتے ہیں۔“

”یہ سب اس نے کہا تم سے؟“
 ”ہاں، تم ہنسو گے مجھ پر۔“ وہ بولی۔ ”اس کی آواز میں
 نے ایسے ہی مٹی... جیسے وہ میرے سامنے ہو۔ اور میں بھی
 مٹی کہ تم بھی ٹوٹو گے۔“
 ہم سب کے ساتھ اپنے اپنے خیالوں کی بازگشت تھی۔
 میں اسے کیسے بتاتا کہ جیسے میں نے رابہ کو دیکھا تھا اور اس کی
 آواز سننی تھی، اس سے ہائیں کی تھیں، ایسے ہی اس وقت معن
 بھی شہلا سے اور اپنے بچے کے خیال سے ہم کلام تھا۔
 گل اسے غور سے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا ”جہاں جی“
 ایک بات پوچھوں؟ ”سچ بتاؤ گے؟“
 ”پہلے تم سے بھوٹ کب بولا ہے میں نے؟“ اس کے
 سوال کی نوعیت کا مجھے اندازہ ضرور ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے
 گول مول بات کی۔
 ”معن کو محبت ہے کسی سے؟“
 میں ایسے ہی سوال کی نوعیت رکھتا تھا اور جواب کے لیے
 تیار تھا ”ہاں، دنیا میں محبت کے نیر کوئی جی سکتا ہے۔“
 ”ناہوت مجھے؟“ وہ بولی۔ ”میں اس محبت کی بات کر رہی
 ہوں جو تم رابہ سے کرتے ہو، جو ناز کو غالب سے ہے؟“
 ”دل کو دل سے راہ ہوتی ہے؟“ میں نے رنگ پر بھک
 کر تسلیم پانی میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا دل کیا کتا ہے؟“
 ”میرا دل... میرا دل کتا ہے... تم اسے بتاؤ گے تو
 نہیں...“
 ”اب تمیں بتاؤں گا؟“ میں نے کہا۔
 ”میرا دل کتا ہے کہ معن بھی میرا نہیں ہوگا،“ گل نے بڑے
 یقین کے ساتھ کہا۔
 ”تم... تم جہاں جی ہو کہ وہ تمہارا ہو جائے؟“ میں اس کے
 ہے ہاں، ”مگر افسوس ہے سب کو کب کہاں ملتا ہے؟ میں اتنی
 خوش قسمت بھی نہیں تھی۔ میری تقدیر تو اب بھی وہی ہے۔“
 ”تقدیر کے ہمارے میں کون جانتا ہے کہ کب زندگی کے
 رستے بدل دیں گے؟“ میں نے کہا۔ ”تم اپنی ہی مثال کو تم پہلے
 گل بانو تھیں، پھر مانگ ہو میں اور اس رات ہمارے کٹنے سے
 پہلے کیا تم سوچ بھی سکتی تھیں کہ تمہاری زندگی میں اتنا بڑا انقلاب
 آئے والا ہے؟“
 ”میں پوچھو گے نہیں کہ میں معن کو کب چاہتی ہوں؟“
 ”نہیں، اس سوال کا جواب تو میں بھی نہیں دے سکتا۔
 کوئی بھی نہیں دے سکتا،“ میں نے کہا۔ ”میری طرح تم بھی

بے اختیار ہو۔ جیسے خدا کے معاملے میں بندہ بے اختیار ہے۔ اس تک رسائی ہو نہ ہو، وہی مہر و پے گا۔ دل کا سودا بھی کسی شرط و صل پر نہیں ہوتا۔

گل مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے میری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو پھر اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اور پلٹ کے پیچھے گئی میں سوچتا رہ گیا کہ اس کی خاموشی میرے خیال کی تردید کرتی تھی یا تائید؟

پھر محسن نے سر جھکا کے مجھے دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آ کے ٹھہر گیا۔

”تو نے حق کیوں نہیں بولا؟ یہ موقع کیوں گنوا دیا؟ جب وہ حقیقت جاننا چاہتی تھی اور سب کچھ سن سکتی تھی۔“

”میں نے کوئی جھوٹ بھی تو نہیں بولا اس سے“ میں نے کہا۔

”مگر تو نے جانتے ہو جتھے سچ سے گریز کیا؟“ محسن نے برقی سے کہا۔ ”مجھے اس آزمائش میں مت ڈال سکندر میں اس جھوٹ کو نبھانے میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔“

”ٹھیک ہے، جا اور اسے شملہ کے بارے میں خود ہی بتا دے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ لیا۔ ”آج تو مجھ میں ہمت نہیں بھتی۔“

”ایک نایاب دن اسے سب معلوم ہو ہی جائے گا۔“ ہاں، مگر اس سے پہلے حالات و واقعات خود اسے اندر قائم کرنے پر مجبور کریں گے۔ آہستہ آہستہ اس کے شکوک کھڑے بنیادیں جب استوار ہوں گی تو یقین کی دیوار اٹھنے کی ضرورت نہیں اور منطقی نتائج کی مدد سے سچ کو سمجھ گی مہلے کی اور نہ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی خود کو زمین پر طوری پرستی سے پھینک دینے کا صدر اٹھانے کے لیے تیار کر لے۔ ناقابل علاج سرطان میں مبتلا کسی بھی مریض کے کو احقین اپنے احساس سے بھوکا کر لیتے ہیں۔ انھیں حوصلہ جمع کرنے کی مہلت مل جاتی ہے لیکن گھر سے محول کے مطابق خوش و خرم اسکول یا آفس جانے، الے کھ کھل جاتی لاش اچانک گھر پہنچتی ہے تو یہ صدر جان بوجھ کر ثابت ہوتا ہے۔“

”میں دونوں طوط سے احساس پشیمانی کا شکار ہوں میں شملہ کے انعام کو دھوکا دینے کا مرکب بھی ہورہا ہوں اور گل کے جذبات سے بھی کھیل رہا ہوں۔“ محسن نے بے بسی سے کہا۔ ”تم تو صرف کھیل کے تماشا بنی ہو اور جب گل کو معلوم ہوگا۔۔۔ تو مجھ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ میں نے محسن کی است کاٹ دی۔ ”اگر تیرا خیال ہے کہ وہ پاگل ہو جائے گی یا خودکشی

کر لے گی تو میری بات کھلے، نہ وہ تجھ سے شکوہ کرے نہ اور نہ مجھے الزام دے گی۔“

محسن نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ ”یہ تو کیسے جانتا ہے؟“

”میں جانتا ہوں کہ اس کی محبت تیری طلب سے مشروط نہیں ہے۔ بالکل بوجہ کی طرح جو ابھی طرح جانتی تھی کہ لاہور مجھے کتنی محبت ہے اور میں اس کے لیے کتنا ناقابل حصول ہوں لیکن اس نے راجہ کے غلات اپنی رقابت کے جذبہ ان اظہار کبھی نہیں کیا۔ یہ بھی ویسی ہی محبت ہے جو رقابت کے تقو سے بے تعلق رہتی ہے۔ ساری دنیا اس کے محب کو جانے توڑ کوئی فرق اس لیے نہیں پڑتا کہ اسے اپنی محبت کے سوا کسی سے سروکار نہیں ہوتا۔“

”تیرا یہ فلسفہ اتنا ہی نظریہ عشق...“

”میں نے کہا تھا کہ میں کچھ کر دیتے کو تیار ہوں۔ تو آج ہی آزمانا چاہے تو جاؤ گے کہ شملہ میری بیوی ہے اور میں ایک بچے کا باپ بھی ہوں، پھر دیکھو کیا اس کی محبت تجھ سے نفرت میں بدلتی ہے، لیکن اچھا ہے اگر تو اسے حقیقت کو قبول کرنے کے لیے کچھ وقت دے۔“

محسن خاموش ہو گیا اور دماغی پرگم ہونے والے ساحل کو دیکھنے لگا۔ لاش خیمہ تیرا رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی اور اب بڑے بڑے بحری جہازوں کے قریب سے گزر رہی تھی جو گھرے سمندر کے متلاطم سینے پر فطوں کی طرح قائم تھے۔ آسمان اب بھی روشن تھا اور نیل کرچی کی بند گاہ پر کھڑکیں ہوتی بھاری بحری جہازوں کے فولادی بازوؤں کی آوی تڑپیں لکیریں دیکھ سکتا تھا۔ ساحل کی پانی کی وہ بوجس میں تیل اور کوئلہ کرکٹ اور دھواں سب کچھ شامل تھا۔ اب پانی میں نہیں رہی تھی۔ اب تازہ و مطرب ہوا میں ایک نمکین نمک تھی۔ اوپر آبی پرندے خوب پرواز تھے اور نیچے سمندری آسمان کی طرح ویران ہونے لگا تھا۔

گل گھر اوپر آئی۔ ”جیس میں چنگاری ڈال کے یہاں کھڑے ہو دو لوں؟“

”میں نے کہا۔“ جیس... کہاں ہے جیس؟“

”جیسو ما سو کتا ہے۔“ محسن بولا۔ ”مشرقی کی کھوپڑی میں تو دھینا ہے... آپ ذرا چیک کر لیں۔“

”اسے کہہ دیا کہ دوست محمد تمھارا مسخر ہے اور میں تیرا کر چکا ہے۔“ گل نے جھگڑے کہا۔ ”وہ کہہ کر ایک ایک سننے پر تیار ہوں۔“

”میں نے سچ کے تصور حال حال حد تک سنگین ہو کر گل کی طرف اشارہ کیا۔ ”مشرقی اور کریم بوج ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کے پیٹھ اور... میں باز آیا محبت سے اٹھا لو پاؤں اٹھانا۔“

حق اور اس سے پہلے کہ وہ دل درمقولات کرتے، دوست محمد نے کریم کو ڈیوٹی پر طلب کر لیا۔ ”میں نے مشنری کے کہا کہ وہ ہمارے کمرے میں چلے آجیو اور اس نے کمرہ کمرہ کمرہ ہاتھ دے کر دیکھا۔ ”اچھا صاحب، میں مگر ایک فیصلہ کر جاؤ۔ یہاں اب میں۔۔۔ ہوں گیا کریم رہے گا۔“

”اوہ... یہ تو مشکل فیصلہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”گو ایک ایک کو سمندر میں پھینکا پڑے گا۔“

”اور اس کے لیے دیکھنا پڑے گا کہ جہاز اور نا تو سامان میں کس کا ٹھکانا چاہتا ہے۔“ محسن بولا۔ ”پہلے تو میں کے پیر ہوئیں گے۔“

”جب تم چلے جاتے ہو تو زار و جہاں میں آنا اور کریم کو بھی۔“

”میں نے کہا۔“

”اپنے کہیں میں پہنچ کے میں نے محسن سے کہا۔ رات ہونے سے پہلے پہلے ہیں۔ اور کی کا نام دے دینے چاہئیں۔“

”پہلے تو ضروری ہوگا کہ ہم دوست محمد کو وہ نقشہ دکھا دیں جو شاہ پل نے بنا کے دیا تھا تاکہ ہم صحیح سمت متعین کر لیں۔“

”ہاں وہ اب بھی کارآمد ہوگا۔“

”خامبر پر جہاز اپنے مقررہ راستے پر ہی سفر کرے گا۔ دیر سے روانہ ہونے سے روٹ تو نہیں بدل سکتا۔“ میں نے کہا۔

”دوست محمد ہی بتا سکتا ہے کہ ہم اس بحری جہاز کے نزدیک کب پہنچ سکتے ہیں۔ آج رات تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن گل کی رات سب سے موزوں ہے۔ اگر ہم سارا دن چلتے رہے اور کوئی گڑبڑ نہ ہوتی تو جو میں گھنٹے بہت ہوتے ہیں۔“ محسن نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ لاہور میں مسلسل سفر نہیں کر سکتی۔ چھوٹا انجن ہے نا اسے وقفہ دینا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”دوست محمد کچھ ایسا بندہ دہشت کرے کہ ہم پرسوں یعنی بدھ کی رات تک جہاز کے قریب ہوں۔ اور اسی رات کے دوران ہم جہاز پر پہنچ کر کوشش کریں۔ کاپانی کا انحصار تازہ اور غالب سے ملے ہوئے ہے۔“

”بدھ کی رات میں ریک سے جہاز کی سطح باز یا رہے زیادہ دوپہر تک پہنچنے کے ساحل پر نہ اترے تو تیری اور راجہ کی ملاقات کیسے ہوگی۔ شرمیں داخل ہونے اور پھر حاجی علی کی درگاہ تک پہنچنے کے لیے بھی وقت درکار ہوگا۔ ہم وہاں ابھی ہوں گے اور ہمارے سامنے ایک نہیں دس سٹے ہوں گے، محسن نے کہا۔

”اسی وقت دوست محمد اندر گیا اور اس کے پیچھے مشنری ہائے کی ٹرے لے آئی۔ دوست محمد کی شان پہلے ہی قلندر لڑتی۔ رنگ کالا تھا اور سر کے سخت گھروسے بالوں میں سفیدی غالب

تھی۔ جب سے وہ نقشہ کرنے لگا تھا اس نے شیو بنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس کے چہرے پر بھی بال آگئے تھے۔ لال چار خانے والی پٹی میں اور بوسیدہ خاکی پتلون شاید اس نے کئی گھنٹے سے پہن رکھی تھی۔ رہی سہی کسر اس کے بدن پر سیل کی تڑپ پوری کر دی تھی۔ مشنری نے چائے کے برتن رکھتے ہوئے ناک پر دوپٹے کا پلو رکھا اور زیر لب کہا۔ ”موا جرسی... کوٹے کی پوٹی۔“

”کیا تم نے دوست محمد سے کچھ کہا؟“ محسن بولا۔ ”بھی نہیں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے۔“

”ہاں ہاں جو پوچھنا ہے سامنے پوچھ لو۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے غلط نہیں بتایا تھا۔ سب سے پہلے قفسہ پاک کیا کسر کر دیوں۔“

”میں نے گھر پر ہاتھ کو چھری کی طرح پھیرا۔ ”پھر دلاؤ۔“ میں نے ہاتھ سے سینے میں نیالی جھجھکھونا۔ ”اور آخر میں ہو۔“ میں نے ایک ہاتھ کی انگلی سے ریلو اور بنا کے ٹراکس دلیا۔ دراصل میں نے دیکھ لیا تھا کہ دوست محمد نے جھجھکھونا مار کے زمین پر بیٹھے ہی انھیں بند کر دی تھیں اور ذہنی طور پر وہ غیر حاضر تھا۔ لیکن پیچھے کھڑی ہوئی مشنری کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

”کیوں بھی دوست محمد؟“ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”یہ ٹھیک بولا نہیں نے۔“

دوست محمد بھاری سے بولا۔ ”ابو! سب ٹھیک ہے۔“

مشنری پہلے ہی بدھواس ہوئی تھی۔ دوست محمد کا جواب سننے ہی اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ ایک دم چھا گیا۔ ”...ٹھیک کر کھا کر گری۔“

”بیچ مار کے اچھی اور غائب ہو گئی۔“

دوست محمد نے اسے غور سے دیکھا۔ ”اس لڑکی کا سفر میرے کو خراب لگتا۔“

”ہاں، پاگل ہے، بچاری،“ محسن بولا۔ ”لیکن خطرناک نہیں ہے۔“

”کیا نام ہے اس کا؟“ دوست محمد نے پھر دے سے کہا۔

”نام تو... پتا نہیں... کریم پیارے باو کی کتاب ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پڑا نہیں مانتی۔“

”کریم پیارے بولت... اس کا کون ہے یہ پاگل؟“

”تمہیں نہیں معلوم؟“ میں نے کہا۔ ”بوی ہے اس کی۔“

”اچھا... سلامتی... شادی بنایا اور کم تو نہیں بتایا۔ ہم کو اٹھا دو لوں اور ہم سے اسادی کرتنا۔“ وہ خفا ہو کر بولا۔

”پلو چھوڑو استاد، یہ نقشہ دیکھو۔“ میں نے کہا۔

دوست محمد نے کانڈ کو چیل کے نظر جھاننے کی کوشش کی، پھر آنکھیں مل کے دیکھا۔ اس کی صورت پر جھجھکھٹ کے آثار نظر آنے لگے۔

”ابھی ایک گھنٹہ دو کم ہو۔“ وہ التجا میرے لیے سے ہاتھ

پھیل کے بولا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا اور اسے ایک مگرٹ نکال کے دے دی۔ "اب رات کو سونے سے پہلے تین مگرٹیں نہیں ملے گی" اس نے میری بات ان سختی کر دی اور مگرٹ جلد کے لیے لپے کش لینے لگا۔ میں اور محسن چلے بیٹھے رہے اور دوست محمد کے "پوٹ" میں لٹنے کا انتظار کرتے رہے۔

بالآخر اس نے انھیں کھول کے نقشہ دیکھا، اس کے ماتھے پر غور و فکر کی گہری لکیریں کال جال کھڑی ہوئے لگا۔ اس نے دوبارہ سر ہلا کے دوسرے "پوٹ" لیا۔ اور پھر انھیں بند کر کے ایک ایک سے ہوا میں فرضی گہری لکیریں بناتا رہا۔ وہ اپنے تجربے کی روشنی میں کچھ لگا رہا تھا اور اندازے کا تم کر رہا تھا۔

"یہ تو تم ہانتے ہو کہ ہم ایک مگرٹ جہاز کے تاقب میں ہیں" میں نے کہا۔ "اس کا نام ہے ایس ایس کرنا ٹیٹھڑ۔ وہ جہاز ریل آدی رات کے بعد کراچی کی بندرگاہ سے ممبئی کے لیے چلتا تھا۔"

دوست محمد نے سر ہلایا۔ "ابھی یہ نقشہ کس پائل کا بچہ نے بنایا ہے؟"

"میں... کیا یہ غلط ہے؟ میں نے کہا۔"

"کوئی کاغذ لاؤ، وہ نقشہ پر غور کرتے ہوئے بولا: ہم اس کو ٹیک کے بنائیں گا؟"

وہ کوئی نیوی گیشن انجنیر نہیں تھا۔ اس کے پاس کسی بیرونی کسی فنی اور اسے کوئی سند نہیں تھی، لیکن چالیس برس کا تجربہ اس کی سب سے بڑی سند تھا۔ میں نے اسے کورس کاغذ پر اکڑی پرچی کھینچ کر بناتے اور انھیں بند کر کے بڑھاتے دیکھا۔ وہ کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاہدیل کے نقشے میں بڑے تفصیلات کی تھیں، وہ انھیں مکمل کرنے میں مصروف ہے۔

بالآخر اس نے کہا: "ابھی کیا کرنے کو آگیا؟"

میں نے کہا: "پہلے تو یہ بتاؤ ہم اس جہاز تک کب پہنچ سکتے ہیں کیا کل رات تک یہ ممکن ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا، کل رات مشکل ہے بابا۔ ابھی جو فرق ہے... تو چھپ گھٹا۔ اس میں کچھ گھٹا ملاؤ۔ لاتی چلیں گا کچھ گھٹنا، پھر ایک گھٹنا نہیں چلیں گا۔"

"بائیں گھٹنے... یعنی ہر سول بعد دوپہر... میں نے کہا۔"

"اگر کوئی گڑبڑ نہ ہو، دوسرے صبح بولا۔"

"اگر بڑا کس قسم کی جو کچھ ہے؟ محسن بولا۔"

"کیا بات کرتا ہے تم... یہ سمجھ رہے۔ کراچی کا مرکز پر بھی بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ اور تم کو وہیل ٹرمار سے پھر واردات

کو تم چلے جاؤ کسی چٹان مٹان پر... پھر... انجن خراب ہو جاوے پھر؟"

"انجن تو جھارے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔"

"او بابا، بات ہم کا ہے۔ جتنا وقت تو گھنٹوں کا نا، وہ چڑا کے بولا: ہم وہ جہاز دیکھا ہے۔ اس کا اسپیل بھی مالم ہے ہم کو۔"

لیکن راستہ خراب ہے۔ شام ہو سکتا ہے۔"

"شام تو ٹیک ہے؟ میں نے کہا: کوشش کرنا کہ ہم اندر آ جوتے تک ان کی نظر میں نہ آئیں۔"

اس نے سر ہلایا۔ "ابھی یہ بولو کہ تم کچھ آگیا تو کیا کر سکا؟"

"اس کا بندوبست ہم کر رہے ہیں۔" میں نے کہا: ہم سب کے فرضی نام ہوں گے اور جی پاسپورٹ، بجلی سے سب رابطہ ہے۔"

"یہ تو بہت نظر آئے بابا۔"

"تم جو حرکت کرو اگر کوئی چیک کرنے آئے تو تم انھیں بند کر کے سو جاؤ۔ ہم بتا دیں گے کہ... ہاں نشے میں ہے۔ کوئی تم سے لاکھ پچھو جواب مت دینا۔ ویسے ہم بتا دیتے ہیں تمہیں کراہ میں ہیں ہمارا شہر کیا ہے۔ میں اور محسن بھاگے ہیں۔"

دوست محمد نے محسن کا، اور ہم دونوں ہمارے بیٹھے ہیں۔"

"اور وہ پائل؟"

"ہمارا مطلب ہے بولی؟ میں نے مسی روک کے کہا۔"

"وہ تو ہے ہی کریم کی بیوی کریم ہمارے ساتھ کام کرتا ہے۔ ہم سب مائی گھر ہیں۔"

"جو تمہارا مرضی بولو بابا۔ ہم اپنا کام کرے گا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا: رات کو باری باری ڈیوٹی دے گا تم۔ ایک آدی جلا ساتھ ہوئیں گا ایک کریم کا ساتھ۔"

مگریم تمہاری مدد کے بغیر تک تو نہیں جاتے گا؟"

"ہم اس کا مغز میں سیدھا راستہ ڈالیں گا۔ پھر کیسے بیویوں کا راستہ وہ... اور ہم بھی ادھر ہے، لیکن ہم کیلا سامان رات نہیں جاگ سکتا؟ اس نے سنا ہر جاتے چلے کیا۔"

اس کے جانے کے بعد مجھے گل کا خیال آیا۔ اس نے جانے بھی نہیں پئی ہمارے ساتھ۔"

"عرشے پر ہوگی؟ محسن نے کہا: میں نے کہا: "آہوں"

جب وہ دونوں آئے تو گل کے چہرے پر بڑی تکیہ بکراٹ تھی۔ دہری کے ناز اور محسن کی انداز سے روشن، بیخ مندی کے غرور سے معمور اور غور معلوم نہیں محسن نے کیا کہہ دیا تھا اس نے کیا بھولا تھا کہ اس اور مجھے بھی گل... کی شوخی عود کر آتی تھی۔

"کہاں تھیں تم؟ میں نے ڈانٹ کر کہا۔"

"پہلے تو کریم اور شری کا ڈراما دیکھ رہی تھی۔ تم نے ناشورہ چھوڑ دیا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی: "اب وہ کریم کی قسم پر بھی خیار کرنے کو تیار نہیں کرتی ہے تمہارا باپ مجھے بھی قتل کرنے کا۔"

میں نے بعد میں کو ڈرنا دیکھی رہی۔ بڑا اچھا لگتا ہے۔"

"ابھی شری شروع ہوا ہے، میں نے کہا: صبح ہو چکیں گے آج تمہارا حال کراب کیا لگتا ہے؟"

"کیوں؟ صبح کی جوگا؟" وہ بولی۔

"سند ریپٹ میں طوفان اٹھانے کا، پھر متلی اور قے ہوگی جسے سب کینس۔" کستے ہیں۔" میں نے کہا: تمہاری بہت سب کی حالت خراب ہوگی، بہتر ہے اس سے پہلے ہی ضروری کام کر لیں۔"

کیونکہ لاٹش جلا کے میں نے محسن کی مدد سے چار پاسپورٹ تیار کیے، پہلا پاسپورٹ میرا تھا، دوسرا محسن کا۔

"محسن ہماری قومیت اور شہریت بدلے گی تو ہم بھی نہیں ہوں گے۔" میں نے کہا: محسن غور فرماتے کے بعد میں نے اپنا نام اس پر چند ولد وطرزی لال اور تیرا نام فیر چند ولد وطرزی لال لکھو لیا ہے۔"

گل بہنی محسن نے استیجا کیا یہ کیوں یہ کفروں کے نام رکھ کے اپنی اور میری عاقبت خراب کرتا ہے؟"

"ناقل کفر کفر بائیں۔" میں نے کہا: ہماری اصلیت ولایت بدل نہیں سکتی۔ اس سے دھارے ایمان میں غل ملنے کا کوئی سوال ہے اور ایمان میں؟"

"پھر محسن ضرورت کیا ہے میر چند ولد وطرزی لال بھنکی؟"

آخر ہندوستان میں مسلمان بھی رہتے ہیں؟ محسن بولا۔

"ہاں رہتے ہیں لیکن انھیں وہ تحفظات اور اصلاحات حاصل نہیں جو ہندوؤں کو حاصل ہیں۔" میں نے کہا: لیکن بڑے مسلمان کی حیثیت سے ہم ہر جگہ اپنے لیے جگہ بنا سکیں، مشکوک سمجھے نہیں ہمارے شکار کا شکار ہو جائیں۔ میں عام لوگوں کے درمیان رہتا ہوں اور کوئی جانے کہاں کی خاک مچھانچی ہے؟"

"میں قائل ہوں کہ بغیر تیری بات مان سکتا ہوں بشرطیکہ میرا نام میر چند ہو جو میری ریشہ دار عادات اور شاہانہ اطوار کے زیادہ شاہانہ ٹائٹل ہے۔" محسن نے کہا۔

"بات صورت کی ہے عزیزم، اگر تم غیر جانبداری سے غور کرو تو تمہاری شکل سنگھوں والی ہے۔ آدی دیکھے تو خواہ خواہ ترس لکے خیرات دینے کی سوچتا ہے۔ فیر چند کا تیل تمہاری صورت پر بہت مچ چھال ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ دھاندلی نہیں چلے گی، ٹائٹل کو فیصلہ کرنے دو۔"

"اور ٹائٹل کی ہوگی۔" میں نے کہا: "پھر گواہ گروٹ، تم

دونوں تو ایک ہی تھیں گے گی مسٹر پاکستان اور تم اسے بنا دو گے۔" میں نے یورس، میں پکڑتا ہے ہلکے ہلکے۔"

"اچھا میں کرو، اور رشتہ تو ان کے ہنسنے لگ جائیں گے۔"

میں نے سکڑنا لگا اور اوپر اچھا لگنے سے بچ کر کے دونوں ہاتھوں میں دوایا۔ محسن نے چاند تارا مانگا۔

"اب بولو، وہ دونوں بھتیگیوں کے درمیان جھانک کے سن رہی۔"

"کون سا ہاتھ سائے کر لیں، دایاں یا بائیں؟"

"بائیں؟ میں نے کہا۔"

"میں دایاں؟ محسن نے غور چھایا اور گل نے سیدھے ہاتھ کی بھتیگی سائے کر دی۔"

میں نے قہقہہ مارا۔ "دیکھا ہے کہتے ہیں تقدیر کا فیصلہ اور وہ سکڑنا کر گل سے لے کر جب میں ڈال آیا جس کے دونوں جانب چاند تارا ہی تھا محسن کو یاد نہیں آیا کہ اس ہنسنے کے لیے ایسے خصوصی سکے ہم کتنی محنت سے بناتے تھے، اور سچا لکے رکھتے تھے گل نے یہ بات یقیناً نوٹ کی ہوگی مگر اس نے یہ راز افشا نہیں کیا۔"

"گلاب کو جس نام سے چاہو پکارو وہ گلاب ہی رہتا ہے محسن نے ڈھٹائی سے کہا۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے اتفاق کیا "شوا اپنی گل پاسپورٹ میں گل خان ہے، تم اسے گل جان کو سب بھی رہے گی گل باؤ۔"

"او گل جان، ہوشے۔" محسن نے غور لگا یا: "وئی قریب؟"

میں نے گل کو گل لالہ بننے دیکھا اور سر جھکا کے پاسپورٹ کے اندراجات مکمل کرنے لگا۔ یہ بہت احتیاط اور جانفشانی کا کام تھا۔ محسن نے میری مدد کی اور اڑھ گھنٹے میں ہم فارغ ہو گئے۔ ہمارے پاس جو ہر تین تھیں وہ اصلی تھیں کوئی دوسری نہیں جلدی ایکسٹوں کو خود حکومت نے فراہم کی تھیں۔ بینک پاسپورٹ بھی جلی نہیں تھے۔ اب وہ لوگ بھی زندہ نہ تھے تو ان کی گندہ کی رپورٹ لکھواتے، چنانچہ نقل طرح سے اصل کے مطابق تھی۔ خود تصدیق کرنے والے ہم پر شک نہیں کر سکتے تھے اور یہ دتا ویز ہمارے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت تھی۔

"کیا ہم یہ پاسپورٹ ہر جگہ ہر وقت پیش کریں گے ہر بار؟"

عجبے تھو تھوے کو؟ محسن نے کہا۔

"میں نہیں جانتی کہ کوئی ہماری شناخت کا ثبوت نہ مانگے اور رشوت لے کر بھی ملنے پر آمادہ نہ ہو۔ پاسپورٹ نکالنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا: یہ پاسپورٹ صحت سے گزرتے ہوئے یا مشرقی پاکستان کی سرحد عبور کرتے وقت زیادہ کارآمد ثابت ہوں گے۔ ابھی تو ہم چھپ رہے ہیں پچھلے گئے تو کہہ دیں گے کہ غلطی سے آگے نکل گئے۔ پاکستان اور تجارت دونوں ہی اپنی

سمندری حدود میں گھس آنے والے ماہی گیروں کی لاپتہ پکڑتے رہتے ہیں لیکن ان کے خلاف قانونی کارروائی نہیں ہوتی پس دو چار دن کھتے ہیں کچھ مال بناتے ہیں یا مال نہ ملے تو تیرہ تیر کے چھترے تھوڑی سی خاطر تواضع کرتے ہیں اور جیو پور دیتے ہیں جو کچھ کم نذرانہ پیش کرنے کی یوزیشن میں ہیں اور کبھی آؤ اور کبھی اس لیے فوری طور پر ہیں قانون سے کوئی خطرہ لاحق نہیں

”پھر اتنی جلدی کیا تھی پاسپورٹ بنانے کی؟“ گل نے کہا۔
”اچھا سوال کیسے ترسے گل خان؟“ میں نے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ دوران سفر کچھ بھی ہو سکتا ہے کوئی بھی حادثہ ایسا ہی آسکتا ہے جو ہم سب کو مہلک کر دے کسی بھی نوعیت کی ہنگامی صورت حال کے بارے میں ہم سب کو پہلے سے معلوم ہونا چاہیے کہ ہاری کیا فائزے دار کی ہے“

”کیا یہ بہترین سیل ہوگا کہ اس بچے کے سامعین میں سماء مشنری اور ان کے بچوں سیل کر کے کو کبھی شامل کر لیا جائے؟“ حسن نے کہا۔

”ٹھیک ہے“ اس بریفنگ کی زیادہ ضرورت ابھی کو ہوگی۔
”میں نے کہا“ دوست محمد کو جیو پور دو۔ وہ ہم سے زیادہ جانتا ہے سمندر کو“

”حسن“ اس بریفنگ کی زیادہ ضرورت ابھی کو ہوگی۔
”میں نے کہا“ دوست محمد کو جیو پور دو۔ وہ ہم سے زیادہ جانتا ہے سمندر کو“
”اچھا“ اس کے ساتھ صرف مشنری تھی۔ اس کا بھی منہ سوجھا ہوا تھا اور وہ ایسے آئی جیسے غلطی بلدیو قرار دیا جائے والا کھلاڑی پولیس میں آتا ہے۔
”نصف بتر تو آگئی“ میں نے کہا۔ ”نصف بتر کہاں ہے؟“
”اپنے اعمال کی سزا جگت رہا ہے“ حسن بولا۔ ”آستارے شکر کو کھڑا کرنا رکھا ہے؟“
”کس جرم میں؟“

”جرم... ہجرتیلا ہے شاعر نے کہ جرم گفت میں میں لوگ سزا دیتے ہیں“ حسن بولا۔ ”دوست محمد اس خلام سماج کا گمانہ نہ کیا ہے میری سفارش سے وہ بیروں پر رہا ہو کہ اسے جب دایں جلے گا تو باقی سزا کاٹے گا“

کریم آہ دیکھا کہ اور دیکھ کر انا اندھا رہا۔ اللہ کا قسم ہم ایک دم ہر گیا صاحب آپ بوہت علم کیا کریم بھتی پر۔ آستارہ کو بول دیا کہ ہم پوری پوری شادی بنایا اس کو کریم بلایا۔ ہم بولا کہ اس کا دایاں کب بولنا ہاں شہم تاحی ہاں کوئی مت آؤسے تو شادی ہووے گا لیکن تم نہیں آئیں گا تو کریم بھتی ہاں میں بولیں گا۔
”پھر آستارہ نے نہیں بولی نہیں کیا؟“
”کیا صاحب“ لیکن اچھی بولنا کہ اچھا تو شادی نہیں بنایا ہے

تو میرے ساتھ وہ نہ کر اس پاگل سے نہیں بنائیں گا۔ میں بولا کہ پاگل استاد تو صاحب... وہ مشنری کا نام لیا۔ اب ہم اس کو کیسے دے کر یہ پاگل نہیں ہے۔
”اے ہے“ اس شخص بڑھے پر خدا کی مار مجھے پاگل کہتے مشنری نے ہاتھ بلکے کہا۔ وہ خود پاگل... اور تو کیوں نہیں بتا کر یہ بات اسے۔

”کبھی کبھی استاد سے جھوٹ بولتا ہے مشنری۔ اللہ نہ کو مانی دیوے۔ لیکن آتا ہوا جھوٹ کیسے بولے“
”کیا مطلب؟“ مشنری نے جھک کے کہا۔ ”جھوٹ ہے اور بھی کتنا ہے نیچے پاگل تیرا اپنا دماغ ٹھکانے ہے...؟“
”اے اپنا پاس کہ مصر ہے فی دماغ، لیکن تو کھڑوت کر، ہم ایسا بات نہیں بولیں گا۔ ہم ساری رات دماغ میں کا گنگو پور صبح اذان دیں گا۔ تو تیرا نام پس گا... آہ اپنا کہ کوئی نہ ٹھاہو گیا... وہ جھوٹے فرس پر بیٹھ گیا۔

اس کی باتوں پر مشنری آنا لازمی تھی۔ لیکن میں نے سیرس ہو کر کہا۔ اس وقت تمہیں ملانے کا مقصد یہ ہے کہ کچھ مشنری باتیں تمہیں پہلے سے بتا دی جائیں تاکہ تو مت جانتے ہو گے کہ ہمارے اس سفر کا مقصد کیا ہے۔ ہمارے سامنے خطرات ہی خطرات ہیں لیکن ہم خدا پر بھروسہ کر سکتے ہیں کہ جیسے اس نے آج تک ہماری حفاظت کی ہے آئندہ بھی کرے گا۔ احتیاطی کار لازم ہے۔ ایک بات تم دھیان سے سن لو۔ اب ہم وہ نہیں ہیں جو روایتی کے وقت تھے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ یہ سفر ہمیں بدل کے اور اپنی اصلیت کو پوشیدہ رکھتے ہوئے کریں۔ ہم سب نے اپنے نام بدل لیے ہیں اور آج کے بعد ہم انہی ناموں کے ساتھ سفر کریں گے۔ ہمارے یہ نام واپسی تک یہی رہیں گے۔ اگر کبھی سے ہم نے ایک دوسرے کو ان ناموں سے دیکھا نہ شروع کیا تو عادت نہیں ہوگی اور کہیں کسی غلط موقع پر ناواقفگی میں صبح نام ہمارے منہ سے نکلا تو سب پھنس جائیں گے۔ یاد رکھا

میرا نام ہے امیر چند، لیکن کا نام ہے فقیر چند اور یہ گل پور اور واند لباس اور طیلے میں بیٹھی ہے، یہ گل خان ہے۔ یہ عورت نہیں ہو ہے۔ امیر چند اور فقیر چند بھائی ہیں اور ان کے باپ کا نام ہے دمتری لال۔

”صاحب جی یہ تو بہت مشکل نام ہیں“ مشنری نے کہا۔
”وہ میری باتوں پر ہے حد حیران اور پریشان تھی۔“
”فحوت کر دین میں تیرے کو کھجاندوں گا۔“ کریم نے کہا۔
”مگر صاحب“ یہ دمتری لال کون ہے؟“
”تمہارا آستارہ یہ ہم یہ ظہر کریں گے کہ وہ ہمارا باپ ہے

میرا اور حسن کا،“ میں نے کہا۔ ”گل خان ہمارا ساتھی ہے اور ہم سب اچھی گزیر ہیں۔ کبھی کبھتے ہیں اور گل صبح سے ہم یہ کام شروع بھی کر دیں گے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔“

”ہمارا بھی کوئی اچھا نام رکھو صاحب“ کریم نے کہا۔ ”یہ مشنری بھی ہم کو اچھا نہیں لگتا۔“
”ارے کھو ہے، میں اچھی نہیں گتی تھی۔“ مشنری نے جھک کے کہا۔ ”کون اچھی کے ہے پھر تھی، بتا۔“
”ارے بابا، ہم نام کو بولا۔ مشنری تو وہ ہوتا جیسے اپنا استاد... ٹھیک“ کریم نے اسے کھجایا۔ ”پہلے اس کو سب مشنری صاحب بولا۔ اچھی دعا ساد ہے۔“

”جو تم خود اپنے لیے اور مشنری صاحب کے لیے وہ نام تجویز کرو جو تمہیں اچھا لگتا ہے“ میں نے مسکاکے کہا۔
”طلہ اور سارا کیسا رہے گا۔ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ نکت کرتے رہتے ہو یا حسن نے کہا۔

”ایک دم ٹھیک صاحب“ کریم خوش ہو کر بولا۔
”اسے گل ناماد، توں جابلہ، میں مشنری ہی بھلی ہو مشنری نے گل میں کہا۔“ جیسے تو وہ بڑھاٹیلے کی طرح سجا بھیرے ہے؟“
”جو جھوٹو، تمہارے ہی نام ٹھیک ہیں“ میں نے کہا۔
”میرا، صرف کریم اور یہ تمہاری گھروالی تھی مسز کریم“
”میں... صاحب جی“ مجھے تو صاف ہی رکھو۔“

”اچھا... گویا تمہیں کریم کی شریک جلت کھانا بھی منظور نہیں سماء مشنری؟“ میں نے کہا۔ ”میں بھی مجبور ہوں، حسن کے لیے بھی یہ ممکن نہیں۔ چلو ہم فی الحال تمہیں دوست محمد کی زوجیت میں دیتے ہیں۔ عارضی طور پر۔“
”ہم نے ہو گیا کہ تم دوست محمد کی بیوی؟“ حسن نے کہا۔
”اور یہ فیصلہ بلا نہیں جا سکتا۔ کریم کے علاوہ اس پورسٹ کے لیے وہی دستیاب ہے۔“

”اچھا... تو پھر کریم ہی ٹھیک ہے“ مشنری نے مڑوہ لے لی۔ ”لیکن اسے سمجھا دینا۔“

”بھئی یہ تو کاغذی کارروائی ہے۔ اس نے تمہارا شوہر بننے کی کوشش کی، تو ہم پھر پھر کریں گے تمہیں“ میں نے کہا۔
”اور اب ذرا تو میرے میری بات سنو۔ ہم مینوں کے پاسپورٹ تو بھی ہوتا تھا پاسپورٹ ہم کریم کے لیے بنائیں گے۔ مشنری کا اور دوست محمد عرف دمتری لال کا کوئی پاسپورٹ نہیں ہوگا۔ کبھی کسی نے چیک کیا تو چار افراد کی چیکنگ کافی ہوگی۔ سب نے پاسپورٹ نکال کے پیش کیے تو یہ بھی شک پیدا کرنے والی بات ہوئی کہ کریم کہہ سکتا ہے کہ اس نے نئی شادی کی ہے بیوی

کا پاسپورٹ ابھی میں بنوایا۔ دمتری لال کے لیے میں اور حسن کہہ دیں گے کہ اس کو کوشی کی کت ہے۔ پاسپورٹ تھا مگر نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے... جن کے پاسپورٹ میں وہ انہیں اس وقت تک پیش نہیں کریں گے جب تک میں انہوں لیکن ان کو اپنے پاس رکھیں گے، ہر وقت۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ایک بلاٹک میں پاسپورٹ کے ساتھ انڈین کرنسی اور پاکستانی کرنسی ہوگی کریم کو دو ہزار پاکستانی روپے اور دو ہزار بھارتی روپے دیے جائیں گے۔ ہم سب کے پاس پانچ پانچ ہزار ہوں گے۔ اس رقم کو انتہائی ہنگامی ضرورت کے لیے محفوظ رکھنا ہوگا کہ گولڈن یا کسی اور حادثے کے باعث لالچ خرچ ہو جائے تو ہم سب لالچ جیکٹ کی مدد سے ڈوبنے سے بچ جائیں گے۔ یہ ایسا راستہ ہے کہ اور سے بھری جہاز اور لالچیں گزرتی رہتی ہیں۔ کوئی کوئی سب کو بچالے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم پھر ٹرائیں اور الگ الگ لالچوں یا بحری جہازوں پر پہنچ جائیں۔ اس قسم کے حالات میں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مدد کرنے لگے کچھ نہیں پوچھتے۔ ان سے صرف اتنا مانگا کہ آپ کے ہمارے لالچ ڈوب گئی ہے۔ وہ بیوی کی طرف جارہے ہوں گے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ کراچی کی جانب جارہے ہوں گے تو ایسی صورت میں، ان سے درخواست کی جا سکتی ہے کہ وہ تمہیں ہمیں جانے والے جہاز پر منتقل کر دیں۔ تھوڑا آگے پیچھے سب ہمیں پہنچ جائیں گے۔“
”اگر اس سے پہلے ہی کسی وجہ سے یا شاکر کے اندر نہ پہنچے تو حسن بولا۔

”مشنری نے ایک پیچ ماری۔ کیسی باتیں کرو ہو صاحب جی۔“
”تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی قریب آئے تو ایسے ہی ڈانٹ کر بھگادینا۔ جیسے کریم کو ڈانٹتی ہو؟“ حسن بولا۔
”آؤ... آؤ...“ میں نے میرے ہارٹ کا ماسک کہا۔ ”میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ہمیں پہنچ جانے کے بعد ممکن ٹھکانے کا مسئلہ درپیش ہو۔ اول تو کچھ دے دلا کر کھانے کی کوشش کرنا۔ ہند گا کہ کسی کے لیے نئی جگہ نہیں کرنا چاہی اور زمینی کی بندرگاہیں کوئی فرق نہیں ملے گا۔ ویسے ہی لوگ ہوں گے، وہی سب دھندے۔ یہ ابھی کر کے والے اور پورہ وارے بتانے والے۔ وہ تمہیں باہر نکال دیں گے۔ براہ راست پولیس یا سٹم والوں سے واسطہ پڑ جائے تو پھر اپنے پاسپورٹ پیش کر دینا۔“
”میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہے“ مشنری نے کہا۔

”تمہارا پاسپورٹ یہ ہے؟“ میں نے کریم کی طرف اشارہ کیا۔
”بتا دینا کہ سمندر میں گر گیا تھا۔ گل کو کا تو مل جائے گا۔ ہمیں میں بھی ہزاروں کشتیاں اور لالچیں ہوں گی اور پھلی بندر بنی ہوگا۔

یہ سب سے پہلے ہمارے سرکاری کتب خانے میں

”خیر! انھیں کچھ نہیں لگے گا ہلکی لالچ پر۔“ میں نے کہا۔ اور
 پہلا خطرہ ہو سکتا ہے؟“
 وہ ہنس کر لکھا بات بولتا کس قدر صاب۔ خطرہ کہ ہمیں ہوتا
 گھر میں سرگرمی پر آسمان میں اللہ پر عبور و سار کھو۔ پھر وہ ہلکا اور
 کشنیتا ہوا غائب ہو گیا۔
 جب مشتری نے کھانے کا اعلان کیا تو میں اور محسن عرشے
 پکھڑے ہوئے تھے۔
 ”ہم کتنا نہیں کھا نہیں گئے۔“ میں نے کہا۔
 ”کیوں صاحب جی اتنی محنت کی ہے میں نے۔“ مشتری نے
 یابوسی سے کہا۔

”تمہارے صبر نے منہ کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ کھانا
 کھا کے آجاتا میرے پاس کہتا تھا کہ اے کھانے سے دیکھا بہتر؟
 ”کیوں، کیا خزانہ نظر آئی اس ہڈے سے خوش کوس؟“ میں نے پوچھا
 ہوں جا کے، ”مشتری بھگوان گئی۔“
 ”اے! ایسا اقدام خود کو خوشی مت کرنا۔“ میں نے کہا۔ ”ایک
 تو وہ غصے میں ہے پھر نے میں بھی ہے۔ کہیں پوچھا تھ کر نہ رہے۔“
 ”آپ مذاق کرتے ہو مجھ سے صاحب جی۔“ مشتری نے کھانا
 سچے رکھ دیا۔ ”کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ میں تھل۔“
 ”یاد رکھو جو کئی ہے، ”محسن نے بیٹھے ہوئے کہا۔ ”تجھے
 سوچ رہی ہیں یا نہیں۔“
 ”کچھ نہیں بات کرتی۔“ واقعی دوست محمد نے منہ کیا تھا حالت
 خراب ہو جانے کی اگر پیٹ بھرا ہوا ہوگا۔ ”میں نے کہا۔ ”رات
 بھر پیرے داری کریں گے یا تیار داری۔“
 ”نافرمانی ہوں گے تو کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔“ محسن نے
 کہا۔ ”اور سمندری سفر سے جو کچھ ہوتا ہے نا، اس کا علاج ہے میرے
 پاس۔ میں نے کریم سے کہہ دیا تھا کہ دوا علاج کا بندوبست بھی
 رکھے، ورنہ سب لیے پڑے رہیں گے۔ پہلے کھانا کھا میں گئے پھر
 دوا کھا میں گئے۔“
 ”اگر یہ بات ہے تو پھر بسم اللہ۔“ میں نے بیٹھے ہوئے کہا۔
 ”مگر یہ گل کہاں ہے؟“

”اس کی طبیعت بھگوانی تھی میں نے دوا دے دی ہے اس
 کا آرام کرنا ہی بہتر ہے۔“ محسن بولا۔ ”طبیعت سنبھلے گی تو کچھ کھلی ہے
 گی۔ بہت کھانی یاد دودھ۔“
 ”ہم پر کیوں انہیں جواب تک؟“ میں نے کہا۔
 یہ سب مناجات اللہ ہے۔ ”محسن اور پرانگی اٹھا کے بولا۔
 ”وہ چاہتا تھا کہ ہم کچھ روٹ کھا میں، ”خوب ڈٹ کے۔“ سبحان اللہ
 بی مشتری جی چاہتا ہے کہ میں... میرا مطلب ہے تمہارے ہاتھ

ہی تو م لوں ابھی تو کچھ بھی کیا بنائی ہے کھیرے کی۔“
 ”لو کی کھیر ہے صاحب جی۔“ مشتری نے خوش ہو کر کہا
 ”کریم کے تو مزے ہو گئے۔ کبھی لکھو کی کھیر۔ کبھی کریم کھیں۔“
 کبھی گوشت کا کھلو تو کبھی بھجن کا۔ ”محسن نے کھاتے کھاتے کہا۔
 ”گھاس پھوس سب پکا تھی بوتھ۔“
 ”آپ بڑے مذاقیے ہو صاحب جی۔“ مشتری نے کہا۔
 ”مذاقیے؟ ایسی سخرے۔“ میں نے غصے کی ٹانگ لاکے کہا۔
 ”آپ نے مشائیر وانی صاحب۔ آپ کو جو کر ملے جانتا ہے۔“
 یہ گستاخ کینہ۔ آپ کے خاندان کی ناموس پر حملہ ہو رہا ہے اور آپ
 پیٹ کا دوزخ بھر رہے ہیں۔ کیا ہوا آپ کی عزت کو؟“
 ”نفل گئی ایک ہے غیرت کے ساتھ۔“ محسن نے دوسری ہانگ
 لہرا کے کہا۔ ”یہ سب بھی کچھ روٹ کھاتے ہوئے ہمارا خون سرد
 پڑ جاتا ہے اور سفید بھی ہو جاتا ہے۔“
 ”صاحب جی، ایک بات پوچھوں پھر کم تو کتنا ہے کہ یہ میرا
 باپ نہیں ہے، ”مشتری نے کہا۔

”باپ نہیں تو پھر کیا ہے...؟“ میں نے کہا۔
 ”مشتری ہستی۔“ اس نے میں تھل کیسے کیسے۔ ”مجھے تو یقین تھا
 ”جب وہ یقین قتل کرے گا تو تمہیں بھی یقین اچھے گا۔“
 ”میں نے کہا۔“ جیسا کہ میں نے بتایا تھا، ”سب سے پہلا مشکل تھا
 بد نصیب کسمس، اس کا بڑا ختم تو تیرہ تھا بہت سنگین۔“ آخر اس نے ہی
 پیدا کیا تھا دوست محمد کی بوی جیسی افسوس ناک چیز کو اس کی
 سزا میں سے، پھر وہ دوا دیا۔۔۔ جو کچھ دوا دیا۔ اچھا آدمی تھا۔ زانہ
 غلام ابن غلام بس فراموشی پر دو گم میں مارا گیا۔“
 ”فراموشی پر دو گم!“ مشتری نے حیرانی سے کہا۔
 ”ہاں! بیٹی کی کوئی بات نہیں مالت تھا دوست محمد! اس نے
 ایک دان فراموشی کی۔“ اب آپ شکاری تھے کیا مارا؟“ زانہ نے کہا
 ”میتا ہی شیر جینے،“ باقی اب تو رہ گئے ہیں چل کر تو۔“ اس نے کہا
 کہ یہیں آؤ مار کے دکھاؤ۔ وہ بیٹھا ہے اور آتا ہے بندہ دوا کھاتا
 واضح دی سلسلے بیٹھا تھا دوا دے۔ ”شک میں نے اشارہ دوسرا
 طرف کیا تھا مگر اس نے دیکھا نہیں جو آؤ نظر آیا مار دیا۔“
 ”اور ہو،“ مشتری اب خوب ہنس رہی تھی اور کچھ بھی نہ تھا
 یہ سب مذاق کے سوا کچھ نہیں میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اس کا
 چہرہ چڑا کر ایک غلیظ ماحول کی گھن اور فسطی لین کا نتیجہ تھا کہ
 ایسی زندگی کا عظیم تنہا میں مل گیا اور صاحب! ”الاس اور اچھا
 بچپن سے بڑی تنگ نا اُسودہ خواہشوں کے تھکن کی وجہ سے
 سوا کچھ نہیں تھا مجھے یقین تھا کہ ہمارے درمیان رکہہ آواز
 سانس لینے کی عادی ہو گئی اور اپنی زندگی پر اپنے اختیار کا اعتبار

نے؟ تو اس کے مزاج کی شہدی اور اس کا چہرہ چڑا کر سب ختم
 ہو جائے گا۔
 ”اب یہی بتا دو صاحب جی کہ ہو کر کیا قصور تھا؟“ وہ مجھے
 نادمہ دیکھ کر بولی۔
 ”وہ... اس بچہ کی کا قصور کوئی نہیں تھا۔“ میں نے ہاتھ جھاڑ
 سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا بیٹھ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ بوی
 نے کہا کہ میں زندگی میں تنہا کی یہ وراثت پوری نہیں ہو سکتی۔ باپ
 نے کہا، ”چھڑو کوئی مسئلہ نہیں بیٹھتے تھو ماری اسے کہیں تم فخر
 مت کرو۔ اگر ایسے ہی مزے مزے کے کھانے پکائی ہو گی تو تمہارا
 بون پھٹ نہیں پڑے گا۔ کوئی اننگلی نہیں اٹھا سکتا تم پر۔“
 ”کسی جینے کے بھی میری نظر سے دیکھا تو ہم اس کو کا تو ضرور
 کر دیں گے۔“ محسن بولا۔

جب وہ برق میٹ کر سنتی ہوئی چل گئی تو میں نے مگر ٹ
 چپے ہوئے تسلی کی محسوس کی۔ ”محسن فوراً دوا لینے دو مگر اس کے
 تے اور دوا کے اندر جانے سے پہلے ہی مجھے دوا پائی آگئی۔ جتنا
 کیا تھا سب لنگ لنگا اور میں دو گھنٹے تک عرشے پر سر دھوا میں ایسا
 ۔۔۔ جس نے اس عرصے میں لالچ کے اندر تمام شک پیدا کر کے والی
 چیزوں کو چھپا دیا۔ اس طرح کہ کوئی اچانک تلاش لینے آجائے تو
 اسے کچھ ملے۔ گل نے بھی ایسا پاس بدل لیا تھا اور اگر یہ اس نے
 پڑنے سے پہلے پڑے ہوتے تھے مگر اس کے باوجود وہ چھپا کر نہیں گئی
 تھی۔ اگر لہذا باز دھارے ساتھ ہوتیں تو میں ان کا مسئلہ بھی ہوتا۔
 ”یہ گھر دیکھو میں جس کی کمی نہیں، میں ان کے رنگ
 سمندری آب و ہوا میں سولا جاتے ہیں اور جسم شاخ گل کی طرح
 نرم و نازک نہیں رہتے۔ گل نے بھی محنت زندگی ضرور گزار لی تھی
 مگر ذہن نے کیا بات بھی کر اس کی نادمہ میں فرق نہیں پڑا تھا۔“

”محسن نے سب کا قصور کے مطابق اس کو دیکھ کر سختی سے
 تانہ کی کہ اپنے پاس کچھ نہیں رکھنا ہے جو تلاش میں برآمد ہو جائے۔
 اس کو قریب رہنا چاہیے جہاں سے ایک دم نکلا جا سکے۔“
 ”میں نے اور محسن نے بھرے ہوئے خود کار رولور عرشے
 پر بیٹھ گئے اسباب کے درمیان چھپائے۔ وہ ایسی جگہ تھی کہ
 دوا کی کسی کا پتہ نہ پتہ تھا نا، ”تو سب جی اسے مایوسی کے سوا کچھ
 نہ تھا لیکن مجھ کو کھڑے ایک دم بیچ کے یا بیچنے ہوئے ہونے
 کی صورت میں ہاتھ بڑھاکے باؤں کی سیکنڈ سے بھیج کر وقت میں فائر
 کر سکتے تھے۔ مزید اطمینان کے لیے میں نے اور محسن نے ایک
 ریفریل کی۔“

”اگر کسی دشمن کی باقائون نہ نافذ کرنے والے کسی ادارے
 کو لاکھوں کو اپنی طرف آ کر دیکھیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”تو ہم پہلے سے

یہاں بیٹھ جائیں گے۔ فکرم نہ آتے یوروں کے سن کو زمین میں رکھ۔“
 ”مجھے یاد ہے۔ ہم ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر آسنے
 سلسلے بیٹھ کے جال کو گھنٹوں پر پھیلا دیں گے اور اس کی مرمت
 میں مصروف ہو جائیں گے۔ مزاحمت باطل نہیں کریں گے اور اپنے
 دیتے سے خود کو غریب اور بے سہارا مایہ گیر ثابت کریں گے۔
 گالی گلوچی یا ایک آدھو جی پٹھ لکھنے کی حد تک برداشت کا مظاہرہ
 کرنے سے کوئی غلطی نہ ہو جائے۔“
 ”ورد تکلف بر طرف۔“ میں نے کہا۔

”ہم میں سے کسی ایک کے پاس نشین گن... کے کے
 پاس دستی کم بھی ہو نا چاہیے۔“ محسن نے کہا۔ ”کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے“
 ”میں نے اس سے اتفاق کیا اور یہ دونوں چیزیں بھی قریب
 رکھ لیں۔ کسی کے براہ راست خوانین تک پہنچنے کا امکان نہ تھا۔
 خوانین کی نصیحت آبادی صرف زبان چلا سکتی تھی رولور یا اسٹین گن
 چلانے والی گلی تھی اور مصور یا سنگت سے دوچار ہونے کی صورت
 میں وہ ہماری فتح کے لیے ایسا ہی خفیہ موثر ہتھیار ثابت ہو سکتی تھی
 جیسا کہ دوسری جنگ عظیم میں ایتھیم بم ثابت ہوا تھا۔
 خدا نخواستہ یہ کم ہو پر قابو پالیا تو خود توں کو وسیطہ جیروں کی طرح
 ہسکالے کی کوشش کرتا اور ایسے میں گل ان کو حیران ہونے کا موقع
 دینے پر خلاص کر سکتی تھی۔“

”گل کی طبیعت سننے میں تھی۔ اس نے کہا کہ زانہ خانہ تک
 کوئی پونج کے نو دیکھے گل خانہ سے پوٹیاں نہیں پین کھی ہیں۔
 ”منہا مشتری، فرض کرو دشمن نے حملہ کر دیا تو کم کیا کرو گی؟“
 ”محسن نے مشتری سے پوچھا۔
 ”کوئی دشمن صاحب جی؟“ وہ خوفزدہ لیے میں بولی۔
 ”دشمن بہت ہیں ہمارے۔“ محسن نے ڈاٹ کے کہا۔ ”دشمن
 بنانے کے سوا آج تک ہم نے کیا کیا ہے؟“

”مشتری رو دھو سکتی ہے۔ کو سننے سے سکتی ہے اور اگر ضرورت
 پڑے تو بے ہوش بھی ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ نفعی یا جنگ کی
 حکمت عملی بھی کھاتی ہے۔ جو بعض اوقات کامیاب بھی ہوتی ہے
 لیکن یہ سب صورت میں ہوگا جب ہم پر براہ راست حملہ
 ہو۔“ میں نے کہا۔ ”جنگ لگ کرنے والوں سے پورا تعاون کرنا ہوگا۔
 وہ جیسے چاہیں تلاش کریں۔ یہ سب کچھ میں کریم اور دوست محمد کو بھی
 سمجھا دیتا ہوں۔ آپ لوگ اب سوجا ہیں۔“
 ”میرا خیال ہے کہ تو بھی سوجا۔“ محسن نے کہا۔

”اس وقت بارہ بجے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں گھنٹے بعد میری
 ڈیوٹی ہوگی۔“ مجھے جگا دینا۔“
 مشتری اور گل اب اسی کیمین میں تھیں جس میں پہلے اللہ

کے ساتھ موہنی تھی۔ دوسرے کین کے ایک ٹھٹھے پر میں بہت دیر تک سونے کی کوشش میں انھیں بند کیے لیٹا رہا لیکن ذہن اور اعصاب پر اندیشہ سوار تھے۔ ماحول اجنبی تھا اور رات کے مناتے میں ہر صدمہ سمندر کی پڑ سمیت گوج تھی۔ میں اس لیے تنہائی سے جاکتا تھا کہ کیا پالتے ہی وہ سب خیال جو صدمہ ذہنیت کے جرم میں پیچھے بہت چلتے تھے مجھے گھیر لیتے تھے۔ رالیکہ تصور ایک زندہ حقیقت کی طرح سامنے آ جاتا تھا۔ بھر ناز و اور غالب کے بالوں اور اس قدر ہجر سے جو شکوہ کرتے تھے کہ ہم کس سے شکایت کریں؟ ہمارے والے وقت کے عداوت تھے جو ایک عذاب رکھتے تھے۔

ابھی میں سویا بھی دھکا کہ عمن نے مجھے ٹھٹھا دیا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ میں نے ایک پچھلا لالچ کس لئے جسے کا لگا یا جہاں اب کریم ڈلوٹی پر تھا۔ اور اس کا استاد قریب ہی بہت کم جگہ پر سٹا ہوا سو اور با تھا۔ میں عرش پر آگیا اور سمندر کی دمت کو تصور میں سینے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ اتنا ہی ناممکن تھا جتنا خلا کی گہرائی کا تصور کرنا۔ آخری رات کا وضو سنا پانچ سمندر پر غبار سا چھللا رہا تھا۔ کراچی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ یہی بہت آگے تھا۔ یہ لالچ ایک چھوٹا سا عافیت کا جزیرہ تھی وہ نہ صرف لامحدود گہرائی میں کھینچے لینے والا گونجا کر تھا، پھنکارا، دہاڑتا سمندر تھا۔ ایک ملکب فٹ پانی کا وزن با سٹھ پونڈ ہوتا ہے۔ لاکھوں ملکب میل سمندر کے پانی کا وزن کیا ہوگا؟ میں نے سوچا یہ ان گنت سوال ہیں جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مثلاً اس وقت میں کیسے جان سکتا ہوں کہ رالیکہ کہاں ہے۔ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے اور سو رہی ہے تو کیا خواب دیکھ رہی ہے؟

دو ایک تجارتی جہاز کسی عکس روشن کھٹے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے پیچھے بھی ایسے ہی روشن دھبے سے تھے جن کی حرکت کو محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لالچ کے اجنبی کی آواز نیلکنت بند ہوگئی۔ اس کی رفتار میں نمایاں کمی واقع ہوئی لیکن سطح آب پر اس کا توازن برقرار رہا۔ اجنبی کیوں بند ہو گیا؟ دوست تمہارے کہا تو تھا کہ کچھ گھنٹے بعد اجنبی کو بند کرنا پڑے گا۔ اس وقت مجھے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ کچھ سمندر میں ہم لالچ کو روک کے کیسے کھڑے رہیں گے۔ کیا اس طرح توازن کو برقرار رکھا جاسکے گا؟

میں نے لالچ کے اس حصے کا رخ کیا جہاں اب دوست محمد کی تاضی تھی۔

”کیا ہوا دوست محمد؟ اجنبی کیوں بند ہو گیا؟“
”گرم ہو گیا تھا بابا، بند ہو گیا، ہم خود کیا؟ اس نے چڑچڑا لیے میں کیا۔“ تم کہہ کو پریشان ہوتا ہے۔

”لالچ کیا... ایسے ہی ڈوٹی رہے گی؟“

اس نے ایک ہاتھ نیچے کیا اور مجھے سے اوپر کھینچا۔ اشارت ہو گیا لیکن اب اس کی آواز بند کی ہوئی تھی۔ لالچ نے ایک جھٹکا اب اوپر اٹھنے کے پڑھنے لگی۔

”یہ دوسرا اجنبی ہے؟“ دوست محمد نے کہا۔

”یہ دوسرا اجنبی کہاں سے آگیا؟ میں نے حیران ہو کر کہا۔“
”ادھر لالچ میں ہی تھا کہ اس قدر صاب۔“ آپ تو نہیں پتہ ہو کہ کچھ تھا؟“ وہ بولا۔ ”پتا نہیں، کون کثرت کر کے ڈالا تھا؟ ہم بنائے چا لو کیا؟“

میں نے وہ دونوں کی طرح کھڑا رہا۔ اگر یہ دوسرا اجنبی ہوتا دیکھتے نہ ہوتا پھر ہم بول نہ لادے۔ دوست محمد نے کہا: ”بہت خرچہ کیا چاہتا تھا۔ ابھی دیکھو کسکیا مہاٹ چلتا ہے۔“
”یہ تو تمہارے کمال کر دیا۔ میں واقعی خیال نہیں تھا کہ یہ کریم کو معلوم نہیں تھی؟“ میں نے کہا۔

”وہ ابھی پیچھے ہے بابا۔“ دوست محمد بولا۔ ”میں اس کا واسطے پھر رہا تھا۔ ہم چا کر گھنٹا میں اجنبی ڈٹ گیا تھا کہ کیا؟“
”شاید ہمیں نہیں غرق کر دیتا؟“ میں نے کہا۔

دوست محمد ہنسنا نہیں نہیں، وہ بولتا کہ دوسرا اجنبی لوٹاؤ والا لیکن ابھی وہ اجنبی بنائیں سنا۔ خراب ہو جاتا تو اس کا پانی؟ اس کو چا لو نہیں کر سکتا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم دوست محمد کو ساتھ لے کر سوچا تو ہم نے اس کی زندگی کو بچانے کا تھا مگر پچھلی اس نے ہم سب کی زندگی، خدا جسے چاہے وہیلر بنائے اور جسے چاہے سبب بنائے۔ اپنی پرستارہ صبح روشن ہو کر کھائیں سمندر ہنوز رات کی عکس تھی۔ یہ اندھیرا چاند کی برائے نام روشنی گراؤ سمندر کا نظر آتا تھا۔

اچانک میں نے ایک تیز روشنی دیکھی۔ ایک جھٹکا دکھائی دے رہی تھی۔ گونگی پھر پھوڑے سے وقفے کے بعد ڈٹا جھللائی۔ یہ گونگی ہوئی سرج لالچ تھی۔

”ابھی آپ بتوڑا ہوا شیار ہوا؟“ دوست محمد نے کہا۔
”کیا یہ ہے؟“ میں نے کہا۔

”پولیس کا لالچ بھی ہو سکتا ہے؟“ دوست محمد نے کہا۔
”میں نے گھڑی دیکھی۔ سوا بجے تھے۔ ابھی حسن سوار نہیں تھا کہ میں نے اسے سمجھوڑ کے اٹھا دیا؟“ عمن...

”کیا بات ہے؟“ وہ پریشان ہو کر بولا۔
”کوئی لالچ آ رہی ہے ہماری طرف؟“ میں نے کہا۔ دوست کا خیال ہے کہ انٹر پول والے نہ ہوں۔“

عمن اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ابھی میں جگا نہیں؟“

عمن کی رولنگ اور مشین سے عمن کی کیا ناندہ؟ ہم منٹ لیتے ہیں ان سے۔ وہ کہہ کر کے سوال جواب۔ اپنا سپورٹ دکھا دیں گے ان کو اگر انھوں نے مانگے چل اور پھر چلیں۔“

عمن نے سر ہلایا اور میرے ساتھ عمن پر آگیا۔ رات اجنبی اب گھوم نہیں رہی تھی۔ اس کا رخ ہماری جانب تھا اور میں ہر دو سات تھی۔ عمن کچھ انداز تھا کہ اس کی رفتار کم نہیں ہوگی۔ بین الاقوامی سمندروں میں ہر قسم کے مجرموں سے نمٹنے والی پولیس ہمارے ملک کی پولیس نہیں ہوتی ان کا تجربہ، استعداد اور بی رتاری ہی نہیں اس قابل بناتی ہے کہ وہ مجرموں کو فرار نہ ہونے دیں۔

”دوست محمد نے کہا تھا کہ یہ لوگ بلا وجہ پریشان نہیں کرتے۔“
”عمن نے کہا؟“ اگر کوئی خبری کر دے تو اور بات ہے لیکن خبری انھی کی ہوتی ہے جو اس سنگٹ میں مصروف ہوں۔“

”ہاں، نا ہی کیوں اسے انھیں کیا؟“ میں نے قریب آتی ہوئی لالچ پر نگاہ جمائے کہ وہ تو فیضانہ کے سمندر میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔“

”اگر یہ پولیس نہ ہوتی؟“ عمن نے کہا۔
”پولیس ہوئی تو دوری میں ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”شناختی بیج وغیرہ بول گئے ان کے پاس۔ سمندر خزانق تو ہونے سے رہے۔“
”کبھی سنا تو نہیں کہ سمندر میں ڈاکا پڑا ہو یا کسی نے بحری جہاز ہائی جیک کر لیا ہو؟“ عمن بولا۔ ”پھر باہر کی کچھوٹی سی لالچ پر کسی کو کیا لے گا؟“

”میں نے تو سب کچھ مل سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی لالچوں کے ذریعے میرے جہازات، سونا، فضیات اور نوادرات، یہاں ملک کے عورتوں اور بچوں کو اسمگل کیا جاتا ہے۔ ڈونیا کی مٹی یہی سب بکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”فرض کرنا انھوں نے سربری تلاش کی دلی ہر ساری وضاحت سے مطمئن نہ ہوتے؟“ پتا چلے کہ ہم باہر کی نہیں ہیں؟“ عمن نے کہا۔
”آخر پرانے اور تجربہ کار لوگ بول گئے یہ بھی۔“

لالچ اب اتنی قریب آچکی تھی کہ اس کے کھاتو راجن کی گونگی سمندر کے شور پر غالب آگئی تھی۔

”کیا ہم خود کو بالکل مایل کیسے کر رہے؟“ عمن بولا۔
”یہ لوگ بات تو سمجھ رہی ہیں ہی کیوں کر؟“ میں نے کہا۔
”تو مت بولنا۔ میں میٹرک فیل انگلش سے کام چلانے کی کوشش کر دوں گا۔“

لالچ ہمارے بالکل قریب آگئے تو آواز ہوگئی۔ ”اجنبی تک

سرج لالچ نے ہمیں اندھا کر رکھا تھا۔ اب ایک وقت دو ٹارٹ لائٹس ہم پر پڑیں۔ دوست محمد نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے لالچ کی رفتار بہت کم کر دی تھی کہ انھیں شک بھی نہ ہو کہ ہم فرار کا ارادہ رکھتے ہیں۔

”کون ہو تم لوگ؟“ کسی نے بہت صاف آواز میں جلا کے انگریزی میں کہا۔ لالچ کا دریا نی فاصلہ چند منٹ سے ہی کم ہو گیا تھا۔ بات کرنے والا ایک فون استعمال کر رہا تھا۔

”فشر میں۔“ میں نے مزید ہاتھ دھکے کے جواب دیا۔

”ہم لالچ پر آگے دیکھیں گے۔“ اسی شخص نے بیگانہ فون پر کہا۔
”اب میں نے لالچ پر کھڑے ہونے میں افراد کو دیکھا۔ وہ سب درمی میں تھے۔ ان میں سے ایک نے بیگانہ فون اٹھا کر کہا تھا: ”باقی دواں کے پیچھے تھے۔ ان کے ایک ہتھ کیسٹ مارا تھی اور دوسرے میں رولور۔ بات کرنے والا فشر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا انگریزی بولنے کا لہجہ مجھے عزیز ناوس نہیں لگا۔ وہ پاکستان بھارت یا کسی علاقے کے کسی ملک کا باشندہ ہو سکتا تھا۔“

لالچ بالآخر اسے قریب آگئی کہ دریا نی فاصلہ تین ڈٹ ہو گیا۔ یہ دونوں لالچوں کو جلانے والوں کی ہمارت تھی کہ اسے کم فاصلے کے باوجود لالچیں مکرانی نہیں تینوں پولیس میں بہت لگا کے ہماری لالچ پر آگئے۔ اس سے پہلے میں نے فطر لالچ کا صرف نام ہی سنا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے دائرہ اختیار میں کیا ہے۔ وہ کیا کر سکتے ہیں اوکے نہیں کر سکتے مگر کرتے ہیں۔ ان کی وردی کیسی ہوتی ہے اور ان سے شناختی ثبوت مانگنا کتنی ہی جہزم تو خراب نہیں ہوتا۔

”تم فشر میں ہو؟“ دونوں جہانی ہو؟
”میں سر۔“ میں نے کہا۔ ”امیر خندہ فقیر خندہ؟“ میں نے اپنے سینے پر اور عمن پر انگلی رکھ کے کہا۔ ”فادر مدھی لال۔“
”تم بہت دو کس ملک کے شہری ہو؟“

”بھارت سر۔“ میں نے کہا۔
”تمہارے ساتھ اور کون ہے؟“
”دس فقیر خندہ، یو ولف۔“ میں نے کہا۔ ”سیلینگ، ون فرینڈ کریم اینڈ ولف۔“

اپنی بغیر گرمی انگلش سے میں نے لالچ پر موجود سارے ارکان کے بارے میں بتا دیا مگر اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔ وہ پیک ہجے کاٹنے بغیر مجھے گھوڑا رہا۔

”ان کو لاؤ، میرے سامنے پیش کرو۔“ وہ بولا۔
”میں نے فنی میں سر ہلایا۔ اور کہا: ”سیلینگ، سو رہی رک۔“
”یہ وہ بیار ہے اور سو رہی ہے۔ پھر میں نے بہت کے کہا۔“

”کیا ہوا نام پوچھتا ہے میرا؟ وہ تیز لہجے میں بولا۔
میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ اینڈ کارڈ؟
اس کا ہرہہ طرح پرکھ لیا۔ میرا شاخنی کارڈ دکھانا چاہتے ہو۔
ابھی بتاتا ہوں میں تمہیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی طرف دیکھا
اور بولا۔ اندر تو جیسے اسے گھسیٹ لاؤ؟“

”وہ تو... میں نے احتجاج کیا۔ والی؟“

”بہن معلوم ہو لے کہ تم بروہ فروش ہو۔ یہاں سے لوگیاں
اٹھانے کے لئے جاتے ہو اور بیچتے ہو اس نے کہا اور وجہ بیان
کیا۔ ”بہن جگر پر کھڑے رہو۔ نہ مجھے اختیار سب کہ تمہیں گولی مار دو۔“
وہ شگ ہو مجھے اس کے لہجے سے۔ ”تو بہن کی
صوت اختیار کرنے لگا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس خطے کا رہنے
والا ہے۔ پھر وہ اس خطے کے ایک جاہل ماہی گیر کے ساتھ انگریزی
کیوں بول رہا تھا وہ مجھ سے اردو میں بات کر سکتا تھا عام حالات
میں دو افراد کسی اجنبی زبان کا سارا کیوں نہیں گے جب کہ انہما خیال
کے لیے وہ ایک مشترک زبان پر قادر ہوں اور خصوصاً اس وقت جب
ایک فریق اجنبی زبان سے ناواقف ہو۔ مگر یہ شخص ظاہر کر رہا تھا کہ
وہ اردو نہ سمجھتا ہے اور نہ بول سکتا ہے۔ اس کے دو مقاصد یہ ہو
سکتے تھے کہ وہ اپنی انگریزی کی شان بگھارنے کے لیے یا مجھے مرعوب
کرنے کے لیے انگریزی کی سطح سے نیچے آنا نہیں چاہتا۔ مگر میرے
ذہن میں ایک قیاس مقصد واضح ہونے لگا تھا۔

میں نے سوچا کہ اس نے کہا۔ ”آپ کے گھر میں کیا مال بہن
نہیں ہیں کہ آپ کو سب بروہ فروش نظر آتے ہیں؟ آپ خود دیکھتے ہو
یہ کام؟“

یہ بات میں نے عمداً اردو میں کی تھی اور اپنے چہرے کے
تاثرات کو زیرِ ملاحظہ رکھا تھا۔ میں نے اسے گالی دی تھی مگر میرے
چہرے پر سرکراہٹ تھی۔ اگر وہ میری بات نہ سمجھتا تو زخم خوردہ ناگ
کی طرح بول پڑتا۔

”ہاؤ ڈیر لوی؟“ (تمہاری یہ مجال) اس نے دہرا کر کہا اور
ہاتھ گھما کے میرے ہنجر پر پڑھا۔

محمن نے مجھے روک لیا۔ ”جائے دو بھائی۔“ افسر لوگ ہیں
جب کوئی ایسی بات ہی نہیں تو کہیں ڈرنے کی کیا ضرورت
ہے؟

مجبوراً کہ میں نے خوف کے سوا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں
کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جیسے جیسے پہلے میں نے افسر بگا دیں ہم
پھر یہ خوف سے تلاشی لیں عورتوں کے کمرے میں ایسے جانا۔“
”اے تو بھائی ان کو بولونا۔ تم ہی جانتے ہو انگریزی؟“

محمن نے کہا۔

”... آئی گو... فرسٹ ٹیم نے کہا۔“ وہ لوگ بڑے
... آئی ایک...“

مطلب یہ تھا کہ میں پہلے تو نہیں ہو جاؤں گا۔
افسر نے غصے کے باوجود اجازت دینے کے انداز میں

بلا لیا۔ اس کی تھون کی بیٹ سے ایک جھوٹا سا داک ٹیپنگ ہوئی
جس کا انشیا ایک مختصر سا تھا یہ دو یا تین سیل سے چلنے والا
... و ہڈی والی سیٹ تھا یعنی اس سے پتہ چلا دیا جیسا کہ مائیک
سنا بھی جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے سامنے نمازہ ہوتا تھا کہ یہ موبل
فاصلے کے مواصلاتی رابطے میں کام نہیں آ سکتا۔ اس کی ریفر
کو میٹر کے اندر جو کچھ بھی یا اس سے بھی کم ریسیور آف تھا۔ اپنی
لائف پر جو کسی فرد سے بات کرنے کے لیے وہ اس کا کوئی فری
دبا کے آ کر۔“ شاید وہ میں سامنے ہی تھا۔

اس نے ایک لمحے ایک ہاتھ سے آگے دیکھا۔ ”ہوؤ
اور ہاتھ کی اس حرکت کے نتیجے میں والی ٹائی آن ہو گیا۔ یہ ایک
غیر لاری مثل تھا اس کا ہاتھ میں پر لگا اور گرے سے یاد آئے۔
نے کام شروع کر دیا۔

جند کیٹ کے لیے اس کے لیے دوسری لائیٹ میں ہونے والی
گھنٹھو انفر کی لائیٹ میں شور تھا۔ کچھ آئین کا کچھ سنڈر کا کچھ اس
کے ہاؤڈوں میں ایک قہقہہ صاف سنا پھر کسی نے کہا۔

”دونوں کی...“ لیکن اس سے زیادہ میں نے سمجھ کر سن سکا
اس شخص نے فوراً والی ٹائی بند کر دی۔ میں نے سخت کوشش کی
اور اپنے ردِ عمل کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ لیکن اب مجھے مزید کسی
ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اس شخص کے انداز سے ہی واقف
تھا اور وہ آواز بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھی جس نے صرف دو
لفظ ادا کیے تھے۔ ”ذکر ہم دونوں کا تھا یا دونوں عورتوں کا۔ اور اچھا
انہوں نے کوئی غلط گالی دی تھی یا یہ کیا تھا کہ دونوں کی لائٹوں
کے لیے اسی سمندر کو مدفن بنادیں گے۔ یا کوئی عجیبی بات جو
سے ان کے عوام کا اظہار ہو رہا تھا پوری بات نہ سننے کے باوجود
میں نے سمجھی۔

مجھے یقین تھا کہ میری طرح محمن کے حواسِ خمسہ بھی مستہ
ہوں گے اور اس نے بھی آوازوں کو اور آوازوں کو پہچانے کے
بعد سمجھ لیا ہو گا کہ ان حالات میں وہ سب نہیں ہو سکتے۔ جو ہم
ہو چکا۔ یہ قطعی غیر متوقع صورت حال تھی اور باہمی مشورہ کے
بغیر صرف اس یقین پر کہ ہماری سوچ اور ہمارے خیالات کے
ایک ساتھ چلنے پر ہم ایک متفقہ فیصلے پر عمل کر سکتے تھے۔ مگر

ہے ذہن ایک سے منطقی نتائج اخذ کریں گے تو ہم دونوں کی
ملکت میں ہی فرق نہیں ہو گا۔ یہی سوچنے کے بعد میں نے قدم
اٹھایا۔ وہ شخص مجھ سے ایک قدم پیچھے ہوا اور میری گردن پر
رکھ کے چپے لگا۔ دوسرے شخص نے محسن کو بائیں طرف جھکیلا
”بیٹا، عورتوں کی کو کوئی بات نہیں ہو، میں نے چلنے چپے
اپنے پیچھے آنے والے محسن کو مخاطب کیا۔ لیکن یہ شہر کے میں
ہائے کمرے میں نہ چلے جائیں جہاں ہم سوتے ہیں؟“
”وہاں تو یہ ضرور جائیں گے بھائی،“ محسن نے سخت نفی میں
ہے میں نے کہا۔

اس کا نتیجہ ہماری خواہش کے عین مطابق رہا۔ مجھے آگے لے
چلنے والے افسر نے اپنے ماتحت سے کہا۔ ”تم چائے عورتوں
کے کمرے کی تلاشی کرو اور انہیں باہر لے آؤ۔ اس کے ساتھ دھڑ
کرتے ہیں جاتا ہوں۔“

”وس،“ ”میرے...“ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ افسر نظر آنے
والے نے غیاری سے زبردست سوسائٹ سے ہونے لگی میں سر ہلایا اور
”ہاؤ ڈیر لوی؟“ ”اگ کہیں سے کوئی تمہارا ہے؟“
میں نے خوفزدہ فخر آتے ہوئے زبان ہونٹوں پر پھیر کے
”ہاؤ ڈیر لوی؟“

اس نے سیدھے ہاتھ والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
”اس دروازے کو کھولو...“

”سر... اسٹوری... تو جھنگ بیڑ...“ میں نے کہا۔
اس نے میری گدی پر ہاتھ مارا پھر مجھے یوں رکھا دیا کہ میں
دروازے سے نکلنا اور اندر جا کر۔ دروازے کے دونوں
بٹ کلک کئے تھے۔ میں ہی چاہتا تھا۔ وہ میرے پیچھے اندر آیا
اور رولور کا ڈنگ میری جانب کرتے ہوئے اس نے اپنی ایک ہانگ
پچھنے کے لیے دونوں بٹ ملا دیے۔ کم رفتار پر چلنے والی لائیٹ زیادہ
پچھلے لے رہی تھی اور مجھے ہر لحاظ اندیشہ تھا کہ میری گدی پر سے
ہوئے رولور سے گولی نہ چل جائے۔ وہ بھی نقل کرنے ہی
آئے تھے لیکن وہ پہلے دیکھنا چاہتے تھے کہ لائیٹ پر اور کون ہے۔
اب انہما معلوم ہو گیا تھا کہ ہمارے علاوہ لائیٹ پر دو عورتیں بھی
تھیں ان کو اصل خطہ مجھ سے تھا۔ پچھتاہو جان میں سب سے
پوچھنا شکاری تھا وہ مجھے گھیر کے سب سے الگ کرنے میں
کامیاب رہا تھا۔

اب فرش پر گرتے ہی میں نے بٹ کے دیکھا تو مجھے اس
کے ہاتھ میں دوسرا رولور دکھائی دیا۔ اس کی نالی کے آگے افسر
لگا ہوا تھا اور جب اس نے فائرنگ کی تو اس کی آواز اتنی ہی
ہوئی جتنی میرا سر کڑی کے فرش پر پھرنے سے ہوئی تھی۔

”اگر آؤ سہ سہ کے فرق نے اس وقت میری جان بچائی
یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ میرے لیے قدرت کی عطا کردہ
ملکت ابھی تمام نہیں ہوئی تھی چنانچہ ابھی تک میری جان کو
گزندہ پہنچانے والے ناکامی سے دوچار ہوتے آئے تھے۔

لیکن یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس پر تکیہ کر کے میں بہت
توڑک نہیں کر سکتا تھا اور جسے تسلیم کر لینے کے بعد دشمن بھی اپنے
قاتلہ عزم سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ فوری طور پر ہم نے
کی جنگ ابھی اتنی جلدت کے تقاضوں کے مطابق لڑ رہے تھے
میں نے گرتے ہی کمرٹ لے کر پلٹنے اور اٹھنے میں
اتنی دیر بھی نہیں لگائی جتنی دیر میں رولور سے نکلنے والی گولی
نے درمیان فاصلہ طے کیا۔ میری جان لینے کی کوشش کرنے
والے نے بھی کچھ دیر کی تاخیر کا یہ وقت سیکڑے کے دسویں یا سوویں
حصے کے برابر تھا یا اس سے بھی کم، لیکن یہی زندگی اور موت کے
درمیان احساس کا وہ فاصلہ تھا جو ایک جھپٹا ہوا تھا۔ اس
کے فنا ہو جانے کی صورت میں یہ فریگی بے کارل نہ تھی۔ میں
صورا اسرائیل کا احمد و نیوے وجود اور ناقابلِ فہم انتظار بن
سکتا تھا۔

گولی میری گد پھٹی تو میں وہاں نہ تھا بلکہ نشانے سے چند
انچ دور کھڑا اوپر اٹھ چکا تھا۔ میرے حریف کو مجھ سے ایسی پھٹی
کی توڑ تھی اور نہ اتنے کم فاصلے سے اپنا نشانہ خطا جانے کی حلق
کوئی اُمید۔ وہ تیرائی اور بے یقینی کی کیفیت سے گزر کے کامیابی
کی خاطر دوسری کوشش کے لیے پوری طرح مستعد ہو چکا تھا جب
میں نے اسے جالیا۔

اس کے رولور کا ڈنگ نیچے کی جانب ہی تھا چنانچہ میں
اٹھ کر کھڑا ہوتا تو دوسری گولی کا نشانہ ضرور بن جاتا۔ میں نے
فقرت پرانے بیگٹے ہوئے ایسے جست لگائی جیسے کبھی کبھار گمری میں
پروٹوٹے ہوئے پتھوڑا سا آؤٹے کا سطرہ ہو کر پڑی ہے، ایک
نبی جست کی صورت میں۔

اس کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ میں نے اس کے ایک
پڑتوں سے اوپر اڑا کر۔ بیڈلی کے نیچے والے حصے کی بڑی پڑتوں
میں سے لگتی تو بڑی ٹوٹ جاتی پھر یہ چوٹ ٹوڑ نہایت جلد
اس نے ہلکا کے چڑھنا ہی تھا کہ میں نے دوسری ٹانگ کو دونوں
ہاتھوں کی گرفت میں لے کر جھٹکا دیا۔

وہ سر کے بل پیچھے کی طرف گرا اور اس کے دونوں ہاتھ
ہوا میں غیر موجود دھار کے لیے پھیل گئے۔ اگلے لمحے میں اس
کے اوپر سوار تھا۔ میرے ہاتھوں نے اس کی گردن کو دو بوجھ لیا۔
اس کے دونوں بازو میرے گھٹنوں سے دبے ہوئے تھے اور نہ

اس کے دونوں بازو میرے گھٹنوں سے دبے ہوئے تھے اور نہ

وہ جھپٹا کر تار یا پھول کو بھی پٹنے دفاع کے لیے استعمال کرتا۔
اب وہ صرف اپنی ٹانگیں چلا سکتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ کچھ جنوں
سوار پھونکے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ورنہ میں اس کی گردن توڑ دیتا
یا اس کی سانس رگ جلانے تک اس کا گلہ نہ چھوڑتا میرے ذہن
کے کسی گوشے میں بیانیال وہ جھڈا ایک پائپ میں کون نہیں کرنا چاہیے
پھر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں مقولوں سے ابلنے لگی ہیں اور زبان
حلق سے باہر نکل آئی ہے۔

میں نے دوا کو قوتدار سا کہا اور کہا: تم زندہ رہنا چاہتے ہو؟
اس نے اقرار میں ملکا کہ اپنی آنکھوں سے رقم کی آغوشی۔
"میرے لیے تم کو اس کے سمندر میں پھینک دو۔ نہایت آسان
ہے۔ میں نے کہا: تمھارے ساتھ آنے والے دونوں ماتحت بھی
تم کو نہیں بچا سکتے۔ وہ شاید تم سے زیادہ بے بس ہوں گے۔ تمھاری
لاٹج پر جو لوگ رہ گئے ہیں انھیں مار کے تم آسانی سے تمھاری
لاٹج پر قبضہ کر سکتے ہیں اور اسے غرق بھی کر سکتے ہیں لیکن تم قانون
کے محافظوں کے دشمن نہیں ہیں۔"

اس کے ہاتھ سے ریوا اور لے کر میں نے اسے آزاد کر دیا
اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانے کی اجازت دی۔ وہ مجھے
شلف فٹال نظروں سے گھورتا رہا۔ ایک رعایت کا یقین آتے
ہی اس کا رویہ پھر بدل گیا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر سخت۔" وہ بولا۔ "تم نے
اپنے جراثیم کی طویل فرسٹ میں ایک اور جرم کا انصاف کر لیا ہے
تم اب بھی خود کو قانون کے حوالے کر دو تو بیخ جاؤ گے۔"

"یہ منازعت تم کیسے دے سکتے ہو؟" میں نے کہا۔ "اگر تم میرے
جراثیم کی طویل فرسٹ سے پہلے ہی باخبر ہو تو یہ بھی جانتے ہو
گے کہ میرے خلاف کتنے مقدمات عدالتوں میں زیر سماعت ہیں؟

"میرا مطلب تھا... کہ تم بین الاقوامی مجرم بننے سے بچ سکتے
ہو۔" وہ بولا۔ "تم تمھاری مزاحمت کے معاملے کو نظر انداز کرتے ہو
کہہ سکتے ہیں کہ تم نے پڑا اس طور پر خود کو قانون کے حوالے کیا تم
کو رعایت ملی سکتی ہے۔"

"مگر میں نے ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ تمھیں کیا رعایت
دوں۔" میں نے کہا۔

"تم بے وقوف نہیں ہو سکندر سخت۔" وہ بولا۔ "تم کو
سمجھنا چاہیے کہ میں بین الاقوامی تنظیم کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہم
ایکے نہیں ہیں۔ تم مجھے مار دو یا ہم سب کو لاٹج کے ساتھ ہی ختم
کر دو تو اس سے تمھارے لیے فرار کے راستے نہیں کھلیں گے۔ تم
بہت جلد محصور کر لیے جاؤ گے، یہ کھلا سمندر ہے۔ یہاں چھپنے

چھپانے کی کوئی جگہ نہیں۔ جیسے ہی مارا دوسروں سے مواصلاتی
رابطہ منقطع ہوگا، ہماری تلاش شروع ہو جائے گی۔ سب جاننے
ہیں کہ تم کہاں تھے اور ہم نے آخری رابطہ تک قائم کیا تھا اور
کس سلسلے میں قائم کیا تھا۔"

"تمھیں یہ سب اطلاعات کس نے فراہم کی ہیں۔ میرے
نام اور مجھ پر عائد الزامات کے بارے میں؟
"تمھاری حکومت نے؟" وہ بولا۔
"حکومت پاکستان نے؟" میں نے کہا۔ "میں نہیں مان کرہ
"اس سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

"... تم خود کون ہو؟" میں نے کہا۔ "انگریزی بولنے کے
نے مجھے یہ دھوکا دینے کی کوشش کیوں کی تھی کہ تم اردو بولتے
ہی نہیں؟ تمھارا تعلق اسی برصغیر سے ہے یا جنوب مشرقی ایشیا
کے کسی ملک سے۔ ہر جگہ کوئی توئی چھوٹی اور بولی ضرور جانتی ہے۔"

"تمھیں میری قومیت سے سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ انگریزوں
کا علم صرف میرٹ پر مشتمل کیا جاتا ہے اور ہر ملک کی پولیس
سے لیا جاتا ہے۔"

"رائٹ، پھر تمھیں اپنی قومیت بتانے سے انکار کر رہا
اگر تم پاکستانی ہو تب بھی میں تم سے رعایت طلب کرنے کا حق
نہیں رکھتا اور یہ تمھاری فرض شناسی کا تقاضا ہے کہ کوئی غصہ
قومیت کے حوالے سے رعایت مانگے تو تم اسے بالکل ممان
دکر دیتا کہ انڈیا میں پاکستان کی پولیس کا نام روشن ہو۔" میں نے کہا۔

"میرا وقت ضائع مت کرو۔..."
"اوکے، میں براہ راست کچھ سوالات کرتا ہوں۔ ہمارے
بلدے میں تمھیں کس نے اطلاع دی تھی کہ تم برہہ فروش ہیں؟"

"میں نے ابھی بتایا تھا۔..."

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے کمر
پر اُلٹے ہاتھ کاٹنا چھ مارا۔ "یہی بات تمھارے جھوٹے ہونے کی دلیل
ہے۔ میری حکومت کی جانب سے اگر میرے خلاف الزامات کی
کوئی فرسٹ جاری کی جائے گی تو اس میں سب کچھ ہو گا محدود
الزامات میرے بدترین دشمنوں کی سازش کے باوجود اس میں شامل
نہیں ہوں گے۔ ایک منشیات کے کاروبار میں قوت ہونے کا
دو بارہ فروشی کا۔ یہ خدا کی بھرپور خاص مہربانی ہے کہ میرے ہاتھ
اور جان دونوں میں مجھے بے ضعیف بلایا نہیں سمجھتے۔"

"چکڑاٹنے والے الزامات لگاتے وقت کچھ نہیں سوچتے۔"
"اگلے رائٹ، تمھارا نام کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تم سے
تمھاری شناخت معلوم کرنے کا قانونی تحفظ حاصل ہے۔"

"شناختی کارڈ میری جیب میں ہے۔"

"اپنا نمبر دیواری کی طرف کر دو اور ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" میں نے

کہا۔ "میں خود دیکھ لوں گا۔"
اس کا ریوا اور اب میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ انتہائی عجیبی
اور لمبی کا اخبار کرتے ہوئے پھوٹا سا گھسا لیکن یہ اس کی
بڑی تھی۔ وہ اس ایکٹ کے حملت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب
پڑا تھا۔ ہونے کے باعث میں اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں
وہ ایک دم پڑا اور اس نے بے یک وقت گھٹنا اٹھا کے میرے
پیشے سے ذرا نیچے مارا اور دونوں ہاتھوں کی کمنیوں سے میری
پیلوں پر پھر پور وار کیا۔

میرا اتنا شدید اور فوری تھا کہ ذرا سی دیر کے لیے میری
سائنس کی تھی اور میرے قدم کھٹ گئے۔ اس نے بڑی بھڑکی سے
اپنا ہاتھ قبضے کے اندر ڈالنے کی کوشش کی۔ میرا آجھا دھڑکنی
طور پر غصہ تھا لیکن ذہن پوری طرح مستعد تھا۔ میں کچھ گیارہ
وہ دوسرا ریوا اور نکالے گا۔ اس یقین نے میرے ہاتھوں کو متحرک
کیا۔ اس بار میرے عوام کی لڑہ میں یہ خیال حال نہیں تھا کہ میرے
ہاتھوں کوئی پولیس میں نہ مارا جائے۔ مجھے یقین آچکا تھا کہ پولیس کی
یہ وردی پسینے والا کوئی قانونی اختیار نہیں رکھتا۔ اور وہ حقیقت
بروردی صرف ہمیں بدلنے کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

میرا بائیں ہاتھ کی ضرب اس کی گردن پر پڑی۔ وہ گردن کی ہڈی
چھٹنے کی تھلا چمکے۔ میرے ہاتھ ایک لکڑی جو گردن کے ٹوٹ جانے
سے اسی دور رہ گئی۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اب میں نے جھجک کر اسے سیدھا کیا اور اس کی شرٹ
کے اندر ہاتھ ڈالا۔ اختیاریہ بائیں پور کا چھوٹا سا آؤٹینگ ریوا اور
نور مجھ سے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے دھڑکے حفاظتی انتظام کو
نوٹ بننے کے لیے اس ریوا اور کو اپنی آسان دسترس میں رکھا تھا۔
دھاسے اپنی تقدیر نے دی کہ اس کو طاقت پر غرور میں مبتلا کیا
اور وہیں پتھریا جہاں اس کا حریف میں نہیں آجائے گا۔

شناختی کارڈ مجھے باہر والی جیب سے ملا لیکن اسے کھول
کر دیکھنے میں میں چونک پڑا۔ اس پر تصدیق بھی کسی اور کی جو صورت
سے کوہیا، ظاہر یا جا بجا کرنے والا ہو سکتا تھا یا ایسی خطے میں
آبادی قوم کا باشندہ جو رویت نام زمین اور بر ملا نشانیات
اپنے مخصوص نشانیات کی بنا پر پہچانی جاتی ہے ان علاقوں کے
نام بھی ایک سے لگتے ہیں۔

ایک بات یہ تھی کہ شناختی کارڈ اصل تھا۔ ابھی تک اس مجرم
کو جس کی لاٹج خود اختیاریہ جرم کی تفسیر میں بڑی تھی یہ توقع نہیں
لا تھا کہ وہ اس تصور کی جگہ اپنی تصویر لگا سکے اور دوبارہ کر
کے اس کا پلانا نام بھی لکھ لے۔ غالباً وردی نہیں لینے کے بعد اسے
آگوست نہیں کی تھی۔

اس کے ساتھ ہی یہ خیال آتا لڑھی تھا کہ انڈیا کی وردی
اور لاٹج صرف ہمارے خلاف کارروائی کے لیے موصول کی گئی
تھی۔ اور وہ اس حد تک موزوں کامیاب ہو گئے تھے کہ بے خوف
خطر ہماری لاٹج پر پہنچ گئے تھے لیکن انھوں نے یہ سب کیسے
کیا؟ انڈیا کی لاٹج پر قبضہ کرنا آسان کام تو نہیں اور پھر وہ
شخص کون تھا اور اب کہاں ہے جس کی وردی لاش کے سبب بچھا
باہر مکمل خاموشی میں دونوں لالچوں کے ابھرنے آپس میں بھلا
معلوم ہوتے تھے۔ دونوں کی آوازوں میں نمایاں فرق تھا۔ ہماری
لاٹج کے ابھرنے پر یقین اور پڑھا یا غالب محسوس ہوتا تھا۔ دوسری
لاٹج کے ابھرنے میں طاقت اور سرکشی کی غراٹھ تھی۔ کیا انڈیا کی وردی
کی یہ نئی زیادہ تیز رفتار لاٹج اب ہمارے کام نہیں آسکتی ہے؟
وہ شکاری چھپن سکے ہیں جو ہمارے کھانا میں آئے تھے تو ہم
بھجائے ان سے چھپن سکے ہیں۔ لاٹج کا غول ایک بار بدلا تھا وہ
پھر بدل سکتا ہے۔

زیادہ سوچنے اور غور کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔
فلاح کی پروا کے بغیر میں نے اس منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ
کر لیا۔ تو پھر مجھے اپنے پیڑھے لاش کو پہنانے اور اس کی وردی
خود پسینے میں چند منٹ لگے۔ میں نے اس کی بلیٹ کے ساتھ نکلے
ہونے والی ٹانگیں کو دیکھا تو مجھے اس میں صرف دو ہی ہتھ نظر
آئے۔ ایک سامنے تھا جس پر پاؤں لکھا ہوا تھا یہ درمیانی پورٹین
میں تھا اور آف تھا۔ نشانے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اوپر کرنے
سے آواز سنائی جاسکتی ہے اور نیچے کے اپنی آواز سنائی جاسکتی
ہے۔ یہی وہی کنگٹن ریسورس تھا اور نیچے کا ٹرانسپیر ہے۔

میں نے ہتھ کو دبا کے اور کیا۔ ایک دم اس کا اسٹیک
آوازیں سے بھر گیا۔ والیوم کا بھن اس چھ آواز میں نے چاروں چوڑے
سیٹ کی سائڈ پر تھا۔

"کیا بات ہے... تم کب تک کھڑے رہو گے... ہانسی
نے رہی ہے۔" کہا۔ یہ منظر میں مجھے لاٹج کا شور سنائی دیا۔

جواب نشانی بند اور واضح آواز میں آیا۔ "اور میں کیا کروں؟
میں اکیلا ہوں... اس کی مرضی کے خلاف بات ہو تو وہ گرم ہو جائے۔"

"اور یا... تم دو جو... دور کی آواز نہ کہا۔
"دو کیسے یا ر... تیسرا تو اوپر کھڑا ہوا ہے۔ وہاں بھی تو ہونا
چاہیے کسی کو؟" قریب سے بات کرنے والے کی آواز آئی۔ "وہ
ہوتا تو میں کہتا کہ تمہیں کو ہاندہ سے یا اسے ریوا اور دے کر کھڑا
کر دیتا۔"

میں کچھ گیارہ کی گنگو دوسری لاٹج اور ہماری لاٹج کے کسی
کیمین میں موجود دو شکری آپس میں کہہ رہے ہیں اور ان میں سے ایک

34

121

120

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے من کے ساتھ گل اور شتری کو ریغال بنا رکھا ہے۔ غالباً ان کے ساتھ آنے والے تیسرے شخص کے پاس داگ لگی نہیں تھا چنانچہ وہ عرشے پر صورت حالات سے بے خبر مطمئن کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ کپکپ درست کر کے اور ریوالور ہاتھ میں کچڑے کے باہر نکلا اور سیدھا سامنے والے کین میں داخل ہو گیا۔ اس کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ ایک ایسی جھری سے مجھے اندر کے منظر کی ایک جھلک نظر آئی تھی۔

جو شخص من کے ساتھ دونوں عورتوں کو لائے آپ کی کھڑا تھا وہ ایک دم ہلکا۔ قدرتی طور پر اس نے پہلے وردی کو دیکھا اور ذرا سی دیر کے لیے مطمئن ہو گیا اس کا ریوالور جو میری طرف اٹھا تھا پھر اپنے اسیروں کی جانب ہو گیا جو اپنی ناک کین کی دیوار سے لگائے سیدھے تھوڑے پہنچے پھر پھرتے اور اپنے پیچھے کچھ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے، ورد من ضرور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتا جب ریوالور کی نال کا رخن ان کی طرف نہیں تھا۔ شاید وہ میری صورت بھلا اپنے ترلف کی لنگا کھڑے سے پہلے دیکھ لیتا۔

وردی ہین کے خود کو انٹر پول کا نمائندہ ظاہر کرنے والے اس دوسرے جہاز شکاری نے بھی صورت کی تبدیلی کو دوسری نظر میں سمجھ لیا۔ ظاہر ہے اسے صدمے سے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا لیکن مجھے اس کو ناک آؤٹ کرنے میں کوئی وقت نہیں لگائی سیدھا اس کی طرف گیا۔ درمیانی فاصلہ اتنا کم تھا کہ وہ بل بھی نہ سکا میری گرفت میں آجائے کے بعد اس نے مزاحمت کا آغاز کیا گولاس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ میرے لیے اہل ہاتھ کے دایرے ناکارہ ہو گیا اور اس میں اتنی طاقت بھی نہ رہی کہ ریوالور تھام سکے۔

ریوالور پھینک کر اور اس کے ساتھ ہی من نے ہلٹ کر پیچھے دیکھا۔ میں نے اپنے ترلف کی گردن کو بائیں بازو کے نیچے میں اس طرح کس لیا تھا کہ اس کے زرخیزے پر پورا زور ہوا تھا۔ وہ نہ بھول کے سانس لینے کی کوشش میں تھوڑے پر اٹھا اور لائیں چلا رہا تھا میں نے دوسرا ہاتھ استعمال کرتے ہوئے اس کے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ ایک بجی کے ساتھ وہ جھدے میں گر گیا اور پھر ایک عجب سے منھم خیز لو زہیں ساکت ہو گیا۔

اتنی دیر میں من ریوالور اٹھا چکا تھا اور دونوں عورتوں کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ بالسا ہلٹ کیا ہے۔ شتری تو وہاں سے ایسے فرار ہوئی کہ ایک درجے سے ٹھنڈی پھوڑاؤ سے اس کے گزرتے ہوئے ٹھنڈی لگی تو گزرتے گزرتے ہی۔ وہ پیچھے دیکھ رہی تھی جیسے ڈر ہو کہ وہ لاش پھر اٹھ کھڑی ہوگی۔ گل نے پہلے ہی ہشت و خون دیکھا تھا۔ وہ نہ سکون رہی۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ من نے کہا۔
”مجھے بھی یہاں باندھنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”عزیز گل، یہ صرح لائٹ ڈراؤ دوسری طرف کرو۔“

”کون سی سرچ لائٹ؟“ وہ حیران ہو کر بولی۔
”اپنے زبے روشن کی۔“ میں نے کہا۔ ”پر وہ کچھ کا کچھ گل محل سکوت ہے جو نہ جیر کے کھڑی ہوئی۔“ شتری نے لائٹ کے بدن سے یونٹ نام لگ کر اپنے کپڑے سے ناکارہ پھرتی اور پھر لائٹ کو اپنے پیڑ سے پھانسلے وہ ہماری طرف آئی۔ پیڑ کے کھڑی رہی۔

میں نے اتنی درمیں صورت حال کی وضاحت کی کہ ہر لوگ میں انھوں نے غائبانہ علم کو مار کے منظر پول کی لائٹ میں اور میں دھوکا دینے کے لیے یہ بھی بدلہ۔ اس آدمی کوئی پتہ چلا یا پانی نسل کا تھا۔ اس کا شخی کارڈ طبع سے برا بد ہوا اس شخص کی تیب میں بھی کوئی کارڈ ضرور ہونا چاہیے۔
”ہاں گل۔“ من نے کہا۔ ”کارڈ نکال کے مجھے دکھایا۔“

یاد رہے کہ اسی قسم کی چیز میں نام ہے۔۔۔
”چھوڑ نام کو۔“ یہ اسی زرخیز کے لوگ میں ممکن ہے منظر میں بھی علاقائی سمندروں کی ایک الگ تنظیم ہو۔ میں نے کہا۔
”ہم وہی کرس گے جو ہمیشہ کرتے آئے ہیں۔“
”انگریزی محاورے کے مطابق“ من کی اولاد میں ان کے سکوت میں۔ ”من اپنے پیڑ سے لائٹ کو پھانسلے۔ ”سنگل۔“ آپ ملاحظہ فرمائی کہ میں کتنا بینڈرام اور اسارٹنگ رہا۔ گل نے ہلٹ کے دیکھا اور من نے تو مذاق کیا تھا مگر۔
”محموری کھڑی رہی۔ یہ وردی واقعی اس کے جسم پر سچ رہی تھی۔ میں نے جلیجی بجا کے اسے متوجہ کیا۔“ اور۔۔۔ غور فرمئے۔

”لیے میری بات مینی، یہ شکل فرصت میں دیکھیے گا۔“ میں نے کہا۔
”کر رہا تھا کہ اب من اسی کے جسم میں دی کریں گے جو انھوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ ان کے ساتھی واپسی میں دیر ہو جانے کے پرتشان ہیں۔ میں نے انٹر پول پر ان کی گفتگو سنی تھی۔“
”تو نے کسی کی آواز سنی تھی؟“ من بولا۔

”ہاں۔“ تو نے بھی سنی ہوگی۔ جب پہلی باغری سے والی آن ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ”شک مجھے اسی وقت ہو گیا تھا۔“
”ان کا ایک ساتھی ابھی عرشے پر موجود ہے۔“ من بولا۔
”میں اسے بلاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔
”وہ پہچان جائے گا۔“ من نے کہا۔

”محفوظ کر دیں اسے موقع نہیں دوں گا۔“ میں نے کہا۔
”گل تم کو اس کی مدد کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ تم کو صرف پانچ منٹ دیے جائیں گے۔“
”اور پانچ منٹ کا طلب ہو گا جو پانچ منٹ بننا ہیں۔“ من نے کہا۔ ”من نے اسے ڈانٹ کر کہا۔“ جبکہ تم عورتوں کی حفاظت ہوتی ہے۔ میدان حشر میں جانے سے پہلے بھی آپ ایک ضرور چیک کرو گی۔“

”میں ساتھ چار منٹ میں تیار ہو سکتی ہوں۔“ گل نے کہا۔
”میں باری میں واپس گیا۔ مجھے اوپر پہرا دینے والے کی پانچ منٹ کی نظر آئی۔ وہ بڑی بے قراری سے ایک ممدو فائل پر مڑتی کر رہا تھا۔ میں چند قدم دوڑا تو وہ چونکا اور ایک دم ہلکا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرا منہ دیکھتا میں نے چلے ہوئے اس کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور دبی ہوئی آواز میں پکار کر کہا۔ ”نیچاؤ۔“
”وہ دفعتاً پھرتی واپس چھا چکا تھا وہ مجھ اس کا ساتھی شکل میں گرفتار ہے اور اسے مدد کے لیے بلارہا ہے۔“ میں آؤٹی آواز میں بولتا تو وہ آواز کے ذوق کو بھی ٹوٹ لیتا۔ اس نے من کی آواز کو بدایا کے بات کرنا بھی خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری تھا۔

”وہ میرے پیچھے دوڑنا آیا۔“ میں کین میں داخل ہوتے ہی دھڑلے سے گل کے کھڑا ہو گیا۔ وہ سیدھے اندر آیا میں نے اسے دھوکا دیا۔ چند منٹ میں اس کا بھی وہی انجام ہوا جو اس کے دو ساتھیوں کا ہو چکا تھا۔ ایک باہر من نے ہی اس کی وردی اتاری اور گل کی طرف چھٹک دی جو دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

”نواب تم کو ٹھیک ساٹھ چار منٹ دیے جاتے ہیں۔“ گل جان سے گل خان بننے کے لیے۔ ”وہ بولا۔“ اور ساتھ چار منٹ پورے ہوئے ہی ہم پھر اندر بول گئے۔ ”آدھا منٹ گزرنے کے لیے۔“
”چلو چلو یہ ایمان۔“ گل نے اسے باہر دھکیل دیا میں نے ان مہلت سے فائدہ اٹھا یا اور درست جھدے پاس جا پہنچا۔ وہ کسی حد تک صورت حال کو سمجھ چکا تھا لیکن شتری نے اپنی بدبوئی سے اس کو کٹھن کر دیا تھا۔ وہ اپنا سر پھرتے بیٹھا تھا۔

”ٹھیک بولنا حسب تیرے کو، باگل ہے تو۔۔۔“
”تم اللہ کی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔۔۔“ شتری نے ہانپتے کہتے ہوئے کہا۔ ”اسے کریم ہر ذات۔۔۔ پانی ہی پلا دے۔۔۔“
”اسے میں گری کیسے دھوکے باز۔۔۔ آف۔۔۔ اور انھوں نے ہٹ سے گردن ایسے ٹوڑ دی جیسے۔۔۔ ہوئی گردن نہ ہو گئی ہو۔“
”آف۔۔۔ اسے باہر کون کس کارڈن توڑا۔۔۔؟“

”میں نے اسے مختصر ساری بات بتائی اور یہ بھی سمجھا دیا کہ اب ہم دوسری لائٹ پر قبضہ کرنے جا رہے ہیں مگر وہ اپنا کام کرتا رہا۔ اس کا کام ہماری کایا بی کے بعد شروع ہوا۔

”اور صاب۔۔۔ ہم کیا کرے؟“ من نے کہا۔
”تم اپنی اس بدبوئی ناؤ کو سنبھالو۔“ میں نے شتری کی طرف اشارہ کیا اور واپس چل پڑا۔
”جب میں کین میں داخل ہوا تو گل اپنے بالوں کو سیٹ کر کپ میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اس کا چہرہ لال لال ہو چکا ہو رہا تھا۔

”آؤ کو دعوے کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے۔“ من نے دانت نکالے ہوئے کہا۔ ”ساڑھے چار منٹ۔۔۔“
”ایک منٹ گھڑی آگے کی تم نے۔۔۔“ گل چلا کر بولی۔
”نہ اس نے مجھے دیکھا اور غاموش ہو گئی۔“
”میں مدد کروں؟“ من نے کہا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔“ سکندر بھائی آپ ذرا لیٹر، وہ ہلٹ کے بولی اور میں نے ناٹائی ہونے کے باوجود اس کے ترانہ ہد ہاں کو اکٹھا کر کے ٹوپی میں قید کر دیا۔ اس کے لمبر کرنے کے انداز نے مجھے دم بخود کر دیا تھا۔ یہ وہی ناگ نئی تھی جو گفتگو کرتے ہوئے مراد انمازی کا لیاں ایک جاتی تھی اور اسے احساس نہیں ہوا تھا۔

”جو تھے ڈھیلے ہیں۔“ گل نے تھسے باندھتے ہوئے کہا۔
”تم پھار چلن کی طرح چل کر ہو؟“ من نے کہا۔
”یہ ریوالور اور۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”پڑی فادائش؟“
”میں سر۔“ گل نے مجھے سیلوٹ مارا۔ ”میں سب کی رہی ہوں۔“
”اے دن۔“ میں نے کہا۔ ”بھریک اور من آگے پیچھے ہانپنے عرشے پر ابھی اندھاری تھا۔ یہ صبح، ذب کا دھندلکا غالب ہونے کے بعد ذرا دیر کے لیے پھر اپنا تسلط قائم کرنے والی تاریکی تھی جس نے میں انسانی مدد دی۔“
”تم نہیں سمجھو۔“ میں نے گل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اور اسی طرح پھر اوتھری ہو جیسے وہ دے رہا تھا۔ جب تک ہم نہ ملایں تم اور صرت آنا۔“

”یہ سہی ہوئی پھول کی خیریت کے لیے دعا کرتی رہنا۔“ میں نے کہا۔
”گل کیسے سمجھتی تھی کہ یہ پھر جبری ضرورت نہیں ہے۔“ من کے الفاظ کا مفہوم میرے لیے کچھ اور تھا گل کے لیے کچھ اور تھا۔ گل الفاظ وہی تھے۔ وہ نہ دبا کے ہنسی اور شاد بزمی بھی ہوگی مجھے عمن کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ وہ نہیں ہانپتی تھی کہ اس کا جذباتی استقبال ہو رہا ہے۔ جو حالات کی ضرورت تھا۔ بھگت گل کو حالات کی ضرورت بنا غلط تھا۔

ایک لائٹ سے دوسری لائٹ پر سہنپنا مشکل نہ تھا۔ آگے پیچھے ہم اپنے آپ کو لائٹ کے عرشے پر کوڑے تو عرشے پر نہ جانے کدھر ایک شخص نمودار ہو گیا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔

کو ریشہ نہ بٹا تھا۔ دیو الوور کے فائبر کی آواز کے ساتھ ہی لیبن کے دروازے کا شیشہ ٹوٹا۔ سامنے آئے بغیر چھپنے والے مشین گن کا ایک

برسٹ مارا۔ اس وقت تک میں اس حصے میں پہنچ چکا تھا جہاں انجن نصب تھا۔ فائر کی آواز سے اور پھر شین گن کا رولڈ چلنے سے وہاں موجود سب لوگ مجھ کے قے کے جنگ کی لائچ پر مشغول ہو چکے ہیں۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ گول اور مناب کہاں ہیں۔ چلو، کسی شخص نے چرخ کر کہا۔ لائچ کو یہاں سے نکالو۔ میں نے دروازے سے کان لگا کے سننے کی کوشش کی مگر جواب میری کچھ میں نہ آیا۔ لائچ اب حرکت کرنے لگی تھی۔ "یکہا ہے؟ اس کی رفتار بڑھاؤ۔ اب یہ کم کی اودنے دیا تھا۔"

"رفدار ایک دم نہیں بڑھ سکتی، یہ جواب انگریزی میں دیا گیا تھا۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے اس لائچ کے ساتھ دوسری لائچ تک گئی ہے یا الگا دی گئی ہے۔ اس کا انجن دولا چوں کو تہیں پہنچ سکتا ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں، دوسرے شخص نے کہا جو نسبتاً پے کون تھا اور انگریزی میں بات کر سکتا تھا۔ تم دونوں کو سنایا، میرے لیے دونوں لائچوں کا اکٹھا ہونا ایک اچھی خبر تھی۔ معلوم نہیں ایسا کس نے کیا تھا شاید دوست محمد نے۔ وہی ایک ایسا شخص تھا جو تجربے کے ساتھ عقل سے کام لینا جانتا تھا۔"

"باہر مت آنا، میرے پیچھے سے کوئی نہ چلا گیا۔ لیکن یہ حکم دیر سے جاری ہوا۔ اس وقت تک ایک شخص اندر سے باہر آنے کے لیے دروازہ کھول چکا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا پھر شین حملت میں پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ میں نے دروازے کو ایک لمحہ ماری۔ وہ شخص دونوں پٹ لگنے سے پیچھے گرا مگر رولڈ اور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے فائر کیا اور میں نے غوطہ مارا۔"

"مجھے احساس تھا کہ یہاں ایک آفٹھن بھی ہے جو مجھے بغیر وارننگ کے شوٹ کر سکتا ہے لیکن میں بیک وقت دونوں طرف سے آنے والی گولوں سے نہیں بچ سکتا تھا میں نے پہلے والے شخص پر جیت لگا کے اسے اٹھنے سے پہلے ٹوٹ کی تھوکر مار کے گرا دیا۔ اس کی زبان شاید دونوں جیٹروں کے درمیان لگی تھی کہ اس کے منہ سے خون نکلا۔ میں نے پھر اس کے لات ماری، یہ لات اس کے سینے پر پھوٹا سا بائیں جانب پوری قوت کے ساتھ لگی۔ وہ بلبلایا اور سینے پر ہاتھ لکھ کر کھجک گیا۔"

"میری دائیں جانب اتنی دیر میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ میرے بعد میں معلوم ہوا کہ حملے کے پریشان بنے ہوئے ہٹ پاتھ نے شاور نیوی گریٹ نے حاضر دماغی سے اور جرات سے کام لیا ہوتا تو میں پہلی لگ مارنے سے پہلے ہی مارا جاتا جیسے جہاں انھوں نے اپنے

پیچھے ہٹ کر مارنا اور اس شخص کو میری طرف رولڈ اور اٹھانے کو جو ابھی تک ان کا نشانہ لیے کھڑا ہوا تھا، ان میں سے ایک نے جیت لگائی اور اسے نیچے گر دیا۔ اسے گر گئے میں لائچ کو واپس لے کر دوسرے جھکے کا بھی دخل تھا۔ یہ صرف میری ہی ذمہ داری تھی۔ کوئی شوق کا مشترکہ نتیجہ تھا کہ میدان ہمارے ہوا۔ یہ اتنا ہی فیصلہ کن جنگ چند منٹ سے زیادہ جاری رہی لیکن ان چند منٹوں میں فیصلہ سبھی فرق کے نتیجے میں ہو گیا تھا۔ دشمن ہتھیاروں سے کمزور تھا۔ اس غم کی طرح جو کسی جزو گلے کے اندر اسلحے سے پوری طرح لیس ہو رہا تھا۔ یہاں ہمارے اقدام بھی ان کی قوت کو گنتی تھی۔ دشمن میرے ساتھ ہوتا اور ہم مسلح ہوتے تو مقابلہ برابر کا سمجھا جاسکتا تھا۔ ایک فائدہ تو مجھے حاصل رہا، وہ اندر سے حاصل ہونے والی حمایت تھی۔"

"جب ہم دونوں دشمنوں کو زیر کر چکے، میں نے ایک کو اس قابل نہ سمجھوڑا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا بھی ہو سکے اور لائچ کے حملے سے دوسرے کو بے دست و پا کر دیا۔ تو میں تھکنے ایک دوسرے کو خوشگوار داری اور فتح مندی کے احساس سے والی سرت اور اعتماد کے جذبات کے ساتھ دیکھا۔ ہم آپس میں اجنبی تھے مگر ایک دوسرے کی زندگی کے تحفظ کے لیے لڑ رہے تھے۔"

"جنگ کے اتحادی تھے۔" "تھینک یو ویری میچ،" ان میں سے ایک نے مجھے ہاتھ پر انگریزی میں کہا۔ وہ گولہ چٹا صحت مند جوان آدمی تھا۔ ہم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کے ہمیں بچایا۔"

"دوسرے نے فقط سکر کے ہاتھ ملایا اور زریلر کچھ کہا۔ جو میں نے سمجھ سکا تاہم اس کے جذبات کا اظہار اس کی ہنسی سے ہوتا تھا۔ یقیناً اس نے اپنے ساتھی کی بات ہی دہرائی ہوگی۔ "یہ انگریزی نہیں بول سکتا کیونکہ یہ بڑا کمزور ہے۔" "پہلے شخص نے کہا۔" میرا نام راجندر سنگھ ہے اور میں انڈین ہوں۔"

"ان کا ایک ساتھی جو گروہ کا سرغنہ ہے، ابھی باہر ہے۔" "یہ فوری طور پر تعارف سے گزیر کر تھے۔" "وہ ایک خطرناک آدمی ہے اور اس کے پاس سب شین گن ہے۔" "وہ ایک آدمی ہے جو تمہیں ہتھکڑیا کر کے اس کے ساتھ تمہیں جلا کر دے گا۔"

"وہ تو لائچ اور یلو سے بولا۔" "تم تو ملر رکھو، ہم اس پر بھی قابو پالیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ بولا۔ وہ تو لائچ کو کھینچ کر روکے گا۔۔۔ ہم سب وہاں جائیں گے۔"

"ہاں ساتھ کیا وہ خود نہیں ڈوبے گا؟ میں نے کہا۔ اور پھر لائچ ہی تو ہے۔" "اس کے ساتھ اب کتنے لوگ ہیں؟" "میرا خیال ہے کہ اب وہ اکلا رہا ہے۔ اس کے چور ساتھی مقابلے میں ہلاک ہوئے۔ دو یہاں بھی قید میں ہیں۔" "تم بھی اکیلے ہو؟" راجندر سنگھ نے کہا۔ "نہیں، میرے ساتھی دوسری لائچ پر ہیں اور ہمارے لیے تفریق کی کوئی بات نہیں۔ ایک شین گن سے وہ مقابلہ جاری نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"سکندر، ہمارا کام اب تک اندر چھپے رہو گے؟ باہر سے کسی نے چرخ کر کہا۔ اور وہ شک ہو چکے تھے کہ بار اٹھانے سے صرف دو دفعہ شین کے ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ لائچ پر سب سے پہلے والے کا ہاتھ لگے گا۔ جب دای ٹائی آگ ہو گیا تھا تو میں نے دو انڈی گننگوں اور شین کی آواز سننی تھی صرف ایک سیکنڈ کے لیے، اور ان میں سے ایک نے آنا ہی کہا تھا۔ ان دونوں کی آواز دای ٹائی آف کر دیا گیا تھا لیکن میرے اوروں کے کان اس آواز پر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہم دونوں نے اس پر پڑھ کر دای آواز کو پہچان لیا تھا۔"

"اب وہ جیت کی حیثیت سے ہم کو فخر کرنے کی احقانہ لکھن میں مصروف تھا۔ ہمارے نظر آنے لگے تو بڑی ذہانت سے بچ بھگت عملی تیار کرنے والا حریف بھی نفسیاً تیار ہے۔ کوئی کے آخری تیری طرح استعمال کرنا ہے۔ طاقات استعمال کر کے باقی مار جانے والے کے پاس کھو ورنہ سب سے جھوٹی امیدیں وابستہ کرنے کا سہارا تو دیتا ہے۔"

"میں تم کو اندر ہی بھونکنے کے رکھ دوں گا سکندر، پڑھو۔" "پھر ملے گا کہ میرے ہاتھ میں دتی تم ہے۔" اس نے ایک سانس میں مجھے ماہن کی ہن کی گایاں دے کر میرے اس خیال کو نفوذیت پہنچائی کہ وہ ذہنی طور پر افعال، بے بسی اور خوف کے لیے جے جذبات سے کتنا مطلوب ہے۔"

"مٹانے کا خوش رکھے اس پر اصرار کیا دباؤ بڑھانا بہتر سمجھا۔" "میں دس لگ گوں گا۔۔۔" عاذا ذل انے ایک گالی دے کر کہا۔ پھر شین ہم جیکب دوں گا۔ تمہارے چھپڑے آٹھ جائیں گے لائچ کے ساتھ۔"

"میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ وہ فرض پر لپٹ جائیں۔ کوئی سوال کے بغیر انھوں نے تعمیل کی۔ میں نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ بول نکال کر لڑائی کا ایک ابتدائی اصول ہے کہ ہم کے دھماکے سے فوڈ کو پکانے کے لیے یک کرنا چاہیے۔ مجھے دتی ہم والی بات محض

ایک دھکی محسوس ہوتی تھی لیکن میں اس کا نام نہ کر سکتا تھا۔ اس احتیاط سے مجھے فائدہ ہوا۔"

"باہر بیٹھو، چرخ رہا تھا۔۔۔ تین۔۔۔ چار۔۔۔ پانچ۔۔۔ اور مجھے بھی گنتی آگے بڑھ رہی تھی دریا میں وقفہ بڑھتا جا رہا تھا۔ تین کے بعد چار کتنے میں دو سیکنڈ لگے تو پانچ تک پہنچنے میں تین سیکنڈ گزر گئے۔ چھ اس نے پانچ سیکنڈ کے بعد کہا۔"

"اندر فرش پر ان کی لیٹ کے اوپر کنبوں کے بن رہے تھے کانوں کو ہاتھ سے بند کرنے کے بعد میں نے انگلیوں کو سر کے پیچھے ملایا تھا۔ میرا ذہن کسی ایسی شین کی طرح مل رہا تھا جس کے اندر مختلف گرائیاں لگ لگ الگ سمت میں تیزی سے حرکت کر رہی ہوں۔ میں بیک وقت بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ کیا واقعی پڑھ دوں؟ ہینک دے گا؟ محسن انکر کیا کر رہا ہے؟ کہیں وہ اور گل پسنے ہی گئے ہیں تو تین مارے گئے جاسی صورت میں کیا دوست محمد اور کریم کچھ کر سکتے ہیں؟ ہوس تک گھسنے کے بعد پڑھ دے؟ ہم نہ جیکھا تو پھر وہ کیا کرے گا؟"

"پڑھو نے دس تک گنتی پوری ہوتے ہی منہ میں گن کا پرٹ ملا کر گولیاں کین کے دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی ہمارے دہرے کے گزرتی ہیں۔ میں نے اپنے ساتھ لیٹے ہوئے دونوں افراد کو دیکھ رہا تھا۔"

"راجندر سنگھ نے اپنی ماوری زبان میں پڑھ کر کا شجرہ نسب غلط کرتے ہوئے کہا۔ دستی ہم داپتہ، اور یوں میرے اس خیال کی تائید ہو گئی کہ پڑھ کر کے پاس شین گن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ درنہ وہ اپنی دھکی پر عمل ضرور کرتا۔"

"ڈٹے رہو سروراجی، میں نے سر ہلا کے کہا۔" "سول واگور دی۔" میں نے اس کے نیچے ڈانٹا مارٹ نہ رکھا تو میرا بھی نام راجندر سنگھ نہیں۔ اور یہ دونوں ان کا تو نہیں تھا کہ پان سے قید کر دیا گیا۔ اس نے دونوں قیدیوں پر پھڑک کے اعلان کیا۔"

"ایک پولیس مین کو قانون کے مطابق کارروائی کرنا چاہیے سروراجی؟" میں نے کہا۔"

"جواب میں اس نے وہی کہا جو عام طور پر کہا جاتا تھا کہ کیا قانون اور کمان کا قانون۔ دنیا میں قانون کس نے اپنے ہاتھ میں نہیں لے۔ کہا ہے اور جو زبردست ہے وہی قانون بناتا ہے اور توڑتا ہے۔ ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے جس کی انتظامیہ کی جینس۔ وہ ایک طرح سے ایم آر ایس کے اعتراض و دھماکے کی تائید کر رہا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ لاقانونیت کی دبا ایک بین الاقوامی ساکھ تھی۔ ایم آر ایس یعنی ماٹ از رائٹ سوسائٹی کے

باقاعدہ اراکین جم چند سرچھرے تھے۔ مگر درحقیقت اس کے حامی اور اس کے نظریات سے اتفاق کرنے والے اس دنیا کے وہ سب مظلوم اور محروم تھے جو کثرت میں تھے۔

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ میرے لیے نئے خدشات اور خطرات کا احساس نہ کیا یا اب پیٹر کو دیکر رہا ہے، کیا اس کے پاس شین گن کے رائیونگ ختم ہو گئے؟ یا وہ آخری داؤ لکھے ناکامی کے بعد میدان چھوڑ گیا۔ فرار کے رستے اس کے لیے کھلے ہوئے تو ہیں۔ وہ لائف جیکٹ پہن کے کھلے سمندر میں گور سکتا ہے مگر اسے ایک طرف دوسری لائن سے کیے جانے والے فالو کا سامنا ہو گا تو دوسری طرف نئی نکلنے کی صورت میں ہر طرف پھیلے ہوئے سمندر کا۔ ساحل سے سیکڑوں میل دور وہ کسی بحری جہاز یا لائن پر پہنچ جانے کی توقع رکھ سکتا ہے مگر اس کا امکان بہت کم ہوتا ہے کہ سمندر کے شور میں کسی شخص کی پیچ و پکار کوئی سن سکے یا بوجوں کی رستہ وغیرہ میں گھرے ہوئے ایک آدمی پر کسی کی نظر پڑے۔

سروراجی نے سوائے رنگا بھول سے میری طرف دیکھا دھمی قیدیوں میں سے ایک دم ٹوڑ رہا تھا۔ اس کے سارے اعضاء رئیسہ میری لالوں اور مٹھوروں سے پاش پاش ہو چکے تھے دوسرے کو سروراجی اور اس کے ساتھی نے مل کر باندھ دیا تھا مگر وہ ہوش میں تھا۔

”یہ... مرہا لے گا...“ وہ دہشت زدہ ہو کر بولا۔
سروراجی نے اس کے منہ پر کڑا تالا۔ ”سورادھم... اؤٹے مرتے توں وی جانا لے اپنی ٹکڑ کر“
اچانک باہر سے میگافون پر محسن کا اعلان سنائی دیا جو میرے لیے اتنا ہی اطمینان بخش اور حوصلہ افزا ثابت ہوا جتنا ہوائی گولے کے بعد خطرہ مل جانے کا سائرن خندق میں رہا لینے والوں کے لیے ہوتا ہے۔

”پیٹرو اور مقابلہ مت کرو۔ تمہارے سب ساتھی مارے جا چکے ہیں، محسن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی، ہم تمہاری لائن پر قبضہ کر چکے ہیں تمہارے لیے اب بھاگ جانے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا“

یہ وہی میگافون تھا جو اسٹریلوں کو گماندہ بن کے آنے والا پہلا شخص استعمال کر رہا تھا۔ اس کے اعلان نے یہیں ہزار سال نہیں کیا تھا، صرف تشویش میں مبتلا کیا تھا لیکن اب اسی میگافون سے نشر ہونے والا اعلان ایسے رہ جانے والے استاد پیٹر کو کتنا دہشت زدہ کر رہا ہو گا، یہ سوچ کے مجھے خوشی ہوئی۔ میرے لیے دہشت کے سارے دشمن ایک سے مجرم تھے مگر پیٹر کے خلاف

میرے جذبات میں ذاتی علوت کا پہلو بھی تھا کیونکہ وہ باپ کا قاتل ثابت ہو چکا تھا۔ بعض اوقات میں سوچتا تھا کہ وہ میرے سامنے ایک مجرم کی طرح آیا اور مجھے اس کو انصاف کے مطابق موت کی سزا دینے کا اختیار حاصل ہوا تو میں طرح اس کو زیادہ سے زیادہ ذلت دے کر ختم کر دیتا۔ اگر انعام کی آگ تو شاید کی طرح بھی سرزد ہوگی۔

جب محسن نے اپنا اعلان قہر یا تو میں اپنی جگہ سنا میں نے اس کہیں میں گولی سے ہوجانے والے سوراخ پر ان کی جگہ کے باہر جھانکا۔ وہ باہر کی مختصر رہا داری میں محسن تھا۔ اس میں وہ نیزہ بھی دیکھ سکتا تھا جس پر والٹیس سیٹ وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ اس کے قریب آئی ہوئی کسی اور شاہ دین کی لال لال نظر آرہی تھی لیکن آگے کا منظر میری نگاہوں سے اوصل تھا۔ یہ اعلان عرشے کے اوپر لے اس محض سے کر رہا تھا جہاں سے شہنے آنے والا زہر شروع ہوتا تھا۔

میں نے سروراجی کو اشارہ کیا: ”آہاؤ، باہر کوئی نہیں ہے۔“
راجندر سنگھ کے ساتھ اس کا ساتھی بھی کھڑے تھا اور کھڑا ہوا اور انھوں نے ہاری باری سوراخ سے جھانک کے اپنا اطمینان کیا۔ استاد پیٹر نے محسن کے اعلان کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ غالباً اب وہ کسی محفوظ مقام پر موجود رہا ہو گیا تھا جہاں سے قریب آنے والا شخص اس کی زد میں ہو سکتا کوئی اسے وہ کے نشانہ نہ بنا سکے۔

میں نے سروراجی سے مشورہ کیا: ”ذرا مجھے نقشہ سہاڑیں اگر وہ غیث کہیں چھپ گیا ہے تو اسے کسی طرح باز رکھا جائے گا۔“
”تمہاری بندہ اوپر سے بول رہا تھا؟“
”ہاں اوپر سے تو وہ ہر طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ اس کے لیے یہ نامکن ہے کہ سمندر میں کوو کے نکل ہائے ہیں نہ؟“
”نیچے ایک تو وہی کپتان کا کمر ہے،“
”راجندر سنگھ تھا۔“
”پھر اس کے ساتھ اسٹور ہے،“
”ادھر میرے ہاتھ پر کپڑا اور اس کے پیچھے ٹائلٹ“

محسن نے میری ہاریڈر کو مخاطب کیا: ”پیٹر وہ توڑ کر لڑنا ہے تو ہوتو تمہاری مرضی لائن ڈوب جانے سے یہیں کپڑا ہو گا۔“
”کاپی لائن میں بالکل محفوظ ہوں گے۔“
”دیکھا اباب ہلا تمہاری۔“
”جے اور اس کا کاپی سراج ہم اکیلے ہو اب کوہاں دینی ہے اور سب حساب برابر کرنا ہے۔ بہت ہے تو نہ میں چھلانگ مار دوں ہم تمہارا بچا کر لیں گے اس وقت تک کہ تم کسی شاکر کا ٹکڑ نہیں بن جاتے ہم تمہیں کوئی نیلہ مار گے۔ ہم دیکھیں گے کہ تم کمال تک تیر کے جانتے ہو“

راجندر سنگھ نے سختی دیر میں مجھے سہاڑا تھا کہ پیٹر روک کر بچ رہے تھے۔ میں نے اس سے متبادل راستے بتائے تھے جو محفوظ تھے۔ ہم سامنے سے جانے کے بجائے یہ کر سکتے تھے کہ پانی میں آکر جہاں آدھریل طوف سے شیش ٹوڑ کے پیٹر کو پھانسی کر دیں۔ اور وہ اُدھر سے جواب دے تو سامنے سے محسن دروازہ توڑ دے۔ پیٹر وایک وقت میں ایک ہی طرف کے چلے گا۔ جواب دے سکتا تھا۔ غالب امکان یہ تھا کہ اس کے پاس شین گن اتنا زیادہ نہیں تھے چنانچہ وہ ریلوے سے مقابلہ کرے گا۔ ایک ریلوے گاڑی ہو جانے کے بعد وہ دوسرا استعمال کر سکتا تھا مگر کھو ہو جانے کے بعد وہ غیر معتبر عرشے تک پہنچا راستہ نہیں روک پاتا۔ سمندر کی طرف کھڑکی کے گول سوراخ سے گردن لگا کر بغیر وہ ہیں نشانہ نہیں بلکتا تھا مگر ہم پانی میں رہ کر اسے دھوکا دے سکتے تھے اور جیسے ہی اس کا سر نظر آئے فائر کر سکتے تھے۔

اس پورے پلان میں بہت سی خامیاں بھی تھیں اور خطرات بھی تھے۔ ایسے امکانات بھی تھے جو ہمارے خلاف بھی جاسکتے تھے لیکن بحری طور پر یہ قابل غور لاؤجر تھیں۔ پیٹر روک میں ڈوگا ہوا ہمارے ساتھ ہی چوہے کا کھیل کھیل رہا تھا۔ یہ عقل کی اور اعصاب کی جنگ تھی جس میں نفسیاتی فواید میں حاصل تھے۔ ہم تلافی زیادہ تھے اور قوت میں بھی ہم محفوظ بھی تھے اور فن و حرکت کے لیے آزاد بھی۔ اکیلا پیٹر وہیں عامی طور پر موجود رہا ہو گیا تھا اب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ بات صرف وقت کی ہے ورنہ جنگ کو ختم ہوئی اور اس کے لیے فتح کی امید رکھنا کسی مجرم کی امید رکھنے سے بھی زیادہ بعید از قیاس ہے۔ ہم صرف انتظار کر کے بھی جیت سکتے تھے۔ پیٹر روک کھائے پیٹیر لایہ پانچے موجودہ اسٹاک کے ساتھ تک ایک کمرے میں بند رہ سکتا تھا۔ بالآخر اس کو باہر آنا پڑا مگر یہ سلسلہ دنوں پر محیط ہو سکتا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ محسن کو میری فکر بھی ہوگی اسے نہیں معلوم کہ میں رہا داری کے دوسری جانب موجود ہوں اور میرے ساتھ دو دروازے بھی ہیں۔
میں نے جلتا کہ محسن! وہ حلوہ وہ ایسے نہیں نکالے محسن نے میگافون پر کہا: ”کو غیریت سے ہے نا؟“
”ہاں مجھے کے دو افراد میرے ساتھ ہیں پیٹر کے“

”وہاں گند تھے۔ ایک شاید مر گیا ہے ایک زندہ ہے۔“
”سنا۔“
”عرشے پر کون ہے؟“
”بانی سب لوگ، وہ کل کے جاہنیں سنا“

”اس کے لیے میں نے دوسرا بندہ لیت لیا ہے۔“
”کما۔“ سامنے سے مت آنا، وہ فائر کر دے گا۔“
اسی وقت شیش ٹوٹنے کی آواز آئی۔

راجندر سنگھ نے کہا: ”نکل گیا وہ مزہزادہ سمندر میں گور گیا۔“
محسن ایک دم واپس بھاگا کیونکہ نے نے اس کے قدموں کی آواز سن کر سروراجی کی بات میں اتنا یقین تھا کہ میں بھی باہر جانے کے لیے لپکا لیکن پھر ایک خیال نے مجھے روک لیا۔ میرے پیچھے دوڑنے والے سروراجی مجھ سے نکل گئے۔

”کی ہویا ہے بادشاہو؟“ انھوں نے ناک کولا جلا کے کہا۔
”سروراجی! کون سا شیخ زیادہ قابل اعتماد ہوتا ہے؟ جو آدمی اپنے کانوں سے سنے یا وہ جو آنکھوں سے دیکھے؟“
”کس کی آنکھوں سے؟“ سروراجی نے ایک منطقی سوال کیا۔
”مگر میں نے کہا۔“ بہت بون کی بات ہے۔ ہم نے صرف شیش ٹوٹنے کی آواز سنی ہے۔ بندے کو فرار ہوتے نہیں دیکھا۔ اور یہ بندہ کوئی احمق نہیں ہے۔ انتہائی عیار آدمی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے راستہ صاف کرنے کے لیے دھوکا دیا ہو یا کہیں سامنے ہلا کے مارنے کے لیے یہ پال چلی ہو۔“
”پھر کیا کرنا چاہیے؟“ وہ سر جھکا کے بولا۔

”انتظار،“ میں نے کہا۔ ”محسن اوپر گیا ہے عرشے پر جو دوسرے لوگ موجود ہیں ان سے بچ کے پیٹر روکے نکلنے کا سوال ہی نہیں اسے وہ پانی میں نظر آتے ہی شکار کر لیں گے۔ وہ بڑے ماہر شکاری ہیں۔“

”یہ استاد پیٹر کون ہے؟“
”یہ بھی شکاری ہے،“ میں نے کہا۔
”عجیب بات ہے۔ تم بھی شکاری ہو، وہ بھی شکاری اور شکار کرتے ہو ایک دوسرے کا۔“

”سروراجی! دنیا جب سے وجود میں آئی ہے، ایسا ہی ہو رہا ہے۔ شاید اس سے بھی پہلے، ہمارے عقیدے کے مطابق... شیطان نے جنت میں باوا آدم کو شکار کیا، شیطان آج بھی انسان کا شکاری ہے۔ جنا ہو گیا یا سست کیا تجارت، ہر جگہ جھوٹے اور بڑے شکاری ہیں، سامنے بھی اور پیچھے کے پیچھے بھی۔ میلی بھی شکاری ہے اور بھول بھی۔“

”تیرے بٹے... کو سوچی بات کی ہے بادشاہو آپ نے یہ سروراجی نے بے حد تشریح کر کے کہا۔“

عرشے کے اوپر سے مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اگر پیٹر نے سمندر میں چھلانگ ماری تھی تو اب تک اس

کسی نے فائر کیوں نہیں کیا باب تو سورج اتنا بلند ہو چکا ہے کہ بیڑ و چھاپیں رہ سکتا کہیں وہ پانی کے نیچے ہی پیچے نہ نکل جائے۔ مگر یہ سکت پانی نہیں ہے، لہٰذا یہ خوار سے اچھا ہی لگی اور تکرورہ کشتی دور جا سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ کپاس گز سمندری لہروں سے لڑنا کوئی آسان کام ہے۔ بھر یہ خاموشی کسی؟ اگر کرم بلوچ اور دوست محمد بھی ہیں تو ان کو کچھ کرنا چاہیے ایسے احمقوں کی طرح انھیں پھاڑ پھاڑتے دیکھتے رہے تو وہ نکل جائے گا۔ محسن خود چھلانگ ماروے، دوست محمد کو دھانے کسی کو تو نیچے جاکے دیکھنا چاہیے۔

میرا زور بریک ڈاؤن ہونے لگا۔ ایک طرف یہ خیال تھا کہ بیڈرہ نے شیش توڑ کے ہیں دھوکا دینے کی کوشش کی ہوگی چنانچہ مجھے اس محفوف پناہ گاہ سے نکل کے اس کا نشانہ نہیں بننا چاہیے۔ دوسری طرف محسن کی طرف سے بیڈرہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملنے سے مجھ پر چھلانگ سوار تھی۔

بالآخر انتظار میری قوت برداشت سے باہر ہو گیا میں نے اندھا کا نام لے کر دوڑ لگائی اور دریائی راستے سے سیدھا گزر گیا ہر قدم پر مجھے کسی گولی کا انتظار رہا لیکن اس سے میری رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مخالفت سمت کے زینے سے محسن نیچے آ رہا تھا محسوس اس کے پیچھے تھی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے کہا۔
”کچھ نہیں، وہ نظر ہی نہیں آیا، محسن بولا۔
”تم صرف ایک طرف دیکھتے رہے ہو گے“ میں نے کہا۔
”وہ جالاک آدمی لالچ کے نیچے سے گزر کر دوسری جانب نکل گیا ہو گا“

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایک طرف میں تھا، دوسری طرف گل تھی اور سمندر میں چھپنے کی تو کوئی جگہ ہے نہیں۔“
”وہ دونوں لالچوں کے درمیان نہ ہو...؟“

”اب دونوں لالچوں کے درمیان پچاس گز کا فاصلہ ہے“ محسن نے کہا۔ ”پہلے دوست محمد نے لوہے کے رستے کا لہج ہانڈہ دیا تھا مگر پھر وہ رستا ٹوٹ گیا۔ جب آگے والی لالچ بھی“
”چھلانگ چھٹکا ہی کا تھا۔“ میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔
”مگر یاد یہ کیسے ممکن ہے؟“

”یہ تو ممکن ہے کہ وہ اندر ہی ہو۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سمندر میں ہوتا تو ہم اسے دیکھ لیتے۔ ہر ایک وقت چار افراد کی نظر اسے تلاش کر رہی تھیں۔“

”چار کون؟“ میں نے کہا۔

”دوست محمد اور کرم بلوچ بھی تھے۔ دوست محمد کھانا اچھا ہے۔ کرم بلوچ کا نشانہ کسی بھی ہونڈا گاہ تو ٹھیک ہے مگر وہ کچھ دیکھتا تو ضرور مچا دیتا، گولی ضرور چلا تا لیکن ہم اس کے ساتھ دھوکا نہیں ہوا۔ آئی ریٹنگ وہ پانی کی گہرائی میں چھپ کے بھی سمندریں کر سکتا تھا کہ تیرتا ہوا لڑا لنگ بھر دور جاکے نکلے، آخر وہ آدمی ہے آپ دونوں نہیں۔ میں نے تو اس ارکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک لالچ کے نیچے کوئی کونا یا کیل تھا ہے اور سر پانی سے نکال کے روپوش نہ ہو۔ وقفے وقفے سے ناک باہر نکال کے سانس لینا شروع اور لالچ کے نیچے خود دوپہ مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ دوست محمد نے اور بھی میں نے دور میں سے کونا کونا دیکھ لیا ہے۔“
”مگر وہ اندر بھی تو نہیں ہے؟“ میں نے کہا۔
”یہ تو نے کیسے جانا؟ محسن بولا۔
”وہ اندر ہوتا تو مجھ پر فائر نہ کرتا۔ میں سامنے سے گزرنے

آتا تھا،“ میں نے کہا۔
”اس کے فائر نہ کرنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ اندر نہیں ہے ممکن ہے اس نے ایسا اعتماد کیا ہو یا اس کے پاس خالی روادور ہو گیا ہو۔ سوام کاتات ہیں۔“

”تو نے ٹھیک کہا،“ میں نے ایک دم چنگ بجاتی۔ اس نے دھوکا دیا نہیں محسن، ایک یا نہیں دوبارہ۔ پسے اس نے شیش توڑ کر یہ ظاہر کیا کہ وہ کل گیا تم اسے تلاش کرنے اور دوسرے لیکن وہ اندر ہی چھپا رہا مجھے شک ہوا تھا کہ وہ اختیار آدمی لیا کر سکتا ہے چنانچہ میں نے سامنے سے گزرنے کا ریک نہیں لیا اس نے نہیں بے وقوف بن سکے، مہلت حاصل کرنا اب وہ اندر نہیں ہو گا۔ واقعی نہیں ہو گا۔“

میں دایں دوزا میرے پیچھے سروراجی اور ان کا ساتھی آگئے تھے مگر ہماری گفتگو میں غل نہیں ہوئے تھے۔

اب سروراجی نے مجھے روکا، ناکہ صراطے ہو بادشا ہوا“ میں نے کہا۔ ”تم آئی آؤ میرے ساتھ ممکن ہے نہ سوارہ توڑنا پڑے۔“

”لیکن... ایسے... ذرا خیال سے...“ سروراجی نے ریلوے دیتے ہوئے کہا۔ ”گولی بڑی نامزد شے ہے۔“
”خود موت،“ اب کچھ نہیں ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”گولی کوں چلائے گا جب اندر کوئی بھی نہیں ہو گا۔“
سروراجی کا منہ میرے سے کھل گیا۔ ”جے جے اندر بھی نہیں اور باہر بھی نہیں، بندہ ہے کہ سمجھت، ریلوے استاد ہے۔“

میں نے دروازے کو لات ماری۔ دروازہ میری قوت کے مقابلے اندسے بند تھا۔ محسن کی طرف میں نے اس وقت دیکھا جب میں پڑا۔
”تو... یہ تیرا دماغ خراب ہے۔“ میں نے خیر کے کہا۔ ”اوپر بات... تم دونوں پاؤں وہاں تک لگ گیا ہو گا۔ وہ یہ تو چاہتا تھا۔“
”بات فرما محسن کی عیب میں لگی۔ وہ وہاں دھڑا۔ اس کے پیچھے لے کر دوڑ گئی۔ اپنے ساندے سے بڑے جوتوں کے ساتھ اس کا دھڑا کی ٹھیکرہ نظر پڑا کرتا تھا۔ میرے ساتھ سروراجی نے نیک خوں کے شانہ ملایا۔

”اب ذرا پیچھے ہٹ کے،“ ایک ساتھ۔ ”واگہرو کا فائدہ“، ”ماہی مدد“، میں نے بھی جوالی نعروں لگایا، ہم دونوں ایک مایہ روزانے سے کھلے۔ دروازہ کچھ کمزور ثابت ہوا میں تو منہ کی مچھر دار جی سیدھے اندر گئے اور پھر نہر کے کئی کرے۔ ”او تیری ماں نوے جان چور“ انھوں نے گھٹنے سے تھلے ہوئے اٹھ کر کہا۔

”نکل گیا جوتو“، میں نے ایسی سے خالی کین کو دیکھا۔
”میں اور دیکھتا ہوں“، سروراجی اٹھ کھڑے ہوئے دوسرے مذاہم جو تیرا خون کی طرف گئے، مگر صاف نظر آتا تھا کہ وہ جوتی کول شیش والے سورج سے باہر اتر گیا ہے، مجھے عجب دیوار کے ایک کپ سے وہ رتی بھی بندھی ہوئی نظر آگئی جو پورٹ پول سے گزر کر پانی میں ڈوب گئی تھی۔

اب مجھے پانی میں غل پڑا، ہم کرتے ہوئے بھی غم آتی تھی۔ لکڑی کا مالٹا اس نے راستہ نہ بنایا۔ وہ صرف عقل کی مدد سے مصروف ہونے کے باوجود آکر ہو گیا اور ہم جو آزاد ہوتے اور دوسرے اور خیال کے گھوڑے پھر تعلقات میں دوڑاتے رہ گئے اور خود انھوں کی طرح دوڑتے پھرے۔ اس نے شیش توڑنے کے بعد اٹھا کر، وہ اوپر سے آنے والی سب آوازوں کو سن رہا تھا، محسن اور گل، دوست محمد اور کرم سب چلا چلا کے ایک دوسرے کو ہدایت دیتے رہے ہوں گے، تم اور دیکھو تم اور دیکھو، وہ دوسرے سے نکل جائے، استاد، کرم، تم کیا کر رہے ہو؟ گل دوڑیں بکڑو، دوڑو، بھاگو۔

آہم کر کے ملے، ایسے ہو چکے ہیں اور اس شخص کے ساتھ واپس نہ گئے، میں کہہ کر وہ باہر نکلا ہی نہیں تو وہ اطمینان سے کوئی آہٹ ہو کر کھینچ کر پانی کی خاموشی سے اتر گیا۔ اس نے یہی اندازہ کر لیا کہ وہ اندر ہی ہے تو پانی پناہ گاہ سے باہر آئے ہی نہیں اور اسے پانی کا زنگی اوپر سے سناؤ دینے والی آوازوں میں سنائی نہ دی

ہوگی میری ہی آواز کہ وہ سب سے الگ شناخت کر سکتا تھا پھر کسی نے مجھے میرا نام لے کر بھی نہیں پکارا ہو گا۔ اس نے رولنے کو اندر سے بند کر دیا تاکہ اسے توڑنے میں بھی کچھ وقت لگے۔ میں اس کی گولی کا نشانہ زین جانے کے ڈرے ایک طرف رہا۔ دوسری طرف اسے تلاش کرنے والے لوٹ آئے۔ یہی وہ وقت تھا جب استاد بیڈرہ واپس گیا۔

”آجاؤ سروراجی، اب کوئی فائدہ نہیں،“ میں نے کہا۔ ”اوپر چل کے دیکھتے ہیں۔“
”ہاں جی، یہ تو بڑی عجیب بات ہو گئی۔“
اور محسن اور اس کے ساتھ باقی سب لوگ بھرستہ ہو گئے تھے۔ محسن دور میں لگائے دور دور دیکھ رہا تھا۔

”اسے کم سے کم دس پندرہ منٹ مل گئے“، میں نے نفسی سے سر ہلایا۔ کہا۔
”دس پندرہ منٹ میں دس دس پندرہ منٹ تو جانیں سکتا بادشاہو“، سروراجی نے کہا۔ ”آخر زندہ بشر ہے۔“

انھوں نے یہ پہل عقلمندی کی بات کی تھی۔ ”آپ نے ٹھیک کہا، ہم اسے تلاش کریں گے، محسن، تو اس کے ساتھ اپنی لالچ پڑھا۔“

”تم جی زیادہ دیر مت جانا،“ محسن نے دور میں مجھے تھلے ہوئے کہا۔
”ایک میل کے دائرے میں، ایک میل قطر کے دائرے میں ہم غلط سمتوں سے چلیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم کھاک وائر جانیں گے، تم دوسری طرف سے یعنی ایٹنی کھاک وائر آؤ گے۔ ہم ایک دوسرے کو کراس کریں گے اور اپنا پیکر پور کر کریں گے اس طرح ایک راولڈ میں دوسرے دیکھیں گے پھر وارنہ غصہ ا ماویع کریں گے تقریباً دو فرلانگ جس کا مطلب ہے کہ تم ڈیڑھ میل قطب میں اسے تلاش کریں گے لیکن یہ مدہ ہے اسے آگے وہ نہیں جاسکتا۔“

”آئے آئے سر“، محسن نے عین میلز کے انداز میں سر کہا اور دوست محمد کو اشارہ کیا کہ لالچ قریب لائے۔

”سروراجی، آپ ابھی گڈی اشارٹ کر رہے ہیں نہ کہا۔“
”کیوں نہیں، ابھی لو“، سروراجی نے کہا۔
”محسن نے گل کو ڈاٹا۔ یہ تم کیا یہ آدمی چھلانگ ہوئی ہو؟“
”کیا کرلوں پھر میں؟“ گل جھلکے بولی۔ ”او کسی کی ہم ہے ہی نہیں۔“

سروراجی رنگ گئے۔ ”جے جے... اوئے بادشاہو! امیر تے کڑی اسے“، انھوں نے گل کی بات پر غور فرما کر کہا۔ ”زمانہ

مجھے گل کے جواب نے غصہ طغایا۔ ان حالات میں جب ہم سنت اخصاب کشیدگی کا شکار تھے، ایک سکرپٹ کسی کونٹے دو ایک گولی سے زیادہ خوش ثابت ہوئی۔ گل ابھی لائی پریکٹس تھی۔ اور گولیاں سن سے اڑاؤں تھی جب دوست ہماری لائیو لائیو لے آتا تو میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا تو ناسات کے لیے وقت نہیں تھا۔

چنانچہ میں نے محسن سے کہا: "تم نہیں ٹھہرو۔ دوست محمد کے ساتھ میں جاؤں گا" محسن نے گل پر ایک تھوڑا سا دھکا دیا جیسے پروگرام فوراً تبدیل کی نیت دارو ہی ہے گل کا بار اور چڑھا رہا۔ "میں آپ کے ساتھ چلوں گی، مکہ بانی" اس نے مجھے مخاطب ہو کر اور محسن کو گھور کر کہا: "میرا خیال اب اس لیے بھڑا ہے کہ اپنی لائیو چھپنا تک ماروی۔"

میں نے دوست محمد کو سمجھا کر کہا کہ میں کیا کرنا ہے۔ "ہم سمجھ گیا بابا، پر ابھی اپن کو ایک سکرپٹ تو دو، سویر ہو گیا" وہ بولا۔

"سکرپٹ" میں نے کہا: "وہ تو خیر میں لانا ہوں تم لائیو کا راستہ کریو کو بتاؤ اور میرے ساتھ ساتھ آؤ"

میں نے اپنے جانے لگا تو گل نے کہا: "میں کیا کروں؟" "تم انھیں کھلی رکھو اور چاروں طرف دیکھو۔ پانی میں جو چیز نظر کرے اسے گولی مار دو، میں نے کہا: "میں ڈرلا نہیں دھونڈنے جا رہا ہوں۔ ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں"

میں لاش کے جسم پر میرے کپڑے تھے اس کو الٹ پلٹ کے میں نے جھول کو دیکھا۔ دوست محمد کے اپیشل سکرپٹ اس کی آمد والی جیب میں محفوظ تھے اسے ایک سکرپٹ دے کر باقی میں نے اپنے یونیفارم کی جیب میں رکھ لیا کہ میرے بوجھ نے لائیو کو اپنے اسٹاک ہاؤس کے مطابق چلانا شروع کر دیا تھا۔

میں نے ایک لاش کو اٹھایا اور سمندر میں چھینک دیا استاد ایک بات غور سے سنے "میں نے کہا: یہ بات میں کسی اور کے سامنے کہنا نہیں چاہتا تھا"

استاد نے سکرپٹ کا لمبا کش لے کر سر ہلایا "بولو" "جب یہ تلاش کا کام ختم ہو جائے گا، میں نے دوسری لاش کو اٹھانے کو کہے کہ تم لوگ لائیو لے کر واپس چلے جاؤ گے"

"واپس؟ کدھر۔ کراچی؟" "ہاں، واپس کراچی" میں نے کہا اور تیسری لاش کی طرف ہل چڑھا۔

"اور تم... کیا کریں گے؟"

"ہم رہیں گی اس وقت اور محسن۔ ہم اس انٹرویو کی لائیو نہیں کریں گے۔ میں نے تیسری لاش کو بھی سپر وائز کر دیا۔ ابھی اپن کو سمجھ نہیں پڑا، دوست محمد نے کہا۔

"دیکھو استاد! ویشن کا ایک بہت خط ناک آؤنگ تک لیا ہے اگر وہ نہ ملا تو یہ بات یقینی ہے کہ وہ کسی دیگر بھی پہنچ جائے گا۔ اسے ہماری منزل کا علم ہو گیا ہے۔ لائیو کو بھی دیکھ لیا ہے۔ ہم اس لائیو میں گئے تو ایسے جڑیو گے جیسے چوہے دان میں چوہا سیسا آتے ہیں اور چھوٹا ہوتا ہے ان کو بھی میں انتظار کرنے دو۔ غم واپس کراچی جاکے شہر اکرام شیخ کو جاننے ہونا ہاں کسی کیسی کانٹیر میں تم کو بتا دوں تمہاری مدد کرے گا"

"کہا ہے کہ واسطے۔ اپن کو مدد نہیں مانگتا بابا" دوست نے غصے سے کہا۔

"تمہاری نہیں بلکہ کریم بوجھ کی مدد کرے گا وہ ملے گا اور مشنری کو بچائے گا۔" میں نے کہا۔

"ان کو ہم بچا سکتے ہیں... اپن کو کسی شیخ کا گھر نہیں ہے۔ لیکن یہ جو تم بولا۔ یہ ایک دم غلط بولا۔" "کیا غلط بات کہی ہے میں نے استاد" میں نے اس کا کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بابا تم لوگ خالی ایسا بات بولنا کڑھا پڑو کو باب کا نامک جانتا، دوست محمد نے کہا: "ابھی آپ کا چلو تم جاؤ۔ ادھر جاؤ یہ پھر ویشن لوگ جھڑا ہے۔ وہ کو ماتا ہے... تو مارے کریم اور اس کا پاگل عورت کو کہ مجھے خونہ شرمندگی ہوئی" یہ تم نے کیسے سمجھا استاد؟

تمہارا زندگی سے کوئی تپسی نہیں رہی۔ تمہاری زندگی کی کہ میں نے لائیو بھیجے گا فیصلہ کیا۔ ہم تو بھی جیسا کہ تم نے تمہاری لائیو بھیجی ہو چکی جانے کی اور اس میں تم نہیں ہو گے۔ اسے بابا کہے کو ایسا بولنا کہ لائیو بچا جائے گا۔

سالاد دوست محمد پانچ منٹ کی ایسا نامک گزرا ابھی ادھر وہاں بھی، کلکتہ، مدراس، واسطے کراچی کا جیسا ہے کہنا بارگیا کوئی پانچوٹ نہیں ملگا مانگتا تو ہم کدھر ہے ادھر ایسا سب یا رما دے اپنا بندہ رہی ہے۔ ادھر کوک پاس آتا ہے۔ ہم ان کو سامان رکھتا ہے۔ ہم کوئی سالانہ سیدھا بندہ گاہ جاوے اور کدھر اجاوے۔ نابا، اپن دیکھ رہے ہیں کوئی مارو اپنا اور کدھر ترقی کا۔ بدھ کوئی ہے۔ اور میرے لائیو چھوڑے ہوئے... تم بولو کدھر ہے کہنا

تم سائل پر کہیں دور اتر کے آ جاؤ گے؟ میں نے کہا: یہ بات ہے تو میری بات نہیں، لیکن تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے میرا مطلب ہے ہماری لائیو کے ساتھ پھر تم کہاں لوگوں کے اور کب؟ ابھی تم بتاؤ، ہم سارا سہی دیکھا ہے"

"اچھا... تو پھر جملہ رت، حاجی علی دگا پڑا، میں نے کہا۔

"خفیک ہے اپنی لائیو کو سیدھا ادھر لادو گا۔ کھانا فریند میں ہے دوست محمد نے کہا۔

مندرجہ ذیل میں نے خیرانی سے کہا: کوئی جزیرہ ہے یا دوست محمد نے انٹر میں سر ملایا۔ بوسہٹ بڑا دگا خریف ہے ادھر سب آتے ہیں، ہندو، پارسی، عیسائی اور مسلمان"

اوپر سے فٹنری آواز سن کے میں ابھل پڑا۔ کوئی یقیناً فوٹو لائیو تھی اور اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اس نے پڑو کو دیکھ لیا ہے۔ میں تیزی سے اوپر پہنچا۔ گل ہاتھ میں ریلوے بلیک خفت سے سکر رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ کدھر دیا؟ میں نے کہا۔

گل نے اپنی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک جگہ میرے سطح آب پر مرنے والی دی جو خون کی نشان دہی کرتی تھی، لیکن وہ ایک خامی کی بجلی تھی۔

"تم پھل کا شکار کرنے آئی ہو؟ میں نے کہا۔

"وہ... دراصل میں سمجھتی تھی کوئی آدمی ہے۔" آدمی کی دو انگلیں ہوتی ہیں اور وہ ہاتھ۔ اور اس گاہ وہ بھول کر طرح اڑے بھی نہیں دیتا، میں نے کہا: "اس فرق کو ذہن میں رکھنا"

"تم نے کہا تھا کہ پانی میں جو چیز نظر آئے اسے گولی مار دینا" "ہاں، لیکن اب میں متاظر ہوں گی۔ پہلے پھر لوں گی کہ آپ استاد۔" میں ہنس پڑا کیا یہ بہترین ہو گا کہ تم مشنری کی مدد کرو اور مجھ کو کاپیٹ سمجھنے کی تحریک میں حد تو دس بیج چکے ہیں اور کسی کو ایسا چال بولے بھی نصیب نہیں ہوتی ہے۔ کچھ تو خدا کا فوٹ کرو"

اس کے جانے کے بعد میں نے اور دوست محمد نے ساتھ ساتھ اس کے اپنی کو اپنی نظروں سے کھانے کا عمل جاری رکھا۔ اعلیٰ حویط میں سمندر کا منظر اور دور تک بالکل واضح تھا۔ سب اس سے اٹھنے والے بنیاد نے ابھی تک خدگاہ کو نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ لائیو کے دونوں جانب دو چراغ لگے۔ بالکل کوئی جنوئی سی پھلی جس کی پھلتی تو دکھائی دیتی تھی۔

محسن جس لائیو پر تھا وہ نسبتاً تیز رفتار سی کے ساتھ اپنا چکر یو راکر رہی تھی اور ابھی ہم نے ایک تہائی فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ وہ دائرے کا دو تہائی حصہ مکمل کر چکی تھی۔ جب وہ میرے قریب سے گزرتی تو میں نے ان سے رفتار کم رکھنے کو کہا تاکہ یہ فرق نہ رہے اور دو چکر ہم بھی پورے کر لیں۔ انٹرویو کی اس لائیو کی رفتار جاری پر اپنی لائیو کے مطابق میں دنگی مڑ رہی تھی۔

ایک راز بندہ راجو جانے کے بعد رپورٹ نیکی تھی۔ کسی نے پانی میں پھیلنے والے سوا کوئی چیز متحرک نہیں دیکھی تھی۔ شہر پر گرمی کے مطابق دوسرے راز بندہ میں ہم نے دائرے کو بڑھالیا۔ ناکامی میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی میں جھجھکا ہوا شکار تھا۔ پڑو آدمی تھا کوئی چھلاوا نہیں کہ بیچ سمندر میں غائب ہو گیا۔ نہ اس کا سراغ لائیو کے اندر ملا اور نہ باہر آخری امکان سے لے کر ذہن قبول نہیں کرتا تھا یہ تھا کہ پڑو فرار ہونے کے بعد ڈوب گیا۔ میں نے دوسرے چکر کے اختتام سے پہلے دوڑ میں لگا کے مشرقی آغوش کی جانب دیکھا تو مجھے سطح آب پر ایک سیاہ دھبہ سا دکھائی دیا۔ میں نے دوڑ میں کچھ فوکس کیا۔ دھبہ واضح ہوا اور پھر غائب ہو گیا۔

میں نے دوڑ میں دوست محمد کو دی۔ تم دیکھو۔ تھوڑا سا شمال مشرق کی جانب۔ وہ کالی کالی چیز کیسا ہے؟

دوست محمد نے کہا: "تم کیا سمجھتا ہے ابھی؟" "وہ کسی آدمی کا سر بھی ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

دوست محمد نے دوڑ میں کچھ پھر کر دیکھا اور تائید کے انداز میں سر ملایا۔ میری بلاؤں ایک دم نمی آمید کی سنسنی میں داخل گئی۔

"لائیو کو ادھر مڑ لو" میں نے کہا: "ہم اس کی پھلی کیوں گے، فاصلہ زیادہ نہیں ہے"

"ابھی ہم خود لائیو کو چلا دے گا" دوست محمد نے پچھے اتر گیا۔

چند منٹ میں لائیو کے رخ بدل لیا کہ کریم اوپر آ گیا۔ میں نے اسے دوڑ میں دی۔

"تم بھی دیکھو اچھا کیا کوئی آدمی ہے؟ میں نے کہا۔

کریم نے اپنی نظر کے مطابق دوڑ میں فوکس کیا: "میں قسم کھاتی ہوں کہ کدھر پڑی ہے" اس نے چلا کر کہا: "ابھی سالانہ کے کدھر حاشیوں گا"

میں نے پھر دوڑ میں اس سے ہمیں دل کے دھڑکن اور اوی کرش تیز ہو گئی تھی۔ لائیو کی رفتار میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور ہم اس شخص کے قریب ہو رہے تھے۔

دور بین کے مدد سے میں مسلسل اس ڈوٹی انتہائی کالی سی چیز پر نظر رکھے ہوئے تھا جب فاصلہ دوڑ لانگ سے بھی کم ہو گیا تو میرے لیے شک و شبہ کے کوئی گناہ نہ رہا۔ وہ کوئی آدمی تھا جو سمندر کی موجوں سے لڑتا ہوا تیر رہا تھا اور مجھے دور جانے کی سخت جدوجہد میں مصروف تھا۔

میں آستاد پٹیل کو "میں نے شدت جذبات میں فالت میں کے کہا۔" اتنا ہی سہ سستے تھے تم اس دن سے بھاگ رہے ہو جب تم نے میرے والد ذرا غلے کو قتل کیا تھا پھر ان غلے کو قتل کیا تھا اور تم نے بھاگتے ہوئے میں ان گنت خون کیے تھے مگر بالآخر تمہارا اپنا وقت آ گیا ہے۔ تم اب تک دشمن انسانوں کے جنگل میں دوپوش ہونے میں کامیاب رہتے تھے لیکن یہ سمندر متعارف ہے اب کوئی جانے پناہ نہیں۔ ہاں تمہاری لاش کے لیے یہ ایک قبرستان ہے۔"

کرم بلوچ میری خود کلامی پر حیران تھا اس نے یہی سمجھا ہو گا کہ صاب کا دامغ چل گیا ہے۔ لیکن وہ میرے جذبات کا اندازہ کیسے کر سکتا تھا ایک بہت بڑا اپنے تجربے، اپنی غریب کاری اور اپنی طاقت پر غور کرنے والا شکاری دامغ چل گیا تھا۔

میں نے اس پر نشان لے کر بغیر فائر کیا اتنی دور سے میری گولی ایک ایسے بد کو کیسے نشانہ بنا سکتی تھی جو بہت چھڑا تھا اور لوہوں کے ساتھ متحرک تھا خود میں لالچ پر کھڑا ہوا تو لم کے ساتھ حرکت کر رہا تھا لیکن میں اسے دہشت زدہ کر رہا تھا چلتا تھا۔ وہ فائر کر کے نہیں لے کر بے وقوف کر رہا تھا۔

پٹیل رو۔۔۔ بھاگ۔۔۔ میں تجھے قوت دیتا ہوں، میں نے چلا کے کہا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ سمندر کے شور میں میری آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اب میں دور بین کے بغیر بھی اس کے ہاتھوں کی دیوانہ وار جدوجہد کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ اب بڑا پانی میں غائب ہو گیا تھا پھر آ پھر آ تھا اور آگے بڑھنے کے لیے سمندر سے لڑنے لگا تھا۔ یہ زندگی کی محبت تھی اور موت کا خوف تھا جو اسے شکست تسلیم نہ کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

وہ اب مقابلہ بے سود تھا میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کتنا تھکا ہوا ہو گا۔ وہ لالچ کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اگلوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ وہ ہمارے ہاتھوں مرنے کے مذاب سے دہشت زدہ تھا۔

میں نے اس پر دو گولیاں اور چلائیں۔ میں اس پر زلزلہ میں تھا کہ کوشش کرتا تو اس کو نشانہ بنالیا مگر میں اسے اتنی آسانی سے مرے کی اجازت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ میں اسے زندہ چکڑا بنا رہا تھا۔

میں نے دیکھتے ہوئے کمر میں اپنا لالچ کے ساتھ ہاتھ سے نکل کے سیدھا جا رہا ہوں تو انٹرپل کی لالچ کا رن بھی ہوا۔ طرف کر دیا۔ لیکن وہ اب بھی بہت دیکھتے تھے۔

اب تک ہماری لالچ نے ایک جھٹکا لیا اس کا کھنکھارہ اور بند ہو گیا۔

میں نے کرم کی طرف دیکھا۔ یہ کیا ہے؟

"دیکھئے صاحب! ابھی استاد۔۔۔" میں نے لالچ کی طرف اشارہ کیا۔

گاتو ٹھیک کر دیں گا، وہ بولا اور وہاں سے بھاگ گیا۔

مگر ایک ٹھسے کے ساتھ میرے قریب آئی۔ کیا وہ؟

گیا ہے بکر بہت بدحواس تھا۔

میں نے ہنس کے کہا: "ہاں۔ وہ دیکھو، وہ ہے اس پٹیل۔ میرے باپ کا قاتل اور مجھے قتل کئے ہوئے ہیں بھائی۔" میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے دلا شکاری۔

موت اسے کہاں لے آئی؟

"میں نے تین بار فائر کیا اور اسے قتل کیا۔ وہ بولی: "کیا لالچ وہ زندہ ہے؟"

"پٹیل گرفتار ہو کر لیں اسے" میں نے کہا۔

"اچھا لوچا ہے پٹیل" میں نے کہا۔ "نانشا بھی کرو۔"

میں نے صرف چاہئے ٹانگ اٹھا لیا۔ میری نظر پر جی ہوئی تھی جواب پھر سوگند دہلا گیا تھا۔ لالچ کا کھنکھارہ مگر مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ ایک میل آگے چل گیا۔ فرق نہ پڑتا۔ سمندر کی بکریاں وسعت کو عبور کرنا اس کے نامکن تھا۔

میں نے لالچ قریب آئی اور پھلکی لالچ کے متوالی۔

میں چھلانگ مار کے آیا اور اس نے دو زمین میرے لیے۔

"یہ وہی ہے؟" میں نے کہا۔

"اور کون ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "کوئی اور ہونا بھاگنا کیوں؟ لالچ ہماری طرف آتا اور خدا کا شکر ادا کرتا کہ وہاں بچانے والے بچے گئے۔"

میں نے لالچ میں سر ہلایا۔ "چھوٹک کیوں گئے؟"

"انجن بند ہو گیا ہے" میں نے کہا۔ "چلتے ہیں؟"

"نانشا وغیرہ کر لیں؟"

"نانشا؟" میں نے چلا یا۔ آہ۔۔۔ یہ کیا یاد دلایا تھا۔

میں توجہ اس احساس میں تھا لیکن اب تو خدایہ میں بھوک فوٹ ہو جاؤں۔

"ہو جاؤ شوق سے یہ گلے نے کہا؟ تمہارے لیے؟"

نانشا نہیں بنایا ہے۔ لپٹنے لپٹے اور سکندر بھائی کے لیے بنایا ہے۔"

"ایسی کی تھی تمہارے سکندر بھائی کی؟" میں نے چاہئے کا مجھ سے چھین لیا اور پھر ٹھسے میں سے ایک ساتھ چار ٹانگ اٹھا لیا۔ "یہ تو باپ کی پیٹ کا سوال ہے بابا۔ اس میں نہ کوئی کسی کا بھائی نہ بھائی اور بہت خیال ہے چاہئے سکندر بھائی کا تو انھیں اپنے حق کا نشانہ ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے فی الحال۔" میں نے چاہئے کا دوسرا ٹھسے لیا۔

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ ویسے بار۔۔۔ یہ گلے بڑی اچھی ہوئی۔ بڑا تو کسی بات کا مانتی بن نہیں۔" میں مجھ سے مخاطب رہا۔

"اور وہاں وہ کیا ذائقہ ہے چاہئے؟" کیا لذت ہے سانس میں۔

سبحان اللہ! ابھی جس کے گھر جانے لگا۔۔۔

گلے نے احتجاجی انداز میں داک آؤٹ کی مگر مگر کرتے ہوئے "ساری عمو روئے گا پناہ نام پر بکرو" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"کیا خیال ہے۔ دوسری لالچ میں چلیں؟" میں نے بولا۔

"نہیں۔۔۔ انھیں بھی کوئی کچھ کھانی ہیں۔ چاہیں تو یہاں تو ہمیں اپنا نشانہ ہے چاہیں؟" میں نے کہا۔ "گلے اور دشمنی مل کے اگر یہ ہیں؟"

"یار۔ وہ کیسے؟" میں نے ایک دھجے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے پٹ کے دیکھا۔ "یہ۔۔۔ کوئی ایسی ہی لالچ ہے۔"

یہ ایک دم کہاں سے نمودار ہو گئی؟

"ایک دم تو نہیں آ سکتی۔ ہم ادھر دیکھ رہے تھے؟"

میں نے کہا۔

میں نے دو زمین لگ کے دیکھا۔ "یہ تو ادھر ہی آ رہی ہے۔"

لیکن ابھی بہت دور ہے۔ تین پارسل یا اس سے بھی زیادہ سمندر میں زیادہ ٹانگے ہیں۔

لالچ کا کھنکھارہ دوبار اشارہ ہو کے بند ہوا اور تیسری کوشش میں بھل پڑا۔ میں نے والیں اپنی لالچ پر چھلانگ لگائی۔

"تم مت آنا ادھر؟" میں نے کہا۔ "انٹرپل کی یہ لالچ کسی کی نظر میں نہ آتا چھتا ہے۔ ہمیں اسی میں آگے جانا ہے۔"

ایک بار لالچ کی رفتار میں اضافہ ہوا۔ اب میری نگاہ ایک وقت اسٹاپ ہو رہی اور قریب آنے والی لالچ پر تھی۔ بہت آہستہ میری توجہ میں اضافہ ہونے لگا۔ یہ دو کورہ پٹیل کو سمجھا لیں۔ پٹیل دوری کو کوشش کرے گا کہ انھیں متوجہ کرے۔

اس بار میں ریلو اور نکال کے پوری طرح مستعد ہو گیا۔ لالچ

بہت دور گئی تھی وہ اب صاف نظر آنے لگی تھی۔ ادھر میرے اور پٹیل کے درمیان فاصلہ سو گز سے بھی کم کر رہا تھا۔ میں نے احتیاط سے نشانہ کے کرافٹر کیا۔ پٹیل کا سر اوپر اٹھا اور غائب ہو گیا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ وہ دوبارہ سطح پر آیا تو میں نے ایک وقت دفا ٹریکے۔ بھجاس گز کے فاصلے سے میں اس کی موت دیکھ رہا تھا لیکن میرا نشانہ خطا کا نہیں پٹیل کو اوجھال رہی تھیں اور میرے لیے توازن قائم کرنا مشکل سے مشکل۔

پڑا ہوا رہا تھا۔

سمت شعل ہو کے میں نے پھر نشانہ لیا اور گولی چلائی۔ وہ اب اتنے کم فاصلے پر تھا کہ میں نے اس کے چلائے کی آواز صاف سنی۔ وہ آخری بار ابھرا اور غائب ہو گیا۔ جب لالچ اس جگہ پہنچا جہاں پٹیل میری گولی کا نشانہ بنا تھا تو وہاں مجھے پانی میں تازہ خون کے دھارے نظر آئے۔ خوشی کی ایکسپریس تابو کر دیے والی لہر نے میرے وجود میں کسختی پھیلادی۔ پٹیل روکا میرے ہاتھوں قتل ہونا میری ایک بہت پرانی خواہش کی تکمیل تھی۔ اسے میں دنیا میں اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا۔ اسے علم تھا کہ میرے ہاتھوں میں دن رات دیکھنے والی انتقام کی آتش سوزاں کو پٹیل دکانوں کی سرور کرے گا۔ یہ انتظار بالآخر میرا بنا ہوا۔ میں نے اس کی جیسے ابھی ابھی میں نے جلائے کے ہاتھوں کی طرح کو بھینچا ہے اور قتل کے جرم میں عدالت انصاف سے موت کی سزا پانے والے پٹیل کو کا جسم سمندر میں غائب نہیں ہوا، بھائی گھاٹ کے اندھے کونوں میں بیٹھ گیا ہے۔

اب میں نے اس لالچ کو دیکھا جو شکل سے تین چار لانگ دور تھی۔ یہ کوئی سا فریڈ وار لالچ تھی۔ مجھے فوراً اس وادی کا خیال آیا جو میرے جسم پر تھی۔ یہ وادی ٹھیک پٹیل کی تھی کہ انٹرپل والے ایسی پرانی اور پراپرٹیٹ لالچ پر کیوں ہیں میں نے کسی ناخوشوار صورت حال سے نمٹنے کے لیے خود کو فوٹی اختیار کر لیا۔

میں نے چنے چاکے دوست محمد کو ماری بات سمجھا: "تم اوپر جاؤ استاد، اور کرم سے کہو کہ اپنا رخ بدلے۔ ایک لالچ ادھر آ رہی ہے۔ اس کا راستہ کھٹنے کی کوشش کر کے۔ میں اور گل اسے، فوٹی میں اوپر نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا: "سمجھ رہے ہونا میری بات کو؟"

"سمجھ گیا بابا۔" ابھی تم فکر نہ کھو۔ دو۔ اپنی سب ٹھیک کر لیں گا۔ دوست محمد نے مجھے تسلی دی: "یہ سمندر اپنا شہر ہے۔ اپنا وطن ہے۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے فائر کی آواز سنی ہو۔۔۔ انہیں نے کہا اور دوست محمد کو ادھر جانا دیکھا۔ ہمارا لالچ ابھی

نمک آگے بڑھ رہی تھی پھر اس کا رخ تھوڑا سا بدلا دوسری لائی کا دار بہت قریب سے آئی۔
ادھر کریم بولنے چلا کسی سے کچھ کہا اس کا دوسری لائی پر سے کیا جواب دیا گیا "یہ میں دس سکا لیکن دوست محمد

نے فقہر مارتو مجھے اطمینان ہوا "میں گل کے کرے میں گھس گیا۔ وہ جو نے اور ٹی آتا رہے بڑی بے تکلفی سے نمک پر ہانگ لکے لیٹی ہوئی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ بڑا لڑکے اٹھی۔ اس کے بال ٹھانہ پڑ بھر گئے۔

"لیٹی ہوئی میں نے سر گریٹ بلا کے سائنے والی برتن پر بیٹھے ہوئے کہا "مشری کی کمال ہے؟"
"اپنے اندر میرے لیے ناشتا بنانے لگی تھی تم بہت خوش ہو؟"
"میری زندگی کا ایک اہم دن ہے۔" میں نے کہا "آج میں نے وہ قرض تو چکا دیا ہے جو ایک بیٹے کی حیثیت سے مجھ پر واجب تھا۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں نے کتنی مشکل سے انتقام کی لگ کو دیا تھا خود کو قاتل کی تھاکر میری ذاتی دشمنی کے جذبات میرے اس من سے زیادہ اہم نہیں جس کا مقصد چند غلاموں کو بے نقاب کرنا اور انھیں کفر کا رونا کرک پھینکا ہے۔ لیکن جب یہ فحش میرے سامنے آتا تھا تو میرے ذہن تازہ ہو جاتے تھے۔ میری نظروں میں میرے والد کا چہرہ آ جاتا تھا جو انصاف مانگتا تھا۔ تم کو معلوم ہوگا کہ انھیں کیسے رسوا کر دیے اور قابل حد ملا مت طریقے پر کرتی ہے کسی دوسرے چارگی کا عذاب دے کر مارا گیا تھا اور ماننے والے ہی نمک حرام تھے۔"

"مجھے معلوم ہے یہ گلے کیا۔"
"پاکستان میں میرے مصلحت دالام کی داستان کا حرب اقول بھی شخص تھا۔" میں نے کہا "آج اس کی اپنی داستان نما آہوئی۔"

کاش یہ تماشا شے عبرت میں ان سب کو دکھا سکتا۔ . .
"چلو چلو اور سکندر بھائی! اسے اپنے اعمال کی سزا اس دنیا میں تو مل گئی۔" میں نے کہا "ابھی آخرت کی سزا باقی ہے جو زیادہ سخت ہوگی۔"

مشری بڑبڑاتی اندر آگئی "لو صاحب جی! اچھا ہوا کہ میں نے کچھ زیادہ ناشتا بنالیا۔ صبح سے تین بار تو بنا چکی ہوں۔"
"مگر میں نے تو ایک بار بھی ناشتا نہیں کیا اور نہ گلے۔"

ہم پر کیوں عطا ہو؟ میں نے کہا۔
"اچھا وہ آپ کا جیتا کریم، اس کے پیٹ کا دوزخ تو خدا ہی بھرے۔ ایک بار دونوں کے لیے ناشتا بنانے کے لگئی۔ اس کے لیے اور استاد کے لیے۔ . . وہ سب چٹ کر گیا، پھر

آپ کے لیے اور استاد کے لیے بنایا اس میں بھی شامل ہو گیا بس اب جلدی سے کھا لو ورنہ وہ پھر آجائے گا۔ قسم اللہ کرنا میں جی! ایسے نہیں بننے کا چارون بھی "مشری نے جانے نہ سنے ہوئے زبان کا استعمال جاری رکھا۔

"خادی کے بعد کیا ہوگا مشری؟" میں نے کہا "تم میرے

سے شاٹنگ پکائی ہوگی اور وہ کھاتا رہے گا۔ دراصل اس کے پیٹ میں جن ہے۔ وہ بے جا رہے گا بھی کیا کرے؟"

"پیٹ میں جن ہے؟" مشری نے کہا "میں نے یہ نیازی سکاٹا ہاں، کبھی سال سے ہے۔" میں نے بے نیازی سکاٹا

کو برقرار رکھا۔ بہت جتن کیے، بڑے زبردست مال آئے مگر اسے نکال دئے کہ پھر ایک بہت بڑے جلائی قسم کے کیر برصاحب کے پاس لے گئے اسے۔ انھوں نے کہا کہ جن کیا جن کے باب کو بھی نکال دوں میں۔ ابھی شاو جنتا کو حکم دوں تو وہ اندر لے آئے اسے کان سے پکڑ لائیں مگر یہ سمجھ لو گھر کا میں ہنہ گھر سے جلائی گائیں۔ ابھی تو بوتل میں بند ہے۔ . ."

"بوتل میں۔ . . کون سی بوتل میں؟" مشری کو اس کی کتاب نے جو اس کر دیا تھا۔ اس کے پیٹ میں کوئی بوتل بھی ہے؟
"نہیں ہوئی۔ انھوں نے کریم کو ایک بوتل سے نشہ بردی تھی ہر طرف سے بند جو ہے،" میں نے کہا "اب جن بابر آتو کس پر اتنا ظاہر ہے اس کی بیوی پر؟"

"بیوی پر کیوں صاحب جی؟ مشری کی حالت غیر ہو گئی۔
"جن تو غور غور پر ہی آتے ہیں،" میں نے کہا "اور کریم کے گھر میں بیوی کے سوا کون عورت ہوگی، چنانچہ کریم نے کہا کہ مجھ نے اپنی گزارا کر کے گا جن کے ساتھ دلیہ خاصا بے ضرر سا جن ہے ہاں کھانے کو کچھ دئے تو پھر۔ . . میں نے دونوں کا نون لکوں کے انداز میں چھوا۔"

"پھر کیا ہو تا ہے؟" مشری کا پتہ ہوئے بولی۔
"مجھے سب کچھ ہو سکتا ہے،" میں نے کہا "آخر وہ جن ہے کلچر چاہے، خون پی جانے کریم کا یا دل توڑ دے۔ بس تم خیال کر کریم کو نہیں، جن کو مزے سے کھانے کھلا کے خوش رکھا۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا؟"

مشری کے چلتے ہی گلے میں منہ شروع کر دیا اب تک وہ بڑی مشکل میں تھی اور اسے منہ ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔
"آپ بھی حد کر کے جس سکندر بھائی خواہ مخواہ آئے ہاں گلے نے کہا۔"

"انگریز کہتے ہیں کہ مرد کے دل کا راستہ اس کے پیٹ سے گزرتا ہے۔" میں نے کہا "میں نے مشری کو کامیاب اللہ العالی دنا

ہم رکھا دیا ہے۔ وہ پیٹ کے جن کو قابو میں رکھے گی تو کریم اس کے قابو میں رہے گا۔"

اوپر سے دوست محمد نے مجھے آواز دی "ابھی آ جاؤ کوئی خط نہیں ہے۔"

میں نے اوپر جا کے دیکھا تو وہ لائی کا کانی دروازہ کھلی تھی۔

اور ہم اپنی دوسری لائی کے قریب پہنچ چکے تھے۔
"کون لوگ تھے اس لائی میں۔ ادھر کیوں آئے تھے؟" میں نے کہا۔

"ادھر لین سے ملنے کا واسطے نہیں آیا تھا۔ اپنا راستہ پر جاتا ہوا تھا۔ بولا "اپنا کراچی کا لوگ تھا۔"

"یہ لائی کراچی جا رہی تھی؟ تم پہانتے تھے کسی کو؟"
"ہاں!۔۔۔ سب میرا بھی یہی والا لوگ تھا،" دوست محمد نے

کہا "ادھر کا آدمی ادھر لانا۔ مسلمان لوگ کو ادھر سے پاکستان جانے کا دیرا نہیں ملتا۔ بوہت پریشانی سے ملتا ہے۔ اب کسی کو ایک دم جلنے کو ہے۔ اس کا ماں کر گیا ہے ادھر یا شاید ہی ہادی ہے۔ کسی کو فکری لگ گیا ہے، وہ کیسے کونے گا، سب مجبور لوگ ہیں۔ اُدھا خاندان انڈیا میں، ادھا پاکستان میں؟"

"یہ تو بہت غلط ہو رہا ہے دوست محمد۔"

"مب جگر بولتا ہے سکندر صاحب، ادھر ولایت میں بھی ہوتا ہے۔ سارا دنیا سے لوگ ادھر رہ جاتا ہے؟" دوست محمد نے کہا "امریکا جاتا ہے اور سارا یورپ جاتا ہے کیا پڑتا جاتا ہے؟ میں بڑا جانا۔ انڈیا کا مسلمان لوگ کیا کرے۔ ادھر بوہت ٹنگ ہے۔ ابھی جی کو کو قلعہ ملتا ہے آجائے۔"

ایک بار پھر دونوں لائیوں کے قریب آتے ہی ہم سب لکھ ہوئے۔ دوست محمد کو میں پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جب اس نے اعلان کیا کہ ہم واپس جا رہے ہیں تو کہہ لکھ کچھ اور آگیا۔

"تم یہ کیا بولت استاد۔ . . ہم کیسے واپس جائیں گے؟"

"اسی لائی میں جانے گا جیسے آچھا تھا۔"

"لیکن استاد خیال کرو مشری کا۔ . ."
"وہاں کیا خیال کریں گا؟" دوست محمد نے کہا "ابھی تو خیال کر اس کو کیا بھی ہے جا کر فلم ہسٹوٹ بنانے کا تھا، سالا پڑیا۔ میں نے سب کی نظر بچا کے کریم کو آگے ماری "استاد شیک کر رہا ہے کریم فی الحال تمہارا دایں ہلے جاتا ہی ٹھیک ہے؟"

"ادھر آپ لوگ۔ . . ہاں کریم بڑھ چکا ہے بولا۔"

"ہم آجائیں گے بعد میں " میں نے کہا۔

اس کے بعد ادھا گھنٹا عمل انتقال میں گورا میں نے اور جس نے اپنے تین سوٹ کیں انٹر پول کی لائی پر منتقل کیے۔ کچھ عرصت ایک میں تھے جو میں نے سردار جی کو محض ان کا شک دور کرنے کے لیے کھول کے دکھا دیا۔

سردار جی سخت شش دین میں تھے۔ ابھی نمک ان کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا تھا اور وہ ہمارے ساتھ تھے

تو صرف ایک ہندو احسان مندی کا اظہار کرنے کے لیے نہیں نہیں بروقت مدد کر کے بچایا تھا ورنہ معلوم نہیں ان کا کیا ہوتا جیسے ان کے باقی ساتھی مارنے کے تھے دلیہ ہی وہ جی مارے جاتے۔

ابھی تک مقابلے کا آخری راؤنڈ ہی چل رہا تھا مگر پتہ رو کے مارے جانے کے بعد حملہ آوروں کا وضع کیا ہو گیا تھا۔ ان کا ایک ساتھی زندہ بچا لیا گیا تھا جو لغزش کے لیے محفوظ رہا تھا۔ سردار جی کے پیشرو رانہ فاضل کا تعلق تھا کہ وہ اس واردات کا اطلاع فوراً اپنے مرکز کو دوسرے ساتھیوں کو دیں۔ لیکن عملی صورت حال یہ تھی کہ وہ آسمان سے گر کر گھر میں ایک نمک گئے تھے۔ پہلے ایک خطرناک گرجوں کے گروہ نے انھیں یہ خیال بنالیا تھا اب ہم انھیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر رہے تھے۔ ہم نے ان کی دریاں بین لی تھیں اور ہمارے پاس اٹھنی کا اسلحہ تھا۔ ہم ان کے میگا فون کو ان کے والی ٹاکی کیلئے استعمال کر رہے تھے جیسے ہمارا نام بھی انٹر پول کے گلے میں لکھا جا چکا ہے۔

محسن بنے سردار جی اور ان کے بری ساتھی کے درمیان کسم پ کی گفتگو ہوئی ہو جس میں انھوں نے ایک دوسرے پر اپنے تشویش ظاہر کی ہو لیکن ذریعہ اظہار ان کے درمیان کیا تھا۔

زبان بارسن ترکی و من ترکی نامی اہم سردار جی اپنی مادری اور فادری زبان کے علاوہ انگریزی پر قادر تھے۔ ان کا ساتھی بری میں کبھی کبھہ کتا تھا تو معلوم نہیں سردار جی کیا سمجھتے تھے اور کیا نہیں سمجھتے تھے۔ اگر وہ تھوڑی بہت بری سمجھ گئے تھے تو انھوں نے

یہ بات ظاہر نہیں کی تھی۔ ایک دوسرے کی بات سمجھنے کا سلسلہ تو اس سے پہلے بھی ہو گا جب علی کے سب ارکان ایک ہی لائی پر بدن رات ساتھ رہتے تھے لیکن اصل بات یہ ہے کہ زبان ایک مؤثر ذریعہ ضرور ہے مگر ابلاغ کے لیے انگریز نہیں ہے۔ انسان کی زبان فائز بھی سمجھ جاتے ہیں اور وہ جو کوئی زبان بول ہی نہیں سکتے اور گونگے کھاتے ہیں، وہ بھی دل کی بات جان لیتے ہیں۔

محسن جب دوسرا سوٹ کیس اٹھا کے لایا تو گل اس کے ساتھ تھی۔ پیچھے کریم نے تیسرا سوٹ کیس سر پر اٹھا رکھا تھا اور

138

میں سمجھ گیا۔ وہ علاقہ پاکستان کی سمندری حدود سے زیادہ قریب تھا۔ سردار جی نے کہا: وہ کشمیری ہیں، بادیان تھی اندھ۔
 عواماگرے سمندروں میں نظر نہیں آتی، خیر میں نے جب نزدیک
 باکے پوچھا تو ایک شخص چلتے دکھا کہ ہم ٹھٹ گئے، برادر ہو گئے
 معلوم ہوا کہ وہ ماہر گاہر ہیں، ساحل سے بہت دور نکل آئے تھے
 اور طوفان میں گھر گئے تھے۔ ڈوبنے سے تو گئے لیکن مگر کھانے
 پینے کو کچھ نہیں رہا۔ انھوں نے کھلنے کا ٹوک کر لیا۔ سمندر سے
 بھلی بھلی اور کھالی۔ بھجیرے کی کھلی کھاتے ہیں، پینے کو کچھ
 نہیں تھا۔ اتفاق سے ناریل جیس کوئی چیز ہوتی ہی گوری انھوں
 نے اسے پکڑا اور توڑا تو اندر ناریل جیسا پانی بھی تھا۔ وہ تھوڑا
 تھوڑا سببے پیا۔ شروع میں سببے والے زیادہ پی گئے تھے۔
 باقی کو قطرے کے حساب سے ملا کر اس کے بعد ان کی حالت زیادہ
 بھگوانی ہوئی۔ دوسروں کا ہتھ پڑ گئے تھے، ایک تو مرجھا تھا، باقی دو
 مرنے والے تھے، انھیں فوری طبی امداد کی ضرورت تھی اور غوراک
 کی نہیں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان سب کو لالچا میں منتقل
 کریں، اب لکنا پتا چلے جاے بادشاہ کو کہ نہ کر کر رہا ہے جی
 کر گیا، لوگوں لالچا پر پہنچے ہی مردہ تو کھڑا ہو گیا۔ اس سے

نوں بڑا سیانہ اندھہ ایں " پھر وہ جہانی پر آگئے۔ چل خیز گل کرتے
 بات ایسی ہے۔ " میں نے کہا " مناسب ہوگا کہ آپ اپنے
 راجی کو پوچھ لے لیجھاؤں کہ ہم بمبئی کی طرف ہمارے ہیں مگر ہماری
 منزل اپنی نہیں ہے۔ راستے میں کسی جگہ ہم آپ سے کہیں گے کہ
 ہڈا شکر۔ اب آپ جا سکتے ہیں "۔
 یہ بات بھی سروساجی کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن انھوں نے
 کہا " اچھا سمجھاؤ۔۔۔ جو کرسے تیار کیا اور اپنے بری ساتھی کو
 بیری بات پر لٹری کلاس کی انگلی میں سمجھاؤ۔ اس قسم کی زبان
 لکھا کر دینے والے استعمال کرتے ہیں۔
 انھوں نے کہا " دی گو۔۔۔ بمبئی "۔
 " بمبئی " بری نے حیران ہو کر کہا اور سوال اُس کی آنکھوں
 میں آ کر آیا۔
 سروساجی نے اس کے شائے پر پتھری کی دے کر اسے مطمئن کرنے
 اور پریشان نہ ہونے کو کہا اور واپس چل بیٹھے " میں اُن کے
 کہیں کوئی کام اور دوا نہ مقرر کر کے کی کوشش میں مصروف تھا
 پتھر پتھر سے دوسرے کہیں کو استعمال کیا۔
 مہر اور انداز نہ دیکھ "۔ میں نے پتھنے کے بعد کہا " سب سے

”تو تجزیہ بہتر ہوگا کہ آپ اس صورت حال کا چھٹی طرح سمجھ لیں۔ یائیں نے کہا: ”کیا خیال ہے اگر ہم آپ کے کیسین میں بیٹھ کے بات کریں، اور اور لے کپ آف ٹی“

”مجھے چاہئے ہائیٹا نہیں آتی۔“ سروراجی نے کہا۔

”آپ کو ایک بہتر نیا ہاؤس میڈل کی خدمات حاصل ہیں اس نے جو درجہ یائیں پہن رکھی ہے اسے نظر انداز کر دیں۔ وہ ایک سیلینڈ اور ایک کمال عورت ہے۔“

”کمال تو تم سب ہی جو،“ سروراجی نے کہا۔ انگریزی میں اتنی سنجیدگی سے بات کرتے ہوئے ان کی شخصیت بالکل بدل گئی تھی اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس صورتِ حالات سے ناخوش ہیں۔

سروراجی کا کیسین وہی تھا جس میں کچر دیر پہلے استاد پڈر نے قیدِ حیات سے نجات پانے سے پہلے اسمیری کے آخری لمحات گوارے تھے۔ اس کا سامان منقہ مرگر پر تکلف تھا اس سے ملحق کیسین میں گل نے اپنا مکان بنا لیا تھا اور اس کا طبلہ ابھی تک ہی نیمہ رواؤ نیمہ زمانہ تھا۔ اس نے مروانہ کو بیٹھا مہم پہن رکھی تھی مگر بال بٹھ جانے سے اس کے شانوں تک قراضے ہوئے بال آزاد

باسے میں کچھ نہ پاتا تھا۔
 اپنی لالچ پر پہنچ کے نہیں نے دوست محمد سے کہا "اب دیر
 مت کرو، آج کا فوراً، ایسا نہ ہو سردارجی اگر چاہیں اور ہمیں ان
 کے ساتھ بھی زبردستی کرنی پڑے۔"
 "زبردستی کئی پٹے لگ، دشمن بولا، ابھی دس سی باتیں
 سی۔ وہ آسانی سے ہماری بات کیے مان سکے ہیں۔"
 نہیں نے اور دشمن نے داپس انٹر پول کی لالچ پر چھلانگ ماری
 ہی تھی کہ ہلری لالچ روانہ ہو گئی۔
 "یہ... کیا ہوا، ہمتی لالچ تو جا رہی ہے، سردارجی
 نے کہا تم... کیوں نہیں گئے؟ وہ اب انگریزی میں بات کر
 رہے تھے۔
 "ہم آپ کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں، میں نے کہا، اس
 لالچ میں کھلے خرابی ہو گئی ہے کہ وہ سفر کے قابل نہیں رہی۔ وہ
 کراچی جا لے گا اور میں یہی چاہتا ہوں۔"
 "لیکن، ہم تو ہمیں نہیں جا رہے ہیں، سردارجی نے کہا، ہم
 ایک خاص علاقے میں پھنسل ڈھونڈ رہے ہیں۔"
 "وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اب ہلری بھی مجبور ہے یہاں

”ہم آپس میں بھی رابطہ رکھتے ہیں۔ بہت دیر سے ہم نے نہ کسی کو پیغام دیا ہے، نہ کسی کا پیغام وصول کیا ہے۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ ہمارے ساتھی نقوش میں مبتلا ہو

”ول کی کیا بات کرنے ہو بوا دتا ہو۔۔۔ دل کو لیر لیر
ساتھ ہے مگر یہ جو اوپر کی منزل میں تھوڑی بہت غلط ہے
جو دن کے بارہ بجے ماری جاتی ہے،“ وہ اپنی بات پر سنا

”ہاں، خاص پاکستانی“ نہیں نے کہا۔ پاکستان میں وہ ہرماضی کیسے بھی دشمن ہو گئے۔ اخوان نے پولیس کے ساتھ مل کر پھیل رہی ہرجاسا کی زد پر پورا کچھ دولت کی مدد سے مجھ پر ہت سے مقدمات بنوا دیے۔ ان میں کئی کے جھوٹے ثبوت بھی تھے۔ میں نے قانونی جنگ لڑنے کی بہت کوشش کی مگر

”والہر“ میں نے کہا ”بہت زبردست اور کامیاب
 وکیل تھی قہ، اور میری وجہ سے اُس نے بھی بہت کچھ اٹھائے
 یہ جنگ ابھی جاری ہے اور اس کا ایک سین آپ نے دیکھا: مجھ
 خدا پر بھروسہ ہے میرے مددگار میرے دوست ہیں جیسے یہ
 دونوں میاں بنوئی جو میرے ساتھ ہیں... سواری... میں

لے لکھا تھا کہ نہیں جھوٹ بالکل نہیں بولوں گا۔ یہ میاں جو یہ نہیں ہیں۔

سرور جی منہ پھلا کے بنے۔ عاشق معشوق میں ہوا ہے ہم تو سمجھ گئے تھے جی خیر وہ گورو کرسے کا تو کیا بیوی بھی بن جائیں گے۔

”تھی میری زندگی کی فلمی اسٹوری“ نہیں نے کہا۔ اب مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ رابعہ کو اغوا کرنے والے اسے ایک بحری جہاز میں لے کر گئے ہیں ہم انھی کے تعاقب میں تھے کہ برعکس ہمارے پیچھے لگ گئے۔ یہ ہمارا راستہ روکنا چاہتے تھے معلوم نہیں انھوں نے کیسے ہمارا سراغ لگایا۔ ہم بہت رازداری سے انھیں بدل کے ٹھکے تھے۔ اگر آپ نے ہمیں پہلے دیکھا ہوتا تو ہمارا تھکے ہی مختلف نظر آتا۔ سماجی گیر بنے ہوئے تھے۔ بالکل بالکل کی دردی میں ہیں انھوں نے بھی یہ دردی پن کے ہمیں دھوکا دینا چاہا تھا۔ اب میں کہہ کر رہے ہیں ہم نے تو انھیں پہچان لیا تھا۔ ان کے بے وقوفی کے باعث۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم پہچانے جاتے ہیں یا نہیں۔

اب کس کے سامنے جانے کا خیال ہے۔ اوئے بس شکر کرو کہ بان بچ گئی، گھر واپس جاؤ، سرور جی نے کہا۔

”آپ نے یہ بات ٹھیک بارہ بجے کی ہے اس لیے میں محاف کرتا ہوں“ میں نے کہا۔

سرور جی چوتھے بارہ بج گئے؟

جی... اسی لیے آپ ساری بات بھول گئے؟ میں نے کہا۔ ”والیسی کا اب کیا سوال۔ مجھے رابعہ کو واپس ساتھ لے کر آنا ہے اور یہی جان بچانے کی بات، تو اب تک خدائے بھائی نے آگے بھی وہی بچائے گا اور نہیں بچائے گا تو میری کوشش سے کیا ہوگا۔ رابعہ جس جہاز پر ہے وہ ابھی بھی نہیں پہنچا، میں اسے راستے میں ہی پکڑ لینا چاہتا ہوں۔“

”کیسے پکڑنا ہے؟ حال ڈال کے یا کٹے سے؟“

”آپ مذاق کر لیں۔ یہ میرا کام ہے“ میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ کیسے کرنا ہے آپ سے صرف اتنی مدد کی درخواست ہے کہ مجھے اس جہاز تک پہنچا دیں، جب ہم اس جہاز پر پہنچ جائیں گے تو آپ کا کام ختم۔ آپ والیسی آجائیں اور جہاز کو روانہ چاہیں کریں۔ اگر ہمارا کام ایلے نیکر کام چل جائے تو آجیسا ہے۔ درجہ جہاز میں ہوں سو اس پر آپ کہہ دیں کہ سرور اور منسن کے ساتھ کیا ہوا۔ پھر انھوں نے نیا کیا۔ ہم نے کیسے متاثر کیا، کتنے بندے مارے اور آپ کی کیا مدد کی۔ سب بتا دینے سے ہمیں کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ ہم یہ پہلے تھے کہ ہمارے مبینی پہنچنے کی خبر کسی کو نہ ہو۔ سامنے

مجھ میں سے اگر آپ یہ آخری سچ نکال دیں کہ آپ نے میری ایک پہنچایا، تو اس میں آپ بھی کوئی الزام نہیں آتا۔ یہ سچ جانتے ہیں اور سچ کا فرض برابر ایک جھوٹا سا جھوٹ بول رہے ہیں آپ کہ وہ اپنی لالچ میں بھاگ گئے تھے۔“

”جھوٹا سا جھوٹ، سچا واہ گورو معاف کرے۔“ بڑے جھوٹ بولے ہیں سرور راجندر سنگھ نے، اپنے فائبرس لیے پھر یہ جھوٹ کیوں نہیں بولوں گا میں جو سچ سے زیادہ سچ اس لیے کہ یہ سچی والا جھوٹ ہے۔ یہی والا سچ نہیں۔ آپ جلد بات تو ہر ہے میں نے نہیں نے کہا۔ ”اچھی طرح لیں اور اپنے ساتھی سے بھی مشورہ کر لیں۔ اگر وہ آپ کے فیصلے سے متفق نہ ہوا۔“ مغل چائے لے کر آئی تو اس کے سر پر محن بھی آ گیا۔

”اونٹیں مار۔ وہ بڑا دبا بندہ ہے تم نے دیکھا نہیں؟ کر کے سب دیکھتا رہتا ہے اور اپنے کام سے کام کر رکھتا ہے۔ اسے سمجھا دوں گا۔ انھوں مجھے صوف ہے کہ جن کی امانت تم پر تک نہیں پہنچی۔ جو منر کے ان کے پیارے انھیں دیکھ کر کے خیر دیکھنے سے ڈکھڑکھاتا ہے۔ اب میرے کر لیں گے۔“ میں آپ کا احسان بھی نہیں بھولوں گا۔ رابعہ کو پکڑو گا آپ کے بارے میں“ میں نے کہا۔ مغل نیچے بیٹھ کے کھائے بنانے لگی۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اپنے راجھا صاحب! ایک بار بتاؤ مجھے۔ اگر تمہیں اپنی میرز ملی اور دشمنوں نے تمہاری کھینچ تو تمہاری والیسی کیسے ہوگی؟“

”والیسی پھر کہاں ہوگی سرور جی؟ میں نے کہا۔“

”یہ اطلاع غلط بھی تو ہو سکتی ہے کہ تمہاری میرا اس جہاز پر ہے۔“

”اطلاع سو فی صد درست ہے“ میں نے کہا۔ ”اور غلط ہوتی تب بھی میں جانتا۔“

سرور جی نے ایک آہ بھری۔ ”بڑا مشکل کام ہے عشق کر بھی اور پھر آج کل کے ذلت میں... تو یہ تو یہ؟“

”آپ نے کسی سے عشق کیا ہے یا کبھی نہیں کیا۔“

”ہاں، جوانی میں ڈیڑھ عشق کیا تھا ایک آدھا... ایک پورا... اس کے بعد اپنا بچاؤ چاہی گیا۔“

اب تو خیر سے سال ہو گیا شادی کو۔ ہر چھ ماہ میں ایک بچہ سکا اوسط ہے۔ مجھے بہت ہنسی آئی، ہر چھ ماہ کے بعد کیسے کیا یہ بھی دینے اور غریب کی نصیب ہے۔ انھیں دو ہو گئے تو اوسط کیا کیا حساب کرے گا۔“

”اور آدھے عشق کا قصہ کیا ہے؟ محن بولا۔“

”... پھلا تھا۔... سچا مگر... اس میں بھی سرور راجندر سنگھ کا ہی باج سچا پہلے تو ایک بڑا ظالم رقیب آ گیا۔ اس نے میں جہاز سے بھایا اور دھکی دھکی کر مہر بنادوں گا۔ چرائے کو پتلا کر تو اس نے سرخا بنادیا اور ڈھٹے سے بھاگ کر غریب ہل کر ٹوڑی۔ عشق بھی کیوں کس سے نہیں نے سچے عاشق کی طرح

”کہا کہ عشق نہ چھوڑے ذات، وہ بیٹنگ ہے تو کیا۔ دل جس پر آتا ہے وہی عشق تھا ناجی، ایسے کو نہ ختم کر سکتا تھا۔ ایک دن ہم ہزارت کے گھوڑے پر سوار تھے گھوڑا بے قابو ہو گیا۔ پھر رات بھر بولیں نے بھلیا۔ اور اس کے سامنے ناک سے زمین پر لکیریں نکالیں پڑیں۔“

میں نے اور منسن نے تو ہنسی پر کچھ تالیاں پالیا مگر گل کو ہنسی آتی تھی تو وہ کہ نہیں کرتی تھی۔

”یہ تو پورا عشق ہو اور راجی، آپ آدھا کتنے ہیں؟“

”آدھا ہی تھا یار۔“ ذن دے ٹھیک تھی نا۔ وہ بھی کرتی عشق تو پھر میں بھلا بیٹھا ہوتا تھا اسے سامنے، ہر تکرر کی سوک بھڑا دوسرے رہا ہوتا، سرور جی نے ہنس کے کہا۔ ”اچھا ہی ہوا نا کہ آدھا رہا۔“ انھوں نے جیب میں سے ایک پرس نکالا اور اس میں لگی ہوئی تصویر کو دیدار عام کے لیے پیش کیا۔ ”یہ نا آفت؟“

مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ ایک بھڑی موٹی سی لڑکی تھی تو لڑکے سے لڑی بھڑی کھڑی ہوئی تھی تاہم سرور جی کے کہنے کے مطابق جس پر دل آجاتا ہے وہی لیلی۔ اور لیلی کے لیے تو بہت پہلے کہا گیا ہے کہ اسے محبوب کی آنکھ سے دیکھو۔ کچھ تاخیر ہم سب نے اتفاق رائے سے اس کو آفت قرار دیا۔ سرور جی کو جیوری کے فیصلے سے بے حوصلی ہوئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جو گل نے ایجاد کیا تھا اور منسن کے خیال میں اس خوراک سے ہر حال بہتر تھا جو ہم کتاہ گاروں کو ہڈیوں میں کھانے کو ملے گی میں سو گیا مگر اور منسن کے تعلقات بھی کچھ خراب ہو گئے تھے۔ مغل ایک کہیں میں بند ہو گیا اور منسن نے ہنس کے لیے شلالا اسے واٹر لیس آبریش کی اور باس کی لاشوں کو کھانے لگا۔ جو شخص اندر بندھا ہوا تھا اسے بھی مندر

کے سپرد کیا۔ پھر وہ سرور جی کے ساتھ واحد زندہ قیدی سے قیدی کرنا رہا۔

اپنی بد قسمتی کے باعث زندہ گرفتار ہونے والا بھی اس سے زیادہ کچھ نہ بنا سکا جو مجھے واٹر لیس آبریش شاہ دین نے بتایا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ شیخ پورہ کا رہنے والا تھا۔ اسے مجھے ایس بی سرانجے کے پیڑرو کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ وہ شیخ پورہ کا ہسٹری شٹر تھا اور پولیس نے اسے پیڑرو کے ساتھ جیسے وقت وہی لکھا تھا جو شاہ دین سے نارووال کے تھا۔ دارلک شیر نے کہا تھا۔ وہ پیڑرو کے بارے میں بھی کچھ بتائیں جانتا تھا اس نے صرف ایک نئی بات بتائی کہ باس کے نام سے سفر کرنے والا کسی چوہدی دلاور کا ڈراڈ پور تھا اور وہی باقی سب لوگوں کو ایک کار میں کراچی تک لایا تھا۔

جیب میں سوکرا تھا تو شام ۷ بجے تک تھی اور سورج مغرب میں بہت نیچے آ گیا تھا۔ لالچ تیزی سے آگے بڑھتی جاتی تھی لیکن چاروں طرف جہاں تک نگاہ جاتی تھی مندر، ایک دیوار تھوڑی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ زمین اور آسمان کے درمیان صرف سمندر کی گونج تھی لالچ کے انجن کی آواز۔ آفت کے ایک کٹا سے سے دو مسرے کنارے تک ایک خط تھا جس میں زندگی کے آثار نہ خود تھے کہیں کوئی پرندہ تھا نہ کوئی پروایا درخت۔ ایک بولی جہاز اوپر سے گزرا تو اپنے جیسے زندہ انسانوں کا تصور ذرا سی دیر کے لیے قائم ہوا، جہاز آدھیل ہوا تو تنہائی کا جو وہ پھر مسلط ہو گیا۔

منسن نے مجھے بتایا کہ اس نے تفتیش سے کیا مفید معلومات حاصل کی ہیں۔ پھر وہ سونے چلا گیا۔ کو شتر رات میں ہم بند پوری نہ کر کے تھے اور کتے والی رات کے بارے میں یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ خود سرور جی بھی سونے بڑے تھے صرف وہ رہی تھا جو ایک پراسرار قسم کی شخصیت رکھتا تھا۔ فائبرش اور بظاہر تمام معلومات سے بے تعلق نظر آنے والا اور اپنی ذات کے خول میں بند رہنے والا۔ لیکن ہر وقت مستعد اور ہوشیار۔ کھلی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھتا تھا مگر کوئی اسے دیکھ نہ تو وہ انجان بن جاتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ مسلسل ایک شخص کا دینے والے اور ویزا کارکن کام میں مصروف ہے مگر ابھی تک

منسن کا شکار نظر نہیں آتا۔

میں نے اس سے دوستانہ اسرار قائم کرنے کی کوشش کی اور کچھ دیر اس سے اشاروں کی زبان میں گفتگو کرنا بدلا میں نے لالچ چلانے کی خواہش کا اظہار کیا اور اس نے مسکراتے ہوئے مجھے اس کا موقع دیا۔ یہ میرے لیے ایک مشکل کام ثابت ہوا۔ اگر وہ مسلسل نگارن نہ کرتا رہتا تو میں مگر بڑا فرق کر دیتا۔ پھر میں نے

145

اُسے پوچھا "کی؟" اور اُس نے سکرا کے اقرار میں سر ہلایا۔
چائے کی طلب مجھے بھی تھی چنانچہ میں نے گل کے کین
میں جھانک کے کہا "بھئی کوئی اللہ کا بندہ جاگ رہا ہے یہاں؟"
گل نے انھیں کھوسے بغیر کہا "یہاں کوئی اللہ کا بندہ
نہیں ایک بندی ہے جو سو رہی ہے۔"

اس بندی سے اللہ کے نام پر ایک پیالی چائے کا
سوال ہے۔
"جل جائے گی انعام کیا ملے گا؟ وہ اٹھ بیٹھی۔

انعام... میں تم کو غروب آفتاب کا بے حد خوبصورت
منظر بالکل مفت دکھاؤں گا چائے لے کر عرش پر آ جانا۔
میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑی اور میں نے عرشے کا رخ کیا۔ میں گریٹ سنگا
کے ٹنڈار اور بہت سے ایسے سوالات پر غور کرتا جا جواب میرے
ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ ایک سوال یہ تھا کہ سلسل کی گھنٹے کا یہ
سفر ایک کس سمت میں ہوا ہے؟ ہم اس بات کا یقین کیسے کر سکتے
ہیں کہ ہمارا اور ایس الیس کرنتی تھوڑا لگ بھگ ہی راستہ ہے اور ہمارے
درمیان فاصلہ کتنا کم ہوا ہے؟ ہمارے کا معمولی سا فرق بڑھتے
بڑھتے سیکڑوں میل کا فرق بن جاتا ہے۔ ہم نے سروراجی سے
مبینی والے راستے پر چل کے ایس الیس کرنتی تھوڑا لگ بھگ پہنچنے
کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کیا لاٹھی اسی راستے پر جاری تھی اور کیا پانی
پر نظر آنے والا یہ راستہ ایک ہی تھا؟ میں جو کچھ معلومات رکھتا
تھا اس کے مطابق کبھی پانی ہوئی شڑوں کی طرح خفائیں ہوا
جہازوں کے لیے راستے متعین ہیں اور سمندر میں بکری جہازوں کے
لیے اگر یہ بات درست تھی تو سمجھ کر تشویش ہے جانتی مگر درحقیقت
فاصلے کے بارے میں بے یقینی کا اضطراب اپنی جگہ تھا۔ ہم اس
بکری جہاز کے قریب بھی ہو سکتے تھے لہذا اس سے بہت دور
بھی۔ میں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس بکری جہاز نے کتنی رفتار سے سفر
کیا تھا اور لاٹھی کی نیزہ رفتاری کے باعث ہم نے وقت کے
فاصلے کو کم کیا تو ہم اس بکری جہاز تک آج رات پہنچنے میں کامیاب
ہوں گے یا نہیں؟

دوسرے زیادہ پریشان کن سوال کا تعلق ان واقعات سے
تھا جو ہماری لاٹھی پر حملے اور بیڑوں کی ہلاکت کے دوران میں
پیش آئے تھے۔ ہم نے سفر کا اہتمام انتہائی رازداری سے کیا تھا
مگر یہ ہماری خوش فہمی تھی کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔

چوہدری دلاور رائے اپنی سب سے معلوم تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ
رہے تھے اور نہ جانے کب سے دیکھ رہے تھے۔ چھپ چھپ
ایس الیس کرنتی تھوڑا لگ بھگ کا تعاقب شروع کیا تو انھوں نے اپنے

آویں ہمارے تعاقب میں رواد کر دیے۔ انھوں نے بھی اس
لیے لمبی چالنگ کی تھی۔ سوال یہ تھا کہ وہ اتنا عرصہ دور دور
ہماری تیاری کو کیسے دیکھتے رہے اور کیوں دیکھتے رہے؟
ان کو روانگی کے وقت کا علم کیسے ہوا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ان
پہلے سے کچھ معلوم نہ ہو جس کے بارے میں رواد ہوتے ہی کسی نے ان
مغلط کر دیا ہو کہ میں اور سکندر کس لاٹھی پر کیسا جھینس رہا
نکلے میں۔ یہ اطلاع انھیں کس نے فراہم کی؟ ہشتی، گریٹ ہونڈ
دوست محمد کیا ان تینوں میں سے کوئی...؟ نہیں... ہونڈ
اور لیدر از قیاس ہے کہ ہم میں سے کسی نے خبری کر کے غار
ہونے کا ثبوت دیا ہو۔ ہمارے علاوہ کون ہوسکتا ہے؟
جب گل چائے لے کر آئی تو میں ریلنگ پر جھکی ہوا
میں لاٹھی کے چلنے سے اٹھنے والی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔

کیاں ہے میرا انعام؟ گل مجھے جانے کا پتہ تھا کہ ہونڈ
میں نے تارک بھٹے کو دیکھا... اسے... سوچا
تو غروب ہو گیا۔ خیر طوع و خائب کا منظر کچھ لینا۔ فرق صرف سمت کا
ہو گا۔ منظر بالکل ایک سا ہوتا ہے؟

وہ چائے کا گلاسے کو قرب ہی ایک بیڑ پر بیٹھ گیا
بھائی، یہ بتائیے کہ کیا ایسا یقین توں میں؟
میں نے کہا "کھانا... جب تم پکاؤ گی عزیزہ..."

بتائیں گے؟
"کیوں؟ دن میں کیا کھانا تھا؟ وہ جھجھکا کر بولی۔
وہ... اچھا وہ کھانا تھا پھر تو بھئی سیمان اللہ اللہ
ونیزہ... کیا بات ہے؟ میں نے کہا۔
وہ اداس ہو گئی۔ مجھے بکا نا آتا نہیں۔ آج کیسے یہ کا تو
میں سکھاتی ہیں یا لڑکیاں گھروں میں کیسیتی ہیں میرا دھڑکی کرنا
اور نہ مان تھی۔ میں نے جو کچھ کیا تھا..."

"ارے یا گل... میں تو مذاق کر رہا تھا کیا مجھے غصہ
میں نے کہا۔ لیکن تم میں کیسیتی کی اور خود کو بدل لینے کی زبان
صلاحیت ہے صرف ملاجیت ہی نہیں ہے۔ صحت بھی ہے۔
پورا یقین ہے کہ جب تم امور خانہ داری بخشنی کی تو سب
کردو گی، راہ کو بھی اور... ناز کو بھی؟ میرے منہ سے

نام نکلنے والا تھا۔ بروقت میری زبان پر ناز کا نام آ گیا
"امور خانہ داری؟" وہ غلامی دیکھتے ہوئے بولی۔
مملکت کا ہے یہ؟ دیکھتے سے۔ کچھ عرصے پہلے کوئی ایسی بات
سامنے کرتا ہی نہیں تھا۔ میرا گھر کہاں ہوگا؟ میں نے بھی
سوچا تھا اور میں تو تو تک نہیں کر سکتی تھی کہ گھر میں
شام تک نہیں وہ سب کروں گی جو عورت اپنے گھر میں کرتی

میں سمجھ گیا کہ اب اس کے جذبات کا دھارا کس سمت
چلنے لگا ہے۔ یہ خواب دیکھنے کا اور سننے کا وقت نہیں تھا۔
چنانچہ میں نے کہا "تم نے اس بڑی کو چائے دی یا
... نہیں؟ تم نے کب کہا تھا؟"
میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "میں اس سے کہہ چکا تھا خیر
بے دے دو۔"

گل کے جاتے ہی میں نے اس قیدی کو تلاش کیا۔ وہ مجھے
بغیر میں بندلا۔ محسن نے اُس سے خاصی سخت گفتگو کی تھی۔
اس کے آثار تشدد کے نشانات کی صورت میں عیاں تھے۔ مجھے
دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں دہشت آتی۔ وہ ریٹوں سے
پونڈھا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ الگ الگ اوپر اٹھے
ہوتے تھے اور وہ دلوں سے لگ کے سیدھا کھڑا ہٹتا ہوا پر
خار ریٹوں کے دوسرے ختمے کو چھتے کے قریب لگ سے

خٹک کر دیا گیا تھا۔ وہ اچھلتا تو پھر زمین پر گر جاتا تھا۔ اس کے
مارے جو کچھ جھکا گئے۔ نہ وہ دائیں بائیں ہوسکتا تھا اور نہ جھک
سکتا تھا۔ جیسے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
وہ سخت اذیت میں تھا اور میں اعزازہ کر سکتا تھا کہ اس

بقوت برداشت بہت جلد جواب دینے والی ہے۔
میں نے اس کے قریب جا کے کہا "میں تم کو آزاد کر سکتا
ہوں اگر تم میرے چند سوالات کا جواب دے سکو؟"

"میں... میں سب بتا چکا ہوں؟" وہ کہنے لگا۔
"نہیں۔ ایک بات تم سے کسی نے نہیں پوچھی؟ میں نے
کہا تم نے بتایا ہے کہ جو باس تھا وہ چوہدری دلاور کا ڈرائیور تھا۔
نہیں؟ چوہدری دلاور کا نام کہاں سے سنا؟"

"اسی... کی زبان سے..."
"تھار اسٹاپ سے خود اس نے تمھیں یہ بات بتائی؟ میں
نے کہا اور منتی ہوئی گریٹ اُس کی گردن پر لگادی۔ جھوٹ مت
بولو جو لوگ تم کو اتنی دور سے، الگ الگ مقامات سے لائے
تھے وہ بے وقوف نہیں تھے۔ اگر رازداری مقصود ہوتی تو وہ
بجائے بھانٹ کے لوگ جمع نہ کرتے۔ ان کے اپنے باس بہت
ملکے غلام تھے؟"

وہ ہر طرح بڑبڑاتا تھا لیکن اپنی جگہ جھجھک کے رہ گیا تھا۔
"ایک بار پھر سوچو؟" میں نے کہا۔

"وہ... وہ کراچی میں ملے تھے۔ ہم سب
فرار آئے تھے اور کار چوہدری دلاور کی تھی؟" وہ بولا۔
"نہیں؟ تم کیسے معلوم ہو؟"

"مجھے موقع مل گیا تھا۔ راستے میں ایک جگہ... ڈرائیور

اُس کے گریٹ لینے لگا تھا۔ میں نے غور کیا مرنٹ کھوں کے
دیکھا... اس میں کائنات تھے گاڑی کے مالک کا نام
چوہدری دلاور لکھا ہوا تھا۔"

میں نے سر ہلایا۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ اب آگے بولو۔
چوہدری دلاور صاحب... اور چیف... دونوں
برائے جواز سے کراچی پہنچے تھے؟ اس نے کہا "وہ ہمیں یہاں لے
گئے تو ڈرائیور ان کو چوہدری صاحب کہہ رہا تھا۔"

یہ چیف کون تھا؟ اس کا نام انھیں معلوم ہے؟
اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کالا آدمی تھا موٹے...
گھونگر لالے بالوں والا۔ اُس کے کانوں میں مندریاں تھیں..."

اس نے سب کو ادا کی گئی تھی۔ ڈرائیور کے سوا۔ باس نے اس سے
کہا تھا کہ انھیں خود چوہدری صاحب انعام دیں گے۔ جب تم واپس
آؤ گے وہ کہنے لگا کہ... کیا مجھے بھی جانا ہے... میں تو
ڈرائیور ہوں ان کا۔ انھوں نے تو مجھ سے کہہ نہیں کہا تھا۔ باس نے
کہا کہ جی ہاں میں کہہ رہا ہوں۔ تم ساتھ جاؤ گے ان کے در...
انھیں کون لے جانے گا۔ اس وقت تک باس نے نہیں بتایا تھا
... کہ وہ خود بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔ وہ ہمیں رات کو کشتی پر
سوار ہونے کے بعد نظر آیا۔ جب کشتی روانہ ہو چکی تھی؟

"اچھا، کشتی کس کی تھی؟"
"مجھے نہیں معلوم..."
"تم لوگ کس وقت چلے گئے؟ میں نے کہا۔

"رات آٹھ بجے۔ اس وقت کشتی کوئی اور جلا رہا تھا۔
کوئی غریب سماجی گریہ تھا۔ اس کی بڑی تھی ایک ایک بیٹی... ان
سے چیف نے کہا تھا کہ ہم سمندر کی سیر کریں گے۔ رات دس بجے
تک کے پانچ سو روپے دیں گے۔ ایک گھنٹا جانے کا، ایک گھنٹا
واپس آنے کا... لیکن ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں گیا۔"

"سب کو مار دیا تم نے؟"
"میں نے نہیں... ان دونوں نے... جو باس اور
چیف کہلاتے تھے۔ باس نے پہلے بڑھے کو دھکا دیا۔ وہ سمندر میں
گر گیا تو اس کی بوی چلنے لگی۔ اسے چیف نے پانی میں پھینک
دیا... یہ رات تو ساڑھے نو بجے کی بات ہے... اس کے بعد
انھوں نے لڑکی کو بچڑ لیا... وہ بہت جیتی جاتی..."

"اور تم بے غیرت... دیکھتے رہے؟" میں نے اُس کے
سر پر ہاتھ مارا اس کا سر ٹپک گیا۔

"ایک نے ہمت کی تھی... لڑکی نے اُسے مدد کے لیے
بلا یا تھا... باس نے اُسے مٹ کر دیا... اور ہم سے
کہا کہ یہ تم سب کے لیے سبق ہے۔" وہ بڑی مشکل سے سر اٹھا
147

کے بولا۔ اس کے بعد کسی نے... دخل نہیں دیا۔ انھوں نے... حرامیوں نے... لڑکی کو زبردستی شراب ملائی... پھر اس کے ساتھ زبردستی... انھوں نے ہم سے نہیں کہا... مگر کسی نے بھی ہمت نہیں کی... معلوم نہیں وہ بے ہوش تھی... یا سرکی تھی... جب انھوں نے اس کو بھی بندر میں ڈال دیا... میرا خون بہہ آہستہ آہستہ کھولنے لگا تھا مگر وہ جن کو میرے موت سے سنت ترمزادے سکتا تھا اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے اس دنیا میں ان کی بربریت اور شیطانی ہوس کا شکار ہونے والی وہ آخری لڑکی تھی جسے میں نہیں جانتا تھا مگر اس کے آخری وقت کے سالے کرب کو محسوس کر سکتا تھا۔ جب بھوکے بچے بھیلوں نے اس کی نظروں کے سامنے پہلے باپ کو پھر اس کی ماں کو مار ڈالا تھا اور اب بھی مٹی کے زخم سے بے بہرہ ہو کر ہی رہا تھا کہ اس نے موت کی آرزو کی ہوگی اس کی یہ آرزو پوری تو ہوئی مگر کتنی بار میرے بعد...

اب... خدا کے لیے مجھے کھول دو... چند منٹ کے لیے بیٹھنے دو... وہ چلا۔
"کاش میرے لیے تم کو اس طرح سے زیادہ بے آبرو کر کے مارنا ممکن ہوتا، میں نے کہا۔" مجھے تو افسوس ہے کہ باقی سب اتنی آسان موت کیوں مر گئے۔"

وہ چلا کر آگیا اور میں باہر نکل آیا۔ دروازے کے پاس گل اتھمائی وحشت زدہ گھسی گھسی شاید اس نے مجھ سے مدد مانگ لی تھی جو میں نے نہ سنا تھا۔ کچھ کے بغیر وہ میرے ساتھ عرصے پر آگئی۔ میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ اس کیفیت کے نتیجے میں مجھے ایک ایسی بات معلوم ہو گئی تھی جس نے میرے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ میرے کان ایک میور لڑکی کی چیخوں سے متاثر رہے تھے جب کہ زور اور بے بس تھی اور اس کے مقابل ہوس کے شکاری تھے۔ بے اختیار رنگے انسانیت اور درد نہ صفت۔

"سکندر بھائی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" گل نے کہا۔
میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھے کہ اسے قریب کر لیں۔ "تم تو کتنی تھیں کہ تمھیں کسی سے ڈرنے لگتا ہے؟"
ایسا میں نے... کبھی نہیں سنا... کبھی نہیں دیکھا... بہت ڈال لڑتے تھے... ہم تو ڈاکو تھے سکندر بھائی! اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "کوئی ہماری جان لینے کی نیت سے ملے نہ آتا تھا تو مارا بھی جاتا تھا... مگر ہم نے کسی گھر سے کسی کی بچی نہیں اٹھائی تھی کسی گاؤں کی عزت نہیں ٹوٹی تھی۔ ڈاکو تو ڈاکو ہوتے ہیں کون روک سکتا ہے ان کو... لیکن

ہم لوگوں نے یہ کبھی نہیں کیا تھا جو ان شیطانیوں نے کیا... تم کیوں دیتی ہو؟ اس طرح کے لیے جسے تم نے دیکھا... تم نہیں جانتی؟"

"وہ لڑکی میں بھی تو ہو سکتی تھی سکندر بھائی... خطرات لوگوں میں گھری ہوئی تھیں... میرا لکیر... کیا بگاڑ لیتا ان کا، اگر ان پر بھی شیطان سوار ہوجا... ناخالی تصور تھا میرے لیے... نامکن تھا ان کے لیے اس کا بدن لڑنے لگا تھا۔"

"میری وجہ ہے گل... کہ میں ان کو سخت ترین قرار کے ساتھ مارنا چاہتا ہوں۔ ان کے مقابلے میں ڈاکو تو واقعی بڑی آوی نظر آتے ہیں..."

سردار جی جمائیاں لیتے ہوئے نمودار ہوئے تو گل نے آنسو صاف کر لیے۔
"تیلے بے رات ہو گئی ہیں تو سمجھا تھا اپنے میزبان ہیں۔" انھوں نے دانت نکالے۔

"کون میزبان! گل نے معصیت سے سوال کیا۔
"لوچی، کوڑی بھی کسی بھولی ہے۔ اور جی سونہی دامیلا یہ ہو گئے میرا بھائی! سردار جی نے میری طرف اشارہ کیا اور کون ہو سکتا ہے سونہی میزبان..."

گل سوال کر کے پچھتائی "میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں؟" اس نے جانے ہوئے کہا اور سردار جی مزید کر بنے۔ وہ کچھ ترنگ میں تھے۔
"میں نے کہا۔" سردار جی! آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ کب وقت کہاں ہیں؟"

"ہاں، ہم لاٹھی میں ہیں اور لاٹھی سمندر میں ہے۔ مذاق کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں یہ جانتا ہوں کہ ہم نے کتنا حاصل کر لیا ہے اور ہم اس جہاز کے کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟"

"بس جہاز نظر آجائے، پھر نہیں جادوں گا کہ کب کتنی پہنچ سکتے ہیں۔" سردار جی نے کہا اور پھر ایک دم سیر ہو گئے۔ "اوتے بے وقوف، مجھے کیا معلوم جہاز اتنے جلد میں کہاں ہوگا؟"

"دفع کریں۔ میں آپ کو ایک نقشہ بنا دوں گی۔" کہا۔ یادداشت کی مدد سے۔

"کیسا نقشہ؟"
"ایک نقشہ تھا۔ افسوس کہ مجھے لینا یاد نہیں رہا۔" بڑھے کے پاس رہ گیا جو ہماری لاٹھی کے کیا ہے۔

"بس وہی اس کو سمجھتا تھا مگر میں نے وہ اتنی بار دیکھا تھا کہ میرے ذہن میں ہے۔"
"اچھا، اندازے کے نقشہ بناؤ۔" سردار جی نے کہا۔ میں تم کو ہاتھ دینا ہوں۔"

میں ذہن پر زور دیتے ہوئے اس نقشے کو تصور کی دے پھر کاغذ پر منتقل کرنے میں مصروف ہو گیا کافی سوچ بچار کے بعد پانچویں نے اپنے اطمینان کی حرکت نقشے کی تمام ضروری تفصیلات درج کر دیں۔ سردار جی نے چائے نوش کرنے کے بعد کہا: "وہ وہ! اور سچے نقشے بنائے گئے۔"

"اس میں ایک دو چیزیں کم ہیں... لیکن کوئی حرج نہیں... میں خالی بیکر مکمل کر سکتا ہوں... انھوں نے کہا۔ اور اس نقشے کے مطابق... مگر ایک بات تو میں نے پوچھی۔ یہی نہیں وہ بڑی جہاز کتنا بڑا ہے۔ کتنے تین کا ہوگا؟"

"وہ... میں نے تو لاتو نہیں... مگر خاصا بڑا ہے۔" میں نے اندازے کی بنیاد پر جہاز کا طول و عرض بیان کیا۔
"ہوں۔" سردار جی نے کہا۔ "میں بھی گیا۔ اس کی رفتار زیادہ نہیں ہو سکتی میں ذرا حساب لگاؤں۔"

سردار جی نے نقشے کو سمجھا لیا تھا اور ان تمام عوامل کو بھی جو سمندر میں غریب وسیلہ نظر ثابت ہو سکتے تھے اور جو ہم جیسے ناچار لاگوں کی نگاہ میں آتی نہیں سکتے تھے کسی بھی مقدمے کے حصول کے لیے محض ارادہ کافی نہیں ہوتا کامیابی کے لیے سازگار حالات میرے لیے کیڑے تھے۔ تاہم نیت میں کوٹ نہ ہو تو اسباب اور وسائل قدرت فراہم کرتی ہے۔

سردار جی کے لیے ہم اور ہمارے لیے سردار جی فرشتہ غیبی ثابت ہوئے تھے۔ عام حالات میں وہ کسی بھی واردات کے بعد وقت ضائع کیے بغیر اس کی رپورٹ کرتے۔ ان کے بہت سے ساتھی مارے گئے تھے اور حملہ آوروں نے انھیں اپنے متنازعہ کے لیے استعمال کیا تھا۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ بہت سنگین ناظم تھا لیکن ایک مشکل وقت میں مدد کرنے والوں نے ان کو دوسری مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک طرف انھیں اسانندی کا جذبہ تھا تو دوسری طرف مجبوری بھی تھی اور معلوم نہیں انھوں نے میری بات سن کے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم معلوم ہیں اور شریف لوگ ہیں۔ چنانچہ جہاز کے مستحق ہیں یا کوئی اور بات تھی۔ بہر حال اب وہ ہماری مدد کر رہے تھے اور ہمارے درمیان کسی قسم کی رنجش یا شدید کی نہیں تھی۔

"کچھ لو سردار جی؟" میں نے کہا۔ "کچھ بات بنی؟"
"ہاں، بات کیے نہیں بنی گی۔" سردار جی نے کہا۔ "اپنی اتنی

عمر سمندر میں گزر گئی تھک مارتے۔"

"میں عمر گزر گئی ہے میں نے کہا۔"

"اوتے باز تو زندگی میں بڑے مشکل سوال کرتا ہے بھائی۔ حساب لگا کے بتاتا ہوں۔" وہ بولے۔ "یہ ہو گئے خیرے... چار سال... اور... ہاں... تیرہ بیٹھے... ستے آتیس دن۔" مجھے ہنسی آئی۔ "پانچ سال دو بیٹھے بھی تو کر سکتے ہیں آپ؟" "اچھا... ہاں ہاں... وہ جہیز کڑھ کر ملے گئے۔" "خیر تو مطلب یہ تھا کہ اگر آپ ہم کام بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔" سران لگاتے ہیں کہ کون کدھر ہے، کیا کر رہا ہے اور کون کدھر ہے تو پھر ایک سالم جہاز کا سران لگانا مشکل ہے۔ بالکل ناممکن اندازہ کر لیا ہے میں نے۔"

"تو تھکتا ہی اچھی خبر ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا نہیں ہے ہم کب تک اس جہاز کو پکڑا لیں گے؟"

"میرے اندازے کے مطابق... باہر سے جو وہ ہفتے لگ جائیں گے۔"

یعنی آج رات کوئی امکان نہیں۔ میں نے اپنی سے کہا۔

"امکان کیوں نہیں؟" انھوں نے ایک ہلکی سے کراہ۔
"میں کسی رفتار سے، ہلکی، سیدھے تیر کی طرف گئے۔" (بھئی)... تو آگے گئے... انھوں نے بھکی لی۔ "اوتے جہاز میں کوکے؟"

"کیا ہو سردار جی! کسے کہہ رہے ہیں؟" میں نے حیرانی سے ادھر ادھر دیکھا۔

"اوپر... تیری بھر جاتی... ہمیشہ بڑے غلط موقع پر یاد۔"

"بھکی کرتی ہے؟"

"اس لیے بھکی لگ گئی آپ کو؟" میں نے کہا۔
اور کیا یہی بات ہے کہ اس وقت وہ (بھکی)... آج بھڑا وار ہے... ہاں... بھڑا وار کو وہ گڑا لے گئے تھے یا بدل پکاتی ہے... بھکی وہ، کیا سواد دلے ہوئے ہیں۔ بندہ زدہ بھول جاتا ہے... اس نے کہا جوگا، ہائے جند۔"

"ہائے جند! جند! ہائے زندگی... میں نے کہا۔"

"جند جیستی ہے نا وہ۔" راجندر نام ہے میرا۔" سردار جی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "ہاں... اب ٹھیک ہے۔ دیکھا بھکی لگ گئی ہے۔ اب وہ نیچے بیٹول کے کھانے میں لگ گئی ہے... کچھ پتا ہے یا رکھ رات کو کھانے میں کیا لے گا؟" انھوں نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"رات کو... کیا خیال ہے گڑا لے بیٹھے یا بدل؟"

نے کہا۔

”اوسے جتے جتے“ انھوں نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ دل خوش کیا اس وقت قوتے۔“

گل ہم سے غاصے فاصلے پر ایک کھڑی سمندر کی رات کو دیکھ رہی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ ہمارے دوپہر کے رویتے پر ابھی تک برسم ہے۔ من بھی اس کے ساتھ نہیں جتا۔

”گل... ہلے گل! میں نے چلا کے کہا“ ادھر آؤ۔“

اُس نے سرگھما کے دیکھا اور آہستہ آہستہ قریب آئی۔

”کیا ہے؟“

”سرور! راجندر سنگھ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لو سرور! گل! ایسی نہیں ہے کہ کسی بات کا بڑا مانے۔ اور محبت سے تو پتھر بھی موزا ہے۔“

”وہ جیسی گل“ سرور! جی نے کہا۔ ”مے تو ذرا عجیب سی بات پر یہ اپنا دل نامراد... ایسا ہی ہے میں۔“

”دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت“ میں نے کہا۔

”ہل... ناراض مت ہوتا... دل اس وقت چانک چل گیا۔“

”گل نے پہلے مجھے غور اور بھر سمجھ کر دیکھا۔“

”کہہ دوں سرور! جی۔ دل کی بات کہتے ہوئے ڈرنا نہیں چاہیے۔ آپ کہیں تو میں ہٹ جاؤں“ میں نے کہا۔ ”کیلے میں...“

”سکندر بھائی، یہ کیا ہے، وہ بد مذاق ہے کچھ جھگڑے ہوئی۔“

”نہیں گل، سرور! جی بھی آخر انسان ہیں۔ ان کے بھی کچھ ارمان ہیں اور دل پر کے اعتبار ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم کو دیکھتے ہی...“

”کیا... سرور! جی، اس وقت بھی بارہ بجے ہوئے ہیں آپ کے ہاتھ گل نے مشتعل ہو کر کہا۔

”او جیسی گل“ سرور! جی نے لو کھلائے کہا۔ ”تم کو دیکھ کے نہیں سوچا۔“ وہ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔

”کیا تمھارے آخراپ نے مجھے ہاتھ جڑا ہوا کے بولی۔“

”او جیسی کا کی، حقہ کیا۔ گڑھے کے چاول پکانا تو ایسا مشکل کام تو نہیں“ سرور! جی نے کہا۔ ”تم کو دیکھا تو میں نے کہا پوچھ لیتے ہیں۔ تم کو پکانا انھیں آتا تو مٹی پاؤ۔“

خفت سے گل پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ”گڑھے کے چاول...“

”اور کیا... میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”تم تو لیمے لال میلی ہو رہی تھیں جیسے سواری تم کو پر دلو کر دے والے تھے۔“

”کیا کرنے والے تھے؟“ وہ بھی نہیں تھی کہ پر دلو کرنا پڑا دینے کو کہتے ہیں۔

”کچھ نہیں“ کچھ نہیں“ سرور! جی نے گھبرائے کہا۔ ”اور اگر گل کے ہاتھوں پر اچھٹا کرنا ہے؟ گولی مارو گڑھے چاولوں کو۔“

”سرور! جی! گڑھیہاں کہاں دور میں ضرور پکانا کہیں لیے گڑھے چاول“ گل نے کہا۔

”جلو پھر جاؤ۔ یہاں وقت کیوں ضائع کر رہی ہو ہمارا۔“

میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”غضب خدا کا! لڑکیاں ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے لگی ہیں۔ جاؤ جا کے ہانڈی چولہا کرو۔۔۔“

”کیا ناچکاؤ؟“

”نوکر نہیں ہوں میں کسی کی“ وہ جھٹلا کے بیڑ چٹختی ہوئی بانے کے لیے چلی۔

”نوکر! تو ہو، نوکر نہ سی“ دشمن نے سانسے سے آکے کہا۔

”خود اپنا پکاؤ اور کھاؤ۔ احسان فراموش لوگ ہوتے۔ دن میں اتنی غنت کی میں نے اور جناب کو کچھ پسند ہی نہیں آیا۔ گل نے کہا۔

”اب یہ تو بہت مشکل ہے عزیز، من بولا، کہ ہم ہر وقت میں وہ سب جان لیوا سرکبات کھا لیں جو ہم ایجاد کرتی ہو۔ اب پھر تمھارا لشکر یہ بھی ادا کریں۔ تم خود تیرن لگ رہی ہیں۔“

رات نو بجے میں نے اور دشمن نے خود کو بہترین ملک ثابت کرنے کا عملی مظاہر شروع کیا۔ متعدد اختلافی مسائل ہم نے ہاں کر کے طے کیے مثلاً یہ کہ آٹا کون گوندھے گا، پیاز کون کاٹے گا، جب دشمن زار و قطار دوڑتے ہوئے باز کاٹ رہا تھا تو میں ہانڈی کے تجربے سے دوچار تھا۔ کبھی اس میں پانی زیادہ ہو جاتا تو آٹے کی کمی سن ہی جاتی تھی، مزید آٹا ڈالنے سے آٹا سخت ہو جاتا تھا۔

”یار دشمن“ میں نے آٹے میں ہتھڑی ہونی انگلیاں جھٹک کے کہا۔ ”آخر یہ عورتیں کیا جکڑ چلائی ہیں۔ آٹا گوندھنے کے بعد پاؤ صاف، برتن صاف، ایسی صفائی سے آٹے کو سمیٹتی ہیں انھیں میں اور نہ ہتھڑی ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ ان کے ہاتھوں سے کوئی ایسی طوبت خارج ہوئی ہے“ دشمن نے قیص کی آستین سے اپنی ناک اور آنکھوں کی رطوبت صاف کرتے ہوئے ایک سانسہ نظر پر پڑی کیا۔ ”جو آٹے کو چپکنے نہیں دیتی۔ اس کچھڑے تو روٹیاں کیسے بنائے گا؟“

”اللہ بڑا کارساز ہے“ میں نے کہا۔ ”ہو رہے گا کچھ نہ کچھ۔“

”گھبراؤں کیلے رومت“

”یار! کیا یہ جو آٹس کو گیس ہوتی ہے اس میں پیاز کا مرقہ شامل ہوتا ہے؟“ دشمن بولا۔

”ممنی دیر ہے کھانے میں؟“ اوپر سے گل نے چلا کے کہا۔

”ہیں جی، بریانی دم ہو رہی ہے“ میں نے جواب دیا۔

”شامی کباب بھی تیار ہیں۔“

”یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔ کیا تھا اگر دن میں اس کی تعریف کر دیتا؟“ دشمن بولا۔ اس وقت وہ اٹھنے پھینٹ رہا تھا۔

”آئین چاں مرواں جتنی گوشت دیبا کی“ میں نے کہا۔ ”یہ بتا پر کار ہے؟ جس سے گول دائرہ بناتے ہیں۔“

”اے، پر کار نہیں بلکہ کتے ہیں جس سے گول روٹیاں بنائی جاتی ہیں“ دشمن نے کہا۔

”میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بھی کوئی دناؤ ٹرک بچے آخر دہی ملن بھی نہیں تو استعمال کر رہا ہوں۔“

”ایک گھنٹے بعد پھر گل نے ڈانٹ کر پوچھا۔ ”آخر کیا مراد ہوگا ہے۔ رات کا کھانا کیا ناشتے میں پیش کیا جائے گا؟“

”ہیں جناب۔ یہ شاہی ٹکڑے بھی ہو گئے“ میں نے کہا۔

”آخر ہم ایک ایک ٹکڑے سے فاحشاں نماز میں اٹھائے مرنے پر غور دار ہونے لگے۔ ساتھ سرور! جی تھے اور اُسے اپنی داستان حیات سے کوئی اقتباس جڑی سنجیدگی سے سن رہے تھے۔

”گل بھی کس سلسل کبھی کبھی کر رہی تھی۔

”لوگوہ ڈرنا آگیا۔“ سرور! جی نے خوش ہو کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”پتے پتے جانو۔ میرا بی، شامی کباب اور شاہی ٹکڑے۔“

”آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ ہم کسی کدھوس میں آئے۔“

”دلے نہیں ہیں“ دشمن نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”اپنا کام خود کرتے ہیں“ میں نے اُس کی تائید کی۔

”مگر بڑے برسے پکڑا رہا ہے جی سرور! جی نے وہ املیٹ دیکھا جس کا موجد دشمن تھا اور میری صنعت گری کی شاہکار روٹیوں کو دیکھا تو ان کی صورت پر واقعی بارہ بج گئے۔ گل کا ہنس نہیں کے بڑا حال ہو گیا۔

”کھا لیں سرور! جی۔ یہ دیکھیں، کدھوس نقشہ بنا ہے برہمظم آٹھ لپکا کا۔“ وہاں لکھ رہی تھی ہوتے ہیں اس شکل کے“ اس نے ”ہماری روٹی اٹھا کے کہا۔

”اوسے تو اڈا بڑا عرق“ سرور! جی نے پہلے لپکے کی گٹھ بکا کہا۔ ”الگ الگ لے آتے ساری چیزیں۔ پانی میں آٹا گھول کے لپی لپے، اندر سے پھینٹ کے پی لپے، پھر بیٹھ جاتے چولہے پر۔“

”جیسی داہ اپنے سکندر صاحب، کیا لطف ہے اس ساؤتے۔“

”ہر کین املیٹ کا“ دشمن بولا۔

”اور کیا ڈانٹیں گے بھر پور نصیحت بخش روٹیاں ہیں۔“

”لوگ صحت کو دیکھتے ہیں۔“

”اور صورت پر اترتے ہیں۔ سیرت کی قدر نہیں رہی۔“

”ہائے! افسردہ کھادی ہو گئی تھی میں نے جیسے جاول،“

”الاجکی کی خوشبو والے“ سرور! جی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”ادھر سرور! راجندر سنگھ کی جان پر پڑی ہوئی ہے، اوسے یار! ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لو گل سے۔“

”ہم نے اپنی خودی کو بلند رکھتے ہوئے اس آخری مشورے کو نظر انداز کیا اور اگرچہ املیٹ میں مرحول کا تناسب بھی اتنا ہی زیادہ تھا جتنا کباب کا، مگر ہم سرکرتے ہوئے ڈر نہیں صرف رہے اور ایک دم میرے کو مبارکباد بھی دیتے رہے۔ ہم ہر آج اپنی قابل رشک صلاحیتوں کا انکشاف ہوا کہ ہم اتنا اچھا کباب بھی سکتے ہیں اور بچہ آتے کہ بھی سکتے ہیں۔“

”بعد میں میرے اور دشمن کے درمیان ایک شدید قسم کچھ چڑب ہوئی جس میں اُس نے مجھے اور دشمن نے اُسے مورد الزام ٹھہرایا۔ سرور! جی نے رات بھر کے لیے لالچ کی کمان سنبھالی تھی اور میری جودہ درجہ صابر و شاکر قسم کا ماتحت تھا ہمارے تیار کردہ ڈنر کو خاموشی سے کھا کے سو گیا۔

”آدھی رات سے کچھ پہلے ہی ہماری گل سے صلح ہو گئی اور وہ ہمارے لیے کافی بنا کے لانی تو ہم عشت پر نیم روشن، گھٹے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے سمندر کی نمی سے پھیل ہوئی کھٹک کو محسوس کر رہے تھے۔

”اگر آج رات کسی وقت اچانک ایس ایس کرانی تھوڑے ہمارے سامنے آگیا، تو کیا ہوگا؟“ دشمن بولا۔

”کیا ہوگا؟ میں نے کہا۔ ”ہم خدا کا ناسے کر چڑھ جائیں گے اور پھر ہمارا بوجھ کر لپی لپی تھا۔“

”ٹھیک ہے، وہ ہمیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے، لیکن اس کے بعد لالچ والیں جلی جائے گی کیا یہ بات شک پیدا نہیں کرے گی کہ لالچ نے غلے کو واپس لے جانے کے لیے انھیں دیکھ کر نہیں کیا؟“

”یہ نہ کہ غور طلب ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں سرور! جی سے یہ درخواست کرنا ہوگی کہ وہ ہمیں چوڑے فرادالیں نہ جائیں لیکن اس قسم کی درخواست وہ کیوں مانیں گے؟“

”ابھی تو ہم انھیں ساتھ لے آئے ہیں۔“

”نہیں میں ان کو روکنے والا کون ہوگا؟“ دشمن نے کہا۔ ”اور پھر یہ بھی تو بالکل غیر یقینی ہے کہ اس جہاز پر ہمارا قیام کب تک ہوگا۔ سچ اس من کے بارے میں ابھی خود بھی نہیں جانتے کہ اس میں میں کیا سبائی ہوگی یا ناکامی۔ اور کامیابی کے لیے مواقع کب ملیں گے۔“

”مزید غور کرنے پر میری عقل سلیم میں وہ سب باتیں لگنے

لگی ہیں جواب تک نہیں آئی تھیں، شفا یہ کہ ہمارا سب سامان تو اسی لانچ پر ہے۔ اُسے ہم جہاز پر بھی منتقل نہیں کر سکتے اور سرداری سے بھی نہیں کہہ سکتے کہ جہاز ہم لے اپنا سب کچھ تھیں سو نہا۔

”وہ قبول بھی نہیں کریں گے یہ ترک کرے“
 ”خود ہم کیسے دستبردار ہو سکتے ہیں اپنے زوردار سے آگے چل کے یہی تو ہماری مشکل کشائی کا سامان ہوگا“ انہیں نے کہا۔
 ”پھر آخری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو جہاز کے ساتھ کیا خود بھی غرق ہوں گے، بچانے والا ہوگا، ہمیں دوست محمد کو ہم نے واپس کر دیا۔“
 ”یہ ایک بنیادی غلطی تھی۔ ہم اس سے کہہ سکتے تھے کہ وہ

اسی دلتے پر تھام نہ چڑھے۔ اور فاسد فرار رہتے ہوئے ایک محدود اثر سے ہم گشت کرتا رہے اور جب ضرورت پڑے تو ہمیں نکال کے لے جائے۔“

”وہ تو اب گیا۔ نہ جانے کس دلتے سے ہمیں چاہیے گا۔“ انہیں نے کہا۔ ”ہم کیا کریں؟ میرے نزدیک ان سارے مسائل کا صرف ایک ہی حل ہے۔“

”ہاں۔“ محسن نے میری تائید کی۔ ”مگر یہیں اس حل سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن جلی کے گھٹے میں جھنکی کون باندھ لگاؤ۔“

”سابقہ ناگ مٹی کوئیں اس کا کام کابل جھنکا ہوں۔“ انہیں نے کہا۔ ”وہ سرداری کو گوئی بھی مار سکتی ہے، اسے گئی نہیں مگر اس میں عقل کے ساتھ حوصلہ بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سرداری بھی اس مرحلے پر وفات پا پانچہ نہیں کریں گے۔ ان کو انکار کر کے مرنا ہوتا تو وہ شروع سے ہی تعاون نہ کرتے۔ تو جو جانے کی سوچاڑ کھا کے سو جوئے کھانے والی بات، کہ نہ فرم ادا ہوا نہ ہماری مدد ہوئی اور جان بے سبب گئی۔“

”سبکے کا کیا ہوا سبک و ماغ گھوم جائے۔“
 ”راجندر سنگھ دیسا سبک ہوتا تو اب تک خود مارا جا پائی مار چکا ہوتا۔“ انہیں نے کہا۔ ”گل کو یہ بات تو مجھ سے بھی جملہ پڑہم دوں جائیں گے۔ وہ سرداری کو روکے گی۔“
 ”مگر سبک؟“

”جب تک... لانچ میں خود نہ لگ جائے۔ اس میں تیل ختم ہو جائے گا یا آخری دو چار گھنٹے یا آٹھ گھنٹے جب تک لانچ چلتی ہے اسے ایک دوا ترے میں چلتے رہنا چاہیے اور گل کچھ دے۔ پس سرداری کو دوڑ نہ جانے دے۔ انھیں مجبور کر دے کہ وہ ہماری مدد کے لیے نزدیک ہی موجود رہیں۔“
 ”محسن نے کہا۔ یار دھڑ کر لیا نہ ہوا، سرداری نے بعد

میں انکار کر دیا اور کہا کہ لڑکی مار دے مجھے گولی۔ ورنہ میں تو مار رہا ہوں، سیدھا دالیں تو گل کیا کر سگے؟ جسمانی طور پر تو وہ کمزور ہے۔ وہ گولی چلانے کی تو لانچ کون چلائے گا؟ کیا گل کی مہجوری سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے سرداری؟

”لانچ پر صرف سرداری ہی نہیں، دوسرا وہ برمی بھی ہے۔ برفرمز مال سرداری سے خود کشی قبول کی۔ تو بری شاہا پانچہ پانچہ پسند کرے۔۔۔ یہ رسک تو گل کو لینا ہی ہوگا محسن۔۔۔ اور ہمیں بھی۔ اس میں فحشی فحشی چانس ہیں کہ سرداری انکار کر دے اور مامے عایش پھر باقی فحشی پر سنڈ میں بھی برابر کے امکانات ہیں کہ برمی مانے یا نہ مانے کو یا گل کے حق میں پھرتی مصلحتانہ ہیں اور اس کے خلاف جتنے ذہن۔“

”ایک اعتماد نتیجہ افکندہ ہے آپ نے۔ صرف ایک ذہن کے رسک پر بھی اس طرح ڈوب جانے کی جیسے نانو سے نہ پڑے۔ یہ کوئی ریاستی کا سوال نہیں ہے۔ ہم اس حقیقت کو نظر انداز کریں کہ تھانل کے لیے اس سمندر میں لانچ کو کنٹرول کرنا ناممکن ہے تو مات اسے موت کے منہ میں دھکیلنے والی بات ہوگی۔ جانتے بوجھتے میں اس تجویز کی حمایت نہیں کر سکتا جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ یہ قابل عمل نہیں۔“

”پھر ہم دونوں میں سے ایک یہ کا کہے۔ میں لانچ پر لڑ جاتا ہوں۔“ انہیں نے کہا۔ ”تم دونوں جہاز پر چلے جاؤ۔“
 ”یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ تمہاری ضرورت وہاں زیادہ جڑ ہے جہاں ہاتھ خالی ہوں۔ میں اور گل اسلحہ مزدور استعمال کر سکتے ہیں مگر کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے کہ اسلحہ کھو لیا گیا تو کام خلاص۔۔۔ میں اکیلا جہاز پر فائل تب بھی۔۔۔“
 ”پھر آپ ہی بتادیں کہ کیا کرنا چاہیے؟ انہیں نے جتنا کہہ۔“
 ”یہ بھی جیتن وہ بھی نہیں۔“

”ہمیں وہی کرنا چاہیے جو ہم نے طے کیا تھا۔ سرداری لانچ لے کر چلے جائیں۔ ہم مٹیوں پر جہاز پر ایک ساتھ رہیں گے۔ محسن بولا۔ ایک ساتھ رہے کہ رسک لینا اور مارنا بہتر ہے۔ اور ہمارا سامان؟“

”مسلمان جانے کیا طریق، زندگی رہی تو اسباب بچے اٹھاؤ۔ جانے گا۔“ محسن نے کہا۔ ”جتنا اسلحہ ہمارے پاس ہے اگر وہ کام نہ آیا تو وہ سوٹ کیس بھی ہے کہ اسے جس میں گولہ بارود بھرا تھا۔ نے۔ روپیہ جیسے بھی جو ساتھ رکھ لیں کافیا ہونا چاہیے۔ دہشت گردانہ نہیں۔ یہ ہاتھ کا میل ہم کسی سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔“
 ”سرداری کو پیش دہی یا سارا خزانہ؟“
 ”اگر وہ لینے میں تو ہماری طرف سے ایک تحفہ نہیں ہے۔“

”خود بھی سمندر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس کی کہ میں اگلوں دن نکلنے پہلے سے موجود ہیں۔“ محسن نے کہا۔
 ”یون تو قریب سرداری نے ہماری پیش کش کو مسترد کر دیا۔ جب میں نے سوٹ کیس کھولا تو ان پر تھوڑی سی دیر کے لیے کٹے گاڑی ہو گیا۔“
 ”اوتے۔۔۔ اصلی نوٹ میں باجھلی؟ انھوں نے کہا۔ اور تمہارے پاس۔۔۔ تم ڈاکو کیس نہیں ہو۔ پھر اتنا مال کہاں سے لانا تو لوگوں نے؟“

”میں نے کہا۔ سرداری! ہم کھانے یا پھر گنگو گے؟“
 ”ہم اپنے بوٹے کے ہوں نا کا۔ تو یہ پانچہ آم کو دیکھتے ہیں۔۔۔ تو کوئی نہیں۔ آم وہ کھائے جس کا بونا۔“ سرداری نے کہا۔

”ہم سب دولت آپ کی مذکر کرنا چاہتے ہیں۔“
 ”مگر کیوں؟ اور جب تم کو اس کی ضرورت نہیں رہی تو اپنی معیبت میرے گلے کیوں ڈالتے ہو؟“ سرداری نے کہا۔
 ”آپ نے ہماری بہت مدد کی۔ انہیں نے کہا۔ اس کا بدلہ مجھے کے قبول کرنا چاہتی چاہیں لکھ لیں، ڈاکریا یا ڈاکٹر لکھ لیں یا انڈین کرنسی۔“

”سرداری نے تھکے لگایا۔“ او بارو! سردار راجندر سنگھ کو بڑے مواقع ملے اس سمندر میں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ اسلحوں نے میرے ہمارا ہر بات پیش کیے۔ اس سے دس گنا رقم کے برابر ہوئے سوٹ کیس دیے، لیکن اپنی عقل میں ایک ہی غرائی ہے۔ اپنی عقل غلامی کے دل کی۔ جو دل کتاب ہے کرت ہے دل جرات نہ مانے وہ ہم بھی نہیں مانتے۔ یہ تو ہمارے دل نے کہا تھا کہ تمہاری مدد کرنی چاہیے دل اس کے خلاف بات کرتا تو اب تک یا ہم نہ ہوتے یا تم نہ ہوتے۔ یہ میمت بھننا کہ تم سے سردار راجندر سنگھ کو قاتل کر لیا تھا۔ ایسی ایسی بگڑے والو اور چھپا کے رکھے ہیں میں نے کہ تمہارے فرشتوں کو بھی پتا نہ چلتا اور میں کو ہینڈ ڈراپ کر دیا کیونکہ تم ہوئے وقت۔ دشمن بڑھ رہا کہ سناؤ۔“

”میں اور محسن اُسے بے وقوف کی طرح دیکھتے رہے۔ ایک بات تو تائیں سرداری! کیا آپ نے میری کمائی پر یقین کر لیا تھا؟ انہیں نے کہا۔“

”میں نے؟ یا میرے دل نے؟ دل کی گواہی میری نہیں ہے۔ ان یا تھا کہ قریب تو گئے ہو۔ جو کہ تم کر رہے ہو وہ تمہارا کام ہے۔ تمہیں منہ نہ کرنا تو تم کو من سامان جاتے۔ یہ تباہی ان باقی دھوٹ کیوں کر لیں گے؟“

”چلو چھوڑو سرداری! میں نے کہا۔ اب جو کچھ ہے سمندر کی امانت ہے۔ راز کو راز ہی رہنے دو۔“
 ”راز؟“ سرداری نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اوتے! سور دے مگر سردار راجندر سنگھ سے راز کی بات کرتا ہے۔ یوم بتاتے ہیں تم کو ان میں کیا ہے؟“

”میں سمجھو نہ کتا گیا۔ اس ساوہ دل اور بے وقوف نظر آنے والے بلکہ ہے قابل تنگ ذہن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے میں کچھ معلوم نہیں ہوئے دیا تھا اور سب معلوم کر لیا تھا۔ میں نے کہا۔“ سرداری! آپ نے پانا قرض ہی نہیں چکا یا بلکہ میں متروض کر دیا ہے۔“
 ”انوں میں بار۔۔۔ کیا قرض اور کس کا قرض؟ تم نے میری

مدد کی تھی لیکن اپنی غرض سے۔ تم نے بھی اُس وقت جب ہم دودھی بندے باقی رہ گئے تھے، پھر بھی تم نے ہمیں مارا نہیں۔ یہی تمہاری مہربانی تھی ورنہ تم کو لانچ کی ضرورت تھی۔ تم لانچ لے سکتے تھے۔ میں بھی تم کو تھکانے لگا سکتا تھا مگر میں نے سوچا کہ چلو، تمہارے لیے میں بھی کردوں۔“
 ”آپ واپس جانے کے بعد میان وہی دیں گے جو ہم پر اثر انداز نہ ہو۔“

”فخرمت کر دو تمہارا نام انہیں آئے گا اس میں مجھے جو کتنا پسند کہہ دوں گا۔“ سرداری نے کہا۔ ”اپنے آپ کو بھی تو چاہنا ہوگا مجھے۔“
 ”رات کے ایک بجے نہیں 2 اور محسن نے مل کھائے نما۔ اسباب کو سمندر کے پسرو کیا۔ اب ہمارے پاس دی بقی باقی بگنی جو ہم نے پاس پورٹ کے ساتھ اپنی کر کے گرد میلٹ بنا کے باندھی تھی۔ اسلحہ کے نام پر ہمیں ہم سب کے پاس ایک ایک روٹا لودھ گیا۔ یہ اسلحہ کسی جنگ باکسی سے متاقلے کے لیے قطعی کافی تھا۔ سردار راجندر میں چھ گولیاں تھیں اور وقت ضرورت میں مگر گولی کو احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا تھا۔“

”سفر بے کراں سمندر میں مسلسل حرکت اور ہزار گن یکسانیت رکھنے والے شڈ بے یقینی اور ذہن پر مسلط بے نام طوف کا نام تھا۔ کب کیا ہوگا، ہوگا یا نہیں ہوگا اور آنے والے صبح کون کہاں دیکھے گا۔ دیکھے گا یا نہیں دیکھے گا۔ ہم جہاں اس وقت عزم اور حوصلے اور جدوجہد کے جوش بھڑکنا تھا اور توانائی

سے بھر پور حسیہ جاتے پڑے ہمارا انسان میں جو ایک مشترکہ مقصد اور جذبات کے رشتوں اور اچھے مستقبل کے خوابوں کے ادا تئیں کل اس تجربے کی تھی کہ گوشت پوست سے غرق

ڈھلچے بنے ہوئے تو نہیں پڑے ہوں گے۔
 سونے کا گوشہ ہے سوہتی مگر میں آنکھیں بند کیے
 لیٹا رہا۔ میں نے خیالات کا رخ بدلنے کی کوشش بھی کی لیکن
 رابعد اور اس کی محبت سے وابستہ خیالوں کا عکس قائم نہ رہا جو
 محسن بھی جاگ رہا تھا مگر خاموش محتاسر سند کے شور کے
 باوجود رات پر ایک جمود حاوی تھا۔ اس جمود سے ہمارے
 اعصاب بھی متاثر ہو رہے تھے اور ہماری خاموشی کے پیچھے
 انتظار اور اضطراب کی بے نام غلغلہ تھی۔
 رات کا آخری بھر تھا جب اچانک میں نے اوپر سے
 سرداری کے چلائے کی آواز سنی۔ وہ ہمیں بھکاری رہے تھے۔
 ”اوپر آگے تیرے کچھ سوئے ہو، واہ بھئی۔“
 میں اور محسن ایک ساتھ دوڑتے ہوئے گئے۔
 ”سرداری، کیا ہوا؟“ میں نے کہا۔
 سرداری نے دوڑیں مجھے تھامی ”وہ دیکھو، ادھر جنوب
 کی طرف، او یا اُدھر شمال ہے۔“
 میں نے رخ بدل کے دوڑیں کو فوکس کیا، ایک بڑی جہاز
 کا دھندلا سا میری نظر میں آگیا جس پر کہیں کہیں روشنی بھی تھی
 ”تم نے دیکھا ہے اس جہاز کو... کیا نام ہے
 اس کا؟“
 ”الیرالس کرانسی تھرڈ“ ”محسن بولا۔
 ”ہاں، دیکھو یہ وہی ہے یا کوئی اور...“
 میں نے دوڑیں محسن کو دی ”تو دیکھو... مجھے وہی
 لگتا ہے۔“
 ”میرا حساب کتاب ہے کہ وہ دوڑیں ہو سکتا۔ ہمارے
 آس پاس ادھر ادھر تھوڑا بہت فرق ہوگا۔“
 ”بال و ہی ہے یا۔“ ”محسن نے کہا۔ اتنے دن سے ہم دیکھ
 رہے تھے۔ میں بھول سکتا ہوں اس کی ساخت کو۔“
 ”امیالا ہوتا تو نام پڑھا جاتا، لیکن شک مجھے بھی نہیں ہے
 یہ جہاز ہمارا نہیں ہو سکتا۔“ میں نے کہا۔
 ”پھر اب کیا کرنا ہے؟“ چلیں سیدھا ادھر؟“ سرداری
 نے کہا۔
 ”ابھی پتھر جائیں۔ آدھا گھنٹا تو دیں میں تیار کیے لیے۔“
 میں نے کہا۔
 سرداری ہنسنے لگے ”آدھا گھنٹا؟ اوکا! دوڑیں سے
 دیکھنے سے فاصلہ کم تو نہیں ہوتا۔ ہمیں گھنٹا گھنٹا جانے کا آخر وہ
 بھی تو آگے بڑھ رہا ہے۔“
 ”پھر کوئی بات نہیں، میں نے کہا۔“ میں گل کو بھی اٹھا

دیتا ہوں۔“

تقریباً چالیس منٹ بعد جب آتقی پر تھم پڑی تو
 کادب کے اختتام کی خبر دے دی تھی، ہم نے خود کو الیرالس
 کرانسی تھرڈ کے مقابل پایا۔ میں نے اور محسن نے دونوں
 لائٹس کو اس کے عرشے کی جانب موڑ دیا تھا۔ اور اس کی طرف
 مجھے عرشے پر کھڑے ہوئے تمام افراد کی حرکات و سکنات میں
 دکھائی دے رہی تھیں۔

سرخ لائٹ کے چھپرے رہتے ہوئے میں نے جہاز میں
 کو فوکس کیا تو مجھے ایک چہرہ ہمارے کپتان محسن کا نظر
 آس کے ساتھ شاہد جمیل تھا۔ ان کے داہنے بائیں دونوں
 یا محافظ۔ انھوں نے ہمیں ایک پولیس لائٹ کو آواز دیا
 لیکن وہ بہت پرسکون اور پر اعتماد تھے۔ میرا آنکھوں سے
 غالب اور ناز کو تلاش کرنے کی عہد جدوجہد کی۔ ناز و دلا
 تو اپنی درس کی وردی میں صاف نظر آتی لیکن رات کے آتقی
 تھے میں اس کا عرشے پر کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ناز و
 محذروں میں سفر کرنے والوں کو پولیس کی بھی وقت چیک
 کرے، جہاز کا عملہ اس سے منط سکتا ہے۔
 بالآخر دو میکان کا فاصلہ اتنا کم ہو گیا کہ میں نے میکان
 اٹھا کر کہا ”یہ انٹر پول ہے۔ ہم جہاز پر آنا چاہتے ہیں۔“
 ”یہ ایک ہتھیار جہاز ہے،“ ”محسن نے میکانوں کے لیے
 ہی جواب دیا۔“ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں۔“
 ”میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا ہے کہ تم کیے جا رہے
 اور نہ ابھی تک کوئی شک ظاہر کیا ہے۔ ہم اپنا فرض ادا کریں
 میں امید ہے اب لوگ تعاون کریں گے۔“
 ”ہم تعاون کریں گے، اپنا نام بتاؤ۔“ ”محسن نے کہا۔
 ”میں لیفٹیننٹ میڈل اس اور میرا ساتھی لیفٹیننٹ
 سندھیا۔“
 ”اوکے... ہم یہ بھی دیکھتے ہیں،“ ”محسن نے کہا۔
 محسن سب سے پہلے چڑھا، اس کے پیچھے گلی گلی
 مردانہ چلیے اور انٹر پول کی وردی میں بھی اس کے لیے
 جہز کے بنا پر مشکل ثابت نہ ہوا۔ دقت کی وارداتوں میں چلیں
 ساتھ دیتے ہوئے اس نے کئی دیواریں عبور کی ہوں گے اور
 چھت تک پہنچنے کے لیے ایسے ہی طریقے اختیار کیے ہوں گے
 میں نے آخری وقت میں سرداری سے ہاتھ ملائے۔
 بہت مرہانی، ہم نے یقیناً بہت زیادتی کی تھی آپ کے
 اس کے لیے معافی... اور اجازت۔“

”جاؤ واہ گورو تمھاری مدد کرنے،“ ”سرداری نے کہا۔“
 ”ایک آخری گزارش ہے،“ میں نے کہا۔ ”ہمارے اوپر
 ملنے کے بعد فوراً واپس مت ہو جاؤ ناچہ منط انتظار کر لینا۔
 جب تک ہم عرشے پر سے غائب نہ ہو جائیں۔“
 سرداری نے سر ہلایا اور میں باہر لپکا۔ اس وقت تک
 میں اوپر پہنچ چکا تھا اور گلی آدھی بندی کو سر کھینچتی تھی۔ پانچ
 منٹ بعد میں نے بھی عرشے پر قدم رکھا تو میرا دل بہت تیزی
 سے دوڑ رہا تھا لیکن میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔
 میں نے دیکھا کہ مصر کی نگاہیں گل پر جم چکی تھیں شاید
 اسے شک ہو گیا تھا کہ ایسی نرم و نازک جلد اور ایسے دل کش
 نفوذ رکھنے والا پولیس میں کیسے ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق میں
 عرشے پر قدم رکھتے ہی مصر اور وہاں موجود سب افراد کو
 بیڈز پر کر لینا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنا ہاتھ لہجے
 زب ادا کرتا جڑھا ایک مارچ کی تیز روشنی میرے چہرے
 پر پڑی۔
 ”تو تم آگے؟“ ایک انوس آواز نے کہا۔
 ”بہت دیر کی مرہاں آتے آتے،“ ”دوسری آواز نے کہا۔
 ”ہم تو ابس بولے تھے،“ اس تیسری آواز نے مجھے چمک
 کر پٹے پر مجبور کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین
 ملا۔ نہیں، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟
 لیکن حقیقت کا ایک بے رحم اور ناقابل تردید ثبوت اس
 کی صورت تھی جو میری نظر سے اوجھل ہو جانے کے بعد بھی میرے
 فزوش زندہ تھی۔ یادو احمی کے سارے غائب لاشتہ اسی کے
 خیال سے بندھا ہوا تھا۔

پیڈرو

میرے سامنے اپنے وجود کی
 ساری شناخت کے ساتھ جوڑو
 تھا اور یہ منظر میرے لیے اور محسن کے لیے ایک ناقابل
 بھن تھا۔ اس نے یقینی میں ایک پہلو میری اس انتہا کا
 تھا جو کہ اپنے نفس کو بھر زندہ دیکھنے سے ہو سکتی ہے جس کے
 بلے میں شے کی گمشدگی ہی نہ ہو کہ وہ مر چکا ہے۔
 ”شک ایک فطری رد عمل تھا اگر آج میں اپنے ساتھی
 اور زندگی کو اپنے مقابل دیکھتا تب بھی مجھے اتنا ہی تعجب
 ہوتا کہ میں نے اسے جذباتی رد عمل کا ہوتا استاد ٹیڈی کو زندہ
 ہائے میں شے کی گمشدگی ہی نہ ہو کہ وہ مر چکا ہے۔
 سکھنا ہے سمجھتا ہوں۔ جبکہ پیڈرو کو زندہ دیکھ کے مجھے
 سخت صدمہ ہوا۔ اس صدمے نے مجھے میرا احساس طہارت
 چھینا اور میری فتح زندگی کے خیال کو مٹا دیا وہ دشمن جس کی

موت کا میں ہمیشہ سے غلام تھا اور جس کو قتل کرنے کے
 بعد میرے وجود میں بھر پور دلی آتش انتقام کچھ سرد پڑ گئی
 تھی وہ میری حسرت کا کام اور کوشش کا تمام پرندہ زن
 پھر میرے درمیان تھا اور اس کے لبوں کی زہریلی سسکاہٹ
 میرے لیے تحقیر و تذلیل کی آذیت بن رہی تھی۔
 اگرچہ غلے کے رویتے میں ایک غیر متوقع بے تعلقی کا
 پتہ بخرا انداز تھا لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ان میں
 سے کسی نے ہمیں پہچان لیا ہے۔ پھر بھی میرا اتحاد باقیوں
 پر ٹھنکا۔ ایک توان کا اندازہ بڑی لڑائی میں ہوتا تھا
 جیسے کہ وہ ہمارے ہی انتظار میں تھے اور یہ انتظار کسی قدر
 طویل ہو گیا تھا۔ شک کی دوسری وجہ ان کا اردو میں بات کرنا
 تھا۔ پیڈرو کے لبوں سے آج تک میں نے غلاظت کے
 سوا کچھ نہ سنا تھا اور نہ سنا تھا۔ اس نے بھی شاعری
 بگھاری تو مجھے اتنا ہی افسوس ہوا جتنا گدھے کو زعفرانی
 کھانا دیکھ کے ہوتا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے فرانسیسی میں کہا ”تم لوگ
 ایسے ہتھیار اٹھا لے کیوں کھڑے ہو۔ تمہیں معلوم نہ رہا ہے
 کہ ہم سندری ڈاکو نہیں، انٹر پول کے نمائندے ہیں اور تمہارے
 ذہن میں اگر مقابلے کا خیال ہے تو نکال دو۔“
 ”محسن نے میری صورت کو دیکھا میں نے
 بہت تیزی سے اس کے سسکل فریج بول کے اسے سر کھانے
 پر مجبور کر دیا تھا۔
 ”شاہد! کیا بھلا کر گیا ہے؟“ ”محسن نے اپنے فرسٹ
 آفسر سے کہا۔ میں نے شاہد جیل کو سب کی نظر بچانے کی کوشش
 ”میں خود کچھ نہیں سمجھا...“
 ”اس آؤ کے چٹھے سے کہو کہ ہم فرانسیسی نہیں جانتے؟“
 ”محسن نے کہا۔

”یہ تو اب بھی کہہ سکتے ہیں سر شاہد جیل بولا۔ میں
 بھی تو فریج نہیں جانتا۔“
 ”کیا تم آخری نہیں بول سکتے؟“ ”محسن نے غصے کے
 محسن نے فوراً مترجم کے فرائض سنبھال لیے۔ اس نے
 میری بات کا ترجمہ کیا ”میرے ترجمے کو فصاحت و بلاغت سے
 عاری رکھ دو ایک تھوڑا سا نفل کر کے پاس ہونے والے
 کالج کی بچی سی بخش بولتا رہا۔“
 ”محسن نے مجھ سے کہا۔ اس نے ایک مقدمہ مارا ”کتنا
 بے تم لوگ ہتھیار کیوں اٹھا لے کھڑے ہو؟“ ”وہ پیڈرو سے
 مخاطب ہوا۔ اس باگی کے بچے سے کہو کہ اسے کیا توقع تھی

ہم بھولوں کے بار اور ٹکڑے اٹھائے کھڑے ہوں گے۔
 "میرزا خاں ہے کہ آپ ان سے مطلب کی بات کریں۔
 یہ لوگ کیا جانتے ہیں؟" شاہد جمیل نے مشورہ دیا اور برسر
 ہو گا اگر انھیں اپنے ساتھ لے جائیں۔
 "کہاں لے جاؤں گی؟"

"اچھے کرے میں کوئی ایسی بات نہیں
 آسانی سے کی جاسکتی ہے۔" شاہد جمیل نے کہا۔
 "یہ تو معلوم کر لیں ان سے کہ یہ کون ہیں؟ پیڈرولولا۔
 شاہد جمیل نے اسے فرزندہ کہنے والی نظروں سے دیکھا کیا
 یہ بھی پوچھنے والی بات ہے؟"

"ہاں! صرف انٹرپرائز کہہ دیا کافی نہیں پڑے گا۔
 "اور یہ وردیاں اٹھائے خیال میں کوئی بھی نہیں سکتا ہے
 اور جس لالچ میں یہ لوگ آئے تھے کیا وہ بھی انٹرپرائز کی
 لالچ نہیں تھی؟" شاہد جمیل نے برہمی سے کہا۔

شاہد جمیل بہت خوبصورتی سے ہمارا دفاع کر رہا
 تھا اور میں ناخوشگوار صورت حال سے بچانے کی کوشش
 میں مصروف تھا۔ اس کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ ایک
 یہ کہ ہمیں شناخت کرانے کے مسئلے کا فوری سامنا نہ ہو
 جس سے ہمارا راز فاش ہونے کا خطرہ مل جائے۔ دوسرے
 یہ کہ ہم اس مہلت سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہیں جو حالات
 سازگار ہوں۔ جب میں نے اسے آنکھ ماری تھی تو وہ کچھ
 حیران ہوا تھا مگر آدمی ذہین تھا اس لیے فوراً سمجھ گیا تھا
 کہ منصور کے برعکس میں خدا بول رہا ہے۔

"تم نے ٹھیک کہا۔" میرا نے شاہد جمیل کے کندھے
 پر ہاتھ رکھ کر سہارا لیا۔ "ان لوگوں سے بگاڑ ٹھیک نہیں۔
 انھیں مال دینا چاہیے۔ تھوڑی بہت خاطر وارات تھوڑی
 سی رشوت اور تھوڑی سی فرمال برداری اور جی حضور۔
 اور کیا مانگتے ہیں بھلا تھانیدار۔ یہ سالے سمندری تھانیدار
 ہیں۔"

"رشوت کی بات ذرا سوچ سمجھ کر کریں۔" شاہد جمیل نے
 اپنے افسر کو سمجھا یا یہ ذرا مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔
 "ہاں ہاں۔ یاد رکھیں تو ہوں۔ وہ کیا۔ اپنی سالی زندگی
 گزری ہے اسی صحرا کے ٹورزم میں۔"

"دشمن کی سیاحتی میں؟" شاہد جمیل نے یہ بھی کی۔
 "ایک ہی بات ہے۔ ایک ہی بات ہے۔ ان کے ہونٹ پہلے ان
 سب کو کہہ جائیں۔ سب اپنا ٹوپ خادے کر آئے ہیں۔ جیل بے آکر ہونٹ
 کیا؟ کیا بولا؟" بھنڈاری اچھلا۔ ابھی تم بھر سب

کاماتے ہمارا انسلٹ کرتا ہے ہمارا بعد میں بولے گا
 ہم نشے میں تھا۔
 "نشے میں تو ہے نا۔" شاہد جمیل نے اس کی بات
 کے آہستہ سے کہا۔ "جب تم جانتے ہو تو غواغوا کر
 سناؤ۔"

"میں کتابوں ان کے کافزات اور ناشی کارڈ پر
 پیڈرولولا ہمارا کیا۔"

"ٹھٹ آپ یہ حکم دینے والے تم کون ہو اس
 میں ہوں۔" میرا نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ تم بھی نہیں
 اندازہ جب تک میں نہ ہوں میرے سامنے ایسا اور
 تم جو بھی ہو۔"

"میں معلوم ہے ابھی طرح کہ میں کون ہوں۔
 "ہاں ہاں معلوم ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ
 باپ مت سمجھو۔ یہاں میں تھا باپ ہوں۔" میرا نے
 کہا۔ "میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو کتنے کی طرح
 گا اور سمندر میں چھیک دوں گا۔"

صورت حال خطرناک حد تک کشیدہ ہو گئی تھی
 کے ذہن میں کوئی شک پیدا کرنے والی بات تھی تو اس کا
 سکے سامنے کرنا نہیں چاہتا تھا اور غالباً خود بھی نے
 تذبذب میں مبتلا تھا مگر میرا کے اشتعال انگیز رویے
 بعد یہ عین ممکن تھا کہ وہ کچھ کر بیٹھا رہا اور اس کے
 وہ میرا کی بستی کی پروا کیے بغیر باغیانہ سرکشی اختیار کر
 خون خرابے تک پہنچ جاتی جس میں کوئی بھی مارا جاتا۔ وہ
 یا تم۔"

ان کی آہ کی چیقلش نے مجھے وہ موقع فراہم
 کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے ایک سیکنڈ کی حرکت میں پاؤں
 کے جواب میں سے رہا اور نکال لیا۔ میرا اشارہ پانے کی
 بھی ایسا ہی کیا اور جب تک پیڈرولولا اپنے جارحانہ
 ہوتا ہوا نہ اپنے آنکھ ٹھیک رہا اور وہ مختلف سمتوں سے
 لیے۔ میرا اشارہ میرا تھا تو میں نے زمین پر مستاد پیڈرولولا
 کے پیچھے گلی سے پوزیشن تبدیل کی تھی۔

"شاہد جمیل تو ان کی سمجھ میں میری بات نہیں آتی
 نے فریج میں کہا۔ ہم ملاوہ خون خرابا نہیں کرتے۔ لیکن
 میں کوئی خیلانے کا حق رکھتے ہیں اور قانونی فریضہ کی
 میں کادٹ ڈالنے والوں سے نمٹ سکتے ہیں۔
 محسن نے بھرا اگر میں میری بات آگے
 میرا نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ نہ ہم تباہی کا وارڈ"

ناس کی خدمت محسوس کرتے ہیں۔ ہم قانون کا احترام کرنے
 والے لوگ ہیں اور مجھے انہوں سے کہ ایسی غلط فہمی پیدا ہوئی۔
 آپ کی تشکیف آوری کا مقصد کچھ بھی ہو کیونکہ آرا رھرا
 آپ اس میں اس کو ناشی تھوڑا آپ کو خوش آمدید کہتا ہے اور
 آپ کو مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہے۔"

محسن نے جو کچھ فریج میں کہا یہ تھا کہ "یہ حرام زادہ جو ایک
 باپ سے بچ گیا یا باپ سے ملوایا گیا۔ دوسری بار زیادہ
 غلاب کی موت کے لیے مجھے اندیشہ ہے کہ اسے ہمارے
 جلائی کا پتا چل گیا ہے۔ ہم میں سے ایک کو اس پر نگاہ رکھنی
 ہوگی۔"

میں نے کہا۔ ابھی سے جگ جھڑونا مناسب نہیں
 پہلے معلوم ہونا چاہیے کہ غلاب اور تازو کمال ہیں۔
 محسن نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ "کیونکہ میرا کاشیت
 روئے ایک نیک فال ہے۔ ہم جھاپے کے مطابق کارروائی کر رہے
 ہیں اور ہمارا بھی معمول کے تجارتی سفر پھر وال ہے تو کسی کو
 ہم سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔"

میرا نے کہا۔ "آپ لوگ میرے ساتھ آئیں جو بات
 بھی ہوگی۔" میرے کہیں میں ہو جائے گی۔
 میں نے محسن کی معرفت جواب دیا۔ "ہم مٹھنے کے
 لیے نہیں آئے ہیں اور نہ ہمیں کسی شے پر بات کرنی ہے۔"
 میرا نے کہا۔ "ممالوں کے لیے ایک جام یا کافی کا ایک
 کپ پیش کرنا اگر رشوت شمار نہ ہو۔"

میں نے کہا۔ ہم ایک نظر جہاز کو دیکھیں گے اور واپس
 جائیں گے۔
 میرا نے واپس جانے والی لالچ کی طرف دیکھا۔ واپس
 کیے جائیں گے؟
 محسن نے خود ہی جواب دیا۔ "لالچ دالیں آئے گی۔"

پھر تو بہت وقت ہے۔" میرا نے کہا۔ شاہد جمیل اس
 شخص کو لے گا میری نظر کے سامنے سے۔ اس کی استودی
 ہاں نہیں ملے گی۔ یہ کسی کا نمائندہ ہے مگر میرا افسر بنائے نہیں
 بیجا لیا ہے۔
 میں ان لوگوں کے مفاد کے خلاف کوئی کام نہیں ہونے
 والا کہ ان کا میں نمائندہ ہوں۔ پیڈرولولا نے اسی پرستی سے کہا۔
 "ان کے مفاد سے میرا مدد تھی والستہ ہے کیونکہ میں
 اپنے جہاز پر مفادات کے تحفظ کی ذمہ داری کسی اور کو نہیں
 سونپ سکتا۔ نفع نقصان کے لیے جواب دہ میں ہوں۔ میرا
 نہ فتنے میں جلاتے ہوئے کہا۔" مجھے کسی خیر کی ضرورت

نہیں! اگر کوئی سمجھ بوجھ پر مستط ہونے کی کوشش کرے
 گا تو۔۔۔

"آپ جلیں سر۔" شاہد جمیل نے اسے سمجھاتے ہوئے
 نرمی سے کہا۔ پیڈرولولا سے مخاطب ہو گیا۔ "تم اس جہاز
 کے عملے سے یہ توقع کیسے مت دیکھا کہ وہ میرا ایک جگہ ہمارا حکم
 ماننے پر تیار ہو جائیں گے؟ خواہ وہ کتنے ہی مجبور ہوں نہ
 ہوں تم جہاز پر قبضہ کر لو تب بھی بکستان کی جگہ نہیں لے سکتے۔"
 "حالت درایتی ہر بات منوالتا ہے شاہد۔ اس وقت
 بھی میں چاہتا ہوں۔۔۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری تم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے
 تھے کہ میرا کو مار دیتے۔ مجھے بھی مار دیتے لیکن اس سے کیا
 فرق پڑتا۔ ہمارا کے عملے کا آخری فرد بھی مر جاتا تو تمہارے
 حکم کی تعمیل نہ کرتا کیوں کہ تم باہر کے آدمی ہو۔ ہمارے پاس
 ایک ضابطہ ہے کہ ایک ذرہ سے تو اس کی جگہ لینے والا دوسرا
 کون ہو گا۔ تم اس فہم سے کہ آخری آدمی بھی نہیں ہو اس
 لیے بھول جاؤ یہ بات کہ تم اپنی بد معاشی یہاں بھی جلاتے ہو۔"

میرا اس کی بات سے خوش ہوا۔ بالکل ٹھیک کہ تم
 نے شاہد جمیل بھی ہی سمجھا رہا تھا اس کو اور اگر یہ پاؤں سے
 نہ سمجھتا تو لاؤں سے کام لیتا۔ کچھ بھوت ہوتے ہیں ایسے۔۔۔
 پیڈرولولا نے ایک گالی دے کر رہا اور اٹھتا ہی تھا کہ
 شاہد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "باگمات ہو۔"

پیچھے سے گلے نے رعب دار آواز نہا کہ کہا۔ "ہاتھ اوپر
 اٹھا لو۔"

گلے کی آواز کا رعب تو کیا قائم ہوتا لیکن یہ وارننگ
 کام کر گئی۔ پیڈرولولا خوشی سے واپس ہو گیا۔ بھنڈاری بیٹے ہی
 جا چکا تھا۔ ہم نے بھی رہا اور جیب میں ڈالے اور میرا کے
 ساتھ چل پڑے۔ اس نے محسن کی معرفت اپنے عملے کے ایک
 جاہل اور غیر ذمہ دار شخص کے رویے پر معافی مانگی اور ایک کپ
 بات کی۔ اس نے پیڈرولولا کے بائیں ہاتھ میں لٹکے ہوئے تھا۔
 جب کہ نشے میں خود کو تان صاحب تھے۔

"تم اس قسم کے بکستان ہو آخر۔" محسن نے اسے ڈانٹ
 کر کہا۔ "تمہارا عملہ تمہارے سامنے سرکشی سے بات کرتا ہے۔
 شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے اور حد یہ ہے کہ تمہارے
 منہ کرنے کے باوجود اس کا سر نکال لیتا ہے۔ وہ بھی بین الاقوامی
 پولیس پر۔"
 "دراصل۔۔۔ وہ عملے میں شامل نہیں ہے۔۔۔"

”کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ کوئی مسافر ہے؟ ایک مال بردار جہاز بر کسی مسافر کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟ محسن نے کہا: ”کیا تم ناچار طور پر لوگوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک کے مائل بنانا چاہتے ہو؟ کام بھی کرتے ہو؟ گناہ عاصیہ لیتے ہو ایک ایسے مسافر سے اور... اس کے علاوہ کتنے لوگوں کو لے جا رہے ہو؟“

”میرا گھر آگیا، آپ ادھر آئیں۔ یہ ہے میرا کین۔ میں ابھی سب وضاحت کر دیتا ہوں۔“

محسن نے میری طرف دیکھی اور فریخ میں کہا: ”یہ سالہ بیٹھ گیا ایک بات کہہ کر۔ اب ہم مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اس شخص کو پیش کیا جائے، اس کی سفری دستاویزات دکھائی جائیں اور مزید ناچار سفر کرنے والوں کا پتا چلانے کے لیے ہم جہاز کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں۔“

”میں نے یہ ظاہر کیا جیسے ساری بات کا علم مجھے اب ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے زیادہ برہنہ کا مظاہرہ کیا۔“ یار جھجھے غالب اور مزاد کو زیادہ فکر ہے۔ وہ دکھائی نہیں دیتے۔ میں نے گرج کے کہا۔

”میرا نے ایک مٹن دیا کہ کسی کو طلب کیا اور پھر پوچھا کہ ہم کیا پسند کریں گے؟“ ”وہ مٹن انٹر سے بیک ڈاؤن تک سب دستیاب ہے۔“ اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”لاٹک جان یاد رکھا۔“

”گو یا تو ایک انڈین شپ پر غریبی خدہ اب کہہ دو۔“ ”کی جرم کا اعتراف بھی کر رہا ہوں۔“ ”سن بولا۔“ ”اسٹنگلنگ کا اور کیا کیا سامان ہے؟“

”میرا پریشان ہونے لگا۔ وہ تو میں اپنے طور پر...“ ”عہان نوازی کے لیے تھوڑی بہت رکھتا ہوں۔ اسٹنگلنگ کسے والے پر لہنت؟“

”ہم ڈوٹی پر ہوں تو پی نہیں سکتے۔“ ”محسن نے رکھائی سکتے

”ادے کافی یا چائے؟“ ”لینج سے پیلے۔“

”کچھ نہیں؟“ ”محسن نے کہا: ”اس آڈی کو لاؤ کون ہے وہ؟“

”وہ...“ ”اصل ایک تجارتی کینی کا نمائندہ ہے۔ یہاں

کا کچھ سامان لے جا رہے ہیں۔“ ”میرا نے کہا۔

”کس قسم کا سامان۔ اس کی تفصیل تو سوچی؟ اور جب کبھی

کا یہ بدترین غصہ غمناک نمائندہ ہے اس کا دھند کیا ہے؟ اس

پر معاش کے پاس سفری دستاویزات ہیں یا نہیں؟“ ”محسن نے

ایک ہی سانس میں کہا: ”میرا میرے ساتھ اس کے رویتے نے

مجھے اور ہم سب کو شکوک میں مبتلا کر دیا ہے۔“ ”سایا لٹا ہے

کہ وہ ملک ہے جہاز کا اور تم اس کے معمولی ملازم۔ جس کی کوئی عزت نہیں۔“

”میرا اس ذات کو پی گیا۔ وہ مجبور تھا ورنہ اتنی بے عزتی کبھی برداشت نہ کرتا۔ جب محسن اس سے بات کرنا چاہتا تو میں سوچ رہا تھا کہ کتنا تن سے حقیقت کیسے اٹھوانی چاہیے؟ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جس بیڈرو کو ہم اپنی ولایت میں غارت کر کے ممال سے بہت دور سمندر میں غرق کر کے کچلے غصہ کس طرح بچ نکلا تھا اور پھر اس جہاز تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوا تھا؟

”میں نے یہ بات محسن سے کی تو اس نے بھی قہقہہ کیا کہ یہ مسئلہ آسانی سے حل نہیں ہوگا۔ یعنی یہی سیاحی انگلیوں سے بھی نکلانہ شکل ہوگا۔ میرا سے براہ راست پوچھا گیا تو وہ صاف انکار کرنے لگا اور شک میں بھی پڑ جانے لگا کہ ہمیں بیڈرو کے بارے میں یہ سب کس نے بتایا۔ جہاں اس پر غارت ہوئی تھی وہاں صرف دو لائیں تھیں اور عینی شاہد بھی تھے جو ان لائیوں پر موجود تھے۔ ایک لائی واپس چلی گئی تھی اور دوسری ہم آئے تھے۔ خود بیڈرو جانتا تھا کہ ہم وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔ ہم نے کسی کے ساتھیوں کو مارنے کے لیے لائی چھپی تھی اور اُسے معلوم تھا کہ اس دردی میں محسن اور سکندر تھے۔ پھر یہ بات اس نے میرا کو یوں نہیں بتائی تھی؟ محسن کا خیال تھا کہ وہ اپنے خاص جرم کی پردہ پوشی پر مجبور تھا۔ وہ میرا کو نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے انٹر لپ کی لاٹک پر قبضہ کر کے اور علی کے افراد کو مارنے کا ایک بین الاقوامی نوعیت کے سنگین ترین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس معاملے سے آگاہ ہوتے ہی میرا اسے خود پولیس کے حوالے کر دیتا۔ وہ غیر قانونی طور پر ممال تجارت کو ادھر سے ادھر کھانے کے کاروبار میں ضرور ملوث تھا لیکن اس کا میں وہ اندیشہ نہیں تھا اس جیسے کیڑوں جہازوں تھے جو بین الاقوامی طور پر اس سمندر میں غیر قانونی تجارت کے فروغ میں معاونت کے جرم تھے۔ وہ نہ سکتا تھا کہ اس کی حیثیت صرف ایک ملازم کی ہے اور کہیں میں اس جیسے ملازم پر حکم بحال لانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن اس نے ہمیشہ بین الاقوامی اصولوں اور اداروں کی

حیثیت کو تسلیم کیا کہ جہاز کا درجہ کسی بھی راستے پر سفر میں نہ سکتا تھا۔ انٹر لپ کی لائیو پر قبضہ کرنے اور علی کے افراد کو مارنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شاید کوئی ایسی ہی واردات کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس کے بعد دنیا میں جانے پنا کہیں بھی نہ رہے۔ خلاف قانون فعل و حرکت کرنے والے

ہمارے دھندے کرنے والے نمائندہ، مکے عالمی اصولوں سے کام چلانے میں یا پھر سیاسی بنیادوں پر ماستے کھلے کھتے ہیں۔

”محسن کے دلائل اور خود میری عقل نے مجھے قائل کیا کہ بیڈرو مجبور تھا ورنہ ہمارا بیڈرو چھوڑ دیتا اسے اپنے جرم کے آفاقی ہونے کا ڈھکا۔ وہ ہمارے بارے میں ایک نقطہ بھی کہتا تھا کہ اس کے پورے گروہ کی قتل و غارتگری کی روداد رٹا دیتے اور میرا ہمارے ساتھ جو کتا پیڈرو کو گرفتار کرتا اور وہ مزاحمت کرتا تو اسے کوئی مار دیتا۔ اسے قطعی ضرورت تھی کہ وہ کسی بین الاقوامی مجرم اور قاتل کو پناہ دے کہ وہ بھی شریک جرم نہ بنے۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بیڈرو اب کیا کرے گا؟ وہ ناموش رہے کہ کوئی خطہ کیسے مول لے سکتا ہے۔ وہ ابھی طرح جانتا ہوگا کہ ہم اس جہاز پر کس اعزاز کے لئے آئے ہیں۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا یا وہ ذاتی خطہ مول لے کر کھر اکو قاتل کرے کہ خود اس کی اور جہاز کی سلامتی خطرے میں ہے یا جو کرنا ہے خود کرے۔ اگر اسے شاہد چیل نہ نہ رکھا ہوتا تو وہ سارے معاملات کو اپنے کنٹرول میں لینے کے فیصلے پر عمل درآمد کر چکا ہوتا۔ شاہد چیل نے اُسے بروقت سمجھا دیا کہ معاملہ ایک میرا کا نہیں جہاز کا سب معاملہ اس کے خلاف تھا۔ آرا ہو جائے گا اور یہی بات پیڈرو کی حوصلہ شکنی کا باعث بنی تھی۔

”میرا بھی وہ کب تک رست لے گا۔ کیا اُسے معلوم نہیں کہ میں نے اسے ملٹ کا سر لٹھ بھجی گئی کا ہو۔ وہ خود جو بڑی دلاور کرنا چاہتا ہے۔ جہاز کسی بھی کینی کا ہو۔ وہ خود جو بڑی دلاور اندیشہ کے مال کا نگراں اور محافظ ہے اور ایسا کبھی نہیں ہونے کا کہ جہاز کے ساتھ کہ ڈروں کا مال ڈوب جائے تو کسی کپتان کو خاطر میں نہیں لائے گا؟ اگر یہ دیکھ کر کہ اس کی ناقصیت یا حماقت کی بنا پر جہاز کے پرچے اڑ سکتے ہیں اس کے لیے اس کے ساتھیوں کی موت نے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اکیلہ رہ گیا تھا۔ اس کا شن نا کامی کی نظر نہ ہوتا تو وہ ہم سب کو مارنے کا یا زندہ گرفتار کر کے اسی لائیو میں لٹا دیتا۔ اس نے ہم پہنچے تھے۔ اس کے سب ساتھی ہوتے تو ہر ایک کی سانی سے۔ اس میں اس کا تھی تھوڑا۔“ ”پر قبضہ کر لیتے اور میرا کی سانی کی دھریہ جاتی۔ علاؤ الدین بیڈرو کپتان ہوتا اور وہ جو

اب صحت حال کیسر پٹ گئی تھی۔ وہ خود بڑی شکل

سے جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ یہ ابھی تک ایک ناقابل فہم اور پراسرار واقعہ تھا کہ آخر وہ کسی گولی کا نشانہ بن گیا نہیں بنا اور پھر غائب ہونے کے بعد ہم سے پہلے اس جہاز پر کیسے پہنچ گیا۔ جس جہاز پر اس کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ قبضہ کرنا تھا اس پر ہم پہنچ چکے تھے۔ ہم مسلح تھے اور ابھی تک اس نے ہم میں خود کو دیکھا تھا۔ اسے علم نہ تھا کہ قبضہ کالم کے دو لوگ غالب اور نازد وہیں جولنا اور جاری کے نام سے جہاز پر سفر کر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم اس پوزیشن میں تھے کہ جہاز پر آسانی سے قبضہ کر سکتے تھے۔ پیڈرو کے شن کے پیچھے تھے کی نا کامی نے اُسے دوسرے مرحلے کی نا کامی کے خطرات سے دوچار کر دیا تھا۔ ممکن ہے جہاز پر خیریت کے ساتھ پہنچ جانے کے بعد اس نے میرا سے کپتان کا کابج لینے کا ارادہ ترک کر دیا ہو اور ابھی تک وہ کچھ نہ کرنا چاہتا ہو مگر ہم اس کے تعاقب میں فرشتہ اجل کی طرح پہنچ گئے تھے۔ اب اکیلا ہونے کے باوجود اس جیسے عیار اور خطرناک جرم کے لیے اس مشکل کا کوئی حل تلاش کرنا ناممکن نہیں تھا۔ اس کا شیطانی ذہن یقیناً کسی منصوبے پر عمل پیرا ہوگا۔ یہ احساس مجھے نڈر کر رہا تھا۔

”جب کافی آگئی تو میں نے محسن سے کہا: ”وقت ضائع مت کر۔ مجھے اس حرام ناز کے طرف سے کشش ہو رہی ہے۔“ ”میرا ارادہ کافی چنے کا نہیں ہے۔“ ”محسن بولا۔“ ”اس میں نہر ملا نہایت آسان ہوگا۔ کافی کے تلخ ذائقے میں پانی نہیں چلے گا۔“ ”پھر تو مجھ کیوں ہے؟“ ”میں نے کہا۔

”میں ریٹ اینڈ سی، یعنی انتظار کرو اور دیکھو کہ مقولے پر عمل کر رہا ہوں۔ شکاری کو نفسیاتی اور اعصابی جنگ کا اہل بھی ہونا چاہیے۔ یہ ایک دلچسپ مقابلہ ہے جس میں تین فریق ہیں صرف ایک فریق کا اصلی چہرہ سامنے ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی نظروں کے سامنے وہ خطرناک شکاری کس قسم کا کھیل کھیل رہے ہیں جو ایک دوسرے سے بھی واقف ہیں اور ایک دوسرے کے غوی غلام کو بھی جانتے ہیں مگر ابھی اپنی اپنی مجبوریوں کے باعث کھل کر سامنے آتے سے کہ تیز کر رہے ہیں۔“

”لیکن ایسا کھیل چل نہیں سکتا۔“ ”میں نے کہا: ”اس سے پہلے کہ وہ کچھ گزرنے میں اس صحت سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔“

”میرا نے کافی نائے گل کی طرف بڑھائی۔ وہ گل کو خاصی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور گل اپنے ذہن فرامی

”بھیکو ہتھیار ڈال دیں؟“

میں نے کہا: ”ایک کے بعد سب بڑی طاقت عقل کی ہے۔ ہم اسی پر انحصار کر سکتے ہیں۔ کیوں نہ ہمیں چاہیے؟“

”ہاں... ایک کا مسئلہ ہے... خود کشی کر لیں؟“ گل نے پریشان ہو کر کہا۔

”میں نے حرام موت کی بات نہیں کی تھی، میں نے کہا۔“ چلو جلدی کرو گل، تم وہیں لیٹ جاؤ، مہر کو دیکھو، یہ نچرل پوز ہے۔“

گل نے میری بات سمجھ لی۔ وہ اس جگہ کے پاس لیٹ گئی جو پہلے مہر کے ہاتھ سے گرا تھا۔ محسن جہاں تھا وہیں اٹنا لیٹ گیا اور میں نے دروازے کے قریب ایک جگہ پسند لی۔

شاہد جیل نے شکست قبول نہیں کی تھی مگر راحت ترک کر دی تھی۔ نہ جانے کیسے وہ اپنے اعمال کے رشتے کا مضبوطی پر انصاف یقین رکھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایک جہاز کا عمل ایک خاندان ہوتا ہے جس کا سر بلکہ کپتان ہو۔ اس کے لیے عقائد و نظریات کو آزمائشی کی کسوٹی پر پرکھ کر وقت کبھی نہیں آیا تھا۔ اور اس نے کبھی محض ہر شخص میں کی ہوئی کہ: ”وفا داری بشرط استوری اصل ایسا ہے۔“ کے مقولے کی صداقت پر

شک کرے اور اس خاندان کے افراد سے جس کا وہ خود بھی ایک رکن تھا، پوچھے کہ کبھی آپ پر اوقات آیا تو اچھے وقت کی طرح وہ سب ساتھ ہوں گے یا نہیں ہاس نے سوچا جو کچھ کر بھی ہوئی تو بچنے والی بات ہے!

مگر غرض فیصلوں کے طعنے میں اس پر ہنسنے والا جو بدلتے وقت کی حقیقت کو نہ دیکھے اور کم نہ کرے ایسی ہی شکست کا صدر اٹھاتا ہے۔ پتھر وہ اب اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ خدا

نکر ہے۔ اس بڑی جہاز کا سر بلکہ اعلیٰ اپنی وفاداریاں تہل کر چکا ہے اور مذہباتی دلائل سے وہ لوگ وفادار نہیں ہو سکتے جو دولت کی طاقت کے سامنے سر جھکا چکے ہوں۔

”خدا اور ضمیر کی بات چھوڑو، یہی پہنچ کے تم مالکوں سے کیا کہو گے؟“ شاہد جیل نے کہا۔

”کچھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ نہ جہاز نے اپنی منزل بدلی ہے نہ کوئی بات خلاف معمول ہوئی ہے۔ جہاز کا کپتان مر گیا ہے۔ وہ شراب بہت پیتا تھا اور دل کا مریض تھا۔ اس کا مر جانا کوئی انجیے کی بات نہیں ہوگی۔ ہم اسے سمندر میں ڈال دیں گے تو یہ بھی خلاف قاعدہ نہیں۔“

”مگر تم نے اسے کیوں مارا؟“ شاہد جیل بڑے دکھ سے بولا۔

”ایک تو وہ شک بہت کرنا تھا۔ پھر اس کی نظر میں بد وقت ایک گتے جتنی بھی نہیں تھی۔ پتھر مارنے کا ہراس سے میں نے ایک لاکھ میں سودا کیا تھا اور جو شخص ایک لاکھ دیتا ہے وہ تمہیں ہوتا مالک اور آقا ہوتا ہے۔ اس کی بات ماننی پڑتی ہے اور عزت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن معاملہ مجھے ذلیل کرتا تھا اور اپنی کبتانی کی دھمکی دیتا تھا۔“

”کیا اسے مار کے تم نے عزت حاصل کر لی؟ پتھر مار کے بچے میں زہر تھا اور نفرت کی آگ تھی۔ تمہارے ایک لاکھ بھی بچ گئے جو تم نے ان گھنٹا سانس کے جھوٹے ٹکڑے سامنے ڈال دیئے تم آقا اور مالک بن گئے ہو۔“

”اصل بات یہ نہیں ہے۔ پتھر مارنے کا یہ معاملہ کب مجھے ایک ملین کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا معاملہ ناموفق کر دیا۔ تم بڑھاکے پانچ لاکھ کر دیا تھا۔ دلال میں شاہد رسا دیتا۔ پانچ لاکھ کو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر وہ مجھے دنگل سے لے گیا کہ میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ جہاز کو بھی میں روکنے کا اور رسا سامان مضبوط کرانے کا یا وہ کسی غمیری پارٹی سے ڈیل کرے گا۔ انٹر پرائز والوں کو بتانے کا۔“

”کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟“

”ثبوت اس کے عمر سے میں جا کے دیکھ لو، یہی ثابت ہے کہ جہاز وہ اس نے انٹر پرائز والوں کو شپ پر آنے کی اجازت دی۔ ان سے شناخت نہیں مانگے ان کے سامنے میری ایک نہیں چلنے دی اور مجھے ذلیل کیا۔ طرح وہ مجھے دانا پاتا تھا۔ بتاتا چاہتا تھا اس نے اپنی دھمکی پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

چاہتا تھا کہ میں ڈر جاؤں اور اس سے بات کروں۔ اس سے کہوں کہ مجھے پانچ لاکھ دینے منظور ہیں۔ کیا سمجھا تھا اس خوف پر تپنے سے استاد پتھر کو اس جیسے دس ہزار میں دس تیرہ پانچ کے کہا ہوا۔ کیا ملا اسے استاد پتھر سے مل کر لے گا ایک لاکھ گئے اور جان بھگت میں گئی۔ میں کچھ تو لیاں کھیلنے والا نہیں ہوں۔ میں نے بکثرت انتظام کر رکھا تھا۔ میں تو گیس مرے دل کو کبھی نہ چھوئے گا قافل ہوں اور زہر میں ہمیشہ پاس رکھتا ہوں۔ کبھی مونیق کا انتظار تھا۔ جاؤ اور وہ ساری لاشیں دیکھ لو جہاز شاہد جیل کی استاد کی کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور پھر مجھے سونے

بتاؤ شاہد جیل کہ تم کس کے ساتھ جاؤ گے۔ ان لاشوں نے ساتھ یا ہمارے ساتھ؟“

”سوچنے کو اب کیا رہا ہے؟ شاہد جیل نے شکست زدہ لہجے میں کہا۔“ اس حرام میں سب گئے ہیں تو مجھے بھی اپنے

کپڑے اتار ہی دینے چاہئیں۔“

”تم نے صبح وقت پر صبح فیصلہ کر لیا۔ اب تم ان

جہاز کے کپتان ہو اور اسے پہنی کے ساحل تک سلامتی کے ساتھ پہنچانے کے ذمے دار ہو۔ میں تمہارے کام میں دخل نہیں دوں گا۔ عجیب تک تمہارا ہٹنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ عملہ بھی تمہارا ساتھ ہے۔ کار وہ سب حکم کے غلام ہیں۔“

”ہوس کے غلام کو؟“ شاہد نے کہا۔

”غلطی کسی کی ہو؟ غلطی ہے۔“ پتھر بولا۔ ”چلو اب آگے۔“ یہ سب گفتگو میں نے دروازے کے قریب لیٹ کر سنتی۔ دروازہ کھولا سا کھلا ہوا تھا۔ چنانچہ میں ایک ایک لفظ صاف سن سکتا تھا۔ اب میں نے قدموں کی آواز کو نزدیک بننے شناسا تو میں نے محسن اور گل کو اشارہ دیا اور خود بھی اٹھی کی طرح ”مر گیا۔“

پہلے میں ارادہ تھا کہ پتھر کو اندر قدم رکھتی ہی قاتل کر لوں گا۔ پھر باقی معاملات آسان ہوں گے۔ گل اور محسن کے ساتھ جب شاہد جیل بھی شامل ہو گا تو وہ ایس ایس کا سختی تھڑکے۔ غدار، تک حرام اور خود فروشی حملے کے لیے مقابلہ ناممکن ہو جائے گا اور بعد میں ان کو ایم آر ایس کی عدالت میں مقدمہ چلا کے باقاعدہ موت کی سزا دی جا سکے گی۔

لیکن پتھر رونے ثابت کیا کہ وہ بے وقوف نہیں ہے۔ وہ خود اندر نہیں آیا۔ اندر آنے والوں میں سب سے آگے خود شاہد جیل تھا۔ میں نے ایک آنکھ کو کھولا سا کھول کے دیکھا۔ وہ تصویر غم بنا جا رہا تھا۔ لاشوں کو دیکھ رہا تھا اس کے ساتھ مجھے کے تین ارکان تھے۔ وہ سب خفقت زدہ اور گھبرائے ہوئے نظر آتے تھے۔

”یہ سب تو مر چکے ہیں پتھر؟“ شاہد جیل نے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم مجھے سمجھو۔ اور اگر یہ تمہارے بے شک ہے تو پھر استاد پتھر کو مجھ کے مقابلہ کو پتھر ڈرے کرے گا۔ ہمارے کہا۔“

”میں مر؟“ شاہد جیل نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”کیا ممکن ہے ان لاشوں کے بارے میں؟“

”تھیں یقیناً ہے کہ یہ لاشیں ہیں؟“ پتھر رونے عیاری سے کہا۔

”کیا آپ کا یقین اس کے برعکس ہے سر؟“ شاہد جیل نے طنز سے کہا۔ ”آپ کہتے ہیں کہ یہ زندہ ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔“

”خود دیکھو۔ خود یقین کرو۔“ پتھر رونے لگا۔ ”السان کی نظر اسے ہوا کبھی دے سکتی ہے۔“

”میں نے دل ہی دل میں پتھر کو اس کی ہوشیاری پر اور انجیے کے ہمارے گاوی کی شاہد جیل کے رویتے نے بھٹو اور اس مالوس کی کیا تھا۔ اس کا ایک ماحول اسی کے

سامنے مروانہ دار مارا گیا تھا۔ اس نے پتھر کی اطاعت پر اور غدار کی کے الزام پر موت کو ترجیح دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاہد جیل حقیقی معنوں میں ایک فرض شناس ماحول کا شاہی انصر ہو گا مگر ثابت یہ ہوا کہ وہ بائیں کرستے ہیں۔ شاہد جیل اس جہاز پر پتھر کی ایک ضرورت تھا۔

پتھر وہ اسے نہیں مار سکتا تھا لیکن موت کے مقابلہ ہوتے ہی شاہد جیل کے سارے زبانی وہ مجھے نقشہ براب ہو گئے۔ اب وہ پتھر جیسے شدید بدمعاش اور مشہوری شیخ جیو کر مینہ کو سر نہہ رہا تھا۔ اچھے تلخ سہی اس نے مہر کی جگہ پتھر کو بات مان لیا تھا۔ اس شکست کو طنز و انداز احتجاجی انداز اختیار کر کے چھیلنے کی کوشش خود اپنا مذاق اڑانے کے مترادف تھا۔

”میں سب کی موت کی تصدیق کرتا ہوں اور یہ تصدیق بھی کر سکتا ہوں کہ ان سب کی موت نہ ہر کئی کافی پینے سے واقع ہوئی ہے۔“ شاہد جیل نے کہا۔ ”آپ ڈاکٹر ہیں؟“ مہر کو پوسٹ مارم کے لیے بولا سکتے ہیں۔ اگر میری بات پر اعتبار نہیں۔“

”کافی میں ایک خطرناک زہر تھا۔“ پتھر بولا۔

”کیوں نہ ان لاشوں کو میں جیوڑ دیا جائے؟“ شاہد جیل اٹھا۔

اس کی بات نے جتنا مجھے حیران کیا اتنا ہی پتھر کو کیا۔

”ہاں؟ کیا احقانہ تجویز ہے؟“ مشہور شاہد جیل نے یہ کیوں نہ کا کر لیا۔

جس میں میں لپٹا رہا ہوں گا۔ سو ری ایم رہو گے۔ کیا تم لاشوں کے ساتھ رہنا چاہو گے؟

”لاشوں کا کیا ہے؟“ کہیں بھی پڑی رہیں۔“ شاہد جیل نے بے نیازی سے کہا۔ ”بھجے ان سے ڈر نہیں گتا۔“

”انھیں یہاں سے اٹھاؤ اور میرے کمرے کے ساتھ دالے اسٹور میں بیچا دو۔“ پتھر رونے لگا۔ ”چلو تم دونوں پہلے

مہر صاحب کی ارضی اٹھاؤ۔ رام نام ست ہے۔ وہ اپنے مذاق پر خود ہی قہقہہ مار کے ہنسا۔ مجھے اس کے اندر نہ گرنے سے مایوسی ہوئی تھی اور اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنا پلان بدلنا پڑے گا۔

پتھر کی باتوں نے اور اس کی احتیاط سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہمارے معاملے میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے پر تیار نہیں آگرا۔ اس وقت میں اور محسن اٹھ کھڑے ہوئے تو صرف اٹھی کو مار سکتے تھے جو پہلے ہی مہر کی کے مارے ہوئے تھے۔ باہر سرخ کھڑا ہوا پتھر بالکل محفوظ رہتا اور ہم باہر تلے تو اس کی کوئی کا نشانہ بن جاتے۔ اندر رہتے تو بے بسی کی قید کا تھے۔

”ڈاکٹر شاہد جیل! پتھر رونے اچانک کہا۔“ تم باقی سب کی موت کا سرٹیفکیٹ بھی جاری کر سکتے ہو؟“

163

میرا دل ڈوبنے لگا۔ پیدرو نے ہندو ق شاہ جیل کے
 کندھے پر رکھ دی تھی۔ اب شاہ جیل کی کمرے کا؟ ایک زندہ
 آدمی کے لیے خودکودہ ثابت کرنا بھی اتنا ہی ناممکن ہوتا ہے
 جتنا کسی مرنے والے کے لیے خودکودہ ثابت کرنا۔ مجھے جسم زندگی
 کی حرارت سے معمور تھے اور نبض زندگی کی حرکت پذیری اور
 توانائی کا اعلان کر رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ جسم کو اڑانے
 ایک منٹ کے لیے سانس روک سکتے تھے لیکن ایسی طفلانہ
 کوشش سے کچھ حاصل نہ ہوتا اب میرے آئندہ اقدام کا
 انحصار شاہ جیل کے جواب پر تھا۔

وہ اپنے اسے صاحب کے پاس لے گیا۔

”جو بددلی ملازم ایک ذہین آدمی ہے، میں نے کہا۔“

”اس کے انداز سے درست تھے۔ مگر تم ان دونوں سے چھٹکارے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ میرا خاکہ درست تھا۔ ہم نے اسے اپنی رقم پیش کی تو اس نے کہا کہ یہ رقم اس کے بڑی بچوں کے کھانسی والی جانے۔ اسے تم پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ تم تنہا لیے ایک لاکھ افکار کرنے سے زیادہ آسان ایک گولی چلا نا ہے۔ تم اسے قتل کرو گے اور تمہارا فائدہ

باہمی کے لیے ضروری ہے۔
 "ہر اپنے اپنے کو بھی سمجھا کے ہو کہ مگر انا
 ایک حادثہ بھی باطنی موت تھی اس کا ہارٹ لینڈ
 میں نے شاہ جیل سے کہا۔
 ".... تو ٹھیک ہے لیکن اس سے زیادہ
 نہیں کر سکتا۔ شاہ جیل سے کہا۔ "مجھے جاز کے بارے
 میں کچھ معلوم نہیں۔"

وہ ہمیشہ مجھے سکندر رنجائی کہتی تھی اس وقت سکندر
 کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ رابعہ کا دل درنہا ہے پر کربلہ ہے،
 اس میں کیسے تانا کہ یہ کام آسان نہیں ہے جو عذاب اس
 سلطنتوں کی دیہ برداشت کیا تھا وہ بہت معمولی تھا رابعہ

اور دوست قدرت کی تابانہائی پر ہر گھٹا لرزے کے سوا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے پیدو کے احکامات کی لفظ بلفظ تعمیل کی تھی کہ شاید وہ میری طرف سے عدم اطمینان کا نشانہ کار تھا۔ تلاشی لینے والوں نے بغیر نوٹس دیے ادر بے سبب میرے سر پر ہرا اور کا دست مارا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میں دوار کے ساتھ پھسلتا ہوا نیچے گرا گیا مجھے اپنے فرش پر گرنے کا پتا بھی نہ چلا۔ غالباً ایسا ہی محسن کے ساتھ ہوا۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو بہت عجیب حالت

میں دیکھا میرے پیروں پر میرا جسم رکوع کی حالت میں قائم تھا لیکن اس طرح کو میں دو گھنٹوں میں بٹ گیا تھا میرا سر ایک گول شگاف سے گزارا گیا تھا جو درمیانی دیوار میں بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا۔ یہ شگاف میری گردن کے سامنے سے کچھ ہی بڑا تھا۔ اتنے چھوٹے سوراخ سے میرا سر نہیں گزر سکتا تھا چنانچہ سوراخ بڑھا رکھا گیا تھا مگر سر نکالنے کے بعد گردن پر اوپر نیچے لوہے کی سلاخیں فٹ کر دی گئیں تھیں گردن سے نیچے میرے بازو دھڑا اور ناخنیں دوسرے ٹھکڑے میں رہ گئے تھے۔

میں نے سر کو دائیں بائیں گھما کر دیکھا سیدھے ہاتھ کی طرف محسن کا سر کٹری کی دیوار میں ایسے لگا ہوا تھا جیسے شکار کے ہونے جانوروں کے ٹھکانے سے بھرے سردیواروں پر گھنٹا نظر آتے ہیں۔ میں اپنی گردن کو تھوڑا بہت آگے پیچھے کر سکتا تھا مگر اس سوراخ سے اپنا سر نہیں نکال سکتا تھا۔ اسی طرح میں رکوع کی حالت میں رہتے ہوئے جسم کو حرکت تو دے سکتا تھا لیکن صرف اس حد تک کہ ناخنوں کو تھوڑا سا آگے پیچھے کر سکتا تھا۔ میری ریشم کی بڈی میں تکلیف ابھی قابل برداشت تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اسی طرح میں ایک گھنٹا بھی نہیں گزار سکتا۔

دوسرے کمرے میں جو آٹھ فٹ چوڑا اور ساڑھے پانچ فٹ اونچا کھڑا ہوا تھا۔ ٹھکڑے کی خالی دیوار میں بالکھڑی کی بنی ہوئی تھیں اور بالکل سامنے والی دیوار میں ایک بند دروازے کے سوا باہر آنے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ٹھکڑے کی چھت میں ایک بلب روشن تھا۔

پیڈرو آہستہ آہستہ میرے قریب آیا اس کے لبوں پر دہری پرائی بُری خفاش شیطانی سکڑا ہوا تھا۔

کیا خیال ہے شاطر اعظم! بازی کیسی جارہی ہے؟ اس نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا تو میرے منہ سے میرا چہرہ سنسناتا لگا۔ تم کیج نہیں سکتے پیڈرو! اس نے میرے دوسرے کان پر تھپڑ مارا۔ بیچ تو میں اس وقت بھی گیا تھا جب تم مجھ پر گولیاں برس رہے تھے اور میں سمندر میں غرق نہ تھا۔

میرے سر کو ایک جھٹکا لگا۔ اوپر نیچے سے لوہے کی سلاخیں میری گردن میں گڑ رہی تھیں اور دائیں بائیں کٹری کے ٹھکڑے سے کنارے تھے۔ نہ میں سلاخیں توڑ سکتا تھا اور نہ کٹری کی دیوار میں تو پیڈرو کو جھجھکی نہیں سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پر جو میری طاقت تھی دوسرے کمرے میں قید تھے۔

”مہرانے کی بتایا تھا تمہیں؟“ پیڈرو نے محسن کے سامنے ہمارے کہا۔

”اس نے بتایا تھا کہ پیڈرو کے تین باب تھے۔ محسن بولا۔

پیڈرو نے اس کے منہ پر تین تھپڑیں مارے۔ رت پھوٹا۔

جھپٹا اور اس کی آواز خالی کمرے میں پٹا پٹا کی طرح سنائی دی۔

وہ پھر میری طرف لوٹ آیا۔ یہی سوال میں تم سے کرتا ہوں۔

”مجھے تو مہرانے بتایا تھا کہ یہ تمہاری خاندانی روایت ہے۔ سب کے تین باب ہوتے ہیں۔ میں نے کہا۔

پیڈرو نے مجھے تین تھپڑیں مارے۔ وہ پھر پٹ پٹ کے کہنے لگا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم اپنی ضد پر قائم رہو گے۔ ہمیشہ کی طرح سو یا ز اور سو جوئے کھاؤ گے۔ تمہاری مرضی! اس نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا اور دروازہ کھلنے کے ٹھکڑے سے نکل گیا۔

”محسن کیا تمہارا انداز ہے کہ اب کیا ہوگا؟“

”ہاں اب وہ کئی کولائے گا۔ محسن نے کہا۔ اور اس کے ساتھ...“

”محسن میں اسے بتا دوں گا کہ یہ راجہ نہیں ہے۔ میں نے کہا۔

”اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ محسن نے بڑی مشکل سے میری طرف گردن گھمائی وہ ہر صورت میں وہی کرے گا جو اسے کرنا ہوگا۔“

وگل اپنی جان بچا سکتی تھی۔ میں نے انہوں سے کہا۔ اگر وہ جانتا... مگر اس نے کوشش ہی نہیں کی۔

وہ ہمارا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ زیادہ اچھی بات ہے اور... جوصلے کی بات ہے۔

”ہم کسے پیچھے...“ میں نے کہا۔ اور یہ قطعاً سے مذہب کا نقصان ہوا ہے۔ جہاز پر آئے ہی ہو یا چھ مونس ملا تھا۔ ہم وہیں سب کو ٹھکانے لگا دیتے۔ سب کو جو تھے وہاں۔“

ہاں ضرورت سے زیادہ احتیاط بھی اچھی نہیں۔ ہم ناز اور غالب کی طرف سے نکر مند تھے کہ ہمیں وہ شکل میں پڑ جائیں۔ اب یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ جہاز پر ہی بھی جائیں۔

میری گردن درد سے بیٹھ رہی تھی اور میرے لیے یہی فکر اور دنا قابل برداشت ہونے لگا تھا۔ میں مجبور تھا کہ اپنے دھڑکے کو بوجھ کو ناخنوں پر اٹھائے رکھوں۔ اس سے میری آواز کے ٹھکڑے بھی اُٹھ رہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ کچھ دیر بعد

میں نے خود کو سمجھانا بالکل نامکن ہو جانے لگا۔ بے ہوشی سے میرا جسم ٹپک جاتے گا اور اس کا سارا بوجھ گردن پر آئے گا۔

جسلاخوں کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔ اگر میں گردن توڑنے سے نہ اتواراں سر کرنے سے ضرور مر جاؤں گا۔ اور یہ محبت کتنی ہوگی ایک گھنٹا زیادہ سے زیادہ دو گھنٹا یا تین گھنٹے۔ میرے ذہن پر بالکھڑی کے حالے پھیلنے لگے۔ ٹوٹی مکمل مندر۔ دروازہ کھلا تو میں چونکا مکمل اندر آئی اور ایک دم اس کی نظریں میرے اور محسن کے چہرے پر گئی جو سامنے سے دیکھتے ہوئے دیوار میں ٹپکے ہوئے نظر آتے ہیں گئے۔ اس کا چہرہ دہشت سے بدلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اندر آجائے والے پیڈرو نے اُسے دھکا دیا وہ منہ کے بل گر گیا۔

پیڈرو میرے سامنے آیا۔ تم سمجھو گئے ہو گے کہ اب کیا کروں گا؟“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ میں نے سکون سے کہا۔ اور راجہ بھی جانتی ہے۔ تم سے بے آبرو کر دے گا۔ اس کی انواریت کی کچھ پیر تبدیل کر دے اور مجھے مجبور کر دے گا کہ میں سب دیکھوں۔“

”اور تم اس کے لیے تیار ہو؟“

”اور میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں اپنی آنکھیں بند رکھ سکتا ہوں۔ کان کیسے بند رکھوں گا۔ میں تمہارا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہاں ایک کام ضرور کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا اور اس کے منہ پر ٹھوک دیا۔

وہ میرے اتنا قریب تھا کہ ٹھوک اس کی آنکھوں میں لگا۔

”اب دیکھو کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ پیڈرو نے مجھے بچ کر گالی دی اور پھر جیب میں سے کچھ نکالا۔ یہ ایک چھوٹا سا چمچ تھا۔ کھانڈا تھا۔ تھپڑا ایک بانٹ لہذا اس کی شکل جتنے کے سول جیسی تھی۔ اس نے چمچ کے چوڑے حصے کو ہاتھ میں پکڑ کر وہ چمچے کا کھڑا میرے منہ پر بار بار اس کی آواز پٹانے کی طرح سنائی دی اور مجھے یوں لگا جیسے میرے ایک گالی گانگے دھکنے لگے۔ میں جن سے یوں متوسس ہوتا تھا جیسے چوڑے کے ساتھ میری کھال بھی اُتر رہی ہوگی۔ گل سے تھوڑا سا اس اٹھانے کے دہشت سے کانپ رہی تھی اور زبردستی بھی ایک پیچ مارا۔ پیڈرو نے میرے دوسرے گال پر وار کیا۔ پھر پیلے گال پر ہر ضرب کے ساتھ میرا سر جھٹکے کھانا مارا۔

میرے دیکھو۔ پیڈرو نے اس چمچے کے ٹکڑے کو میرے

سامنے لایا۔ یہ تمہارا غنیمت ہے۔“

میں نے خواہتے ہوئے چمچے پر نظر آنے والے سرخ دارغ کو دیکھا۔ یقیناً میرے چہرے کی کھال پھٹ گئی تھی۔

”جاننا ہے۔“ پیڈرو چلا آیا اور اس نے سول جیسے چمچے کو میرے منہ پر رگڑ دیا۔ خون کا ایک قطرہ رخاں سے بہ کر ٹھوڑی تک پہنچا اور نیچے ٹپک گیا۔

”اب بتاؤ۔ تم نے تھوٹ لوٹا تھا یا سچ؟“ اس نے میرے بال پکڑ کر کہہ کر جھٹکا دیا۔

”میں نے کہا۔“

”مہرانے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ سب تمہارے دماغ کی اختراع تھی۔“

”تھیں... جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”وہ جھوٹ تھا یا سچ؟“ پیڈرو چلا آیا۔

”وہ سب سچ تھا۔ میں نے کہا۔“

پیڈرو نے دوسری جیب میں سے ایک شیشی نکالی۔ اس میں ایک بے رنگ مایوں تھا۔ یہ معلوم اس نے میری آنکھوں پر ٹپکا دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تیزاب ہوگا لیکن وہ نمک کا پانی تھا۔ یہ بالی میرے رخساروں کی جھٹی ہوئی کھال تک پہنچا تو میرا چہرہ بھر آگ میں جلنے لگا۔

”بولو وہ جھوٹ تھا۔“

”وہ... سچ تھا...“ میں نے درد سے ٹپپتے ہوئے کہا۔ مشکل یہ تھی کہ میں سر کو کٹ بٹا تھا تو خود اپنی ہی گردن زخمی کرتا تھا۔

گل اب ناز و قطار ور رہی تھی۔ اس نے ایک بار پیڈرو پر حملہ بھی کیا مگر پیڈرو نے ایک جھٹکے سے اسے پیچھے در پیچھٹ دیا۔ میرے بعد محسن کی باری آئی۔ اس کا چہرہ بھی ہولناں ہو گیا۔ عمر پیڈرو اس سے بے تسلیم نہ کر سکا کہ ہم نے مہرانے کے بلانے میں جو کمائی سنائی تھی اس کی بنیاد جھوٹ پر تھی۔

بالاخر اسے یقین آگیا کہ مہرانے ہمارا ساتھ دیتے ہوئے بھی جہاز میں کہیں آتش کی مادہ چھپا ہوا تھا اور ہمیں مطلع کر دیا تھا۔ چنانچہ ہر طرف بارود کو چنگاری کھلانے کے لیے پہنچے تھے۔ اگر پیڈرو کا یقین اس کے عکس ہوتا تو اس کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہ ہوتی۔ اب اسے احساس تھا کہ مہراور میں کیا کہیں معلوم نہیں جہاز پر اس کے علاوہ کون ہمارا ساتھی ہے۔ وقت کم تھا اور وہ اتنے بڑے بھری جہاز کی تلاشی نہیں لے سکتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جہاز

172

جسم پر سے ایک ایک ریشہ جتن لیتے ہیں۔
 "سکندر" گل نے چلائے گئے تھا "خدا کے لیے"
 "پیڑرو! میں تافول گا" میں نے محسوس کیا کہ گل کی ہکار
 میرے دل میں انگڑائے کی طرح اتر گئی ہے۔
 "نہیں نہیں۔ تم کو رالید کی قسم" گل نے چلائے کہ "ما تم"
 کچھ نہیں بتاؤ گے۔ تم کو اس محبت کی قوم جو تمہیں رالید سے ہے۔
 تم ہار نہیں سناؤ گے۔۔۔

میرا لہو رگوں میں سر دوڑنے لگا۔ منجھد ہونے لگا۔
 گل نے مجھے وہ قسم دے دی تھی جسے میں نہیں توڑ سکتا
 تھا۔ اور یہ قسم بھی اس نے اپنی ہوشیاری سے دی تھی کہ
 پیڑرو کو کچھ معلوم نہ ہوا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ مجھے خود رالید نے
 اپنی قسم دی ہے۔

گل اب ہر طرف لوٹ رہی تھی وہ پیروں پر کھڑا ہونے
 کی کوشش کرتی تھی اور کوجانی بھی کچھ جھوٹے اس کے جسم
 کے نیچے دب جاتے تھے۔ باقی پھر اس سے چھٹ جاتے تھے۔
 اس کا سارا بدن لال چہونٹوں سے بھر گیا تھا۔ وہ سب
 اسے کاٹ رہے تھے اور وہ بڑی طرح چیخ رہی تھی اس
 کی اذیت میرے لیے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔

اجانک میں نے اپنے پیچھے کچھ آوازیں سنیں کسی کے
 ہاتھ میرے جسم کو ٹٹول رہے تھے۔

"اچھی طرح دیکھ چاری" کسی نے کہا "ان کے پاس
 بھی وہ بلیٹ ہوگی جس میں باسپورٹ تھا اور پیسہ تھا"
 "دیکھ تو رہا ہوں" چاہتے نہ کیا اور اس آواز کو سننے ہی
 میری ساری اذیت دُور ہو گئی اور میری تمام مایوسی ختم ہو گئی۔
 یہ غالب کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ زندہ تھا اور آزاد
 تھا اور میرے اتنے قریب آنے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ
 وہ کچھ نہ کرے۔

"ایسے مت دیکھ ان کے کپڑے اتار لے" جل ہٹ
 میں اتار رہا ہوں کپڑے۔ تو سلاشر مانا ہے چھو کر یوں ہی طرح۔
 دوسرے شخص نے کہا اور چند منٹ میں میری پتلون بھیچ
 لی گئی میرے پیروں کو ایک جھٹکا لگا "دیکھا تو نے ہاتھ
 خوش ہو کے بولا یہ میری بلیٹ" اب اس کو دیکھو "مجھ بولنے
 والے کے آواز ایک دم بند ہو گئی۔ میں نے ایک ایسی آواز سنی
 جیسے کوئی کھڑے کھڑے گر گیا ہو۔

"سکندر" غالب نے آہستہ سے کہا "بس تھوڑی سی
 دیر اور... جو صدمہ ہارنا"
 میرا دوجو مایوسی کے گھٹپ اندھیرے میں معلق
 تھا کیخفت سکون اور امید دینے والے اُجالے میں اتر گیا۔

فوج حذبات سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرا لہو
 آزمائش کی گھڑی میں تنہا نہیں چھوڑتا اور میرا جھوٹا کمال
 ہے۔ میں نے شکر گزاری کے جذبات سے مغلوب ہو کر
 سوچا۔ غالب کی آواز نام لڑتے بہت صبح میں جھٹکے اور
 کے لیے صبح کے اُجالے کی نوید کے ساتھ سنا دینے والے
 آواز اُزال سے کم نہ تھی۔

محسن نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اذیت کی
 کے باوجود دم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے
 وہ سب کچھ دیکھا جو الفاظ کا محتاج نہ تھا۔ گل اب یہ بڑ
 ہو چکی تھی۔ اس کا جسم ایک حد تک ہی مزاحمت کر سکتا
 اور تکلیف برداشت ہو سکتا تھا۔ احساس کے فنا ہونے
 کے بعد وہ کھڑکھ درو سے بے نیاز بنے جس وجہ سے بڑ
 اور وہ آدم خود غری جیونے جو اس کے جسم سے گرفت
 ذو ذہن کو بچ جانے کے لیے اپنے تیز دھار والے (دھن)
 بھر پور استعمال کر رہے تھے اب بھی اپنے کام میں
 مصروف تھے۔

آہستہ آہستہ چہونٹوں کی بیڑ چھٹنے لگی تھی کچھ
 جیونے شکم میرے ہوس کے الگ ہوئے، پھر کچھ اور جیونے
 نیچے اتر گئے۔

کسی کے ہاتھ نے میرا جھوٹا ہاتھ تھام لیا۔
 کپڑا اور سنبھال کے رکھ اسے روکوا کرتے ہیں "غالب نے
 گلو کی دیوار کے پیچھے سے سرگوشی کی۔ اس کے لہو اور
 میرے کانوں کے درمیان ایک ڈھڑکا اچھوٹے تھے
 دیوار حائل تھی چنانچہ میں اس کی سرگوشی کو نہیں سن سکا
 لیکن اس کی صورت کا مدد تصور ممکن تھا۔ روکوا کر
 سینے کے ساتھ لگا لیا اور اس طاقت کے ساتھ ہر
 وجود میں پھر وطن دشمنوں کے خلاف نفرت اور عداوت
 کا آتش فشاں بھڑک اٹھا۔

میری نظروں نے گل کو دیکھا اس مقدس جگہ
 آج تک پہلے سے ساتھ لڑنے والوں کا شوق شہادت
 جذبہ سرفروشی ہمیشہ قابل رشک رہا تھا۔ کرجان جیسے کوئی
 توبہ دام بیچ دی گئی اس درمزم گاہ میں نوادر تھے جہاں
 بھی رالید کی طرح ثابت کیا تھا کہ اس کا خدا نا قابل شک
 ہے اور شکاری اس کے جسم کو شکار کر سکتے ہیں مگر اس
 یقین اور اس کے ایمان کو نہیں مار سکتے۔

چوہنے اب اس کے جسم پر سے اتر گئے تھے۔
 کے پیٹ گل کا خون پی کے اور اس کے نازک بدن کا خون
 کھلے کھلے بھر گئے تھے۔ اب وہ اپنے غری پیچھے جھار

نئے اور اپنے لبوں پر دکھائی دے رہے والے لہو کو جاتی ہے
 تھے۔ گل کا جسم خون رنگ ہو گیا تھا اس کا اینٹا خون اس کے
 ہاتھ بدن پر ایسے پھیلا ہوا تھا جیسے کسی نے شجرے شوح
 ہاتھ کے برش سے اسے پیٹ کیا ہو۔
 لال رنگ کے تمام کارروائی سے بے خبر خود درمیان کی دیوار کے
 جی جاری تھی استاد پیڑرو ایک فاتحانہ نشان کے ساتھ اپنے
 ہاتھ کے پیچھے باندھے کھڑا تھا اور میری طرف دیکھ کے
 سکرا رہا تھا۔

"پیڑرو خدا کے لیے رالید کو بخش دو" میں نے بے حد
 منظم من سے اور شکست خوردہ لہجے میں کہا "اس کی ہر گھٹ
 گنہ گاری باری بھی آئے گی۔ آئے گی کیوں نہیں" وہ بولا
 محسن نے چلائے کہ "باری تیری بھی آئے گی..." اس
 نے بڑو کو فوش ترین کالیوں سے نوازنا شروع کیا جس سے یہ
 ناہوتو تھا کہ اس کی قوت برداشت جواب دینے لگی ہے
 اور گل کی اذیت کے احساس نے اسے پاگل کر دیا ہے۔

پیڑرو دیر سے سامنے آگیا "وقت تم ہے سکندر تم کو اپنی
 مذہب ثابت ہونے ہو۔ پہلے تم صلیب کی بات کر رہے تھے اب
 میں تم کو دوسرا موقع دے رہا ہوں کہ اس بازی کو برابر سمجھو
 جیسے جاؤ مجھے بتا دو کہ وہ تم کہاں ہے۔ کسی بھی طرح مجھ
 سے ضمانت لے لو کہ میں تم کو کھلی جانے کا موقع دوں گا۔
 اس بار نہ کوئی میت نہ کوئی بار۔ زندگی رہی تو میں چلے گئے۔ مگر تیر
 ہی کل ہے جب تم زندگی کے مواقع ضائع نہ کرو۔ آخری فتح
 باختری شکست سے پہلے ہی خود کشی کیوں کرتے ہو؟

اس کے انداز گفتگو میں نمایاں تبدیلی آئی تھی اب وہ
 سنتے سے نہیں دوسرا نہ عاجزی سے کام لے رہا تھا۔ مجھے
 دلائل سے قائل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں اسے
 باتوں میں اٹھاتا اور جھوٹ کے جال میں گرفتار رکھتا تھا۔
 تھانیں میرے ذہن میں ایسی کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی جس
 سے ٹپا سنے لے آزادی اور تحفظ کو یقینی بناسکوں میرے
 مقابل کوئی نام آدمی نہیں پڑ رہا تھا جو استاد کھانا تھا اسے
 بلدو فظ بنا نا آسان نہ تھا۔

"میں تم کو ایک موقع اور دوں گا"
 "ایک اور موقع..." میں نے حیران ہو کے کہا۔
 "ہاں۔ ابھی تو سلاشر اُڑاؤ بیختم ہوا ہے، وہ بولا "یہ بہت
 غور سے سمجھنے تھے اور ان کا پیٹ بھی شہد سے
 کی گھبراہٹ تھا۔ خون اور گوشت کو ان چہونٹوں نے صرف
 بھلے ہوئے
 مجھے تو لیا لگا ہے کہ بالہم چکی ہے۔ میں نے کہا۔

"نہیں۔ زہم بہت معمولی ہیں خون زیادہ پھیل گیا ہے
 اس لیے تم کو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ پیڑرو نے کہا۔ "اگر تم ان
 کی بات کرو تو میں ترس کو اور ڈاکٹر کو جواں سکا ہوں وہ اس
 کے زخم صاف کر دیں گے جسم پر دوا مل دیں گے اور آدھے
 گھنٹے یا ایک گھنٹے میں رالید تم سے بات کر سکے گی۔ لیکن
 زخم خود آندہ مل نہیں ہوں گے کیون چند دن کے علاج سے
 سب ٹھیک ہو جائے گا"

اس کی بات میں امید کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ گل
 کے بدن پر کھیلے ہوئے زخموں کے لالہ زار کا نظارہ کتنا ہی
 دوح فرسایوں نہ ہو اس کی حالت تشویش ناک نہیں۔ دوسرے
 یہ کہ میرے اقرار کی صورت میں ترس کے دوب میں نازدوی
 ڈاکٹر کے ساتھ آئے گی۔ لیکن پیڑرو کو میں کیا بتاؤں کہ ہم کہاں
 ہے جب کہ ہم کہیں بھی نہیں ہے۔ جب تک اسے ٹائم کم
 نہیں ملے گا وہ کہیں کوئی رعایت نہیں دے گا۔ اگر ٹائم کم
 کہیں ہوتا اور میں اسے صبح جگہ لے جاتا تو پھر اسے
 رعایت دینے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ وہ کوئی اصل اور
 وعدے پر قائم رہنے والا آدمی ہوتا تو استاد پیڑرو جسے
 کیوں کھلاتا۔

"جلدی بولو کہ کیا سوچا ہے تم نے؟ درنہ... اس نے
 دھمکی کو نامکمل چھوڑ دیا۔

"ورنہ تم کو مار ڈالوں گے" میں نے کہا "مار ڈالو۔
 تاکہ اس کی جان اس عذاب سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے"
 "ایسے نہیں سکندر اعظم" رالید اور ایک ساتھ دو گے
 گہریت زیادہ دُکھ اٹھا کے "پیڑرو دستبردار ہو کے بولا "اچھی
 بہت دم ختم ہے تم میں۔ اگلا داؤد پندر رالید دیکھے گی۔ جب یہی
 چوہنے تمہارے جسم کو چاٹیں گے اور وہ بھی اتنی ہی پس
 ہوگی جتنے تم ہو۔ میرے پاس دوسرے لاؤنڈ کے لیے چوہنوں
 کی دوسری فوج ہے"

"میں اس کے لیے تیار ہوں..." میں نے اسے چیخ
 کہ ایک گالی دی۔

اصل میں فوری طور پر اس عذاب سے نجات چاہتا
 تھا جس میں میرے ساتھ محض بھی گرفتار تھا۔ میرا اور ک
 دھڑکے تو بے مفلوج ہو چکا تھا۔ میری گردن درد سے آکڑھی
 تھی اور جتنے کے گھڑنے کناروں نے میری گردن کی کھال کو
 لٹھیر کر اٹھا۔ گردن سے نیچے میری ریڑھ کی ہڈی اب میرے
 جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہی تھی اور میرے پیروں کی
 طاقت جواب دے چکی تھی۔ چنانچہ میں بار بار نیچے جھٹکے لگا
 تھا۔ ہر بار جھٹکا میری گردن میں آتا تھا اور میری ٹھوڑی مریغ

سے لکرائی تھی تو میں پھر ناخون کو گھسیٹ کر آگے لاتا تھا اور کوع کی حالت میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہوجاتا تھا۔

آہستہ آہستہ میرے لیے اس حالت میں قدر ہوتا نہ کہ ہوتا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ جب تک میرے ہاتھ میں ریلو اور نہیں تھیں اسے ہاتھوں کو ولوار پر پھیل سکتا تھا لیکن ولوار پر ہمارے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ میرے ہاتھ سپاٹ ولوار پر سے پھسل جاتے تھے۔ اب میں نے ہاتھوں میں ریلو اور درج لکھا تھا میں جانتا تھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے میں اس کی طاقت کو آزمائوں۔ یہ نہ ہو کہ غائب کچھ کرنے سے پہلے ہی ریلو اور استعمال کرنے کے قابل نہ رہوں۔

پیدرو نے دوسرے راؤنڈ میں میرے جسم کی قوت برداشت آزمائے گا کہ ریلو دیا تو میرے لیے اسے استعمال کرنا ضروری ہوگا تاکہ وہ مجھے اس شے سے نکلے اور اس دوران میں غالب یا نازو کا بلان بھی میرے سامنے آجائے تو ہم سب مل کے کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ غالب کا کچھ چاہنا تھا کہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟

پیدرو نے دروازہ کھول کے چلا نا شروع کیا۔ "نرس! آؤ کی چھی۔ تو کہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟ اس نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ وہ ایک جھٹکے سے اندر آگئی۔

"... اس نے ہی کہا تھا کہ... تیار رہنا!" نازو نے خوف کی بہترین ادا کاری کا مظاہرہ کیا۔

"اور وہ کہاں ہے تیرا ضم۔ چارلی؟"

"مجھے... نہیں معلوم ہے۔ نازو کا کپٹے ہوئے لولی۔

"جل جا اس.... ڈاکٹر پیدرو کی کو بلا کے لا اور دیکھو"

اس عورت کو آدھے گھنٹے کے اندر اندر ٹھیک ہوجانا چاہیے پیدرو نے کہا۔

نازو نے سخت دہشت کے عالم میں ان چیزوں کو جھاڑ دیا جو اس کے کپڑوں پر چڑھ گئے تھے اور اب بوسے کین میں پھر رہے تھے۔ اس نے فرش پر پلو لمان پڑے ہوئی گل کی طرف دوسری بار دیکھنے کی جرات نہیں کی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ مجھے توجہ بھی ہوا اور غصہ بھی آ یا کہ اتنی مہلت ملنے کے باوجود نازو بمکی بن کے آسٹو پیدرو پر نہیں گری۔ ابھی تک وہ ایک بڑل اور بے وقوف نرس کے عوار کو سب موقع کے انتظار میں بیٹھا رہی تھی اور شاید وہ مناسب وقت ابھی نہیں آیا تھا جس کا اسے بھی غالب سے زیادہ انتظار تھا۔

"بات میں پیدرو نے اسے دروازے میں لاکر لیا۔ تین چیزوں کو پیر چٹک کے پھیل دیا جو اس کے خوب پر چڑھ گئے تھے۔ چارلی کو بلانا کہ اس پر سے لاسے اور ان سب کو صاف کر دے۔

"جی... میں ہر نازو نے کین کے فرش پر پھرنے والے اور ولواروں پر چڑھنے والے چیزوں پر نظر ڈالا۔ ایک سیکنڈ کے لیے اس کی اوپر میری نظر ملی۔ وہ ایک ٹھوکر جوتھان پر لگا ہوا تھا۔ کچھ گئی۔ میں نے اس کے لبوں کی بے نام سکرپٹ میں امید کی روشن کرن کو دیکھی اور غیر ارادی طور پر مسکرانے لگا۔

پیدرو نے مجھے دیکھا اور میرے پلٹ کے دیکھا تو نازو غائب ہوجاتی تھی۔ ایک چیز ٹائمر سے قریب آ یا اور میری گردن پر چڑھ گیا۔ اس کے پیچھے میری کھال کی خراشوں کی کوئی طرح چھینے لگے۔ پیدرو دوسرا چوٹا کان کی طرف سے اٹھارے میں سے گال پر بلا تکلیف اتنی نہیں تھی جتنی جڑی چٹائی نے مادی پیدرو کے ہونٹوں پر ایک برٹھف مسکراہو تھا۔ "کچھ اندازہ ہوا کہ مبالغہ نے کتنی تکلیف برداشت کی ہوگی! یہ باتا ہوں میں کہ وہ بہادر عورت ہے۔" پیدرو بولا۔

ساتھ دتی... "بھو دو۔ البتہ ہوتی۔ میں نے کہا۔" رالڈ تو ماہ سے کہ طاقت کا جوہت کی طاقت کا جس نے مجھے ہتھ مارا تھا۔

میں سکندر اعظم بنا دیا۔

"ابھی کچھ دیر میں تم دیکھو گے کہ کتنی چیز ٹول کی فوج کے مقابلے میں سکندر اعظم کتنی عمو اور ادنیٰ ہے۔ پیر

کے ہاتھی نہیں معمولی چیزیں ہیں جو بالائے تہ کو اور رالڈ آجائیں گے۔ ہتھاروں کو شست سب جٹ رجائیں گے۔

آخری راؤنڈ ہوگا تب تو دونوں ایک ساتھ مردے کے تھکے۔

اس شکر کا مقابلہ نامکن ہوگا جس میں ہزاروں جھوکے بیونے

شا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ ان باتوں سے وہ صرف مجھے دہشت

کر رہا ہے اور میرا حوصلہ توڑنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے اپنا

کا موقع دیا۔ شاید غالب اور نازو کو ابھی مزید مہلت دلائی

"تھیں یہ معلوم پیدرو کو تھا اسے پاس کتنا وقت ہے۔

میں نے کہا: تیسرے راؤنڈ سے پہلے ہی ہمارے کچھ بچے

سکتے ہیں۔

"اڑنے دو۔ پیدرو نے ظاہری بے پروائی کے ساتھ

"ہم ایک ساتھ ہی مر گئے۔ ہمارے مقابلے میں میرے

ہی مجھے میں جیتے ہوئے خوب جاؤ گے۔ ہاتھ پر بلا ٹھیکز

نہیں آتا۔ کھسکا ہوں کہ کسی شے کا سہارا کی تاکے کا سہارا بھی

نہیں تھیں۔ تو یہ کر نکل جاؤں۔

نازو کے اندر آنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

نازو کے ساتھ دو افراد اسٹوکر لیے اندر آئے۔ ان میں سے

ایک چارلی کے دہک میں غالب تھا۔ دوسرا ڈاکٹر پیدرو تھا۔

ان دونوں نے گل کو اٹھا کے اسٹوکر پر ڈالا اور دروازے

سے باہر لے گئے۔ پیدرو اپنے ہاتھ میں ریلو اور لیے ٹھیکر

نازو کے لیے اب مجھے شعل کرنے لگی تھی۔ میں جھٹکا

اور ماوی کا شکار ہو رہا تھا۔ کیوں کہ میرے لیے اپنی جانی

ادیت سے نجات کے انحصار کا وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا جا

رہا تھا۔

محسن کی خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ اپنے ہوش و حواس

برقرار رکھنے کی جدوجہد میں ناکام ہو گیا ہے۔ اب مجھے اس

کی طرف سے بھی ٹھیکر لگتی ہو گئی کہ میں ہر قسم کے وزن کو برداشت

کرنے والی گردن پر دیا فائنا نہ بڑھ جائے کہ سانس کی آمد و رفت

رک جائے۔

ابھی تک باہر سے کسی کی چیخ مٹائی دی۔ پھر ایک فائر ہوا۔

پیدرو جو پہلے ہی چوہک بڑھا تھا ریلو اور ہاتھ میں ہتھ مار کے دانے

کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے کو تھوڑا سا کھولا اور باہر چاہا

کہ دیکھا۔ باہر ایک مکمل خاموشی تھی لیکن پیدرو کی صورت پر

تشویش کے آثار نمایاں تھے۔

"چارلی! پیدرو نے چلا کے کہا۔" یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اس کی بات کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ دوسری بار اس

نے پیدرو کی کھال پر چڑھ کر باہر نکل گیا۔ انتظار کا ایک طویل

انصاف شن وقفہ آج میں میرے کان ہر آہٹ پر بگے

رہے اور میرا دل بے قراری سے دھکتا رہا۔

بالآخر میں نے اپنے پیچھے آواز میں نہیں لیکن میری بالائی

کا نشانہ نہ رہی جب میں نے پیدرو کو حکم دے کر شاکم کی تعمیل

کرنے والوں نے مجھے اس شے سے نکلنے کی کارروائی شروع

طور پر دیکھ کر ہاتھ میں اس ریلو اور کا بے دریغ استعمال کرتے

ہوئے ان سب کو وہیں ٹھکانے لگا دوں جو مجھے اپنے سامنے

نظر آئی یا میرے کا لیتے ہوئے انتظار کروں۔ عین وقت پر

مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔

تختہ جیسے ہی میری گردن سے مہڈا ہوا میں نیچے گر گیا۔

یوں جیسے میں بے ہوش ہوں اور میرے جسم کی قوت برداشت

پہلے ہی جواب دے گئی تھی۔ اس سے مجھے فائدہ ہوا۔

"اسے چھوڑ دو۔" پیدرو نے حکم دیا۔ اس دوسرے کو

نکال لو پیٹے۔ وہ بھی نہ مرنے دے گا۔

حکم کے غلام دوسری طرف چلے گئے۔ مجھے یقین تھا کہ

اس وقت پیدرو کی توجہ میری طرف ہوگی۔ کوئی حرکت

کے بغیر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ہلایا جو میرے جسم

کے وزن سے دب گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ایک ہاتھ کو

اپنے گریبان تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ ریلو اور کو

میں نے فیص کے اندر ڈال دیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ کر

بھی نہیں سکتا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد مجھے دو افراد نے لنگوں کے

نیچے ہاتھ دے کر ایسے کھینچنا شروع کیا جیسے میں زندہ

انسان نہیں ایک لاش ہوں۔ میرے پیر پھیلے ہوئے تھے

اور فرش پر گر گئے جا رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق

وہ چار افراد مجھے ادر مسن کو لے جانے کے لیے آئے

تھے۔ ان کی قیادت خود پیدرو کر رہا تھا۔ ایک آنکھ کو تھوڑا

سا کھول کر دیکھنے پر میرا خیال درست نکلا۔ ہم اب ایک ٹنگ

ماہماری سے گزر رہے تھے۔ سب آگے مجھے کھینچنے والے

تھے۔ پھر محسن کو کھینچنے والے۔ پیدرو ہاتھ میں ریلو اور لیے سب

کے پیچھے تھا۔ مگر انسانی سستہ تھا۔

ریلو اور کی موجودگی کا ابھی تک کسی کو علم نہیں ہو سکا

تھا جو میرے سینے اور پیٹ کے درمیان تھیں کے نیچے پیدرو

تھا غالب محسن کے پاس کچھ نہیں تھا۔ غالب اسے کیسے تسخیر

کر سکتا تھا جب کہ وہ ہوش میں ہی نہیں تھا۔

جب مجھے فرش پر ڈال دیا گیا تو ایک آنکھ کو تھوڑا سا

کھول کر دیکھنے پر مجھے مقابل کی ولوار میں چھانچ قطر کے دو

سوراخ نظر آئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے انہی دو سوراخوں میں سے

میرے ادر محسن کے سر باہر نکلتے ہوئے تھے۔ شاید میں نکلتے

کے بعد ولوار کے پیچھے وہ تختہ پھر نصب کر دیے گئے تھے

جن میں ہماری گردنیں پھنسی ہوئی تھیں۔ وہی عقوبت خانہ

تھا جس میں کچھ دیر پہلے گل کو شہد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

پہلے ہم تماشائی تھے غراب تماشا بننے والے تھے۔ شک کی کوئی بات نہ تھی کتاب میرے ساتھ تھی وہ سب ہو گا جو گل کے ساتھ ہوا تھا۔ مجھے بے لباس کر کے میرے جسم پر بھی شہد ملا جائے گا پھر وہ جھوٹے چہرے لائے جائیں گے اور گل کو لایا جائے گا کہ یہ سب دیکھئے۔

اس خیال نے میرا دماغ الٹ دیا میرے لیے ممکن ہی نہ رہا کہ میں صبر اور ضبط کا مظاہرہ کرتا رہوں اور کچھ نہ کرنے کی یادداشت میں اس موقع سے بھی محروم ہو جاؤں جو غالب نے جان تھیلی پر رکھ کے مجھے فراہم کیا تھا۔ ان کا کیا بلان تھا کہ کوئی پلان تھا یا نہیں تھی۔ میں کیسے جان سکتا تھا ممکن ہے غالب اور نازا اس انتظار میں ہوں کہ ہم کچھ کریں۔ ازواج انتہی تھی کہ خالی ہاتھوں سے بھی میں اپنا دفاع کر سکتا ہوں کی تھی تو اسے کی جو غالب نے فراہم کر دیا تھا۔ پھر اب انتظار کیا؟ خوف کیا اور نہ مذہب کیوں۔

دو افراد پتھر دے کر میرے کپڑے اُتارنے کے لیے مجھ پر پھینچے ہی تھے کہ میں تیراب کے اٹھا محاذ جنگ کا پورا نقشہ میرے ذہن میں تھا اور میں طے کر چکا تھا کہ میری حکمت عملی کیا ہوگی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتے یا پتھر دیکھ سبھتائیں

نے ایک کی گردن دہریج کے جھٹکا دیا اور دوسرے کو تھوڑا سا گھوم کے لات ماری۔ وہ میرے اندازے کے عین مطابق سیدھا پتھر دیڑی طرف گیا اور اس سے ٹکرا گیا۔

پہلے شخص کو میں نے بلے تاخیر اور پراٹھا دیا اور ان دونوں کی طرف اچھال دیا جو محسن پھینچے ہوئے تھے۔ پہلا فائر میڈرولے

کیا وہ لڑکھڑاکر گرتے ہی سنبھل گیا تھا۔ اس کی گولی نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ گولی اس کے اوپر گرنے والے نے اپنے جسم پر روک لی۔ اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور ایک عجیب حرکت کی کہ پتھر دوسرے چھٹ گیا۔

محسن یہ شور مارتا پڑا ہوا تھا۔ اس کو اندر لانے والے

اس اچانک حملے سے لو کھلا گئے تھے جب انھی کا ایک ساتھی اُڑتا ہوا آیا اور ان سے ٹکرا یا تو ذرا سی دیر کے لیے وہ آپس میں لہجے گئے جس شخص کو میں نے چھینکنا تھا وہ گردن ٹوٹ جانے کے باعث پہلے ہی مر چکا تھا۔ باقی دو کے اٹھنے سے پہلے ہی دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور نازا نڈر آگئی۔

پتھر دے پھر میرا نشانہ لیا تھا اور اگر نازا وہی وقت نازل نہ ہوتی تو میرے لیے خود کو پتھر کی جلائی ہوئی گولی سے بچا ناممکن نہ ہوتا اس کے اوپر میرے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا اور وہ ریلواری اٹھا چکا تھا۔ میں نے ایک دم غوطہ مارا اور

اسی وقت پتھر کی توجہ دوازے کی طرف ہو گئی۔ میں نے غار کی آواز کو سنی لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گولی کدھ گئی۔ محسن کے قریب کھڑے ہوئے دونوں حکم کے غلام مسلح نہیں تھے۔ پتھر دے ان سے ہتھیار لیے لے گئے۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک ریلواری کو کسی بھی غیر متوقع صورت حال کے لیے کافی سمجھتا تھا۔ ابھی تک کسی کو اندازہ نہ تھا کہ نرس کی یونیفارم میں انتہائی بے ضرر اور کم زور نظر آنے والی لڑکی درحقیقت ایک طوفانِ بلائی تھی اور فتنہ منشا ہے۔

دو بے حد تندرست دوتا نا اور لمبے چوڑے لڑکے اپنے مقابل پاکے لپٹا محفوظ ہوئے ہوں گے۔ دل ہی دل میں منہ ہوں گے کہ وہ اباشت بھر کی جھپکی مسکرائے کتی تو ہم ایک اشارہ بروبر سو بار جان دیتے مگر کیا لطف ہے کہ وہ بیک وقت دوسروں کو قوت بازو سے زیر کرنا چاہتا ہے۔

میں نے ان شہ زور مردوں کا خانہ غراب ہوتے نہیں دیکھا کیوں کہ میں پتھر دیڑی طرف متوجہ تھا۔ پتھر کو اچانک احساس ہوا کہ وہ محصور ہو گیا ہے اور بیک پیچھتے ہیں باڑی پٹ گئی ہے۔ اس نے نرس کے پیچھے میں نازا کو کبھی شناخت کر لیا۔ اس کی وجہ لہجہ میں نازا نے بتائی کہ جہاز پر پہنچنے کے لیے وہ اور غالب آپس میں بھی بات کرتے تھے تو وہاں بدلتے

رفتہ رفتہ یہ ان کی عادت ہو گئی تھی۔ اب اچانک نازا نے اپنی اصل آواز میں مجھے سے کہا "سکندر! ہم اتنا دوسرے کو سنبھالنا کہ گردنوں سے میں ٹھٹھ لوں گی" اور اس کے ساتھ ہی نازا کے ہاتھوں کی نزاکت کے جوہر کھلے تو پتھر دیڑی ساری خوش فہمی کا فخر ہو گئی اس نے بیخ کفر فرما ہونے کے لیے دروازے کی جانب جست لگائی۔ آڑ میں چاہتا تو آہ آسانی اسے شوٹ کر سکتا تھا کیوں کہ اتنی دیر میں مجھے تھیں کے اندر سے ریلواری ٹکرائے کی ہلت مل گئی تھی لیکن میں اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ میری اس خواہش کو نازا نے یوں پورا کیا کہ اچانک اسے ٹانگ اڑا کر فرش پر جیت کر دیا۔

میں نے اٹلے پڑے ہوئے پتھر دیڑی پشت پر اپنا ایک پیر رکھ دیا اس نے کرپٹ بدل کے میرے پاؤں چھپنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا پیر چھڑا دیا اور اس کے منہ پر جھٹو کر ماری۔ اس کا سر فرش پر اڑا اور غور سے اس کے سامنے والے واٹ ٹوٹ گئے۔ اس نے پھر اٹھنا چاہا اور میں نے اس کی پسلیوں میں اور اس کی گھٹنوں میں جھٹو کر ماری۔ یوں جیسے وہ کوئی فٹ بال باز وہ فٹ بال کی طرح لڑکھٹا ہوا کھڑے کی دوسری دیوار تک گیا

اور پھر سیدھ ہو گیا۔ اس کے اوپر بیٹھ کر میں نے اس کی جامہ تلاشی لی۔ جو ریلواری اس کے ہاتھ میں تھا وہ اب محسن کے قریب لپٹا ہوا تھا۔ نقد رقم سے مجھے سروکار نہ تھا۔ ایک عجیب سے مگر ٹیٹ اور لاپرواہ آدمی کہ مجھے خوشی ہوئی۔

میرے ذہن کے نیچے پتھر دیڑی طرح باپ رہا تھا اور کراہ رہا تھا لیکن میں اس پر بڑی فراغت سے پیر چھڑا کر بیٹھ گیا۔ اپنی پشت دیوار سے لگا کے میں نے ایک گریٹ جلائی۔ پتھر دے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

میں نے اس کے سر پر کھانا مارا "دیکھتے نہیں میں سگریٹ جلا رہا ہوں۔ آگ کے پڑے رہو" میں نے کہا اور نازا کی دست بدست جنگ کا دلچسپ منظر دیکھنے لگا۔ نازا نے اپنے حریف طاقت ور مردوں کا سارا سن بن کال دیا تھا اور وہ ادھ منہ سے بول رہے تھے۔

"اٹھو بھئی... شاباش" نازا نے ایک کا ہاتھ کپڑ کے جھٹکا دیا "یہ تو کوئی مقابلہ نہ ہوا"۔ اس نے ہاتھ گھما کے نازا کو مڑکا مارنے کی کوشش کی۔

نازا نے اس کا ہاتھ کلائی پر سے کپڑا اور اسے اپنے ہی زور میں پورا پکڑ دے کر جھجھو دیا۔ وہ مدار سے نکلے ہوئے سیارے کی طرح گیا اور دیوار سے ٹکرائے دھیر ہو گیا اس کے سامنے نازا پر پہنچے سے سوار ہونے کے لیے جیت لگائی۔

نازا نے آگے جھٹک کر اسے فرش پر اٹل دیا۔ وہ پٹ کے اٹھا اور ناگل ہو جانے والے پیل کی طرح محسوس کرنے کے لیے آگے بڑھا نازا دھیلے سے تیار تھی۔ اس نے بڑی آسانی سے ایک ٹکٹا اور پراٹھا دیا۔ ایک ہاتھ اس کی گردن پر ملتا اور اسے تھوڑا سا اٹھانے کے ساتھ نازا دیا۔ وہ بے قابو ہو جانے والے جہاز کی طرح دیوار سے ٹکرایا اور وہیں گر گیا۔

"دیر لگتی" نازا نے بی اہم خوش ہوئے یہ دیکھ کر کہ تم آؤٹ آف پریکٹس نہیں ہو" میں نے سگریٹ کا ایک کٹھلے لکھا۔

نازا ہاتھ جھڑکے سنسی "پریکٹس تو میں کرتی رہی تھی۔ اور یہ تو تم ہی بد بخت پر جاری ہو گئی جو اچھا خاصا محافی تھا"۔ میں نے آہ بھر کے کہا "ہم سے ملا تو محافی نہ رہا۔ تم سے ملا تو آدمی نہ رہا۔ مجھوں ہو گیا۔ اب سنا ہے کسی لڑکا ناٹور جہاز کی بنا ہوا پتھر دیڑی کون ہے؟"

"کمال ہے کہ تم اُن سے سکون سے بیٹھے مگر ٹیٹ کے لٹن پر کش لے رہے ہو" اسے اور کچھ نہیں رہا کچھ نہ کو "اور کیا کرنا ہے؟ میں نے سوچ کے کہا۔

"بھئی یہ شیر دلی صاحب ہیں اور اپنے آستا پتھر دیڑی کیا رہا ایسے ہی پڑے رہیں گے؟" نازا نے انھیں سے اپنے بل سوار سے۔

"اور یہ خاموشی کیسی ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "تمہارا وہ خضم عزت جہاز کی چین کمال سے لڑا؟" "وہ ہمارے لڑا ہے اور انتظار کر رہا ہے..." "کس کا...؟ اور کس بات کا؟" میں نے کہا۔

"جہاز باغی اس کی تحویل میں ہیں؟" نازا بولی "اور وہ ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ جہاز کی کیسائی شاہد جیل سے سنبھال لی ہے صورت حال پوری طرح قابو میں ہے"

"یہ بتاؤ گل کیسی ہے؟" میں نے کلمہ دگن "...." نازا چونکی "اچھا... تو وہ گل ہے؟ یہ تازہ گل کھلا یا ہے آپ نے گل بہت اچھی ہے جب؟"

میری نظر پتھر دیڑی طرف گئی "بچ کے رہنا اس سے وہ ناگ سنی ہے ٹینکس ناگ کی کہیں اس کا ٹانگیا یا نہیں مانگنا مثلاً اپنے آستار دیوار بھی تک اسے رالہ سمجھ رہے تھے"

پتھر دے چہرے پر اس انکشاف کا دیکھ شیشی کا احساس بن گیا کہ وہ رالہ سمجھتا تھا وہ رالہ نہیں تھی۔ "یانی تو تم نے بھی نہیں مانگا ابھی تک؟" نازا سکڑائی۔

"یانی کیا اب چاہنے یا کافی نہیں گئے لیکن ذرا اس کوڑے کو سمیٹ لیں" میں نے کہا "تمہارے حکم کے غلام کہتے ہیں علاوہ غالب کے؟"

"شاہد جیل کا وہ سب علاج جس نے فروخت ہونے سے انکار کر دیا تھا حرف تین افراد پر مشتمل ہے" نازا نے کلمہ "جادو افراتین میں کبانا سہرا بھی شامل ہے، ماہرے گئے تھے ڈاکٹر جینٹلاری کے علاوہ دو افراد ہیں جو ہمارے ساتھ ہیں"

"یہ ریلواری اٹھا کے لے جاؤ" میں نے کہا "اور ان دو کو بھی بائیسوں کے ساتھ قید کر دو۔ ان سے بعد میں ٹھٹھ لیں گے۔ غالب کو میرے پاس بھیج دو اور ڈاکٹر جینٹلاری سے کہو کہ محسن کو ہوش میں لانے کی ترکیب کرے"

نازا نے محسن کے قریب پڑا ہوا ریلواری اٹھا لیا پھر وہ میری طرف پٹی "سکندر ایک بات تو پوچھی ہی نہیں میں نے؟"

"یہ کہ اکرام شیخ کیسا ہے؟" میں نے کہا "ابھی بہن ہو" نازا کچھ شرمندہ سی نظر آنے لگی۔

"کیا جیسا یاد کرتے ہیں مجھے؟"

مجھے نہیں معلوم کہ ایک بھائی کے جذبات کیا ہوتے ہیں مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ رشتوں کی راہ میں ناقص حال

نہیں ہوتے۔ یہ سوال تم کو اپنے آپ کو ناجائز ہے۔ اگر ملے یاد کرتی رہی ہو تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے تمہارا خیال نہ آیا ہو؟ میں نے کہا وہ ہمارے ساتھ آنے پر رضہ تھا۔

”مومن بنی لوگ لیا ہوگا؟“ نازو نے کہا۔

”مومن؟“ میرے دل میں دھک کا ایک کانٹا اتر گیا۔

”نازو نہ وہ روکنے والی تھی۔ اور نہ رکنے والی۔ وہ چلی گئی۔“

”کمال علی گئی؟“ وہاں...

”یہی سمجھو؟“ میں نے ایک سر دواہ بھیڑی ہمارے عقیدے کے مطابق ہم سب کو لوٹ کر دینا چاہیے۔

”وہ... وہ مگر... کیسے... اور کب؟“ نازو کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

”درخت میں کس کے یہ سب باتیں یوں سمجھ لو کہ شیخ کو ہم جیسے چھوڑ آئے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کچھ ایسے معاملات بخواتے سنبھالنے ہوں گے۔“

نازو نے سر ہلایا اور پھر ان دونوں کو اشارہ کیا جو ایک لڑکی سے پرٹ جا رہے تھے۔

”دوسرے کی طرف دیکھنے سے بھی گزیر کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا کندھا اتر گیا تھا اور دوسرے کا بازو نا تھا۔

”مگر نازو نے رول اور کارٹن ان کی طرف کیا تو وہ ہانپتے کانپتے اُٹھے۔ انھیں اب اپنے بازو کے بائیں میں کوئی غلط فہمی نہ رہی تھی جو لڑکی خالی ہاتھوں سے ان کے انچر بچر چیلے کر سکتی تھی وہ رول اور سے ان کو چھاتی بھی کر سکتی تھی۔

جب نازو انھیں باہر لے گئی تو میں نے پیر دوسے کہا۔ ”آپ کیا خیال ہے دوسرے راؤنڈ کے بارے میں؟“

”میں نہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ پیر دوسے کہا۔

”مجھے کچھ پوچھنا بھی نہیں ہے۔ اور نہ کوئی اعتراض کرنا حاصل کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے انوس صرف اس بات کا ہے کہ اگر اکیلے ہو چل کے ساتھ کچھ تم نے کیا اسے دیکھنے کی اذیت میں نے اور میں نے برداشت کی کاش یہ ممکن ہو تا کہ تمہارا تماشا بھی ایسے ہی کوئی دیکھتا اور کوئی نہ سہی اپنے چہ بدری دلا دیا صاحب ہی ہوتے۔“

غالب اندر آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ ”ابے بھوتی کے جہ تو ماویں ہو گئے تھے۔ سمجھے تھے کہ اب کوئی نہیں آئے گا۔“

میں نے اس کو دو دھکتے مائے ”اُلو کے پٹھے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔“ یہ خیال ہی کیسے آیا تم دونوں کے دل میں۔

غالب کے ساتھ آنے والے دو افراد اسٹریو کو لائے تھے۔ وہ غصہ کو اٹھا کے لے گئے۔ غالب نے غور سے دیکھا اور اطمینان کا اظہار سر ہلکے کیا۔ ”فلکی کوئی بات نہیں وہ بولا۔“ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ جانتا تھا کہ کیا حال ہے۔

شیخ...

”یہ سب باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے اس کام سزا لیں۔“ میں نے کہا۔ ”کچھ معلوم ہے کہ ہم کتنی سے لڑکیاں؟“

”شاہد جیل نے تو اپنا سن رسی حساب لگائے تھے۔ کفیوڑ کا تھا لیکن یوں سمجھ لے کہ ڈوڑھ دو سو گلوں کا فاصلہ باقی ہے۔ شام تک چلے رہے تو تھیں ہی پہنچ جاتے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہم میں چار گھنٹے جہاز گزار سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کام بھی بہت ہے اور باتیں بھی بہت سی کتنی ہیں۔“

”دونوں کام ایک ساتھ کیے جاسکتے ہیں۔“ غالب نے کہا۔ ”مگر چل پہلے کچھ تازہ دم ہو جا۔ ہنسا دھولے۔ اس جہاز پر دنیا کی ہر نعمت تیرے انتظار میں ہے۔ چائے۔ کافی۔ سینڈویچ۔ مرغ مسلم۔“

”نہیں بس۔“ میں نے ہوش ہوجاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”پہلے استاد کی خاطر وضع کا بندوبست کر۔ تو نے گل کو چھینا۔“

”اگر اس کا نام گل ہے تو اں... خوب چیز ہے۔“

”وہ ایم آراس کی اتنی ہی قابل اعتماد دن ہے جتنی نازو اور یہ اس کے لیے بھی آزمائش تھی۔“ میں نے کہا۔ ”ہم اس کے ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کر سکتے ورنہ اس کے لیے بیٹنا باعث تسکین ہوتا جواب ہو گا۔ درج اب غل۔“

مجھے وضاحت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ غالب نے میری بات سمجھ لی اور چند منٹ کے لیے باہر گیا جب وہ واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں دو ڈسک تھے۔ پیر کی حالت ان ڈسکوں کو دیکھتے ہی غیر ہو گئی۔

”دیکھو... خدا کے لیے یہ سب مت کرو۔“ وہ ڈسک لگا۔

”ہم یہ سب خدا کے لیے نہیں کر رہے ہیں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ”وہ خدا میں ہم جہاد کر رہے ہیں اور بہت سے نیک کام کر رہے ہیں۔“

”میں تم کو بہت سی باتیں بتا سکتا ہوں۔“ پیر دھنچا۔

میں نے اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔ ”بعد میں بتا دینا چاہیے۔ تم خود تارو گے یا۔“

وہ مجھے گالیاں دینے لگا اور اس نے اپنے آپ کو آنے والے عذاب سے محفوظ رکھنے کی دلوں دار کوشش کی۔

میں نے آسانی سے اس پر قابو پایا۔ مزاحمت کے باعث اس کے سر پرے تار تار ہو گئے اور مجھے اس کو باندھنے کے لیے ابھی کپڑوں کی پٹیاں بنانی پڑیں۔

غالب نے شہد کا ڈبا اس پر لٹ دیا۔ آہستہ آہستہ شہد اس کے جسم پر پھینکا گیا۔ وہ پھینکی پھینکی آنکھوں سے ان چوڑیوں کو دیکھتا رہا جو تیرے کے اندر سمجھوں سے بے قرار پھر رہے تھے۔ ڈسک کے سلسلے والا حصہ شیشے کا تھا جس کے پیچھے لال چوڑیوں کا شکاری لشکر صاف نظر آتا تھا۔

توپے اور چھینکے کا نقصان خود پیر کو ہوا۔ اس کے سانس جسم پر شہد کی تر جم گئی۔

جب میں نے چوڑیوں کو آڑا کر اٹھایا تو پیر نے ایک بھیا ایک چم ماری جو پیر نے ٹری سے تالی سے شہد چاٹنے کے لیے لیکے اور دیکھتے ہی دیکھتے پیر کے جسم پر قلعہ ہو گئے۔ وہ پیر کی دلخراش جیچوں سے اتنے ہی بے نیاز تھے جتنے گل کے نازک جسم کو لے رکھی سے کاٹنے والے جیونٹے۔

”اس پہلے راؤنڈ کو ختم ہونے دو۔“ میں نے کہا۔ ”پھر ہم تمہیں بتائیں گے کہ ہمارا دوسرا راؤنڈ کیا ہے۔“

میں نے دروازہ باہر سے بند کیا اور غالب کے ساتھ چل پڑا۔ پیر کے وحشیانہ انداز میں چھینکے کی آواز باہر بھی سنائی دے رہی تھی لیکن میرے دل کے لیے اس میں صرف سکون کا سامان تھا۔ ذاتی سطح پر وہی میلہ بدترین دشمن تھا اور مجھے اس سے اتنے انتقام لینے تھے کہ اس کی ایک زندگی مجھے ناکافی لگتی تھی۔

باہر نکل آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ہم جہاز کی نیلی منزل پر کسی نہ خانے یا اسٹور میں تھے۔ اور پر جانے والے راستے پر عین سیڑھیوں کے درمیان ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ ایک اور لاش مجھے اس کمرے کے دروازے پر نظر کی جہاں نازو جہاز سے رہی تھی۔ لاش کے آس پاس کہیں خون نہ تھا اور اس کے جسم پر مجھے زخم کا بھی کوئی نشان نظر نہ آیا۔

”یہ خود کشی کا کیس ہے؟“ نازو نے مجھے مطلع کیا۔

”حوالات میں کوئی قیدی تشدد سے ہلاک ہو جائے تو تھا نہ انچارج بھی ہی کتاب ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ بدبخت تھا نہ انچارج پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ غالب نے کہا۔ ”نازو کو لڑکی سمجھ کے۔“

”کیا میں لڑکی نہیں ہوں؟“ نازو نے غالب کی بات کاٹ کے کہا۔ ”سمجھئے گا کیا مطلب؟ تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟“

”قہر ہوا بلا ہو کچھ ہو۔“ غالب نے کہا۔ ”اب کیا پوچھتی

ہو تم سے کہ ہم تمہیں کیسی سمجھتے ہیں؟“

دونوں قیدی حوالات میں پہنچا دیے گئے۔ یہ ایک کمرہ تھا جس پر آرکھویر ٹیک یعنی ڈبوں کے وارڈ کا ٹھکانا ہوتا تھا۔ ایک شخص کئی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اپنا ایک ٹوٹا ہوا بازو دیکھنے پر گرے ہلکا رہا تھا۔ دوسرا فریش پر ڈھیر پڑا پسلیوں کو دبائے کراہ رہا تھا میرا چپٹ لٹا چھت کو گھور رہا تھا اس کا فٹہ سو جا ہوا تھا اور آنکھوں کے پاس گہرے نیل تھے جو چھالے ہوئے تھے۔ چنانچہ بظاہر سالم نظر آتا تھا لیکن وہی سب زیادہ شکستہ تھا۔ یہ سب تو پیر کا نازو نے لے لی تھی۔ یہ سب ایسے مرتھے جنھوں نے نازو کو پچاساٹنے میں غلطی کی تھی۔ ان سب کو ایک بے وقوف نظر آنے والی مگر بے حد حسین اور کمزور دکھائی دینے والی گران سے زیادہ طاقت دراز نے وہ پچھنی۔ ”لگائی تھی جس کا وہ قصور بھی نہیں کر سکتے تھے وہ نازو وار دھونے والے اس وارڈ میں داخل ہوئے تو بہت سی نظریں ان کی طرف اٹھیں۔ ان سب میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا تم بھی اسی بت طنائز کے کشیدہ ہوتے ہو؟ اور خاموشی سے سر جھک کانے والوں کی شرمندگی ان کا جواب تھی کہ۔ ہاں یارو۔ یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ نصف درجن جبری مرد ایک لڑکی کے ہاتھوں تس تس ہو گئے۔

سب سے پہلے میں نے شاہد جمیل سے ملاقات کی۔

”میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔“ میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔

اس نے میرے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا۔ ”کیا خوب صلیبیا ہے آپ لوگوں نے میری نیکی کا؟“

”آپ کی یہ ناراضگی میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں نے اپنا ہاتھ خفت سے چھینے رکھا۔ ”ایسا کیا تصور کیا ہے تم نے؟“

”یہ آپ مجھے سے پوچھتے ہیں؟“ شاہد جمیل بھٹ پڑا۔

”مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لوگ اتنا کشیدہ خون کرس گئے اور جہاز کے عملے کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک ہو گا تو میں آپ لوگوں کو جہاز پر قدم بھی نہ رکھنے دیتا۔ میں صرف ان کے خلاف تھا جو اس جہاز کو ناجائز اور غیر قانونی طور پر استعمال کر رہے تھے۔ انھیں پکڑا جا سکتا تھا اور قانون کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ وہ مزاحمت کرتے تو ان کے ساتھ آپ لوگ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اعتراض نہ ہوتا مگر آپ لوگ تو خود جبری قزاق ہیں۔ آپ لوگوں نے میرے عملے کے کتنے بے گناہ لوگوں کو مار ڈالا۔“

”وہ سب مجرموں کے ساتھی تھے اور ہمارے دشمن کا

ساتھ بیٹے والا ہمارا بھی دشمن ہوگا؟ میں نے کہا۔
 ”وہ کسی کے دشمن نہیں تھے اور کسی جموں کے ساتھی
 نہیں تھے۔“ شاہ جہل نے غصے سے کہا ”انھوں نے صرف
 جہاز قبضہ کرنے والوں کے خلاف مزاحمت کی تھی اور یہ
 ان کا فرض تھا کہ وہ جہاز کی حفاظت کریں۔ بھرا اور اس
 کے ساتھی اگر جر تھے تو آپ لوگ ڈاکو ہیں کس نے لیا ہے
 بقیہ تعین کہ اس طرح تم ایک بحری جہاز پر قابض ہو جاؤ؟“
 میں ہنس پڑا۔ ”سرفشا بدچل! انجینیئر نا سبھی کی باتیں
 کرتے ہو کیا۔ پورے نے سکندر سے پوچھا تھا کہ تعین دیا کو
 فتح کرنے کا خواب دیکھنے کا حق کس نے دیا ہے؟ کسی نے
 عمو خروزی سے یا انخریزہ قزم سے پوچھا تھا کہ تعین ہندوستان کو فتح
 کرنے کا حق کس نے دیا؟ یہی ہر فتح خود حاصل کرتا ہے اور
 اس کی فتح ہی اس کے برحق ہونے کا حوالہ بن جاتی ہے۔ ہم کیا
 اقوام متحدہ سے یہ حق مانگتے؟ عالمی عدالت انصاف سے
 حق کا دعویٰ تسلیم کراتے؟ کسی کو آج ملک مانگنے سے حق
 ملا ہے؟“

”مسٹر سکندر یہ فلسفہ اور سیاست کی منطق میرے
 کس کام کی؟ یہ جہاز کی حکومت کی ملکیت نہیں ایک ملیتی
 کا ہے جس نے مجھے بھی لازم رکھا تھا اور میرا کو بھی۔ میرا
 مارا گیا جہاز کا سارا اہل کار ہتھیاری قیدی ہیں۔ باندھا جا چکا ہے
 شاید تم جہاز کو بھی غرق کر دو گے مجھے بتاؤ میرا قصور کیا تھا جس
 کا تم مجھے سزا دے رہے ہو۔ میں کیا کروں گا یہاں جاؤں گا میری
 فوج کی زندگی سب خطے میں ڈال دی ہے تم نے؟“

”یہ ٹھیک ہے شاہ جہل کہ ہم اس جہاز کو غرق کر دیں
 گے لیکن ہم تعین جہاز کی ملکیت حاصل کرنے کا موقع دیں گے اور
 اس بات کی پوری ضمانت فراہم کریں گے۔“

”کوئی فائدہ نہیں ہتھیاری ضمانت کا۔ میرے جہاز کا
 عملہ جانتا ہے کہ میں نے ہی ہتھیاری مدد کی تھی۔“ شاہ جہل
 بولا ”وہ میرے خلاف گواہی دیں گے۔ مجھ پر مقدمہ چلایا
 جائے گا اگر اس سے پہلے ہی تمہارے دشمنوں نے مجھے
 منزلے موت ہندی جہ فلسفہ تمہارا ہے وہی ان کا بھی ہوگا
 کہ ہماری دشمنوں کا ساتھی ہمارا دشمن۔“

”لیکن اب تمہارے خلاف گواہی دینے والا کون بچا
 ہے؟ میں نے کچھ سوچ کے کہا ”ایک ڈاکٹر مجبذاری ہے۔“
 اس کے علاوہ دو افراد۔“

”صرف تین آدمی کیے ہیں!“ شاہ جہل نے انھوں سے
 سر ہلایا۔ ”عملے کے ساتیس اگر کان تھے۔“

اس وقت اگر میں شاہ جہل کو بتا کر ہچہ افراد بھی

زندہ ہیں تو کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اٹھارہ افراد کے مارے
 چلنے کا حقد سرچ نہ ہوتا۔ اٹھارہ افراد کے چلنے کا حقد
 خلاف گواہی دینے والے تو افراد موجود ہیں۔

”میں سمجھتا ہوں کہ تم سب کا ایک ہی مسند ہوگا
 مجھے بتا گیا ہے کہ تمہارے اور ڈاکٹر مجبذاری کے علاوہ
 دو افراد نے تم سے پورا تعاون کیا۔ کچھ جاننے والے یہ کہہ سکتے
 ہیں کہ جہاز کی تباہی کے بعد باقی سب لوگوں پر کیا ہوتی
 یہ انھیں نہیں معلوم۔ پس قدرت نے انھیں بچا لیا۔ ایسا
 ہو جاتا ہے۔ بحری جہاز کی غرقابی میں سو فیصد لوگ نہیں
 مرتے جو جہاز پر ہوں اور بچنے والے لوگ ہوائی جہاز کریش
 ہو جانے کے بعد بھی بچ جاتے ہیں تمہارے ساتھ۔۔۔
 زندہ سلامت ساحل تک پہنچ جاتے والے ایک دوسرے

کے خلاف کیسے بیان دے سکتے ہیں؟ میں نے کہا۔
 ”ہاں۔ ایک جرم میں شریک ہو جانے کے بعد انھوں
 جھوٹ کا سہارا لے سکتے ہیں۔“ شاہ جہل نے کہا ”پھر مجھے
 نقدیش تو ہوگی اور سب سوالات ہم سے ہی کیے جائیں گے۔“

”شاہ جہل تم بلاوجہ پریشان ہو گیا تم جانتے نہیں تھے
 کہ جہاز پر کتنا اسلحہ تھا؟ میں نے کہا ”ڈاکٹر مجبذاری اور
 باقی دو زندہ بچ جانے والے اگر کچھ نہیں جانتے تو میں
 ان کو سب بتا دوں گا۔ کیا وہ انہی آنکھوں سے دیکھنے کے
 بعد بھی یقین نہیں کریں گے؟ جہاز کی تباہی کے اسباب
 متعین کرنے والے خود ہی سمجھ لیں گے کہ اسلحے کے ذخیرے
 میں آگ لگ جانے سے جہاز تباہ ہوا۔ آگ لگنے کے اسباب
 ایک سو ایک ہو سکتے ہیں۔ شارٹ سرکٹ سے تحریک لگانا
 تک اور بے وفائی میں جینی ہوئی گریٹ پھینک دینے تک
 تمہارا صرف اتنا کہ دنیا کافی ہوگا کہ تعین دھماکے نے سکندر
 میں اچھال دیا تھا اس سے زیادہ تم کچھ نہیں جانتے اور تم
 کسی بڑے جنگ جی نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے پھر جہاز کی تباہی
 صرف ایک حادثہ نہیں سمجھا جائے گا۔“

شاہ جہل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اسے اپنے
 خیالوں میں گھوما ہوا چھوڑ کر باہر آ گیا۔ بلاشبہ شاہ جہل کے
 ساتھ زیادتی ہوئی تھی اور اس کا احساس جرم میں مبتلا ہوا
 بھی ایک مختلف زاویے سے جائز تھا۔ لیکن اس جنگ میں
 زیادتی سب کے ساتھ ہو رہی تھی۔ مارے وہ بھی جارح
 تھے جو حق پر تھے اور مظلوم تھے۔ تم اور ہمارے ساتھی اب
 امن پسند اور محبت وطن۔ وہ سب جو علیحدگی پسندوں کے خلاف
 صرف آزاد تھے مشرقی پاکستان کے محبت وطن عوام بلکہ

عربین اور معصوم بچے یکطرفہ ہزاروں کی تعداد میں ہر روز میرے
 وطن کے دشمنوں کی سازش کا شکار ہو رہے تھے اور غداروں
 سے ہاتھوں زندگی سے ہاتھ دھو رہے تھے۔ ایسے حالات میں
 اگرچہ انداز کے ساتھ ہم سے بھی زیادتی ہو جائے اور کچھ
 اپنے حامی و مددگار بھی ہمارا کارروائی کے دوران مسد
 جائیں تو ہم انھیں کرسکتے ہیں کہ ہم ایسا نہیں چاہتے تھے
 کہ مجبور تھے۔ کبھی دشمن کے طیارے اپنے ملک کی حدود
 میں داخل ہو جائیں تو ان کے خلاف کارروائی سے اپنے
 ہی ملک کے عوام کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ فوج کبھی
 دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے اپنے ہی ملک کی آزادی
 ہے۔ ہم اپنے ہی علاقے میں بھی گھر جاتے ہیں۔

عرشے سے سکندر کا نظارہ وہی تھا۔ تاحہ نگاہ پہلا
 ہوا سکندر بچہ رہی ہوئی بے قرار مومن ساکت آسمان اور
 سکندر کا شور تاہم ایک لالچ کے مقابلے میں اس بحری
 جہاز پر تحفظ کا زیادہ احساس ہوتا تھا۔ غالب میرے انتظار
 میں بیٹھ رہا تھا۔

”جیل ہیرو۔ پہلے اپنی حالت درست کر لے۔“ غالب
 نے کہا ”نازاد ایک تربیت یافتہ نرس کی طرح تیری مرہم لپی
 کرنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ وہ میرے ساتھ چل پڑا۔“

”محسن کا کیا حال ہے؟“ میں نے کہا۔
 ”تو خود پوچھ لے۔“ غالب نے میرے ساتھ چلتے ہوئے
 کہا ”نازاد نے اسے باقاعدہ اسپتال میں داخل کر دیا تھا۔ اس
 کو جہاز پر کچھ کے اس کے کپڑے بھی بدل دیے تھے۔ ہوش
 میں آئے ہی اس نے بالکل فنی سوال کیا۔ میں کمال ہوں۔ میں
 نے کہا کہ جنم کی سی کلاس میں۔“

”یادیں گل کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔
 غالب نے ایک آہ بھری ”دیکھو بھائی! ضرور دیکھو ہے
 دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔ ویسے یہ گل ہے کس گلستان
 کا اور کھنڈہ کھنڈہ میں کیسے آیا؟“

”ہے جھجھو کہ خوب سے ہے خوب ترکاں۔ پس یہ بھی
 اسی جھجھو کا حاصل ہے۔“ میں نے کہا ”اور ایک دلچسپ
 بات بتاؤں وہ محسن کے عشق میں مبتلا ہے۔ ناقابل علاج
 قسم کا عشق ہے جس کی دوا ایجاد نہیں ہوئی۔“

”دوا تو ہے۔ شربت حسن۔“ غالب نے کہا۔
 ”اردو جو شربت وصل کی ایک بوتل لاہور میں
 رکھی ہوئی ہے۔“ میں نے کہا ”ابھی گل کو اس کی خیمہ بند
 نہیں ہے۔“

”کیا کما؟“ غالب نے شور مچانا شروع کیا۔ میں

تو سمجھا تھا اس لڑکی کے دماغ میں فتنہ ہو گا مگر یہ کھوکھری
 کا کیس ہے۔ لبقائی ہوش و حواس کوئی لڑکی کیسے عاشق ہو
 سکتی ہے محسن جیسے پالتو شوہر پر۔ میں اسے بتاتا ہوں۔
 ”دیکھو نازا غالب کے چپے۔ ایسا ہرگز مت کرنا۔ ہم
 جو بھی کرتے ہیں سوچ سمجھ کے کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”فی الحال اس کو شملہ کے وجود سے بے خبر رکھنا ضروری
 ہے۔ نازد کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دینا۔۔۔“

”پہلے تم اچھی طرح سمجھ لو میری بات۔“ نازد نے
 اچانک سانس لے کر کہا ”باقی سب کام بعد میں ہوں گے۔“

”شملہ کا کھانا ویسے وغیرہ؟“ غالب نے کہا ”میں
 تمہاری مرضی بھی۔“

”سکندر بھائی تمہارا جوگی میں ان کی زبان بکنے لگی ہے۔“
 نازد نے کہا ”سننے دن سے چپ تھے۔“

”ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں۔“ درنہ کلمات
 کرنی نہیں آتی۔ غالب نے تسلیم بجالا کر کہا ”آداب عرض۔“

”سکندر بھائی آپ گرم پانی سے نہالیں۔ کپڑے بدل
 میں اتنی دیر میں کافی وغیرہ بناتی ہوں۔ پھر آپ کی ڈورنگ
 کروں گی۔“ نازد نے کہا اور مجھے بازو سے کپڑے اندر لے گئی۔
 ”ارے بھائی! میں گل تو تو دیکھ لوں۔“

”ابھی اسے نہیں دیکھ سکتے آپ۔ چلیں اندر۔“ اس نے
 مجھے ہاتھ درم میں دھکیل دیا۔

وہ شاید میرا کمرے سے متعلق ہاتھ درم تھا۔
 اس میں ضرورت کے سب اسباب شامل تھے۔ میں نے
 گرم پانی ٹب میں بھرا۔ اس میں ڈشبل ڈالی اور پھر آدھے
 گھنٹہ تک انہی ساری ٹھکان اتار تار با۔ بالآخر نازد نے دروازہ
 بجانا شروع کیا تو میں لباس بدل کے باہر آیا۔ نازد پہلے میری
 گردن کی خراشوں پر مرہم لگانا چاہتی تھی مگر میں نے کسی تحفظ
 بچنے کی طرح صاف انکار کر دیا۔

”گردن کی خراشوں سے میرے فوت ہونے کا کوئی امکان
 نہیں۔“ میں نے کہا ”بھوک سے مر گیا تو آخر ان تمہاری گردن
 پر ہوگا میرے پیٹ کے خلا میں راکٹ گروٹ کر رہے ہیں۔“

”پہلے بھوک سے پیٹ میں چرے دوڑتے تھے۔ برانے
 دفعوں کی بات ہے۔“ غالب نے کہا ”محسن بھی آدھے گھنٹہ
 سے اعلان کر رہا ہے کہ میں دس سینکڑوں فاقے سے ہلاک
 ہو جاؤں گا۔“

محسن کو صحت مند اور پوری طرح مستعد دیکھ کے مجھے
 خوشی ہوئی۔ ہم نیولون اب سابق کپتان بھرا کے کمرے میں
 اس کے بیڈ پر آئی یا لٹی مارے بیٹھے تھے۔ نازد نے

بہتر میں نیز بانی کے فرائض سرانجام دیے۔ ہر عورت ہر مرد کی ہر ضرورت و محسوس کر کے سمجھتی ہے اور پھر اپنی فطری صلاحیت کو بڑھانے کا راستہ ہونے سے اسے وہ اسباب فراہم کر سکتی ہے جو آرام و آسائش، تحفظ اور طمانیت، سکون اور مسرت کے اور انسانیات کی شکر گزاری کے جذبات کے صورت میں اس کا انعام بن جاتے ہیں اور اس کے وجود کے اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

اپنی پسند کی ہر چیز ختم کر دینے کے بعد میں نے نازد سے کہا: "نازدو لی نی او اور گریٹ! تمہیں نے تائید نہ کر لیا۔ غالب نے دانت نکالتے ہوئے کہا: "تھیک ہو!" تم کس بات پر شکریہ ادا کر رہے ہو؟" محسن نے کہا۔

"میری پسند کو پسند کرنے کا شکریہ" غالب نے کہا۔ نازد کا چہرہ ایک اندرونی خوشی سے دھنکے لگا عورت بیک وقت اپنے بھائی اپنے شوہر اپنے باپ اور اپنے بیٹے کو خوشی دے کر کتنی بے غرض خوشی حاصل کر سکتی ہے۔ مختلف رشتوں کے حوالے اس کے جذبات کی نوعیت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ ہر دشا بد محبت کو رشتوں کے خالوں میں آخستہ ایسا انداز سے تقسیم نہیں کر سکتے۔ شہلے سے مومن تک اور مالِ عیسے ناگ منی تک عورت کی ذات ایک سانباں ہے۔ آسمان کی طرح جو سب کے لیے دی ہے۔

"اب تم گل سے مل سکتے ہو" نازد نے کہا "لیکن دیکھو! اسے آرام کی ضرورت ہے!"

"کبھی اپنے نقش برداروں کی ضرورت کا خیال ہی آتا ہے؟" غالب نے کہا اور دوڑ کے آگے نکل گیا۔

"نکشف بردار کیا ہوتا ہے۔ اس لفظ کا مطلب بھی معلوم ہے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں جوتیاں اچھانے والا" غالب نے کہا "یہ سب شوہر ہوتے تھے۔ بنگال کے بعد کہتے تھے کہ بوی آکھنیت کھو لو میں تمہارا غلام، تمہاری جوتیاں اٹھاؤں گا۔ مٹی بھی کھولوں گا!"

"وہ پرانے شوہر بعد میں اسی بوی کو پاؤں کی جوتی بھی سمجھتے تھے" محسن نے طنز سے کہا۔

"میں بھی سمجھوں گا" غالب نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ گل حاف تنہا بستر پر جا اور اوڑھے ٹیپ لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے ہمت نہ ہوئی کہ جاؤں بٹالہ دیکھ سکوں۔

"کیا حال ہے گل؟" میں نے اس کے ماتھے پر پیار سے ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تھیک ہوں بھائی کندر! وہ مسکائی: "تم نہیں بچو چھو گے؟" اس نے محسن سے مخاطب ہو کر کہا۔

"گل! تم تھیک ہو جاؤ گی" محسن نے اس کا ہاتھ پکڑا "نازد نے مجھے دوا دی ہے اس سے درد کا احساس بالکل ختم ہو گیا ہے، گل نے کہا: "درد گزرے نہیں ہیں!"

"تم بہت بیمار لڑکی ہو گل! ناگ منی سے بھی زیادہ ہمت ہے تم میں" میں نے کہا: "ہم سب فخر کر سکتے ہیں تم پر!"

"وہ... دہماشا... استاد پیڈرو! گل نے نظریں جھکا کر کہا: "کیا تم نے مر دیا ہے؟"

"نہیں! ابھی اس کی سزا شروع ہوئی ہے۔ جو سزا اس نے تم کو دی تھی" اسی سے اب خود کو زور دے رہی خواہش تھی کہ تو دیکھو محرم۔"

"میں دیکھوں گی گل! آنکھوں میں نفرت اور انتقام کی آگ دہکتی تھی۔ اس نے جاؤں کو ہاتھ مار کے بٹا دیا۔ اس نے صرف ایک کاؤن پین رکھا تھا۔ جسم کے بیشتر عضلات پر نازد نے چپکال باندھی تھیں یا مرہم لگائے ٹیپ لگا رہا تھا۔ اسی حالت میں وہ ڈھیلا ڈھالا سوئی سالیاس بین سکئی تھی۔ میں چلنے پھرنے اور حرکت کرنے سے اس کے زخموں سے بڑا۔ چھوٹانے کی تکلیف بھی بہت زیادہ ہو سکتی تھی۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے بھی اس کو کندر سے پکڑ کے پھر بستر پر ڈال دیا۔ وہ کہنے لگی۔

"مجھے ملے۔ میں جلی سکتی ہوں۔ اس کہنے کے لیے آنکھیں نکال کے چا سکتی ہوں میں۔" اس کا جسم کاپ رہا تھا اور وہ جھکیاں لے رہی تھی۔ خوف اور مذمت کے ختم ہوتے ہی آنسو اُمڈائے تھے اور جذبات کا آتش نکال بیٹھ پڑا تھا۔ میں نے نازد کو آواز دے کر لایا اور اس نے گل کو نکال لیا۔

"یہ کسی صورت مناسب نہیں ہے کہ وہ پھر پیڈرو کو دیکھیں" میں نے کہا "اور اس حالت میں!"

"نار سکندر! ہم گل کو اپنے ساتھ لیے لے جائیں گے؟" محسن نے میرے ساتھ ہی ہاتھ رکھے کہا: "جہاز کو غور کرنے سے پہلے ہم کسی لائف بوٹ میں جائیں گے، گل! اس میں کیے رہے گی!"

"لائف بوٹ کے سوا کیا ہے ہمارے پاس؟" میں نے کہا: "یہ ہو سکتا ہے کہ ہم سب ایک ہی لائف بوٹ میں نہ جائیں۔ گل کو ایک الگ لائف بوٹ میں رکھیں۔ ہم میں سے ایک اس کے ساتھ رہے!"

"پھر بھی ہم اسے سمندر کے پانی سے تو نہیں بچا سکتے۔"

سمندر کا صحن بانی اس کے زخموں پر لگے گا۔" وہ بھلی کو اس آزمائش کا سامنا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ہم اسے... کا احساس ختم کرنے والی دوا کی دو گنا یا تین گنا عورت دے سکتے ہیں" غالب نے کہا: "اس کے جسم میں ایک اور جگہ کوئٹن کرنے والی کریم کا لپک کیا جا سکتا ہے۔"

"مجھے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ ہم اسے جھوٹے بہر حال نہیں جائیں گے۔ میں نے کہا: "میرا خیال ہے کہ اب میں جہاز پر روانہ ہونے کے آخری مرحلے کی تیاری شروع کر دوں گی۔"

"ان سب کا کیا ہوگا جو ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟" میں نے کہا: "مثلاً استاد پیڈرو، شاہ جہیل!"

"استاد پیڈرو کو کیس الگ ہے۔ میں نے کہا: "اس پر ہم کس کی عدالت میں اس کے تمام جرائم پر مقدمہ چلایا جائے گا؟" میں نے اس کے ساتھی ہمارے ساتھی نہیں ہیں، لیکن انھوں نے ہماری مدد کی تھی۔ ان کو ہمارا تعاون حاصل رہے گا۔ وہ جہاز پر سے جو کچھ بھی لے جانا چاہیں انھیں اجازت ہوگی۔ جہاز پر جالائف پوش ہیں۔ ایک وہ استعمال کر سکتے ہیں!"

"اور ان کے باقی ساتھی؟"

"میں نے شاہ جہیل کو ان کے مائے میں ہی بتایا ہے کہ اب ہمارے گئے سوائے ان تین افراد کے جو ہماری مدد کرتے رہے۔ انھیں ہم جہاز پر ہی چھوڑ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"وہ ہمارے دشمن ہیں" محسن نے کہا: "ان سب کی طرح جہاز ہو چکے ہیں۔ وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔"

"میرا کہہ کر میں تمہیں ایک مختصر اجلاس کیا جن میں قوانین کی عدم موجودگی کو سب نے محسوس کیا لیکن گل اس قابل نہ تھی اور نازد اس کے معالج و تیمار دار کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ غالب اور نازد نے اپنے پاسپورٹ جہاز پر بیٹھنے کے بعد ایک محفوظ مقام پر بیٹھ دیا۔ مجھے انھوں نے دیرانی وقفے میں اپنے لیے آئینہ بھیجی حاصل کر لیا تھا۔ جہاز پر وہ ڈاکٹر جینڈاری کے اسٹنڈٹ سمجھے جاتے تھے۔ جہاز پر وہ بلا روک ٹوک ہر جگہ آ جا سکتے تھے۔ چار کی یعنی غالب سب کا خادم تھا اور اس سے سب خوش تھے کیوں کہ اس کی بات کا اثر ان میں مانتا تھا۔ لوگ اس سے طرح کا مذاق کرتے تھے۔ نازد کے حوالے سے اشتعال، تجزیہ سوالات تو جی ان کے ذہن میں مالتا تھا۔ اسے ایک احمق شخص سمجھا جاتا تھا۔

اور مجھے کہہ دے کہ لوگ بھی اس پر ہلکے چلتے تھے۔ چار کی کے بچے ادھر آؤ میرے پیرو باؤ۔ چار کی میرے بوٹ پائش کر دو ہر کام خوشی خوشی کرتا تھا چنانچہ کسی بھی جگہ اس کی موجودگی پر کسی کو شک نہیں ہوتا تھا۔ غالب نے خاصی محنت، ذہانت اور برداشت سے یہ تاثر پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی کہ وہ ایک غیاثیہ مقرر اور سے عقل شخص ہے۔ ان بد بخت لوگوں کی طرح جو ذلت اٹھانے، علم سینے اور غلامی کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسری طرف نازد نے ہوس پشیدہ ڈاکٹر جینڈاری کو پوری طرح قابو کر لیا تھا۔ اس نے ایک وقت انتہائی سادگی و ہوشیاری سے اس کی آتش شوق کو تھوڑی سی ٹیکن لیا کوئی موقع نہیں آئے دیا تھا کہ وہ نازد پر دست درازی کر سکتا۔ شراب کا رسیا تھا اور نازد اسے اپنے ہاتھوں سے پلائی تھی تو اس کا نشہ دھند ہو جاتا تھا اگر اس بے وقوف کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ شراب میں خواب اور دوا کی خفیت سی مقدار بھی شامل ہے بالکل کے ساتھ سکون اور دوا کے اثرات بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ خواب اور دوا کی زیادہ مقدار ان کے ثابت ہو سکتی ہے۔ نازد کا مقصد اسے ماننا ہوتا تو اس کے مواقع پر نہ تھے بلکہ ڈاکٹر جینڈاری مر جاتا تو شوک پیدا ہوتے اور فکائش کا لفظ آغاز خود نازد ہوتی۔ وہ ڈاکٹر جینڈاری کو کم سے کم وقت میں مدد ہوش کر دیتی تھی۔ بعد میں جینڈاری تائت سے ہاتھ نکالتا تھا کہ شراب نے اسے ناک آؤٹ کر دیا اور نہ نازد کی طرف سے وعدہ و صل جھوٹا تھا۔ اسے کبھی شک نہیں ہوا کہ اس نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔

نازد و بعد میں اس کے پاس رہنے والی خطرناک ادویات کی الماری کی چابی لے کر اپنی ضرورت کی کوئی بھی چیز نکال لیتی تھی مگر اس طرح کہ ڈاکٹر جینڈاری کو غور و برد کا احساس نہ ہونے پائے۔ اس نے ایک شیشی گلوہور فارم کی غائب کی۔ گلوہور فارم کو کھانسی کے شربت کی خالی شیشی میں ڈال دیا اور گلوہور فارم کی جگہ یا پھر کے پھر اصل شیشی واپس اپنی جگہ رکھ دی۔ خواب گولیوں کی کمی کو اس نے اسپرین کی گولیوں سے پورا کیا اور ایک خطرناک زہری جگہ آٹا پھر دیا۔ یہ کیسی بے ہمتی اور اس نے وہ تو مکمل دیکھ کے استعمال کیے۔ ایک رات شور مچا کہ کوئی ملازم سڑ میں گر گیا ہے۔ اسے نازد نے بے ہوش کیا تھا اور سمندر میں چھینک دیا تھا۔ یوں جہاز پر والوں اس کے ہاتھ لگا تھا۔ وہی یوں اور غالب نے مجھے فراہم کیا تھا۔

اب ہم نے پھر کے کمرے کی تلاشی کی تو مختلف... نوعیت کا بہت سا سامان الماریوں کے خفیہ خالوں سے

برآمد ہوا۔ ان میں دستاویزات بھی تھیں جن میں مہر اکوٹیلے کی خرید کے معاملے میں ضروری احکامات و اختیارات دیے گئے تھے۔ یہ سب ہمارے لیے بے کار تھا۔ اسی کام سے ایک باہر بھی اٹھن پاکستانی اور بین الاقوامی کرنسی میں غیر رقم دستیاب ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میری محسن اور گل کی وہ بیٹی بھی لگ گئی جس میں ہم نے اپنے پاسپورٹ کے ساتھ ہنگامی ضرورت کے لیے بھی رقم محفوظ کی تھی۔

باہمی صلاح مشورے سے ہم نے صرف دو سو ٹکسین چیک کرنے کا فیصلہ کیا جو ہم لائف بوٹ میں اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ ایک میں کرنسی بھری گئی اور دوسرے میں غنیمت اسلحہ ہر سو ٹکسین کو ایک زنا اور مردانہ بیٹوں سے بھرا دیا گیا اور اسلحے کے ساتھ نقد رقم کو بھی وارڈ برف بنانے کے لیے پلاسٹک کے قیضے استعمال کیے گئے۔ میں نے محسن اور غالب کی رائے سے اتفاق کیا کہ کبھی سے جاس کاویٹر کے قیضے پر جہاز ڈوب جائے تو ہمارے لیے ساحل تک پہنچنا مشکل نہ ہوگا لیکن ہم کوشش کریں گے کہ کسی غیر آباد ساحل پر آئیں اور اولین فرصت میں دونوں سوٹ کیس دفن کریں اور اگر اس سے پہلے ہی چیلنگ کا خطرہ پیدا ہو جائے تو دونوں سوٹ کیس سمندر میں پھینک دیں۔ جو رقم ہمارے پاس بیٹل میں محفوظ ہوگی وہ ہماری کفالت کرے گی اور اس کے بعد ہم اپنے وسائل خود پیدا کریں گے۔

نانو نے ڈاکٹر بھنڈاری کے مشورے سے گل کو مار فانیے کو سلا دیا تھا۔ غالب بھی اسلحہ خانے میں لے گیا جہاز کے زیریں حصے میں تین گودام تھے۔ ایک گودام میں نیچے سے اوپر تک کٹری کے کرپ رکھے ہوئے تھے۔ سامنے کی پہلی قطار کے کرپ عام اشیائے ضرورت سے بھرے ہوئے تھے۔ مثلاً گھی کے ڈبے، ڈرائسٹر ریڈیو، کھیلوں کا سامان، پہلی کے میٹر فیزا اور سوئیچ گئیر خراب مشینیں اور فولڈ ہوجانے والا فریج اسلحہ پیچھے تھا۔ وہ سیڑیوں کے کرپ تھے جن میں ریڈیو اور سے مشینیں تھیں۔ ایک اور لفٹ سے طیارہ ٹیکن اور مشین توپ کی بھاری گولیاں تک بھری ہوئی تھیں۔ دوسرے گودام میں آگے چاول اور چینی کی پوریال تھیں۔ پیچھے والی بوریوں میں ریفلیش مشینیں اور ہر قسم کے ریڈیو اور تھے۔ ان سب کو کھول کے چیک کرنا ناممکن تھا۔ مگر اس کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ غالب نے مجھے بتایا کہ چند بوریوں میں بارود بھی ہے۔ تیسرا گودام بارودی سرنگوں، دستی بموں، ڈاکٹا سٹائٹ اور ٹائم بموں کے لیے مخصوص تھا اور یہ حصہ تقریباً جہاز کے وسط میں تھا۔

اسلحہ کی اس کثیر مقدار نے جو میرے ہم وطنوں کے جذبہٴ اخوت اور حب الوطنی کو شدید کرنے کے لیے سب سے جاری تھی، مجھے مشرقی پاکستان کے تحریک کا جھنڈا لے لیا۔ یہ قوت اور ان کے نامزد دوسرائے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ صرف ایک کھسپ بھی۔ اس سے پہلے طاقت خیزی کا کتنا سامان مشرقی پاکستان پہنچا یا تھا اور اس جہاز کے علاوہ اور کتنے ڈرائسے یہ اسلحہ کتنا عناصر تک پہنچانے کا بندوبست کیا جا چکا ہے؟ اس کا کوئی حوالہ نہ تھا۔ یہ صرف ایک چوہدری والا اور اینڈرگرنی تھی۔ جی جواس موت کے کاروبار میں مال و زر سمیت ہر کام عالمی سیاست کی لباٹ پر نہ جانے کتنے مہرے تھے۔ جہاز کی طرح خریدے جا چکے تھے اور ان ہاتھوں میں کھیل رہے تھے جو بہت بڑے شاطروں کے نظر نہ آنے والے ہاتھ تھے۔ جس سوچ میں طر کیا تو؟ ”محسن نے کہا۔

”میں چونکا۔ ”میں نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب امر مشرقی پاکستان پہنچ جاتا تو کیا ہوتا؟

”اگر ہم یہی سوچتے رہے تو رات ہو جائے گی۔ شام تک ہمیں جہاز سے اتنی دوزخ مل جاتا جیسے کہ دھماکے سے ہمارے لیے خطرہ لاحق نہ ہو۔“ محسن نے کہا۔

”تھیک ہے۔ تم دیکھو کہ یہ کتنی دیر کا کام ہے۔“ نانو نے کہا۔ ”اس وقت پانچ بجے ہیں۔“

”کیا میں جیسے کہ تمام سیٹ کر دوں؟“ محسن بولا۔ ”کیا تم آدھے گھنٹے میں نکل جاؤ گے اور کل بھی گئے تو بڑا دیر نہیں جایا میں گئے۔“ غالب نے کہا۔

”ساتھ بے چہر کا وقت رکھ لو۔“ میں نے کہا۔ ”آدھے گھنٹے میں ایک لائف بوٹ آتا دو۔ اس میں گل کو سلا دو۔“ کے ساتھ نانو رہے گی اور محسن ہوگا۔ دوسری لائف بوٹ میں غالب اور میں ہوں گے اور سامان ہوگا۔ بھڑا ثابت کھانے کا سامان اور اپنی دونوں لائف بوٹس میں رکھو۔“ ”یہ سب تو ہو چکے گا۔“ شاہد بھیل اور اس کے ساتھ کیا آخری وقت تک ہمارے ساتھ رہیں گے؟ ”محسن بولا۔

”اور پتہ... دوسرے قیدی؟“ غالب نے کہا۔ ”بارود وغیرہ مت بھیناؤ۔ ہر کام ایک پلان کے مطابق ہوگا۔“ محسن نے اپنا کام شروع کرنا تم کو بھروسے کے قرار دیا۔ ”میں نے کہا۔

”اس کام سے فارغ ہونے میں کتنا وقت لگ جائے گا؟“ ”زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ۔“ محسن نے کہا۔ ”اس کے بعد تم ناز اور گل کو لے کر نکل جاؤ۔ میں نانو سے کہہ دوں گا کہ وہ تیار ہو جائے اور گل کو بھی تیار کر لے۔ غالب کا کام میں ہتھکانہ سدا کرے گا۔ لائف بوٹ کو سمندر میں سے نکالنا ایک آدمی کا کام نہیں ہے۔ میں دوسرے معاملات میں مشغول ہوں۔ میں اور غالب آخر میں مددگار ہوں گے۔“

محسن کو وہی مصروف چھوڑ کے میں اور غالب اوپر چلے۔ غالب نے میری ہدایات ناز و گل کو پہنچانے کے لیے جس کے کارے کیا جہاں لگتی ہوئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر بھنڈاری کو اس کے دونوں ساتھیوں سمیت عرشے پر طلب کر لیا۔

”کیا بولا؟“ ہم سالا اتنا بڑا جہاز چھوڑ کے لائف بوٹ پر جانے لگا۔ ”ڈاکٹر بھنڈاری نے وادیا شروع کیا۔

”مجبوری ہے ڈاکٹر بھنڈاری۔“ میں نے کہا۔ ”یہ جہاز غرق ہونے والا ہے۔“

وہ اچھل پڑو غرق ہونے کو بے کیا بات بولا۔... ”یہاں سے توقف سمجھتا ہوں کہ تم نہیں جانے گے۔“

میں نے اس کے ایک جہان پر سید کیا میں تو کوئی نہ منٹ دوں گا کہ اس جہاز سے کچھ بھی لے جائے۔ ہونڈہ منٹ گزر جانے کے بعد میں تم کو زندہ یا مردہ سمندر میں پھینک دوں گا۔ لائف بوٹ میں تم آسانی سے ساحل تک پہنچ سکتے ہو۔“

”اوہ ماں گاڈ! ابھی تم کیا کر رہے۔“ اچھا۔ ہم اپنا نرس کو ساتھ لے جائے گا۔“ وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے اس کے دوسرا جہان پر مارا۔ ”تمہارے ساتھ یہ دونوں ہوں گے۔ اور شاہد بھیل ہوگا۔“

”بانی دو چپ کھڑے تھے۔ عمران کے چہرے پر ہوشیاری اڑتی تھی۔ یہ ضرورت حال ان کے لیے اچانک پیدا ہوئی تھی جس کا انھوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ صرف پندرہ منٹ کا مدت نے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بھی مفلوج کر دیا تھا۔

”ہم سے وعدہ کیا گیا تھا... کہ تمہارا دن کرنے پر اٹھائے گا۔“ بلا آخر ایک نے انگریزی میں کہا۔ ”اب تم میں خالی ہاتھ سنہ کلچر دو کر رہے ہو۔ ہمارا کوئی مستقبل بھی نہیں ہے۔“ ”اگر تم سمجھتے ہو کہ مستقبل صرف دولت سے محفوظ ہوتا ہے تو یہ تمہارا انعام۔“ میں نے اس سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا جس میں ہم نے کرنسی بھری تھی۔

”اس میں کیا ہے؟“ وہ خوفزدہ ہو کر بولا۔

”ڈرو نہیں۔ اس میں دولت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ مال غنیمت ہے۔ ہم اس کے بغیر بھی گزارہ کر سکتے ہیں۔“ ویسے میں نے شاہد بھیل کو سمجھا دیا ہے کہ اسے کیا بیان دینا چاہیے وہ تم کو سمجھا دے گا۔ تم جہاز کی تباہی کو ایک حادثہ خارجی کارروائی قرار دے سکتے ہو جس میں ہتھکانے سب ساتھی ہلاک ہو گئے۔ بچ جانے والے خوش قسمت تم چار ہی ہو۔ تم سب کا ایک بیان ہوگا تو کسی پر یقین نہیں آئے گی۔“

اس نے سر ہلایا اور سوٹ کیس کو کھول کر دیکھنے لگا۔ کپڑوں کے نیچے دولت کے ڈھیر کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں جھجک اور چہرے پر رونق اٹھی۔ اس کے دوسرے ساتھی نے حریفانہ نظروں سے اس تمام کرنسی کو دیکھا جو کپڑوں کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ پھر اس نے رضامندی میں سر ہلایا اور سلا کرنے لگا۔ غلامہ ہندی انگریزی بھی نہیں بول سکتا تھا۔

”یہ کپڑے سب نکال دو۔ اور ہمارے لائف بوٹ بٹانے کی تیاری کرو۔“ میں نے کہا۔ ”ایک بات یاد رکھنا یہ سب تم چاروں کے لیے ہے۔ اس کی تقسیم تم آپس میں اپنی مرضی سے کر سکتے ہو۔“

”ہاں ابھی میرے کو ایڈیٹ مت سمجھنا۔“ ڈاکٹر بھنڈاری نے کہا۔ ”ابن برابر حصے کے گا۔ کیا ہم خراب کا بوتل لے جا سکتا ہے اپنا ساتھ؟“

”مزدور لے جاؤ۔ دو چار بوتلیں پیٹ میں ڈال کے بھی لے جاؤ۔“ میں نے کہا۔

شام سا چھ بجے پہلی لائف بوٹ سمندر میں اتاری گئی تو سورج مغرب کی طرف جھجک گیا تھا۔ لہروں کا تلاطم ہم ہو گیا تھا اور آسمان پر آڑے دالے آبی پرندے خوریتے تھے۔ زمین کا ساحل اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ پہلی لائف بوٹ میں پروگرام کے مطابق ناز کے ساتھ گل اور محسن تھے۔ نانو نے بڑی عقل مندی سے گل کو ایک پلاسٹک شیٹ میں لپیٹ کر لیواں لٹا دیا تھا کہ وہ آسانی سے سانس لے سکتی تھی۔ گل سمندری مانی کی زخموں میں آگ لگانے والی یلنار سے محفوظ تھی۔ محسن کا ساتھ گل کے نفسیاتی اطمینان اور سکون کے لیے ضروری تھا۔

ردائی سے پہلے محسن نے کہا۔ ”بھئی میں ہم کہاں میں گے؟“

”حاجی علی کی درگاہ پر آدھ کماں۔“ میں نے کہا۔ ”اسی لائف بوٹ کے بلے میں کیا کیا جا سکتا ہے کہ ایک کتا سے پرہیز نہیں کیا اور کماں پہنچے گی۔“

”میرا انداز ہے کہ رات کے وقت سفر میں آٹھ دس

187

گھٹنے لگ جائیں گے؟ محسن نے کہا: بشرطیکہ ہم صبح ست
میں چنے رہے۔
”اس سے زیادہ وقت بھی صرف ہو جائے تو پریشانی
کی کون سی بات ہے، حضرت کا سامان تو ہے نا؟“
”ہاں، نازو نے تو سب کچھ ہی لے لیا ہے جیسے کپکپ
پر جا رہے ہیں ہم، محسن بولا۔
”بہتج تک فہر حال ساحل کے قریب پہنچ جاؤ گے
کوئی لالچ نہائی گی، دل کی کشش ہی پاسور لوٹ کر کو سمندر سے
نکال لے گی، تم ان سے کہہ دیتے ہو کہ ایک بیچارہ کو حاجی علی کے
دہ گاہ پر جانے کے لیے چلے تھے۔“
”لالچ پولیس کی ہوتی تو انھیں وطن کرنا دشوار ہو گا، محسن
نے کہا۔

”کیوں دشوار ہو گا، تیرا اپنا پاسورٹ ہے، نازو کا پلندہ
کل کا پاسورٹ مت دکھانا اور نہ توڑ پھڑ ہو جائے گی۔“
”کیا توڑ پھڑ ہو جائے گی؟“ نازو نے کہا۔
”بھئی اس کا نام گل خان لکھا ہوا ہے، اور تصویر بھی
مردانہ لباس میں ہے، میں نے کہا آگے اس کا رول صبر کرنا
زنانہ بھی ہو سکتا ہے لیکن مردانہ رول میں وہ زیادہ کارآمد
ثابت ہوگی، کیوں اور کیسے کا جواب تم آج رات کے سفر میں
محسن سے پوچھنا۔“
”تم لوگ کب پہنچو گے؟“ نازو نے کہا۔
”یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں نازو، محسن بولا: ”اگر اگلے
لینے کو حاجی چمبرس مل جائے اور اس کے برعکس نہ ہو سکے
ثابت آگے تو وہ شہر پہنچ جائے جو حمال سے چلے دیں
پہنچ جائے یا کوئے یا رے کے چتر میں سوئے دار پہنچ جائے۔“
بقول شاعر:۔

”بھلاؤں گیا شاعر“ نازو نے بھینٹ کے کہا۔
”کون سا شاعر؟“ وہ اس نے غالب کی طرف اشارہ کیا
جو اوپر سے ہاتھ مار رہا تھا: ”اس کے ساتھ تم بھی جاؤ گی نا؟“
”یاد ہے نا کلی جعرات بھی ہے“ میں نے کہا: ”حمال
ہو گیا۔“
”ہر بدمذکر کے بعد جعرات ہی آتی ہے“ نازو نے کہا۔

”حمال کی کیا بات ہے؟“
”مگر رابعہ ہر جعرات کو نہیں آتی، محسن بولا: ”اور یہ
بات بھی وضاحت طلب ہے اس لیے دوران سفر سناؤں گا،
کوہم نے جعرات کی شام سے پہلے حاجی علی کی درگاہ پہنچ
کے کیا کمال کیا۔“
”کلی مغرب کے وقت رابعہ بھی وہاں پہنچ جائے گی۔“

میں نے کہا۔
”اچھا، نازو نے خوش ہو کر کہا: ”تمہارا بھائی
ہاں، جب میں پہنچ جاؤں گا سیکڑوں کی کلاں لگا کر
ٹلے کر کے اور ہر آرائش سے گزر کے تو وہ کیوں نہیں لگے گا؟“
اس کو آنا چاہیے، میں نے کہا: ”اچھا اب جاؤ، خدا حافظ۔“
میں رسمی کی سیڑھی کے سمارے اوپر چڑھ کر چلا ہوا
غالب سست سست راز اور برہم کھڑا ہوا تھا۔
”یہ کیا آلودہ سی نظریات میں آدھا گھٹن کر رہا ہے؟“
”نہی گھڑی دکھائے؟“ چچہ بھنے والے ہیں۔
”بھیک ہے، دوسری پارٹی کو روانہ کر رہے ہیں۔“
میں نے کہا اور درو جاتی ہوئی لائف بوٹ کو مستحکم کر رہا
فرو آ رہا ہوتا اور اپنا راستہ بناتے دیکھتا رہا۔

”شاہد جیل نے ان تینوں کے ساتھ جانے سے
کر دیا ہے؟“ غالب نے کہا: ”وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔“
”ہمارے ساتھ کیوں؟“ میں نے کہا۔
”اسے جانا کو بھی تو رواں رکھنا ہے؟“ غالب نے
اس دلیل نے مجھے قائل کیا، آدھے گھنٹے بعد ڈائری
اور اس کے دو ساتھی ہم سے ہاتھ ملا کر اور ہمارا شکریہ ادا کر
دوسری لائف بوٹ میں روانہ ہو گئے، ڈاکٹر بھٹاری غائب
نشے میں ڈھکتا تھا اور اسے بڑی شکل سے لائف بوٹ میں
ڈالا گیا۔ لائف بوٹ کے روانہ ہوتے ہی میرے اندیشہ روز
ثابت ہوئے، ابھی وہ مشکل سے سو کر ڈور گئے ہوں گے
کہ ڈاکٹر بھٹاری کو سمندر میں پھینک دیا گیا، یہ بچے کا
لالچ تھا جس نے باقی دو کو ایسا کرنے پر مجبور کیا، یہ وہ
ساری دولت آپس میں آدھی آدھی تقسیم کر کے تھے، لیکن
مجھے اس میں بھی شک تھا، مجھے یقین مل چکی ہوئی رہا
یاد آ رہی تھی جس میں اچانک خزانہ پائینے والے تین دنوں
نے ایسے ہی لالچ کے بند بات سے مغلوب ہو کر ایک
دوہرے کو قتل کر دیا تھا، ایک کھانا لینے شہر گیا تھا،
ہمارے میں رہا تھا، باقی دو اس کی عدم موجودگی
میں اسے قتل کر کے ایک حصے دار کم کرنے کی فراہم
پاس کر چکے تھے، اس پر عملدرآمد کے بعد انھوں نے
آخری طعنہ نوش کیا اور اٹھ کر پیار سے بونے کیا، اپنے
پارٹنگے؟ کس کو ننگے گاں اٹھایا، کس کو کتے کا دھوپ
جنا پر اب شام کا سایہ گرا ہوا ہے، لگا تھا اور
احساس کا آئینہ ماحول پر مسلط تھا، ان تینوں کے
جو ادھر پہنچے ہر جگہ نظر آتی تھیں، ایک بند کمرے میں
۱۱۔ موت سے بے خبر پڑے تھے جو گھڑی کی سونپوں

ساتھ ساتھ ان کی جانب بڑھتی آ رہی تھی، ایس ایس کی رات
تھوڑے ہی اپنے انجام سے بے خبر آگے بڑھتا جا رہا تھا،
لیج کی جانب جو سمندر کی وسعت میں ایک جگہ موت کا حال
پھیلنے لگا تھا، جہاں اس پر فکروہ متحرک فولادی کپڑے کو زبرد
پنہ ہو کر جھٹکے کے لیے بحیرہ عرب کی گہرائی میں کھو جانا تھا۔
میسری لائف بوٹ میں بیس منٹ کے اندر اندر ہمارا
مکان ہو جانا لازمی تھا۔
”غالب! کو جا کے شاہد جیل کو لے آئے، میں نے کہا۔
”یہ پتہ روک لانا ہوں؟“
”کیا وہ بھی ہمارے ساتھ رہے گا؟“ غالب
نے برہمی سے کہا: ”یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے، مرنے سے
اسے بھی۔“
”ایسے نہیں مرنا، کم سے کم اتنا تو ہو کر میں اسے خود پھانسی
دے سکوں؟“ میں نے کہا: ”اس کے مرنے سے مجھے یلیناں
تو حاصل ہو کر میں نے اپنے باپ کے قاتل کو سزا دی۔“
غالب کو مجھ سے اتفاق نہیں تھا، مگر اس نے اختلاف
کا اظہار بھی نہیں کیا اور شاہد جیل سے بات کرنے چلا گیا۔
نئی بیٹ کر تھے اس تھکانے میں پہنچا جہاں میں نے پتہ روک
کو لال جیونٹوں کے ساتھ چھوڑا تھا۔

”تھکانے کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا، میں نے فوراً
رولور نکال لیا اور ایک دم اندر داخل ہو گیا، ٹھنڈی کوئی
بھی نہیں تھا۔ میں بیٹ کے بھاگا، یہ میری بے وقوفی تھی
کوئی لوں سوچے، لیکن اندر گھس گیا تھا، سامنے والی دیوار
کے کسی بھی سوراخ سے وہ مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔“
غالب مجھے سامنے سے آتا ہوا ملا دیکھا ہوا،
”یار! وہ پتہ روک وہ کھل گیا، میری سمجھ میں نہیں
آتا کہ کیسے؟“ میں نے کہا اور وہ دروازہ کھولا جس میں بچاؤ
قید تھے، وہ سب موجود تھے، ان میں سے ایک رہ گیا تھا
اور باقی کی حالت غیر تھی۔

”سکندر! بازو شاہد جیل بھی نہیں ہے؟“ غالب
نے کہا۔
میں ایک دم بلاٹا: ”کیا؟ شاہد جیل بھی؟“
غالب نے افسوس میں سر ہلایا: ”میں نے اسے ہر جگہ
دیکھ لیا ہے۔ آتی سی ویر میں وہ کہاں جا سکتا ہے؟“
میں نے اچانک خود کو انتہائی غیر محفوظ اور خطرے
مگھرا ہوا محسوس کیا، ایک وقت شاہد جیل کا اور پتہ روک
کا گناہ ہو جانا، متعدد خدشات کو جنم دیتا تھا، کیا پتہ روک
نے شاہد جیل کو مار کے سمندر میں پھینک دیا؟ اس وقت

جب ہم لائف بوٹ کو رخصت کر رہے تھے، ہمارا حال
اس کے برعکس ہوا، شاہد جیل جہاز کی تباہی کے معاملے
میں ہم سے اختلاف رکھتا تھا، بہرہائیکان کی طرح اسے بھی
جہاز کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی تھی، وہ نہیں چاہتا
تھا کہ ہم جہاز کے ٹکے کے بعد جہاز کو بھی تباہ کر دیں، غلے
کے افراد اس خاندان کی طرح تھے جن کا وہ دوسرا براہ تھا۔
یہ جہاز ان کے لیے گھر تھا جس میں وہ آباد تھے۔ ہم نے اس
کے خاندان کو قتل کر دیا تھا اور اب اس کے گھر کو نیت نابود
کرنے والے تھے۔ کہیں اس نے پتہ روک کو اس وعدے پر
آزاد نہ کر دیا ہو کہ وہ جہاز کو بدحالت بند کر دے گا، کب پتہ روک
کا غماہ رہنے پتہ روک خود بھی یہی چاہتا تھا اور اس کی ضمانت
دے سکتا تھا۔

اب وہ اسی جہاز میں کہیں روپوش تھے اور ہمارے
لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اتنے کم وقت میں انھیں تلاش
کریں۔ میں اس وقت میں اضافہ بھی نہیں کر سکتا تھا صرف
محسن جانتا تھا کہ ٹائم کم کہاں ہیں اور وہ چاہتا تھا کہ آگرم
فوری طور پر لائف بوٹ میں فرار ہونے کی کوشش کرتے تو
یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ پتہ روک کو کس چھپ کر سب دیکھ
رہا ہو گا، ہم پریشان کن کامیہ کھول دیے گا۔

”میں ایسا تو نہیں کرنا شاہد جیل یا پتہ روک نے لے کے ٹائم کم
تلاش کر لیے ہوں اور انھیں ناکارہ کر دیا ہو، گھڑی کی سونیاں
تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں اور ابھی تک میں کوئی فیصلہ
نہیں کر پاتا تھا۔“

اپنے چھپے ایک جنوں خیر مقدمہ سنائی
دیاج میں ایک ایسی پراسیبت کیفیت
تھی کہ یہ دیران کھنڈر میں اچل کر فٹہ آوازوں کی بائشٹ محسوس
ہوتی تھی۔

میں چونک کے پلاٹا تو مجھے اپنے مقابل شاہد جیل دکھائی
دیا۔ اس کی صورت پر عیاں وحشت کے آثار نے مجھے تادیا
کہ وہ اپنے ذہنی توازن سے محروم ہو چکا ہے۔ وقت کے
بے رحم فیصلوں اور اپنے غلط اندازوں نے اس کے سب
خوابوں کو چکن چور کر دیا تھا اور اس سے سب کچھ مین لیا تھا۔
وہ ماضی حال اور مستقبل سے محروم احساس کے غلام کی پیرست
وسعت میں سرگرداں ایک بے وجود لمحے کا عکس رہ گیا تھا۔
یقلت وہ بے گھر ہو گیا تھا اور لاوارث رہ گیا تھا۔
ایک گھر وہ تھا جس کی حسرت تعمیر میں وہ سالوں سے بندوں
تک جھگڑا رہا اور دولت سمیٹ کر اپنے ہوی بچوں کو دیتا رہا
تا کہ وہ دنیا کے بازار سے اپنے لیے ساری آرزوئیں اور سب

خوشیاں خریدیں۔ اس گھر سے اس کی جذباتی وابستگی میں خون کا رشتہ تھا۔

دوسرا گھر یہ ہماز تھا جس میں اب وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اس کے علی کا ہر مزاج کو وہ اپنے خاندان میں شامل سمجھتا تھا، بے مروت یا بے وفائیت ہو جاتا تھا اور اسے چھوڑ کے جا چکا تھا۔ اب ہم رہ گئے تھے جو اس گھر کے وجود کو بھی پرزہ پرزہ کر کے مندر میں بکھیر دینا چاہتے تھے۔

اور شاہد جمیل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گھر والے نہیں رہے تو کیا، گھر تو ابھی ہے اور وہ مرتے دم تک اس کی حفاظت کرے گا اور اس کے ساتھ موت میں بھی وہ تعلق برقرار رکھے گا جو زندگی میں تھا۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا کیونکہ میں نے ہمازوں کے ساتھ کئیوں کے تعلق کی وہ بکھریاں سنی تھیں جن میں ایسا ہی ہوا تھا۔

شاہد جمیل کے ہاتھ میں ایک شین گن تھی لیکن میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس کا رٹھ ہماری طرف نہیں تھا ورنہ اس سے گولی بلا ارادہ چلی جی جاتی، ہماز کے بچکے بچے ظاہر کرتے تھے کہ اب یہ سفید کی ناخدا کے بغیر موت کے ساحل کی سمت خود ہی رواں ہے۔ اسے دست اجل نے منزل تک لے جانے کے لیے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

شاہد جمیل؟ میں نے سکون سے کہا، کیا تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے؟

میں۔ تم مجھے ساتھ نہیں لے جا سکتے، اس نے پھر بے وقوف قسمہ مارا، تم مجھے جبر نہیں کر سکتے، کوئی زبردستی نہیں کر سکتے میرے ساتھ۔ اگر تم نے اس کی کوشش کی تو خود بھی نہ جا سکو گے۔

شاہد صاحب! ہماز ڈوبنے والا ہے؟

ہماز۔ کون سا ہماز؟ وہ بولا، یہ گھر ڈوبنے والا ہے۔ دیکھو، کیسا طوفان آیا ہے۔ میری زندگی گزر گئی ایسے طوفانوں کا مقام کہہ سکتے ہیں اسے بچاؤں گا جیسے پہلے کی بار بچایا تھا۔ مگر تم جاؤ، تم گھر تو نہیں ہے یہ۔

اس سے بحث کرنا فضول تھا کہ وہ اپنا فیصلہ بدلے۔ اس کے لیے وقت بھی نہیں تھا۔

میں نے کہا، ہمارا ایک قیدی تھا۔ استاد پٹرو؟

وہ بھی گیا۔ میں نے کہا کہ جاؤ میرے گھر تم سلاخی کے ساتھ جا سکتے ہو۔ تم نے جو کیا اچھا نہیں کیا۔ میں نے بھی جو کیا اچھا نہیں کیا۔ مجھے میرے اعمال کی سزا ملی۔ تم کو سزا دینے والا میں کون ہوتا ہوں۔ خدا کا عذاب نازل ہو گا تم سب پر۔ کرتے نہ میرا گھر تیا۔ کاش وقت مجھے ملت دیتا کہ میں بھی

اسی طرح تمھارے گھر تباہ کر سکتا، وہ اب رہ رہا تھا۔ انہوں نے اس کے آنکھوں سے اس کے پرورشیت چہرے پر بہہ رہے تھے۔

وہ۔ کب گیا۔ اور کیسے؟

مجھے نہیں معلوم، وہ چلا یا اور اس نے اچانک شین گن اٹھائی، جاؤ تم بھی۔ میں تم کو قتل کرنا نہیں چاہتا، گھر میں۔ حالانکہ تم بھی قاتل ہو میرے گھر کے۔ میرے ہماز کے مگر اپنے آخری وقت میں اس کے وجود کو میں کسی کے خون کے داغدار نہیں دیکھ سکتا۔

میں نے غالب کو اشارہ کیا، لائف بوٹ اتار دو۔

لیکن وہ... غالب نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

وہ اندر ہی ہے؟

ہے تب بھی ہم کیا کر سکتے ہیں؟ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، صرف دس منٹ باقی ہیں؟

کچھ سوچنے کیلئے دس منٹ نہیں رہا تھا، میں نے اور غالب نے لائف بوٹ کو مندر میں چپک کر دیا۔ میں نے ایک آخری نگاہ شاہد جمیل پر ڈالی جو اب شین گن چپک چکا تھا اور ضرب میں غروب ہوتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اپنی زندگی کی آخری روشنی دیکھ رہی تھیں مگر وہ خود شاید وسعت افلاک اور قدر امکان سے آگے اڑنے کے ساحل پر تیار چکا تھا۔

پہلے غالب نے اور پھر میں نے مشاعرہ مندر میں چلا لایا۔ اس وقت میں بالکل تیار تھا کہ کسی بھی سمت سے آنے والی کوئیوں کی پوچھاڑ مجھے ہوا میں ہی چھپی کرے۔ اتنے کم وقت میں استاد پٹرو کا فرار ہو جانا بعد ازاں قیاس تھا اس کی حالت بھی ایسی تھی کہ وہ سمندر کی موجوں سے لڑنے اور ایک بار پھر دست قدرت کی یاوری پر انحصار کرتے ہونے اس وقت تک تیار رہے جب تک کہ کہیں سے غیبی امداد نہ پہنچ جائے۔ ایسا ایک بار ہو چکا تھا۔ امید رکھنے والے کو یہ حقیقت قابل نہیں کرتی کہ خوف گوارا اتفاقات بار بار نہیں لیتے پٹرو لیفٹینانٹ اندر ہی تھا اور شاید اس نے ہماز کے اس کے لیے اسلحے کے ذخیرے کو تیار ہی ہے۔ ہماز کے کوئی صورت نہیں رہی تھی چنانچہ اس نے اپنی زندگی بچانے فیصلہ کیا ہو گا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہ وقت ناہم ہو کر تلاش کرنے میں نہ گنونا۔ میں ہماز کے آخری کلمے سے چھوٹا جاتا جہاں سے میں دھاک کے بعد سمندر میں جا کر تانے تھنے کے سامنے تیر کر دوڑ نکل جانے کی امید کر سکتا تھا۔ لیکن میرے لیے یہ خطرہ اپنی جگہ پوری اہمیت رکھتا تھا کہ پٹرو عمر کے آخری حصے پر موجود ہوا تو وہ میں اتنا

انسانی سے نکل جانے کا موقع نہیں دے گا۔ وہ کوشش فرود کرے گا کہ ہماری لاشیں اس جہاز سے پہلے غرقاب ہو جائیں۔ پورے اندازہ اس وقت درست ثابت ہوا جب بڑی جہاز کی ہندی سے اڑتا ہوا میں سمندر کی سلاطین آغوش میں گرنا چاہا، پانی میں گرتے ہی لائف بوٹ میں ہوا بھری تھی اور اس کے بیٹھنے کے لیے پھول کے گڑھے کی طرح ہو گئے تھے۔ یہ شیا چاروں سمت میں ایک حفاظتی حصار کا کام بھی دیتا تھا۔ جب میں نے لہروں کے شور میں نازکی آواز کی سنیں تو مجھے اپنی بے اختیار کراس احساس ہوا۔ اس لمحے پر اگر اختیار تھا صرف نوشتہ تقدیر میں بقا و فنا کے فیصلے تحریر کرنے والی قوت کو۔ اور یہ فیصلہ مجھے معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس لمحے میں میرے سفر حیات کی آخری منزل آجاتی تو اوپر سے نیچے تک آتے ہوئے ایک خاص بلندی پر وہ کوئی میرے جسم سے فرود گزرتی جس پر دست قدرت کی تحریر میں میرا نام لکھا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں پانی میں گرا اور ایک مختصر فاصلہ میں نے تیر کر لے لیا۔ مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ لہروں کی ٹھنک گرج سے الگ بھی ایک آواز ہے جو اس ماحول کا حصہ نہیں ہے۔ یہ گویوں کی آواز تھی گویاں نہ جانے کس سمت سے آ رہی تھیں اور کہاں جا رہی تھیں۔ نہ میں دیکھنا چاہتا تھا اور نہ دیکھ سکتا تھا۔ میری ساری جدوجہد لائف بوٹ میں سوار ہونے اور اس کے بعد جہاز جلد دوڑ نکل جانے کے لیے تھی۔ اسے میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ اتفاق خوش قسمتی تائید بڑی، شاید سب کا ایک ہی مضمون ہو گا لیکن میں یہ ہرگز دعویٰ نہیں رکھتا کہ ہمارے پرچے جانے میں ہماری خواہش کے ساتھ کوشش کا دخل بھی تھا۔ وہ کوئی اور ہی ہاتھ تھا بچانے والا ہاتھ جن نے سمندر کو سلاطین رکھا تاکہ مارنے والا ہاتھ نہ بچا جانے میں نے نشانے کی زد میں آئی ہوئی چھوٹی سی لائف بوٹ اور اس کے دو عاجز مسافروں کو محفوظ رکھا۔ اس کی شین میں ایک جہاز کے برابر سورج ہو جاتا تو اس کی سب ہوا نکل جاتی۔ ایک کو محفوظ ترین حصے میں پناہ لے لی تھی۔ وہ ہماز کے بازے میں منتقل معلومات رکھتا تھا کہ اس کے کس حصے میں کیا ہے۔ شین کی انکھی ہوئی انگڑت گویاں تو ایک پوزیفیس ڈبو گئی تھیں لیکن لائف بوٹ کو کسی کوئی نے نہیں چھوا۔ بعد میں جب میں نے غور کیا تو میرے ذہن نے بہت سے عوامل کاوش کر لیے۔ مثلاً یہ کہ پٹرو زخمی تھا۔ وہ شاید سیدھا ٹھکرا بھی نہیں رو سکتا تھا۔ بچکے کے کاتے ہماز پر وہ شین گن اٹھا کے صبح سمت میں کیسے نشانہ لے لے سکتا تھا۔ پھر نشانہ بھی ساکت کہاں تھا۔ انہوں کا قیام ہر لمحہ میں زیر و زبر کر رہا تھا۔

لیکن اس وقت صرف یہ ہوا کہ غالب نے ہاتھ بڑھا کے مجھے اوپر کھینچ لیا میرے پٹے پانی میں شراور تھے اور میں ہاتھ رہا تھا۔ کچھ کے بغیر غالب نے میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا کپڑا دیا۔ یہ تقریباً آٹھ فٹ لمبا بہت ہلکا مریضو ڈونٹ تھا جس کے دونوں کنارے بیضی شکل کے اور چپٹے تھے۔

میں نے اور غالب نے بحری جہاز سے دور ہونے کی ایک دلوانہ وار جدوجہد کا آغاز کیا تب بھی ہمیں معلوم نہ تھا کہ زندگی اور موت کی رحد ہم سے کتنی دور ہے اور ہم یہ رحد عبور کریں گے یا اس سے پہلے ہی قضا آجائے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ پٹرو فائر کر رہا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ناہم بم کے پھٹنے کا وقت ہو گیا ہے۔ نہیں ہوا تو شاید چند منٹ باقی ہوں گے۔ دو گھنٹوں آپس میں ملتی نہیں۔ دھماکا دو چار منٹ پہلے بھی ہو سکتا تھا اور دو چار منٹ کی تاخیر سے بھی۔ بلا دھماکا صرف آغاز تھا۔ اس سے ہماز پر لہرے ہونے کو ڈونٹ پہلے نایت کے اسلحے کی تباہی کا سلسلہ شروع ہونا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا، پھر تیسرا، پھر گودام کا آتش گیر مادہ ایک الگ دھماکا کرے گا۔ مگر یہ سب مسلسل ہو گا۔

میں اس وقت غالب کو بھولا ہوا تھا اور غالب مجھے ہم دونوں کو قطعی احساس نہ تھا کہ ہمارے بازو شل ہو رہے ہیں۔ ہم سمندر سے لڑ رہے تھے۔ زندگی کی چاہت، امید، آرزو ایک ہی دم جہد و جدوجہد بن گئی تھی۔ یہی آخری وقت تک شکست تسلیم نہ کرنے کا جذبہ تھا جو ہماری توانائی بن گیا تھا، دعا بن گیا تھا اور یقین بن گیا تھا۔

معلوم نہیں کتنی صدیوں پر عظیم لوٹ کھسوٹ اور مشنوں کا سفر تھا جو یکجہت تمام ہوا۔ اچانک ہر آواز ختم ہو گئی۔ سمندر ساکت ہو گیا اس سکوت نے دنیا کو خوف سے بھر دیا ہو گا گئی۔ ہمارے دل کو دھڑکانا یاد نہ رہا۔ ہمارے افضوں کی حرکت ختم ہو گئی۔ جدوجہد کی مملت تمام ہوئی۔

دھماکا ہوا تو میری نظر ہماز پر پڑ گئی۔ جہاز گئی وہ تھلے معلوم نہیں۔ فاصلے کی اہمیت ہی کہاں تھی۔ کیا ہم محفوظ فاصلے تک پہنچ چکے تھے؟ معلوم نہیں، ایک گز، ایک فرلانگ، ایک میل سب اس وقت برابر تھے۔ ہم کپڑا پر سے گر رہے تھے۔ میرے کولوں کو لہروں نے دھاکا ہوتے ہی جیسے پوری کائنات کو مرتعش ہوتے اور منتشر ہوتے دیکھا، سنا اور محسوس کیا۔ وہ ایک شوخ عرش تھا جس نے زمین اور آسمان کو ملا دیا۔ سورج کا آفتاب گولاً مغرب کے افق پر آئیں آگلا پھیلا رہا تھا۔ یکجہت یہ فقیق ہماز کے اوپر اپنی بجلی مسلسل چمکی اور گرج کے ساتھ طوفانی ہوا میں چلنے چلنے لگیں۔

سمندر ایک دم مشتعل ہو کے اٹھا۔ ایک لہر نے لائف بوٹ کو اوپر اٹھالیا۔ میں نے غالب کا ہاتھ تھام لیا اور ہم لائف بوٹ سے چٹ گئے۔ نہ جانے کتنی بلندی پر لے جا کے لہر نے نہیں اچھال دیا۔ دوسری لہر نے لائف بوٹ کو کچھ کی اور آگے پیچیدہ دیا۔ ہر دھماکا خواہ وہ کسی کم کا ہو یا انچھڑ کا؛ فضا میں ایک خلا پیدا کرتا ہے۔ اس خلا کو پڑ کرنے کے لیے جوا ایک گولے کی طرح دوڑتی ہے۔ ہوائی یہ لہر جو شاک دلوں کھاتی ہے، انسانوں کو اور کھیلوں کو، درختوں کو اور عمارتوں کو گرائی جاتی ہے۔ سمندر میں اس موج ہوا نے لہروں میں وہ تلامہ پیدا کیا جس نے ہمیں تنکے کی طرح آگے پیچدکا۔ دوسرے دھماکے سے دوسری لہرائی جو پہلی لہر کے بالکل پیچھے اس کے تعاقب میں تھی۔

ہو اسے بھری ہوئی گشتی آفت نہیں سکتی تھی۔ پانی کے جان لیوا پتھروں نے کئی بار کوشش کی مگر نہ میں نے غالب کو چھوڑا اور نہ کبھی۔ بالآخر لہر اس میں ٹکرا کے ٹوٹ گئیں۔ میں نے خود کو سمیٹا لیا اور اس اٹھا کے دیکھا تو میرے منہ پر نیکیں پانی کی لہجہ آرائی۔ ٹمک کا ذائقہ میرے لبوں کو کاٹ رہا تھا لیکن میں نے غصے میں مسکارا ہوں۔ یہ اندر کی خوشی تھی جو میرے وجود سے چھوٹ رہی تھی اور خود بخود دیوں تک آگئی تھی۔

دھوئیں کا ایک مرفعلہ اوپر اٹھ کے بادل سا بنتا جا رہا تھا۔ اس کے وسط میں آگ تھی جس کے شعلوں کی زبانیں اوپر بیک رہی تھیں۔ ایں ایں کرائی تھرو۔ ایک آتش فشاں پہاڑ بن گیا تھا بولا اگل رہا ہو۔ جہاز کے جم کے بیڑوں چھوٹے بڑے نولادی اور کڑی کے ٹکڑے اسباب کے پرزے اور آتشیں اسلحے کے اجزائیکڑوں فش کی بلندی تک اڑتے جاتے تھے۔ یہ کسی آتش بازی کے منظر سے کم دکش نگارہ نہ تھا۔ شعلوں کے ٹکڑے اور دھوئیں کے تار یک آسمان کے سبب منظر میں زیادہ نمایاں دکھائی دیتے تھے جو شرباب ثابت کی طرح ایک قوس کی صورت میں لہراتے آتے تھے اور سمندر میں کم جاتے تھے۔ آسمان تک اٹھنے والے شعلوں کے تاریخی رنگ نے لہروں میں بھی آگ کی لگا دی تھی۔

یہ ایسا مسور کن اور دکش نگارہ تھا کہ میں گرد و پیش سے بے خبر اس میں گم رہا۔

اچانک غالب نے کہا: یہ کتنا دل خوش کن منظر ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

میں بے اختیار سینے لگا: یہ ہماری فتح کے جشن کی خوشی میں آتش بازی کا منظر ہے۔

”کیا اس منظر کو وہ سحر کا پتھر بھی دیکھ رہا ہوگا؟“ غالب نے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ پیٹرو کی طرف ہے۔ ”خدا کرے کہ دیکھ رہا ہو اس کا اذیت کا احساس پتھر کیلین دیتا ہے۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مر گیا ہو۔“

”میں یار! ایسے بے غیرت یوں نہیں مرتے۔ وہ ہر کچ گیا ہوگا اور میری تو خواہش ہے کہ وہ ابھی نہ مرے؛ میں نے کہا۔

غالب نے حیرانی سے میری طرف دیکھا: ”تو اس کی درازی عمر کی دعا کر رہا ہے؟“

”ہاں۔ اس لیے کہ میں اس کے لیے بہادری اور آبرومندی کی موت نہیں چاہتا۔ میری آرزو ہے کہ وہ پھر میرے مقابل آئے ایک مجرم کی حیثیت سے۔ جب انصاف کی کوئی پریڈھ کے میں اس کی فرد جرم پڑھوں اور پھر اسے اتنی ہی وقت آیز موت ملے جتنی وقت آیز اس کی زندگی تھی۔“

”اگر وہ جیگ گیا ہوگا تو ہمارے اور اس کے راتے پھر کہیں نہ کہیں ملیں گے وغالب نے کہا۔

”مجھے شاید بھیل کے مرنے کا رنج ہے۔ حالانکہ یہ بڑی باعزت اور قابل فرموت تھی میں نے کہا“ اور میرا دل اس خیال سے بھی بوجھل ہے کہ اس کے ذمے دارم تھے، وہ بہادر اور عالی ظرف آدمی تھا۔ اس نے اپنے لیے خود موت قبول کی مگر ہمیں معاف کر دیا“ غالب نے کہا۔

اب رات کا تاریک سایہ سمندر پر پھیل چکا تھا۔ ہم بحری جہاز کے جلتے ہوئے ڈھانچے سے ایک میل یا شاید زیادہ دور تھے اور لہروں کے ساتھ ہمارا بے سمت سفر جاری تھا۔ جہاز کا روشن ہیولاب کسی لاف کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب شعلے اور انگارے ڈوب چکے تھے جو آسمان کی کالی چادر پر اڑتے رہے تھے۔

میں نے اور غالب نے پھر چپو نہجلائے جو ہمارے جسم کے بوجھ سے دبے ہوئے لائف بوٹ میں پڑے رہے تھے۔ یہ فردوسی تھا کہ ہم اپنی سمت کو اندازے کی کہ ٹمک درست رکھیں۔ ابھی سورج ہماری نظروں کے سامنے غروب ہوا تھا۔ چنانچہ ہم سمت کا تعین کر سکتے تھے۔ ایں کرائی تھرو۔ ”کی پتا سے بھی ایک نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ شمال کدھر ہوگا۔ میں جنوب کی طرف جانا تھا اور صاف تھا ایک حوصلہ افزا غلامت تھی۔ ہم رات کو قطبی ستارے سے مدد لے سکتے تھے۔

ایک گھنٹہ بعد جب ہم مزید ایک میل دور جا چکے تھے، ایں ایں کرائی تھرو۔ جو پہلے ایک آتش فشاں تھا ٹمک کر ایک شعلہ بن گیا تھا۔ میں اور غالب اس پر نظر جاتے بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ یہ شعلہ فقط ایک چنگاری رہ گیا۔ پھر یہ چنگاری بھی غائب ہوگئی۔ رات کا یوں سبب اندھیرا اور سمندر کا غورہ گیا۔ ہم نے دشمن کے ایک قلعے کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ وہ سب اسلحہ غرق آب کر دیا تھا جو میرے ہم وطنوں کے خلاف استعمال ہو سکتا تھا۔

اس فتح کے احساس میں بیک وقت فخر و ترست کے ساتھ فکر گزاری اور ایمان قلب کے جذبات شامل تھے۔ بلاشبہ یہ غلام کی ذات تھی جس نے مجھے توفیق استقامت اور بہت عطا کی تھی اور میری کامیابی کے اسباب مینا تھے۔ سب سے بڑھ کر ملتیت دینے والا خیال یہ تھا کہ میں نے ہزاروں مسلمان، نپ وطن پاکستانیوں کو ان کے گھروں کو اور اہل و عیال کو تباہی سے اور موت سے بچالیا۔ بچانے اور مارنے والا تو ایک ہی ہے لیکن میں نے اس ظاہر کو کیا کہ اس موت کے سامان کا خمیر و نشہ اور عید کا ہنسیوں کے ہاتھ تک جاتا تو کتنی نقصان ہوتا، اس کا مطلب اندازے سے بھی کرنا محال تھا۔ مجھے جسے خوشی تھی کہ وہ سب خون نہیں بہا۔ وہ سب گھر پیوند خاک نہیں ہوئے۔ ان سب عورتوں کا سناگ نہیں اجڑا اور وہ سب بچے قریب نہیں ہوئے اس تمام اسلحے کی تباہی قوت سے ہو سکتے تھے۔

یہ الگ بات ہے کہ لیوے نہ جانے کتنے جہاز ہیں جو پہلے بھی جا چکے ہیں اور آئندہ بھی نکل جائیں گے زمین کے راستوں سے اور خشکی کے راستوں سے۔ انسانیت اور شرافت کا خون کرنے والوں کے درمیان تجارت جاری تھی۔ مگر پھر بھی۔ مجھے ان گنت ہمارے فکر گزار نظر آتے تھے۔ ان بوڑھوں، بچوں جوانوں اور عورتوں کے جن سے یہ کوئی رشتہ تھا تو اخلاقی کا یا مذہبی یا ذاتی کا اور وطن کا۔ جن کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور مجھے بالکل نہیں جانتے تھے لیکن جو میری کوشش سے محفوظ رہے تھے۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ... یہ سب ہو گیا وغالب نے اچانک اپنے آپ سے کہا۔

میں جو ٹمک پڑا۔ ”ہاں۔ سب سے دشواری کام ثابت ہوا۔ بعض اوقات تو میں مایوس ہو جاتا تھا۔“

”میں خود بے یقینی کا شکار تھا۔ وقت اور حالات پر کسی کا اختیار نہ تھا۔ سارے اندازے غلط ہوتے جا رہے تھے۔ ہم ہلکے ہو سکتے تھے اور ہو جاتا تھا کچھ اور۔“ غالب نے کہا۔ ”میں لاد فانی ہو سکتے تھے کہ شاید کرائی تھرو پر آ کے ہم نے ڈانڈی لکھت نمیں دیا اور ہماری یعنی ہم سب کی حکمت عملی

غلط تھی۔ کہیں یہ ہمارا مٹاؤ یا لینن گرا کا مرکز ثابت نہ ہو۔“

”تم دونوں نے وہ کام کیا جو شاید میں نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی اور بھی نہ کرتا۔ میں نے کہا۔“ تم نے علم جان کی ہائی گادی۔“

”اب بڑا عجیب لگتا ہے۔ وہ سب وقت جو ہم نے جہاز کے اندر گزارا۔ اداکاری کرتے، ڈرتے، سوچتے، امیدیں باندھتے اور توڑتے۔ جہاز کا پروگرام بدل بدل جانا تھا اور نئے اسباب پیدا ہو جاتے تھے۔ پریشانی کے۔ تمہاری طرف سے کوئی صورت نہیں تھی۔ رائے کی اور یقین دہانی کی کہ تم سب وقت پر ضرور پہنچ جاؤ گے۔“ واقعی۔ اس ہی صرے نے بہت طول بچھا اور اس دوران کیا کچھ نہیں ہوا۔“ میں نے کہا۔

”یار مجھے مر دی لگنے لگے ہیں۔“ غالب نے کہا۔

”ابھی سے؟“ ابھی تو پوری رات باقی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں ان لوگوں کے لیے مری رہی ہوں گے۔“

”مجھے جو کچھ لگنے لگے ہیں۔“ غالب نے کہا۔

”اور بہت کچھ لگے گا۔“ پیاس لگنے کی ڈر لگے گا لیکن اس سفر میں ہمارا زار و بارہ صرف ہمارا حوصلہ ہے اور عزم ہے۔ میں نے کہا۔

”لکھا ناچلے گا۔“ کانی کچھ نہیں؟“ غالب نے مرد آدھ بھر کے کہا۔ ”میرا جسم ٹوٹ رہا ہے سمندر کے پتھروں سے۔“

”میں بھی ٹھک گیا ہوں لیکن میں آرام کا صرف تصور کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کہتے ہیں، میں سلی دلی پر بھی آجاتی ہے۔ آج تجربہ ہوگا کہ آتی ہے یا نہیں۔“

غالب نے کہا: کیا ہم جہت میں جا رہے ہیں؟

”میرا خیال ہے۔ ابھی سے جہت کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی تو چلے ہیں۔ چلتے جائیں گے، جب تک امید اور یقین کا سہارا حاصل رہے گا۔“ میں نے کہا۔

”معلوم نہیں ہم ساحل سے کتنی دور ہوں گے۔“

”پچاس ساٹھ میل۔“ سوئیل بھی ہو سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

غالب چُپ ہو گیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ ایک دھماکی انداز میں چپو چلا رہے تھے۔ تا حد نگاہ ایک پرتشور تاریک ویرانہ تھا جس میں ابوں کھڑوں سال پرانے سمندر کے پانی کا تلامہ تھا۔ ہمارے دائیں بائیں سمندر کی انتہائی گرائی تک ہزاروں اقسام کی سمندری مخلوق تھی لیکن وہ ہماری تنہائی کے احساس میں شریک نہ تھی۔ اس لیے کنارہ و پے پایاں سمندر کی وسعت میں صرف ہم دو انسان تھے۔ جو باقی سب انسانوں کا تصور کر سکتے تھے جو کہیں بھی موجود تھا۔ ہم انک ہماری ہمارے تصور کی رسائی تھی کسی بھی حال میں تھے اور کچھ بھی کر رہے تھے۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں۔ اور وہ ہمارا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس دنیا میں کوئی اتنا اکیلا بھی ہو سکتا ہے، یہ میرے لیے

ایک بیگانہ تجربہ تھا۔

”معلوم نہیں! وہ کہاں ہوں گے؟“ غالب پھر بولا۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے خیالات کسی ارادے کے بغیر الفاظ کا روپ دھار کے بول نکلتے آ جاتے تھے۔

”کس تو ہوں گے؟ میں نے چوڑے کہا۔ میں کیا بتاؤں؟“ میں۔ ایسے ہی سوچ رہا تھا۔ میں سوچنا بھی نہیں جانتا۔ ہر خیال مجھے غور فز ہو کر آتا۔ میں نے کس نے اپنے آپ کو مایوسی سے دور رکھنے کے لیے صبح کے عذاب سے دور بننا پڑے گا۔ تجھے بھی اور مجھے بھی۔ پیلے سے مت سوچ کر کیا ہو گا جب کہ ہمارے اعتبار میں کچھ نہیں جو ہونا چاہئے ہو جائے گا۔

یہ عجیب سفر تھا۔ جس میں ہم پھر ہمارا خیال بھی ہارتھا۔ خالی بوٹ میں پانی کی لہروں کا مقابلہ کرتے رہنے اور صبر کا خیال رکھنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ حتیٰ کہ میں ایک ننھا سا سورخ ہو سکتا تھا۔ جو سارے عزم سفر کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا۔ ہم ایسے گم ہوتے کہ راستہ ہمارا سورخ نہ ملتا۔ ہم پھر کوئی شاکر یا وکیل حکمران کی تھی۔ ہادی جہاں توانائی ختم ہو سکتی تھی جس کے بعد ہم اس لائف بوٹ کو سمندر کی لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لیے مجبور ہو جاتے اور بہتے بہتے کی مٹی اتفاق سے سلامتی کے ساحل تک پہنچ جاتے تو آگے سفر کی اگلی منزل کا ارادہ کرتے۔ ورنہ ارادہ کیا اور آرزو کیا۔ اگلے لمحے کوئی بیگور ہمیں فنکی آغوش میں گھونٹ سکتا تھا۔ دوسرے ادا دہائے، ظلمات اور حادثات کا ڈر۔ امید کی کرن کو روشن رکھنے کی جدوجہد۔ ایمان اور یقین کا سارا جینے کی آند۔ سب کے ساتھ سفر جاری تھا۔ اندر جہے میں خواب روشن ہوتے تھے۔ یادوں کے عکس جھلکاتے تھے۔ چہرے فروزاں ہوتے تھے۔ آشنائے ہاں دلدار چہرے ہمتوں کے امین چہرے رفاقتوں کے سفر چہرے۔ وہ جو ساتھ تھے اور نہ رہے۔ اور وہ وہاں پھر دور ہو جاتے۔ رابعہ، شملہ، مومئی، استاد فیضی اور انکی روضی سب مجھے یاد آئے۔ سب نے میری دلجوئی کی اور میرے احساس تنہائی کے ڈھیر ختم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔

وہ سفر کی اور آزمائش کی قوت برداشت اور یقین کے امتحان کی حجت ترین رات تھی اور شاید وہی ایک رات تھی جو میرے اعصاب کو شکست دے سکتی تھی۔ مجھ سے بدتر حال غالب کا تھا۔ ہم خاموش تھے اور بولتے تھے تو ایک دوسرے کو رفاقت فراہم کرنے کے لیے نہیں اپنی بیڑی اور بے بسی کا بوجھ اٹارنے کے لیے۔ اپنی فطرتیں کو مشتعل کرنے کے لیے۔ ہم اپنے مزاج کی ساری ٹھنڈکی اور خوش گشتی از ہم خوشی اور عاجزی کھو بیٹھے تھے۔ اگر یہ کیفیت صبح تک رہتی تو شاید پاگل پن

کے دورے میں ہم ایک دوسرے سے لڑتے۔ ہر ایک اور کو مارتے اور انسانوں کی سطح سے گر کر دو وحشی جانور بن جاتے جن کے احساس کو جو کہ تنگی خوف اور عدم اعتماد نے مسکرت دے دی ہو۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ رات کے کسی حصے میں جب ہم بڑے ہار چکے تھے اور لائف بوٹ میں بڑھال پڑے تھے۔ ہر ایک جاننے لگے کہ سمندر کی لہروں پر ڈھکی ہوئی لائف بوٹ کس سمت میں رواں ہے۔ ہماری ساری کوشش خود کو کسی موج کی قوت سے سمندر میں گرنے سے بچانے کے لیے وقف تھی۔ میں نے ایک روشنی دیکھی۔ یوں تو سینے ہی میں نے متحدہ بحر میں کھلے کو دیکھا تھا جو بہت دور سے گزر گئے تھے اور ان کی ساکن لہر آنے والی تھم روشنائی تاریکی میں کھوئی تھیں لیکن یہ روشنی بہت واضح تھی اور میں نے اسے دوسری بار دیکھا تو پتہ چلا نسبت زیادہ قریب آچکی تھی۔ سمندر کے پانی کی مسلسل مارے مارے بدن سن ہو رہا تھا لیکن میں نے غالب کے پاس جا کے لے کر دیکھ آنے والی روشنی کی طرف متوجہ کیا۔

”یہ... کیسا ہے۔ کوئی لارچ؟“ غالب نے کہا۔ ”لارچ یا موٹر بوٹ؟“ ”مگر کسی؟“ غالب نے کہا۔ پھر اسے اپنے سوال کے اعتقاد ہونے کا احساس ہوا۔ ”غیر ہیں اس سے کیا؟“ غالب بولا۔ ”وہ ہمیں بچالیں گے۔ یہی کافی ہے؟“ لیکن کیا انھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے؟ ”دیکھا نہ ہوتا تو وہ سیدھے ادھر کیوں آتے؟“ غالب بولا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم انھیں اتنے فاصلے سے کیسے نظر آ سکتے ہیں۔ دن کے وقت تو شاید وہ دیکھ لیتے؟“ غالب کے لیے میں مایوسی اتر آئی۔ ”تو نے ٹھیک کہا۔ اتنے بڑے سمندر میں ہم ایک نکلے کی طرح ہیں اور وہ کسی نیلے کو تلاش نہیں کر رہے ہیں؟“

”ہم ان کو اس اوایل دیتے تب بھی اندر جہے میں ان کے لیے ہمارا راسخ لگانا دشوار ہوتا؟“ میں نے کہا۔ ”کیا ہم کسی طرح بھی ان کو متوجہ نہیں کر سکتے؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دن میں ہم کوئی کپڑا لہراتے اپنی قمیص اتار کے بھی لہراتے تو شاید وہ دیکھ لیتے۔ رات کے وقت تو لائٹنگ سٹک کی کام کرتا ہے۔ ہمارے پاس نارنجی جلا تو شاید...“

روشنی کا رخ اب تک ہماری سمت میں تھا۔ یہ کسی کی ہڈ لائٹ جیسی روشنی تھی۔ تیز اور ایک جگہ ٹھنکنا۔ اور اس روشنی کے تیز تر ہونے سے ہی فاصلے میں کسی کا اندازہ ہوتا تھا۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ وہ لارچ یا موٹر بوٹ سیدھی اس طرف آ رہی

ہے جہاں، کسی بیبی امداد کے اسرے پر اپنی زندگی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ ادھر ہی آ رہے ہیں؟ غالب نے سترت سے چلا کر کہا۔

میں نے کہا۔ ”یہ ہو سکتا ہے کہ وہ صرف پچاس گز کے فاصلے سے گزر جائیں اور ہمیں نہ دیکھ پائیں؟“ رات کے اندر جہے میں دیکھنے والی دوربین بھی ہوتی ہے۔ ہوتی ہے سراس وقت نہ ہوا۔ جو دوربین سے دیکھے گا اور کیا دیکھے گا یہاں؟ میں نے کہا۔ ”ہیلو؟“ غالب نے بیخ کر کہا۔ ”ادھر دیکھو، ادھر ہم جہاں ہیں۔ ہیلو؟“

”غالب؟“ میں نے کہا۔ ”کیا ہو گیا ہے تجھے؟ وہ تیری آواز کس سے سن سکتے ہیں اس شور میں؟“ لیکن غالب ہاتھ اٹھا کے چلاتا رہا۔ ”ہیلو۔ ہماری مدد کرو۔ ادھر آؤ۔“

”غالب کے مقابلے میں میرے دماغ کی سوچنے بھینکی مابقت بہتر طور پر کام کر رہی تھی۔ اس لارچ یا موٹر بوٹ میں بچے افراد ہوں گے۔ ان میں سے بیشتر سو رہے ہوں گے ایک دو فلوپی پر ہوں گے تو اپنے پہلے سے تین راستے پر رواں رہنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں کریں گے موسم اچھا ہے اور راستہ صاف ہے۔ کسی دشواری کے بغیر ان کی لارچ جیتی جائے گی۔ وہ اطمینان سے گپ لگاتے رہیں گے یا سگریٹ چائے، کافی پیتے رہیں گے۔ ان کو کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی کہ وہ کسی وجہ کے بغیر دور ہیں۔ سمندر پر نظر رکھیں۔“

لیکن میری اس منطقی سوچ کی نفی وہ روشنی کرتی تھی جو ہلہ بولہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں اب انجمن کی آواز کو لہروں کے شور سے الگ کر سکتا تھا۔

میں نے غالب کو دیکھا وہ دونوں ہاتھ اٹھا کے چیخ رہا تھا اور لارچ میں آنے والوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حالانکہ ان کے کالوں تک یہ آواز پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ لارچ کے کسی بند کیبن میں تھے۔ اندر راجن کے چلنے کی آواز تھی اور باہر سمندر کی لہروں کا شور تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے بھی غالب کے ساتھ چلا نا شروع کر دیا۔ میں پہلے دونوں ہاتھ ہلاتا رہا تھا اور انگریزی کے علاوہ فرقے میں مدد لینے لگا رہا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ روشنی رخ بدلے بغیر ہم سے دو سو گز تک آئی اور دور ہوئے گی۔ وہ کوئی لارچ تھی جس کے کیبن کی کھڑکی میں بھی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے سیدھے اٹھنے ملتی جا رہی تھی اور یہ سیدھا راستہ ہماری سمت میں ٹھک

کچھ فاصلے سے گزرتا تھا۔ چلاتے چلاتے ہمارا لگاؤ درکنے لگا۔ لارچ کا رخ کس رخ نہیں بدلا۔ ہم نے اسے بہت قریب آ کے دور ہوتے دیکھا۔ اس کے انجمن کی آواز کا شور ہم پر پڑنے لگا اور روشنی پھر تاریکی کے سمندر میں کھو گئی۔

شدید مایوسی نے ہم دونوں کو مغلوب کر لیا۔ ہم تنگ کے لائف بوٹ میں گر گئے۔ بے رحم رات پھر ہمارے اعصاب پر سوار ہو گئی۔ ہم بے بسی سے اس سمت میں دیکھتے رہے جو در وہ لارچ گئی تھی۔

”صبح تک کچھ نہیں ہو سکتا؟“ میں نے کہا۔ ”کیا صبح ہوگی؟“ غالب نے بیخ نا امید لہجے میں کہا۔ اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا۔ تو بہت سبز کا سامان مثلاً کچھ کھانے پینے کے لیے۔ ایک کپل تریاں یا بلاٹک شیٹ تو حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔ ہماری جہاں توانائی کا گراف اتنا نہ گرتا اور ہم چھو چلاتے رہتے گرم چائے یا کافی سے بھر ہوا تھا تو بھی ہوتا تو بہت تھا۔ سگریٹ چائے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پانی کی مسلسل پوچھا میں دونوں استعمال کے قابل نہ رہتے۔ ہاں نارنج ہوتی تو بہت کار آمد ثابت ہوتی۔ ہم روشنی کو جلا جھکے ہر طرف نکل دے سکتے تھے۔ شاید یہ اشواوسی کو متوجہ کر لیتا۔ مگر ہم بالکل خالی ہاتھ تھے۔ روانگی سے پہلے ہمیں اسباب سفر ساتھ لینے کی جو مہلت مل سکتی تھی وہ پیڑرو کی اور شاہد جمیل کی تلاش میں صرف ہو گئی تھی۔ ہم بڑی افراتفری اور عجلت میں روانہ ہوئے تھے چنانچہ کچھ بھی ساتھ نہیں لائے تھے۔

باقی رات کے لیے گزری یہ خود مجھے بھی نہیں معلوم میں نفاہت کا شکار تھا اور ہم بے ہوشی کے عالم میں آنکھیں بند کیے پڑا ہوا تھا۔ پھر اٹھو رجبے دھوکا دینے لگا تھا۔ کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں آڑا ہوں اور لائف بوٹ ایک انجن والا ہوائی جہاز بن گئی ہے۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کشتی ساکت ہے اور مجھ پر اچلی تیز دھوپ پڑ رہی ہے۔ اس کی زندگی بخش تمازت میرے جسم میں پھیل چکی ہے۔ آنکھیں کھول کے دیکھنے پر میں نے اسی سلام اندر سے سمندر کو پکارا سیب رات کو دیکھا۔

یہ نیند تھی۔ یہ بے ہوشی بھی نہیں تھی۔ یہ صرف انتظار تھا۔ سفر کے ختم ہونے کا یا رات کے ختم ہونے کا۔ سفر یوں بھی تمام ہو سکتا تھا کہ اچانک لائف بوٹ جواب دے جائے۔ ایسی صورت میں ہم کسی قسم کی تھوہمد کے بغیر ڈوب جاتے۔ غالب کو تیرنا نا آہی نہیں تھا اور میں اس قابل نہ تھا کہ تیر سکوں۔ ایک بار میں نے کسی شاکر کو بھی دیکھا جو ہماری لائف بوٹ کے

196

جان ایک دم نرم ہو گیا، بیک روز! یہ ہماری آپس کی بات ہے۔ سب کے سامنے جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت ہے میں وضاحت کر چکا ہوں ایک بار کہیں بے ایمان آدمی نہیں ہوتا۔ تم آدمی ہی نہیں ہو شیطان ہو۔ اور مجھے کوئی مرض نہیں تھا اسے نفع و نقصان سے۔ نہ میں وضاحت چاہتی ہوں۔ میں تو اپنا پورا حشر چاہتی ہوں اور بس۔

”اوکے۔ اوکے۔ ہم ایک بار پھر بات کریں گے لیکن ابھی نہیں۔“ جان نے ہاتھ اٹھا کر کہا: پہلے ہم ان سے نمٹ لیں۔

میں نے کافی ختم کر کے مگ اسے تھمایا: ”تھینک یو۔“

کیا ایک سگریٹ مل سکتا ہے مجھے؟

”میں سگریٹ نہیں پیتا۔“ وہ بولا۔

بیک روز نے نہ جانے کہاں سے ایک پیٹ برنڈ کیا اور میری طرف اٹھال دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کسی تربیت یافتہ فزکس کی طرح غالب کو اپریٹ سے رہی بھی اور اسے چھپے سے کافی پلاسٹی بھی۔

”کیا۔۔۔ مجھے خشک کپڑے مل سکتے ہیں؟“ میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر سکون اور راحت کے اندر ہی توانائی کے احساس کے ساتھ کہا: ”مجھے سردی لگ رہی ہے۔“

”مل جائے گا۔“

”اور ہم نے کچھ کھایا ابھی نہیں ہے۔ کل سے۔۔۔ میں نے کہا۔“

”فکرموت کرو۔ اب تم ہمارے ہاتھوں میں ہو سوری اور بیوک سے نہیں مرو گے۔“ وہ بولا۔ ”وہی تمہاری مرضی۔“

”کیا اس بات کا یہ مطلب لیا جاسکتا تھا کہ ہم نے کسی بھی معاملے میں یہ ضروری تحسین کا مظاہرہ کیا اور داخلہ و مقولات کیا تو ممکن ہے ہیں مرنے والے؟ میں نے سوچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کو ذریعہ طور پر سوال جواب کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا غالب کی حالت بہتر ہو رہی تھی اور مجھے امید تھی کہ میرے کپڑے بدل کے واپس آئے تب وہ پوری طرح ہوش میں آجکا ہوگا۔

مجھے اٹھنا دیکھ کر جان نے اپنے حکم کے ایک غلام سے کہا: ”اس کو پہننے کے لیے کچھ دو۔ مگر۔۔۔ اس نے دونوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ یہ تو بے آدمی۔“

وہ دونوں جو خود کو ناز و نیک یا نیک کا نگ بھگتے تھے اور ڈیل ڈول میں مجھ سے دُگنے تھے اسے اپنی تعریف بھگتے کے مسکرائے۔

”میرے کپڑوں میں دیکھو۔ جو پرانے کپڑے میں مرنے کو چکا ہوں، ان میں سے ان کا ساز و نکل آنا چاہیے۔“ جان نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا: ”لیکن جو تیس ہیں میرے پاس۔“

”کوئی بات نہیں۔ انھی جوتوں سے کام چل جائے گا جب

یہ خشک ہو جائیں گے۔“ میں نے اپنے چہرے ہونے برون جوتوں کو دیکھ کر کہا۔

”سینے پر پرسی ڈائمنڈ سٹون مروانگی کے طور پر کھانے والے نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔“

”فارہون سیک۔“ جان نے سر پر ہاتھ مار کر کہا: میرے قایلین کا ناس تو مت کرو۔“

”سوری۔“ میں نے کہا اور دونوں جو تھے اُتار کے فوٹو میں اٹھالے۔ ابھی تک قایلین اس لیے محفوظ تھا کہ کم کم میں پیٹے پڑے ہوئے تھے۔ جب میں کھڑا ہوا تو پانی جوتوں میں بہنے لگا۔ ایشیخ پر دیہاتی مسخرے کا کردار ادا کرنے والے کی طرح میں کمرے سے یوں باہر گیا جیسے وہ دیہاتی کسی ایوانِ صدر کی خواہش کے نکل رہا ہو۔ بیک روز کھٹکھٹا کے نہیں۔ اس کی کبھی بڑی دلکش تھی۔ اس خوشبو کی طرح جو اس نے گلابی تھکی فوٹو نے انسانوں کو سواہ وغنید کے تعصب میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ یہ تقریق مفید رنگ کو دھڑا امتیاز بنانے والوں نے پیدا کیا۔ بیک روز اگر وراثت روز ہوئی تو قیامت کلمات۔ اس کے ہاتھوں کی دلکش سارے خطوط قاتل اور سب ادائیں نظروں میں گر کر ہستی کے باعث وہ سیاہ نسل کی عورت تھی۔

جوسٹ جان کھلانے والے نے ستر دیے تھے، ایلے تھے کہ ہمارے ملک کے ٹھوسے بازاروں میں پہنچنے سے قبل ہی امیر زادوں کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ فخر کے ساتھ پہنتے۔ مگر میں نے جوسٹ منتخب کیا: وہ بھی بہترین حالت میں تھا۔ جب میں نے اس کے ساتھ بیچ کرنے والی مائی کو مجھے ڈریسنگ روم تک لانے والے کا چہرہ بگڑ گیا۔

”سالے امیر چند۔“ دمڑی لال کی اولاد پورا دلائی صاحب بنے گا؟ ثیرات بھی اپنی مرضی سے لے گا۔“

اسے آرو میں بات کرتے سن کے میں نے شدید جرنالی کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے تھنات سے کہا: ”میرے ساتھ پھر اس لہجے میں بات مت کرنا۔ میں اس سے دس گنے خرید سکتا ہوں جس کے اشارے پر تم دم ڈالتے پھرے ہو مجھے؟“

اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ ”سوری سراسر نا اذیا ہوں آپ کو۔ پلاز مشرفوش سے شکایت مت کیجیے گا۔“

مجھے جان کا اصل نام معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے کہا: ”نہا نام کیا ہے؟“

اس نے اپنے یوں پر زبان پھیری: ”میں نے غلغلے سے ایک نام بتا دیا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے انھیں: ”اگر تم اپنا نام نہیں بتاؤ گے تو میں تمہاری شناخت کر دوں گا۔“ میں نے کہا: ”اور اپنے دوسرے ساتھی کا نہیں بتاؤ گے تو مرشجان کو بتا دوں گا۔“

”نہ مجھے بیک میل کر رہے ہو؟“

”ہاں۔“ وراثت میں تمہارا پاس ہے۔ اس کے ساتھ ایک بیک فیمل ہے۔ میں نے کہا: ”پنچا پنا بیک میل تم ہی ہو تھتے ہو۔“

وہ میری بات سے محفوظ نہیں ہوا۔ مائی تلاش کرتے ہوئے وہ مچھتا ہار کر اسے کیا کرنا چاہیے وہ شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

بالآخر اس نے کہا: ”میرا نام ہے سوہن اور دوسرا ہے میرا بھائی سوہن۔ کیا خیال ہے۔“ ٹھیک ہیں یہ نام؟“

میں سمجھ گیا کہ وہ ہمارے ناموں کی مماثلت اور ہمارے رشتوں کے بارے میں اپنے خشوک کا اظہار کر رہا ہے اور بلاواسطہ طور پر یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہم اگر فقیر چھنا اور امیر چند ہو سکتے ہیں تو وہ سوہن اور سوہن کیوں نہیں ہو سکتے ہیں اس کو پہنچ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا اصل نام نہیں ہے اور جان کے سامنے اگر میں انھیں سوہن سوہن کہتا تو اس کے لیے تھوٹیں کی کوئی بات نہ ہوتی۔

میں نے سر ہلا کر کہا: ”اچھے نام ہیں۔ چلیں گے۔“

”کیا اب ہم بھی چلیں؟“ وہ بولا۔

”جلو۔“ میں نے مائی کی ناٹ درست کر کے کہا اور اس سے آگے ہو گیا۔ اپنے ڈیل ڈول کے باوجود وہ ایک بزدل اور غلام آدمی تھا۔ اس نے مجھے بھی اپنا آقا تسلیم کرنے میں دیر نہیں کی۔

غالب ہوش میں آجکا تھا اور خاموش بیٹھا دیوار کو گھور رہا تھا۔ مجھے یہ صورت حال کچھ عجیب لگی۔

”کیا بات ہے؟ تمہارا یہ بھائی بولتا نہیں؟“ جان نے مائی کی ہونٹوں پر دھکی دالنے کے کہا جس کا اصل نام فرز تھا۔

”ہاں! کویت کیا ہے؟“

”یہ انگریزی نہیں سمجھتا۔“ میں نے کہا: ”اور کچھ ادبنا بھی سننا ہے۔“ اس کی خاموشی میں سمجھ گیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں غالب نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے گریز کیا ہوگا۔

”تھم لو۔“ کیا نام بتائے تھے تم نے؟“

”میں امیر چند۔ یہ فقیر چند۔“ میں نے کہا۔

”کیا حادثہ پیش آیا تھا تمہارے ساتھ؟“

”کچھ لوگ ہماری لالچ پھین کر لے گئے۔“ میں نے کہا۔

”اب میں مار ڈالوں لیکن ان کو رحم آگیا شاید۔ انھوں نے ہمیں لٹ بوٹ میں نکل جانے کی اجازت دے دی۔“

”وہ لالچ تھی یا بحری جہاز تھا؟ فروش نے کہا: ”اس کا نام لائف بوٹ پر ہے۔“

”ایک بہت بڑی لالچ یا ایک چھوٹا بحری جہاز تم کچھ بھی سمجھ لو۔“ میں نے کہا۔

”تم مالک تھے؟“

”میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ہم نے کرانے پر لیا تھا۔“

”کس لیے؟“

”بزس کے لیے اور فارہون سیک۔ یہ مت پوچھنا کہ ہمارا بزس کیا تھا؟ میں نے کہا۔

”یہ اسی کے الفاظ تھے۔ وہ ہنسنے لگا۔“ میں سمجھ گیا۔ خیر یہ بتاؤ کہ تم سے وہ لالچ چھیننے والے کون تھے۔ یہ کام اتنا آسان تو نہیں ہوتا۔“

”میرا خیال ہے کہ زیادہ مشکل بھی نہیں ہوتا۔“

”اگر تم ہوشیار ہو۔“ فوٹوں کو بچاتے ہو اور کوئی ایسا موقع نہیں آنے دیتے۔۔۔“

”موقع بن بلانے آتا ہے۔ جیسے حادثہ ہوتا ہے شکر پر۔ یا آدمی کو مشتق ہو جاتا ہے اچانک۔“ میں نے کہا۔

”وہ پھر ہنسنے لگا۔ کیا عجیب بات ہے۔“

”میرا مطلب تھا کہ آدمی کی شامت آتی ہے تو وہ دشمن پر اعتبار کر لیتا ہے یا دوست ہی دشمن ہو جاتے ہیں مگر وہ ان کو بچانے سے قاصر رہتا ہے۔ خوش فہمی میں مارا جاتا ہے مثلاً اب تم ہو۔ کیا تم مجھ سے توقع رکھتے ہو کہ میں۔۔۔ جیسے ایک گھنٹے قبل تم جانتے ہی نہیں تھے اور نہ تم نے سوچا تھا کہ کوئی اس وقت سمندر میں پڑا ہوا مل جائے گا جس کو تم انسانی ہمدردی کی بنیاد پر نکلنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ کیا تم توقع کر سکتے ہو کہ میں لالچ پر قابض ہو جاؤں گا؟“

”اس کے ایک ہاتھ میں خراب کاجام تھا۔ وہ اٹھانے کا جام چھیننے لگا۔ میری بات اتنی مضحکہ خیز نہیں تھی مگر اس پر نکلنے کا اعتراض کیا تم ایسا کر سکتے ہو۔۔۔“ فقیر چند؟

”ہاں امیر چند ہوں۔“ میں نے کہا: ”میں نے خوش فہمی مشعلان و پھر کیا مجھے تم کو دلپسند سمندر میں پھینک دینا چاہیے لہذا دشمن سمجھ کر۔“ وہ بولا۔

”یہ ہوتی ہے غلط فہمی۔“ میں نے کہا۔

”تم کو اپنے نقصان کا کچھ اندازہ ہے؟“ وہ بولا۔

”ہاں۔“ فقریاد سلاک ڈوب گئے تھے میرے لیکن ابھی بات یہ ہے کہ میں نہیں ڈوبا۔“ میں نے کہا: ”قانونی طور پر تو میں دس لاکھ دس سے دس لاکھ ہول نہیں کر سکتا۔“ ہاں! اپنے طور پر میں دس لاکھ ہول کر لوں گا۔“

”اس نے تعریف اور تائید کے انداز میں سر ہلایا۔“ یہی طریقہ ہونا چاہیے۔ قانون کے بلے میں ماعق یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ وہ کروڑ کی حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے۔ طاقت و کردار قانون کی ضرورت

میں نے کل سچے نہیں کہا تھا۔
 • کل سے کل ہے ورنہ دلت کس وقت ہوئی تھی؟
 • رات ہوتے ہی؟ نہیں کہہ: "سات سال سے سات

”پہلے کیا بایمانی کی تھی میں نے؟“
”گزشتہ بار تم نے ایک میں کے ایک ہزار روپے“
”مگر مجھے ساڑھے سات سو تھانے۔“

میں فوراً طے نہیں کر سکتا تھا کہ فروش اور بلیک روز کے معاملات میں مجھے کس حد تک مداخلت کرنی چاہیے اور کس کا

میں چڑھتا ہوں اور پھر اترتا ہوں اور سونے کی سورج رہا تھا۔
 اُس میں سورج کی کیا بات ہے۔ جاؤ۔ جاؤ۔ سو جاؤ۔
 اُس نے دوسرے حکم کے نفاذ کو اشارہ کیا کہ ان کو اُسٹھ میں لے جاؤ۔
 دوسرا نفاذ ہوا تھا کہ اس کے بیابان پر کھوپڑی کے ساتھ دو
 ٹیڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ تیس دروازہ بند کر کے اُس کے پیچھے لڑا۔

مجھ سے آگے تھا۔ اچانک میں نے راداری کے آخری دروازے سے بلیک روز کو باہر آتے اور پھر پلٹ کے اندر جاتے دیکھنا شاید وہ ہمیں دیکھ کر واپس ہو گئی تھی مگر اس طرح مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کا کہیں کون سا ہے۔ میں نے اسی دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کی۔

مجم کے غلام نے مجھے گردن سے پکڑ کر کھینچ لیا: "ادھر رو" اُس نے مخالفت سمیت کے دروازے کو کھول کے مجھے اندر نکلتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھا تھا۔۔۔ کہ اس نے بلایا ہے مجھے" میں نے گردن کو ملٹے ہوئے حقیقت سے دانٹ نکال کے کہا۔

"اتنے حسین نہیں ہو تم" وہ بولا "وہ دروازے کی طرف آگے اٹھنا کہ کہیں دیکھا"

"کیوں... ہتھاری والدہ ہیں وہ؟ میں نے کہا۔

وہ مٹھنے سانڈ کی طرح پھینکا تا اندازاً۔۔۔ میں یہی چاہتا تھا۔ اس کا رخ میری طرف تھا اُس نے غالب کو نہیں دیکھا تھا، جو دروازے کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ غالب نے ٹانگ اڑائی تو وہ منہ کے بل گر پڑا۔ میں نے اُسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا اور اس کی کمرے سوار ہو گیا۔ پھر میں نے اُس کے دونوں ہاتھ پیچھے موڑ کے لاک کر دیے اور اس کے لیے حرکت کرنا بھی ممکن نہ رہا۔

"... یہ... کیا مقصد ہے اس حرکت کا؟" وہ سر کو اٹھلاتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کا سر نیچے دبا دیا۔ "ہاتھی کی سواری" میں نے کہا اور غالب کو اشارہ کیا۔ اُس نے ہاتھی کی تلون کی جیب سے ریو اور نکال کے مجھے بتا دیا۔

"باس تم کو مار دے گا... تم آگے چلتے نہیں"

"تم بھی نہیں چلتے" میں نے کہا "موتے وقت تم کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم کب فوت ہوئے اور کس کے ہاتھوں میں سے ریو اور اس کی گڈی سے لگا دیا۔

"مجھ سے کیا چاہتے ہو تم...؟" وہ بڑی مشکل سے لڑھا کے بولا۔

"چند سوالات کے جواب" میں نے کہا "جواب غلط ہوگا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہارے اس لباس کی بھوری والاہی اصلی ہے یا نقلی؟"

وہ شاید سوال کے بے نیچے ہن پر جھلن ہوا مگر اس نے کہا۔

"اصلی ہے"

"اس کا نام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"جان۔۔۔ وہ تمہیں خود چاہ چکا ہے۔"

میں نے ایک ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ وہ بلکا ایکوٹھ اس کا ہاتھ گدھے کے پاس سے اڑ گیا تھا "اس کا نام فروش ہے۔ اصل

نام پوچھا تھا میں نے۔ دوسرے سوال کا غلط جواب دینا فوری گردن توڑ دوں گا۔ یہ فروش کیا بلا ہے۔ تمہیں فروش تو وہ ہے اس کے علاوہ کیا بچتا ہے؟

"وہ ایک اسمگلر ہے" وہ کہتا ہے "وہ بولتا ہے ہرگز اصر سے اصر کرتا ہے اطالوی شراب لاتا ہے۔"

"کیا وہ اطالوی ہے؟"

"وہ گواکرا کہتے والا ہے۔" وہ بولا "گلکٹ میں بزنس کرتا ہے"

"گلکٹ سے کیلے جاتا ہے؟"

"نو اوارڈ" وہ بولا "تاریخی چیزیں... اور لوکیاں" میں سمجھ چکا رہ گیا۔ "وہ وہ فروش ہے؟"

"ہاں... سن لیڈن میں انسانی سے مل رہا ہے"

"ایک ہزار ڈالر ایک تیس کے۔ تم نے ڈھائی سو ڈالر ہتھیائے، میرے ذہن میں بلیک روز کے افکار گونجنے لگے۔ ٹارکیٹ ڈالوں ہے، خانہ جنگی کے باعث، فروش نے کہا تھا تو وہ لوکیوں کی بات کر رہے تھے جو مالی منشی میں پسلی کی جارہی تھیں۔ میرے سامنے خانہ جنگی کا تذکرہ ہو گیا کہ نقل کا توجہ ہو گیا۔ ایک ہاتھ مار کے میں نے ہاتھی کی گردن توڑ دی جس پر میں سوار تھا۔ گو کہ یہ کام میں نے جلد میں کیا مگر اس پر اذیت انکشاف کے بعد میرے لیے ممکن ہی نہ رہا تھا کہ میں کسی کو رعایت دیتا۔

"مرزا، تم ٹھہرو یہاں، اگر کوئی ادھر آئے تو کچھ پوچھ لیں۔"

گولی مار دو، میں نے کہا اور راداری کے بلیک روز کے کمرے میں گھس گیا۔

وہ ہونے کی تیاری کر رہی تھی اور اپنے کمرے کے سامنے بیٹھنے لگا۔ جسم پر کوئی کریم مل رہی تھی مجھے ہاتھ میں ریو اور لیے اندر آتا تھا۔ کے اس نے ہن پر جھلن ہوا مگر اس کی فروش نے اُس کے صحن میں پھینک دی۔

"بلیک روز! مجھے سب معلوم ہو چکا ہے" میں نے کہا "تم اس بارہ فروش کی ساتھی ہو"

میری روائ فرانسس نے اس کے کمرے سے امان بھی خطا کر دی ہے۔ اُس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور مسکرا کے مجھے خوش آمدید کہنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کا چمکتا ہوا آنکھیں مچنے جیسا بدن کا پتہ لگا۔

"اب تک کتنی لوکیاں بیچ چکے ہو تم لوگ؟" میں نے مزہ

سپاٹ لیجھ میں کہا۔

"مجھے... نہیں معلوم... تھلا... لیکن یہ میری کھپ ہے۔" وہ ہکلا کے بولی۔

"اس وقت... اس لانچ میں بھی... اومان کا... کتنی لوکیاں ہیں... کہاں سے لاؤ گے؟" میں نے

بج کر کہا۔

"تقریباً اتنی سب گلکٹ سے سول ہوئی تھیں"

"اور اس سے پہلے؟" میں نے محسوس کیا کہ میرا جہر گم ہو رہا ہے۔ میرے جسم کا سارا خون سر کی طرف کھینچا ہوا تھا۔

"پہلی دفعہ... اڑتالیس... دو تینے قبل... پھر ایک مہینے پہلے سا..."

"وہ لڑتے ہوئے بولی۔ کیونکہ اُس کو میری آنکھوں میں آتما ہوا خون صاف نظر آ رہا تھا "مگر دیکھو..."

"بلیک روز! ادھر؟" میں نے نرمی سے کہا۔

وہ توقع نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی میرے سامنے آگئی۔

شاید اسے ایک جھوٹی امید کا سہارا بھی غنیمت محسوس ہوا ہوگا کہ اس کا جوان سڈول جسم اپنی حریت کی آماج سے میرے دل کو پکھلا دے۔ میں نے اُس کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"کبھی تم نے اپنی قیمت کا اندازہ کیا ہے کسی نے کالے گلاب کی بولی لگائی... کالا گوشت پسند کرنے والے گڑھا اور پھر ٹیپے بھی تو بول کے دنیا کے بازار میں؟"

تمہارے لیے کوئی قیمت نہیں۔ ویسے میں برائے فروخت نہیں ہوں، وہ بولی اور اپنی شہوانی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ پھیلا کے اُس کے برسی۔

میں پچھے ہٹ گیا "کاش میرے پاس اتنا وقت ہوتا..."

"وقت تو ہے۔" وہ میری بات کا غلط مطلب نکالتے ہوئے بولی۔

"کر میں تم کو ایک فرانک میں بیچ سکتا... تو وہ فرانک

میرے کام آتا۔ لیکن تم بے مصروف ہو میرے لیے؟" میں نے کہا اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے ہاتھ مارا۔ وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح گری اور ساکت ہو گئی۔ میں غصے میں اندر سے کسی خود کی طرح پھینک رہا تھا مگر میرے پاس وقت کم تھا۔ ایک طرف افغان مخالفت سمیت میں بڑھتی جا رہی تھی تو دوسری طرف راست تیزی سے میری جانب رواں تھی۔

میرے لیے بچنے کا کام چھوڑ کر اس گروہ کی سرکوبی کرنے کے لیے موچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس جیسے نہ جانے کتنے تھے جو ہاتھ بھر میں خود کی حرکت کی سوداگری میں اپنا زمانہ کال کر رہے تھے اور زمانہ اعمال کو سیاہ کر رہے تھے مگر ان کے خزانے معمور تھے اور وہ خوش تھے۔ ان سے ہرگز نہ کے کاروبار میں لاکھوں فوٹ تھے مگر میں ان سے سروکار نہ تھا۔ میرا دل مقصد اس لانچ سکڑے لیے میری پہنچنا تھا۔ اگر فروش ایک بڑھ فروش نہ ہوا، کوئی طرف لگا دی ہوتا تب بھی میں اس مقصد سے کنارہ کش نہ ہوتا لیکن اس کے کاروبار کا شیطانی چہرہ اور اس کے کاروبار کا گھناؤنا ہنس سوسو مٹانے آمانے کے بعد تذبذب کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ سب ایک جیسی

سروا کے مستحق تھے جو کم سے کم ہوت ہو سکتی تھی۔

میری آواز نے ایک بلیک روز کی چیخ سے جواس کے صحن سے نکلنے والی آخری آواز تھی فروش کو چونکا کر دیا ہوگا۔ "خبر کا خطرے کو کھانے والی چیخ جس یوں بھی ہوت تیز ہوجاتی ہے میں بلیک روز کے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ فروش کے کمرے میں سے دھڑا

بھوی ویٹ غلام نکلا اس کے ہاتھ میں بھی ریو اور تھا۔ میرے ہاتھ میں ریو اور دیکھتے ہی اس کی حیوانی جبلت جاگ اٹھی اس نے بیچ لیا کہ اب ہم میں سے ایک ضرور مارا جائے گا۔

فرق کیلکٹ کے ہزاروں حصے کا تھا یا اس سے بھی کم گروہ مجھ سے پہلے فائر کے لیے ہاتھ اٹھا چکا تھا۔ اس وقت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا، فاصلہ بہت کم تھا۔ اس کا شانہ خطا ہونے کا کوئی امکان تھا اور نہ میرے لیے اس کی بلائی ہوئی گولی کے راستے سے ہٹ جانا ممکن تھا۔ فائر میں سے بھی کیا مگر بعد میں۔

یہ غالب تھا جس نے اسے بروقت نشانہ بنایا۔ اس کمرے کے دروازے کی اوٹ سے جس میں فروش کے پہلے ہائی کارڈ کی لاش پڑی ہوئی تھی، غالب راداری پر نظر رکھتے ہوئے تھا۔ یقیناً اس وقت تک غالب کو بھی اندازہ ہو چکا ہوگا کہ راداری میں اچانک سلسلے آجائے گئے بعد میرے لیے خود اپنے دفاع میں کچھ کرنا ممکن نہیں رہا۔

میرے حریف کی چلائی ہوئی گولی شاید میرے اوپر سے گزری اور جو گولی میں نے چلائی تھی وہ بھی نشانے پر نہیں لگی۔ غالب کی گولی لگنے پہ وہ آچھلا اور پچھ کی طرف گر گیا۔ اب انفرادی وقت گوارے کی گھانٹ نہیں رہی تھی۔ فائر ایک لید ہوئے تھے چنانچہ لانچ کے غلے سے فروش تک ہر شخص سمجھ گیا ہوگا کہ ان کو سنگین خطرات کا سامنا ہے۔

وہ سنگین خطرات میں سفر کرنے کے مادی تھے اور ہر قسم کی گڑبڑ سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب ایک کھل جنگ ہوگی۔ خوریز مختصر اور فیصلہ کن۔ میں نے ایک سیکڑنٹ خائفانہ کیے بغیر آگے جھٹ لگائی۔ فروش اپنے کہیں سے مشین گن کے نرنگل رہا تھا کہ میں اس سے ٹک گیا۔

ہم دونوں اندر جا کر رہے۔ اس کے پیچھے کوئی چیز آگئی تھی جس نے اُسے سنبھلنے دیا۔ وہ سر کے بل گر کر دو مشین گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں فروش سے ٹکھانے کے بعد گھوم گیا تھا اور وہیں سے ٹھوکر کے گرا تھا چنانچہ میں اوپر رہا تھا۔ اسی اسلحہ کے اوپر سے گزرنے میں فروش کو دو بچنے میں کامیاب رہا۔ اُس کا ہاتھ پھر مشین گن کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میں نے اس کی کلائی پر پھینکی مادی۔ اُس نے بڑی بھرتی سے مجھے دونوں ٹانگوں پر اٹھا کے پیچھے اچال دیا۔ چونکہ کہیں مختصر تھا اس لیے میں علی دیوار سے ٹکرا کے واپس آیا تو پھر فروش کے اوپر گرا۔ فروش نے

میری گردن کو ایک ہاتھ کے گھٹنے میں کھینچ کر کوشش کی مگر میں نے اسے ہٹ دیا۔ اب اس کی گردن میری بغل میں آگئی۔ میں نے دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی آنکھوں میں گھونپ دیں۔ وہ دوسرے پہلا لیکن اب وہ وقتی طور پر اٹھا ہوا چمکا اور پوری طرح بری گرفت میں تھا۔

”میں مسز ڈوش! تم نے دیکھا کہ جب شامت آتی ہے تو آدمی اپنے دشمن کو پہچانتے ہیں کیسے غلطی کرتا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”اور تمہارے دیکھنا دیتی ہے؟“

”تم... تم فریج جانتے ہو؟ کون ہو تم؟ کس نے بھیجا تھا تمہیں؟ وہ کراتے ہوئے بولا۔

”کسی نے نہیں۔ تم خود آتے تھے اپنی موت کی طرف۔ ہم نے کوئی ایس والیں نہیں دیا تھا تمہیں! میں نے اسے جھٹکا دے کر کھرا کر دیا۔“ تمہارا ہونے کوئی آخری پیغام؟

”مجھے معلوم ہے... تم کس کے آدمی ہو؟“

میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے جھوٹ کرنا بے مقصد سمجھا۔

”چلو اچھا! اگر تم کو معلوم ہے، اب آگے چلو اور وہ باتیں ذہن میں رکھو، میں نے کہا۔ ایک یہ کہ میرے ہاتھ میں ریو اور وہ ہے دوسری یہ کہ ریو اور اس کے نہ ہونے سے بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔“

”تم کیا چاہتے ہو... سو دار کو مجھ سے...“

میں نے اسے آگے دھکا دیا۔ ”وہ بعد کی بات ہے پہلے مجھے بتاؤ کہ وہ سب بد بخت عورتیں کہاں ہیں اور اپنے حملے کو یہ بات بھی سمجھا دو کہ اب مالک ہم ہیں اور انہیں ہمارے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔ باوجود ہرجا“

”لائیج کے لیے میری جتنی جہاں اچھی تک خاموشی تھی اب جمع و پکاردی ہوئی تھی۔ میں فروغ کی رہنمائی کے بغیر بھی اس قید خانے تک جاسکتا تھا جس میں اسی لوہا کی مال شمشات کی طرح رکھی گئی تھیں مگر میں ان سب کے سامنے فروغ کو ایک مجرم کی طرح پیش کرنا چاہتا تھا۔ شاید فارغ ملک کی آواز سننے کے بعد نیچے بھی خوف دہرا سہیل تھا یا ان کے محافظوں نے عورتوں کے گودا میں ہنگامی صورت حال کے مطابق کارروائی کی تھی۔

غالب نے اس عرصے میں بڑی عقل مندی سے کام لیتے ہوئے لائیج چلانے والے عمل کو سہارا دیا تھا کہ سخت آٹا چاکا ہے مگر انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر وہ حسب سابق اس کمالات کی تعمیل کرتے رہے۔ انھوں نے مزاحمت کیے بغیر یہی ملک میں لیا تھا اور اب لائیج کا ٹیٹو کسی کی طرف موڑ رہا تھا۔ کیونکہ ہماری طاقت وہ گولی تھی جو ریو اور کی نال کے ذریعے ان کو تیرا کر رہی تھی کہ وہ کوئی سے گریز کریں۔

”لائیج کے بالکل پیچھے والے حصے میں سے آئے والا راستہ ایک ایسے رخسارے میں کھلتا تھا جو تقریباً لائیج کی مجموعی لمبائی اور چوڑائی کے برابر ہوگا۔ لیکن اس کی بلندی بھی بائیس فٹ سے زیادہ نہ تھی اور ایسا لگتا تھا کہ یہ زیریں منزل جو پہلے ایک حائل نامی لائیج کا اسٹوڈیو تھا بطور غاص کشہ کی گئی تھی۔

اس میں دوسرے دروازوں سے داخل ہونے کا نظام تھا۔ پہلے دروازے کے برابر ایک کمری پڑی ہوئی تھی لیکن اس پر پہنچنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ اس وقت اندر گیا ہوا تھا اور قیدوں کے ہنگامے اور دشواری کو منہ کر کے انھیں خاموش رکھنے کی کوشش میں اپنے دوسرے ساتھی کا ہاتھ تیار تھا۔

اس دروازے سے گزرنے کے بعد قید خانے کا وہ ناک دروازہ تھا جو بند تھا اور جس کے پیچھے سے عورتوں کی دنگرائی چچیوں کے ساتھ ان کے محافظوں کے ہارٹے کی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بیچ بیچ کر انھیں غلط گالیاں دے رہے تھے۔ دونوں دروازوں کے درمیان چھ فٹ کا فاصلہ تھا اور اس میں پوریا نلٹس اور کمریٹ اس طرح رکھے ہوئے تھے کہ بائیں فٹ کی بلندی تک پہنچی ہوئی ریو اور اس کے سبب میں مشکل سے دروازے پر ڈاراستہ کر لیا گیا تھا۔

میں نے ریو اور کو فروغ کی پشت سے لگا رکھا تھا اور بار بار اس کی نالی سے فروغ کو جھٹکیں کر رہی احساس دلانا تھا کہ مجھ سے غافل نہ رہے۔ فروغ سر جھٹکائے آگے چلتا گیا۔ پھر اس نے دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گیا کیونکہ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔

جو نظر میں سے اندر دیکھا اس نے میرے لہو کو منہ کر دیا۔ یہ ایسا جاسوس ٹیمبر تاک اور انسانیت کو رسوا کرنے والا نظارہ تھا جس کا میں... بیویوں صدی کے مذہب حاضرے لاشی آج کے دور میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ آج بھی جب کہ ہم انسان کی عزت نفس، آزادی، جمہوریت اور اقوام عالم کے مندر انسان کی باتیں کرتے ہیں۔ غلامی کا وہ عہد ختم نہیں ہوا جب گھوڑوں گدھوں کی طرح مشقت اور شدت، جھیلنے والے عالم انسان سر باز فروخت ہوتے تھے اور عورتیں اپنے جسم اور گوشت کے سہارا پر بیٹی تھیں تو میں اسے بالوغاً جھوٹ سمجھتے ہوئے بھی تسلیم نہ کرتا۔

لیکن اس وقت میرے سامنے جو سین تھا اس نے میرے ذہن میں دور غلامی کی یاد تازہ کر دی۔ میں نے بہت سی فلمیں دیکھی تھیں جن میں غلاموں کی جانوروں سے برتر زندگی اور ان پر توڑے جانے والے وحشیانہ مناظر دکھائے گئے تھے مثلاً ’سر زمین خرمون‘ (Land of Xarmoon) اس وقت میرے پیش نظر ان سب فلموں کے مناظر سے زیادہ لڑنے خیر لود

”لائیج کے لیے میرے سامنے جو سین تھا اس نے میرے ذہن میں دور غلامی کی یاد تازہ کر دی۔ میں نے بہت سی فلمیں دیکھی تھیں جن میں غلاموں کی جانوروں سے برتر زندگی اور ان پر توڑے جانے والے وحشیانہ مناظر دکھائے گئے تھے مثلاً ’سر زمین خرمون‘ (Land of Xarmoon) اس وقت میرے پیش نظر ان سب فلموں کے مناظر سے زیادہ لڑنے خیر لود

تقریباً بیس فٹ بلے اور پندرہ فٹ چوڑے رخسارے میں پانی زریعہ عورتیں انتہائی بے بسی کے عالم میں رہنہ کھڑی ہوئی تھیں۔ میں دوسرے دور کی عورتیں یا فرشی پر پڑی چلا رہی تھیں۔ اب چوڑے سے بیس سال کی عمر کی عورتیں تھیں لیکن ان کے ہجرت والا اس اور زندگی کے مصائب کے ماحول سے ہونے والے ان میں جوانی کی شادابی و شگفتگی، رستانی و دلکشی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ ایک نفرت انگیز اور کراہت بیدار کرنے والا مظاہر تھا جس میں اشرف الملوقات کی ماں کلمائے والی عورت کو ذات کی انتہائی پستی میں دیکھتے ہوئے مجھے اپنے انسان کلمائے پر خزانے لگی۔

دوستاک درندہ صفت افراد ہاتھوں میں بیڈ کی لمبی لمبی باز چھڑیاں لیے انھیں بے دردی سے مار رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں کی حرکت سے شاہین شاہین کی آواز آتی تھی پھر ان کے نے غلط گالیاں، اپنی تھیں اور عورتیں ضرب کی ضرب سے زب کے بیچ مارتی تھیں تو وہ ہستہ تھے۔ میں نے ان عورتوں کے جسم پر بلے سے نیل دیکھے اور وہ زخم کھینچے جو سب رہے تھے۔ ہاتھ بکے ہوئے سیاہ داغ بن گئے تھے۔ بکھرے بالوں اور رخت زدہ آنکھوں والی ان عورتوں کے اس نول کو دیکھ کر مجھے پیش آیا کہ غلامی انسان کو بزدل کیوں بنا دیتی ہے؟ اس سے اپنی طاقت کا انتہائی احساس کیوں پھین لیتی ہے؟ مانا کہ ایک سوادہ لڑوں کا کسی مرد کی جسمانی طاقت کے مقابلے میں ہتھ پاشاں ہوتا ہے مگر یہاں اسی صورت میں تھیں اور صرب جوں، کیلوا ایک ساتھ ان دھجھڑیلوں پر حملہ نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ ایک دو کو مار گرا تے۔ ریو اور سے فائر کر کے وہ ایک ساتھ اسی عورتوں کو ہلاک نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ دروازہ بند کر کے ان دونوں سے چھٹ لائیں تو ان کے جسم کا گوشت فوج کھائیں۔ ان کے ناخن اور دانت کسی نے نہیں جھینے تھے۔ ایک سو ساتھ ہاتھوں اور انگوٹھوں کے ناخنوں کی بلیا کے سامنے دو غولی بھیڑیے کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ افراد حاکمیت کا سرور ادا کرنا اور ان کی اس بات رکھتے تھے۔ اسی قوم پرستی کی طرح یہی غلامی کے احساسات انہیں قوت کا شعور تھا مگر اسے بیدار کرنے اور متفق کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

میں دیکھتے ہی ذرا دیر کے لیے مٹا چکا تھا۔ بیدار سنانے والے ہاتھ لگ گئے، جسموں پر تشدد جھیلنے والی عورتوں کی کہ ورنہ اس کے ہاتھ سے تڑپنے والی عورتوں کی آہیں اور سسکیاں رگ رگ انھوں نے خوف اور بدبختی کے کس آئینہ چہرے

”میں نے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ان کی نظریہ کی نظر سے ملے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نفرت کا زہر میری دھڑکی بڑی میں آگ بن کے اتر رہا ہے۔ ان سب کا مجھے ملامت کرنا اور سطعون کرنا بجا تھا کیونکہ میں بھی ایک مرد تھا اور یہ مردوں کی دنیا تھی جس میں مرد ایک طرف کھڑے تھے کہ لے ماؤ، ہونو، شیڈو، دنیا کی عزت تم سے ہے، جنت تمہارے قہر کے نیچے ہے۔ اور دوسری طرف ان کی عورتوں کو اور ان کے جسموں کی پاکیزگی کو خود ہی گتوں کے آگے ڈال رہے تھے۔

خاموشی کا وہ لحظہ اذیت دینے والا تھا جس میں ہزار سال تھے اور بے یقینی کے امکان تھے اور اندر کے ہر سب لمحوں کے خرب کا مکتب تھا۔ جب یہ لمحہ رگ رگ تو میں نے ریو اور اٹھایا اور ان دونوں کے سر میں ایک ایک گولی مار دی جو بیدار ہاتھ میں بلے گولی کی کیفیت میں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گریے تو ان کے سر سے پھوٹنے والا خون ہر طرف پھیل گیا۔ ایک بار پھر فضا بیچوں سے بھر گئی۔ میں نے ان عورتوں کو اپنے جسم پر پڑنے والے گندے خون کے پھینٹے دیوانہ وار صاف کر دے۔ پھر جو قریب تھیں وہ اپنے ہاتھوں سے لہو کے ہر پھینٹے کو صاف کر رہی تھیں اور پھر ہاتھوں کو دلوں پر گر رہی تھیں اور فرشی سے صاف کر رہی تھیں۔ دو عورتیں لٹکھڑا کے گریں اور بے ہوش ہو گئیں۔ جو سر گھٹوں میں دیے ہوئے تھیں یا فرشی پر جیسے پڑی تھیں انھوں نے خون میں غطال ان درندوں کو دم توڑتے دیکھا جو ان کی مہاری ذلت و اذیت کے ختمے دار تھے اور اس شرف کیوں دیکھتی رہیں جیسے یہ بھی خائشوں کا سراب ہے دہن ایسا کیسے ہو سکتا ہے کچھ عورتوں نے ہتھریا کی دیوانگی میں دیوانہ وار ہنسنے شروع کیا۔

”میری ہونو!“ میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا مجھے معاف کر دو کہ میں بہت دیر سے آیا اور تم کو اس حال میں دیکھنے پر مجبور ہوا۔ خانا ہے جا ہاتھوں تم سب کو عزت ابرو کے ساتھ واپس اپنے اپنے گھر پہنچاؤں گا۔ شاید میں ہر ایک کے ساتھ نہ جاسکوں مگر آج ہی تم سب کو آزادی ملے گی، اور ایک موقع ملے گا کہ تم اپنی اپنی جنت سے کا لے کر واپس وہیں جاسکو جہاں سے تم کو لایا گیا تھا کیا تم ہاتھ چاہتی ہو؟

”بیشعور عورتوں نے انہیں میں سہلایا۔

”اس کے لیے موقع میں خرمون میں آہوں اور بھی جو کچھ تم کو میں دے سکا مزدوروں کا لیکن اصل چیز تمہاری اپنی جنت ہے جو تمہارے کام آئے گی۔ ان درندوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا اتفاق کریں گے اور نہ پھر کسی تم پر ہاتھ ڈالیں گے۔ ہم نے دنیا کو ان کے ناپاک وجود سے سنبھال دلا دی ہے“

میرا خیال ہے کہ وہ بہت کم اردو سمجھتی تھیں۔ سچہ بچہ جو کچھ نہیں کہہ رہا تھا وہ واضح تھا۔ میرے عمل سے ثابت ہو چکا تھا۔
 ”اصل غم یہ ہے۔۔۔ میں نے فروش کو دھکا دے کر مرنے کے بل کر دیا۔“ اس کو میں بھی مزاد سے کہتا تھا لیکن اسے میرے تھامے سے حوالے کر رہا ہوں۔ سب کے اس پر ٹوٹ پڑا کیونکہ تم سب کو اس سے اپنی اپنی رسوائی کا انتقام لینا ہے۔ دُرو نہیں یہ خالی ہاتھ سے اور نہیں یہاں موجود ہوں۔“

فروش چلایا یہ۔۔۔ یہ تم کیا کر رہے ہو بھائی اور اٹھ کے میری طرف چلا۔ میرے ایک ٹکے نے اسے سچہ چیت کر دیا۔
 ”شلاش۔۔۔ بہت سے کام لو، تمہیں ہمت کی ضرورت ہے ہر دشمن کے خلاف خود تم کو لڑنا ہے خواہ تمہاری دشمن اپنی ہی تقدیر کیوں نہ ہو جب تک تم خود کچھ نہیں کرو گئی خدا بھی تمہاری مدد نہیں کرے گا۔“

معلوم نہیں میرا یہ فلسفہ کس حد تک انہیں قائل کر سکا اور اس کا کتنا حصہ ان کے دماغ میں بیٹھا۔ لیکن میرے اشارے نے انہیں غوث سے نجات دلادی کچھ خوشی کے ہرٹا میں بولنے لگیں تھیں مگر کم سے کم نصف تعداد انہیں گھری ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کی اور انتقام کی آگ دیکھنے لگی تھی اور اس کے شعلے بلند سے بلند تر ہوئے جا رہے تھے۔

وہ کسی آدم خور چڑیلوں کے ٹول کی طرح اپنے نیچے پیلا لے کر اور انت تیز کر کے آگے بڑھیں۔ فروش نے آنکھ کر پھا گئے کی آخری بے سوکوشش کی۔ میں نے ایک اور ٹمکا مار کے اُسے اُن عورتوں کے درمیان پھینک دیا۔

پھر میں نے وہ منظر دیکھا جو میں نے کسی فلم میں دیکھا تھا اور نہ کسی دہشت ناک خواب میں۔ جو کسی فلم میں دکھایا جاتا تو لا میں بیٹھے ہوئے کمزور دل لوگ بے ہوش ہو جاتے اس سے ملتا جلتا سین میں نے گزشتہ روز بھی دیکھا تھا جب گل کے جسم کو لال چوٹے چاٹ رہے تھے۔

اب گل کی جگہ فروش بڑا ہوا تھا اور لال چوٹوں کی جگہ وہ عورتیں تھیں جو اپنے جسم کی بے لاسی، اپنی ساری ذلت و رسوائی کے احساس کو بھول کر اپنے ہاتھ پر ترین دشمن کو سواؤنے جذبے کے ساتھ انتہائی ادبیت سے کربلا کرنا چاہتے تھیں۔ وہ ترخانہ فروش کی چیخوں سے اور ان حویلوں کی خون، بدبائی، منسی سے گونج رہا تھا۔ وہ فروش کو دانتوں سے اڈھڑ رہی تھیں اور دانتوں سے نوج رہی تھیں۔ فروش کا خون بہہ رہا تھا۔ ان کے ہونٹ غون سے لال ہوئے تھے اور ہاتھ خون سے بھر گئے تھے۔ دیوانہ جی میں وہ لپٹے ہونٹ چاٹ رہی تھیں اور ہاتھوں کو چاٹ رہی تھیں۔

دس منٹ بعد یہ غوریزہ کیلن تنہا ہو گیا کچھ عورتیں احساس

کے رد عمل سے بے ہوش ہو گئیں۔ باقی دو راکٹری ہوش اور اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگیں جن پتھان تم با تھا۔ درمیان میں فروش کی لاش پڑی رہ گئی۔ گوشت کے اڈھڑے ہوئے ٹکڑے پھیل ہوئی کھال، ٹھوڑا اور دھنست۔ اس کی آنکھیں بھی ان خونِ نام عورتوں نے نکال دی تھیں اور اس کے جبڑے پیر دیے تھے بہت سی عورتیں ابکائی لے رہی تھیں۔ خود میں نے متلی منوس کی اور اوپر بھجا گا۔

میں نے نئی بارش پر ٹھنڈے پانی کے جھینٹے مارے اور ہر عرشے پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ ٹھنڈی ہوائ نے میری طبیعت کو کسی حد تک ہمال کر دیا۔ جب مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے مجھے سمندر کے عذاب ناک سفر کی صعوبت اور بے چارگی کی موت سے بچا لیا تھا تو میں نے کتنا اطمینان منوس کیا تھا اور اب یہ احساس تھا جو میری روح کا آزار بن گیا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا کیا اسے میں تمام عمر فراموش کر سکوں گا؟ یہ میری زندگی کے بدترین تجربات میں سے ایک تھا۔

اب تک میں نے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی، پھر کوئی عورت چیخ مار کے روہنے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور دیکھ کر طرے پک کے اٹھا مگر مجھے دیر ہو گئی۔ ایک عورت کے جسم کا بھولا سا فضا میں لہرایا اور غالب ہو گیا۔ اُس نے عرشے کے کنارے پر سے سمندر میں چھلانگ لگی تھی۔ دوسری عورت جو اس کے پیچھے آتی تھی ابھی کتے کے مالم میں کھڑی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے بھی خود کو سمندر کے حوالے کر دیا۔

میں نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی مگر لاچ نہیں پیچھے چھوڑ کے آگے بڑھ گئی تھی۔ یہ وہ عورتیں تھیں جنہوں نے اٹھکے ملے ہی موت کو گلے لگنے کو ترجیح دی تھی۔ زندگی کی انہیں جلاش تھی اور ضرورت محوہ جینے پر مجبور تھیں۔ ان کے لیے والدین کے راستے مسدود ہوں گے یا پھر وہ اپنی آنکھوں میں بے اہلی کا اعتراف لے کر ان گھروں میں داخل ہو سائیں جاہلی بول گی جو اُردو کے حصار تھے۔

میں نے انہیں بچانے کی کوشش کے بارے میں ہوجا بھی نہیں۔ انہیں بچانا ممکن ہوتا تب بھی بے مقصد ہوتا۔ زندگی اُس کی ہے جو جینا چاہیے۔ دیر ہوئی کسی کو ماہِ سال کی تحریک میں جکڑے رکھنا اور ایک عمر کو قیدِ بدبختی کی طرح کاٹنے پر مجبور کرنا بھی تو ظلم ہے۔

سمبرے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میں چند ایسی مزدور ہوں گی جو والدین جاکے خوش نہیں ہوں گی کیونکہ وہ منسی اور فاشا، ہر خواہش کے احساسِ مردی سے بھرتا کرنے کی مجبوری اور نا اُمیدی کی زندگی سے نکل گئی ہیں اور وہ

برہن کے لیے سارے پرانے غلاب تھے۔ ان کا سرمایہ ایک ہفتا جویاں بھی ہال ہوتا۔ ہر جسم کے پھونکے خواہش کی تعبیر وقتی۔ بہت سی ایسی ہوں گی جو عزت و دارگاہوں میں اس لیے قبول نہیں کی جائیں گی کہ ان کا وجود ایک بدنام دارغِ فطرت بن چکا ہے۔ میں ان سب کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سب کے ساتھ اپنی تقدیر سے اور میری تدبیر اُسے بدل نہیں سکتی۔

اب بچ کا کب کا آجیلا پھیل رہا تھا۔ صبح قریب تھی اور فضا چند گھنٹوں میں ہماری منزل آنے والی تھی۔ میں نے ایک گرٹ بلا کے اوصاف کو سکون دینے کے لیے چند کشیلے پھر میں غالب کے پاس گیا۔ اُسے مختصر اُن بدبخت عورتوں کے بارے میں بتا کے واپس لوٹ آیا۔ غالب کے لیے لاچ جلاسنے والوں کے سر پر وارزہنا ضروری تھا۔

لاچ کے ہر لیکن سے مجھے جتنے کڑے پر دے چادریں اور تیلے، زروش کے کوٹ اور دوسرے لوگوں کی قسمیں اور ہتھوڑیں میں، وہ سب میں نے نیچے اُن عورتوں تک پہنچا دیں جو پہلے سرخیش کے احساس سے ہی بے نیاز تھیں مگر اب سچی شمی تھیں۔ اُن میں سے مجھے چار لڑکیاں ایسی ملیں جو اردو سمجھتی بھی تھیں اور بولی بھی سمجھتی۔ وہ سب تعلیم یافتہ تھیں اور ان مزدور ٹول کے گروہ نے ان کو بیرون ملک جانے کے اعلا لازمتوں کے سبز باغ دکھائے تھے۔

میں نے انہیں کہا کہ وہ لاچ پر سے کھانے پینے کا سارا سامان لے جائیں۔ جو پکا تازے پکا میں۔ سب کو کھلاش اور خود بھی کھائیں۔ اس لاچ پر جو کچھ ہے وہ سب ان کا ہے میرے اس ارطال نے جیسے مردوں میں زندگی کی روح بھونک دی ایک دم لاچ کو گزرا گزرا ہوا گھوٹوں اور دروازوں پر چڑھ چادریں پیر پیر ہوئی عورتیں شہک خیز مزدور گدہ ہی تھیں مگر وہ خوش تھیں ہنس رہی تھیں اور طرمار رہی تھیں۔ مجھے ان کو دیکھنے سے جو خوشی حاصل ہو رہی تھی وہ دنیا کی سب سے اعلیٰ تھیں اور بھرپور خوش تھی۔

ایک لڑکی نے دوستہ ڈرتے میرے قریب آکر بوجھا۔ ”میرا اب کچھ نہیں گئے وچانے یا کافی؟“
 میں ہنسا دیا۔ ”تھینک یو اگر تم لا کے دو گی تو مزہ دیوں گا اور دیکھو میں کیلا نہیں ہوں۔ میرا ایک اور ساتھی بھی ہے۔ کیا تم کافی بنا سکتی ہو؟“

”میں سراسر آپ دیکھیں گے کہ میں کتنی اچھی کافی بناتی ہوں۔“ اُس کا چہرہ مسرت سے ملنے لگا۔ شکر ہے کہ کوئی بات نہیں جو بکواس ہے نہ سب کے لیے کیا۔ اُس کے بدلے میں کچھ نہیں اہم سامان۔۔۔“
 ”والہ آقا۔۔۔“ مجھے دیکھ ہو رہا ہے۔ جاؤ کافی بناؤ۔“ میں

نے کہا اور عرشے کی رنگت کا سہارا لے کر صبح صادق کے آواز کو مشرق کے آفتاب پر عیاں ہوتے دیکھتا رہا اب میرا ذہن سے پہلے کے مقابلے میں بہت کم سکون تھا اور میرے تھکے ہوئے اعصاب بھی ایک رات کے ایڈو پچھو کر سر کر لینے کے بعد کم نشہ تھے تاہم منہ کی اور تھکن مجھے پھر اُترا ناز ہو رہی تھی لیکن اب سونے کا وقت گزر چکا تھا۔

جب وہ لڑکی کافی لے کر آئی تو میں نے اُس کا دل رکھنے کے لیے تسلیم کیا کہ اس سے بہتر کافی کا ذائقہ میں نے پہلے نہیں چکھا۔ حالانکہ اس کافی میں بنانے والے کی مہارت کا دخل ہی نہیں تھا۔ یہ اسٹیٹ کافی تھی جو گرم پانی میں حل ہو جاتی تھی، چھپی دودھ اختیار سی۔ میری تعریف سے خوش ہو کر وہ مزید کچھ۔۔۔ باقیں کرنے کے مطیع تھی اور مجھے اپنے بارے میں بتانا چاہتی تھی کہ کس طرح وہ ان پردہ فروشوں کے جنگل میں پھنس گئی تھی اور شاید اس کے بعد مجھ سے سوال کرنی کہ ہم کون ہیں جو سمیت نڈکان کی مدد کی غرض کے بغیر کرنے کے لیے یوں نازل ہو گئے تھے لیکن میں اُسی عورتوں کی بدبختی کی کہانیاں سن کے مزید دنگی ہوتا اور سب کی نسبتا تو میں ہی نہ پاتا۔ پھر میرے لیے اپنے بارے میں سچ بتانے کا کوئی سوال نہ تھا چنانچہ میں نے جھوٹ بولنا بھی غیر ضروری جانے ہوئے اُسے ٹال دیا۔

اُس کی دل شکست تو ہوئی مگر میرا ذہن اپنے مسائل کے بارے میں سوچنے کے لیے آزاد رہا۔ میں کافی کا ٹانگ لے کر وہاں چلا گیا جہاں غالب اور لاچ کے ملے کے میدانِ سرچنگ کی خاموشی تھی۔ ماتحت علاقہ قیدی عورتوں کو آزادانہ گھومتا پھرتا دیکھ کے اور اُن کے ہنسنے بولنے کی آوازیں سن کے یقین کر چکا تھا کہ سختہ و آفتی لٹ چکا ہے اور اب والدین کا مطلب ہے، قانون کا ردائی، عرقہ۔ مزدور فروش سے حاصل ہونے والے دولت کی عیاشی ختم اور وہ غلاب شروع جس کا ڈر تھا۔

غالب ایکلا تھا چنانچہ اُن کی حاکمیت لاش نہ لے سکا تھا۔ کافی ختم کرنے کے بعد میں نے باری باری ان دونوں کی حسیب خالی کی، ایک نے ہلاکتی میں مجھے حال بنا کے غالب سے ہتھیل رکھوانے کی مختصر سی جہدِ جہد کی۔ میرے ہاتھوں پر کڑوہ کو جی ہوئی ناک پھٹے ہوئے ہونٹ اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے ساتھ ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ اُس کے جسم کی پولیں دو منٹ سے ڈھیلی ہو گئیں چنانچہ وہ بڑی طرح براہِ ہاتھ اس کا دوسرا ساتھی وقت پر حیرت پھوٹنے لگی۔

اب ہم دونوں زیادہ سے زیادہ فکری کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں نے غالب کو لڑکی کی موت کا واقعہ صرف اس لیے تفصیل سے سنایا کہ وہ دونوں سنیں جو ملے کے پیمانہ نگان میں سے تھے۔ کیا تم ہمیں بھی مار ڈالو گے؟ اُن میں سے۔۔۔

”اس کا انحصار... حالات اور تھارے رویے پر ہے“
 میں نے گول بول جواب دیا۔

”میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن آپ مجھے ایک موقع دیں۔ میں آٹھ یا کم نہیں کروں گا“ وہ بولا۔ ”میں ان کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ اگر آپ نے مجھے پولیس کے حوالے کیا تو بہت بڑا ہونگا۔“
 ”برائی کا نتیجہ تو بڑا ہی ہو سکتا ہے“ میں نے کہا۔ ”کیا اس پر بھی سادی تہائی پر تم نے کبھی غور نہیں کیا تھا؟“
 ”میں لاچ میں اچھا ہو گیا تھا“ وہ دھار میں مارا کر بیٹے لگا۔
 ”جڑا لگا رہا ہوں میں۔۔۔“

”کب سے شریک ہو تم ان کے کاروبار میں؟“
 ”تین سال سے“ وہ بولا۔

”اس گروہ میں اور کتنے لوگ شامل ہیں؟“
 ”بیس سی لوگ تھے، باقی تو ایجنٹ ہیں جو ہر جگہ سے مال لا کے سب تک دیتے ہیں۔“ وہ آکسو پوچھنے کے بولا۔
 ”میں غیرت لوگ۔ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کا خیال نہیں آتا۔ تم ان کے دل میں کہاں سے لاتے تھے یہ مال؟“
 ”پورے انڈیا سے... زیادہ بمبئی اور گلگت سے۔ اب ڈھاکہ سے...“

”کیسے؟“ وہ پرسش سے انوار کے کرے...
 ”انوار ابھی کرتے ہوں گے۔ بمبئی میں تو زیادہ ترویجی تھی جن جو گھروں سے فلمی ہیروئن بننے نکلتی تھیں مگر ایک سٹار بھی نہیں بن پاتی تھیں تو یہ ایجنٹ انھیں باہر بھیج کر رکھوٹے گا سبز باغ دکھا کے لے آتے تھے۔ باقی پیشہ و ماہرین کے مجال میں جنس کے آتی تھیں۔“

”پیشہ و ماشق؟“
 ”اس نے افراط میں لپٹا لپٹا کالج کے روکے ہیں جن کی شکل و صورت اچھی ہے اور جو بائیں کرنا جانتے ہیں لیکن میں مغرب۔ ان کو کسی کا کام ملتا ہے دیا جاتا ہے، براہ۔ وہ خرد و دل کی طرح رہتے ہیں۔ کچھ تعارف دیتے ہیں اور پھر انہیں پھیلاتے تھے ہر شہر میں ہر جگہ۔ جو رول کھینچتے وہ بالآخر ہمارے پاس پہنچتی سب اپنے کام کے ماہر بنتی۔“

”کاش غیر سے پاس وقت ہوتا تو میں ان سب پیشہ و ماہرین کے نام اپنے تم سے پوچھتا اور پھر ایک ایک کو اٹھوا لیتا۔ میں نے انھوں کے ساتھ کہا۔ ”سب کالج کے لڑکے ہیں؟“
 ”سب تو نہیں، زیادہ تر۔ باقی انھی کے جیسے ٹرک و فیرو ہیں۔ ان کے لیے تو یہ کام نہیں عیاشی ہے۔ پیسہ الگ ملتا ہے نئی تہی ہوا کیاں ملک ملتی ہیں۔ مغرب لڑائیں ہوتی ہیں، اس لیے بہت

”سبحان اللہ! کیا مشاہدہ اور تجویز ہے اور کیا حسن بیان ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اہل زبان تو تم توبہ“
 ”میں نے آدھریں آدھریں آکر کیا ہے“ وہ بولا۔
 ”مجھے سخت صدمہ ہوا کاش نہ کیا ہوتا۔ پڑھتے پڑھتے لکھوں گا۔“
 ”لو دی تم نے۔ میں بھی اب شرم آنے لگی ہے خود کو تعلیم یافتہ کے طور پر۔“
 ”تم بیوقوف فیمل ہوئے تو مجھے انھوں نے ہوتا یا کم از کم ادب پڑھا ہوتا کہنے؟“

”غالب نے کہا۔ تم ملازم تھے یا پارٹنر؟“
 ”سب تھے دار تھے۔ فروکش کا پچاس فیصد تھا۔ اس سے وہ بلیک انڈز کو بھی دیتا تھا۔“ وہ بولا۔ ”باقی سب کو کوئی کام ملتا تھا۔“

”بلیک انڈز کا اس کاروبار میں کیا کردار تھا؟“
 ”ہاں ہر کی ایجنٹ تھی۔ سیٹائی کے آدھریں تھی اور مال لینے والے تلاش کرتی تھی۔ وہ کال مندر بھی لگا اس کے کالے ہاتھ کا توڑ نہیں تھا۔ جڑے بڑے اس کے سامنے ہر تسلیم کرنے تھے اور انھی کے وعدے وہ تعلقات کا دھبہ دینا کرتی تھی۔ اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا اور اس کی وجہ سے ہم محفوظ رہتے تھے۔“

”یہ سب کچھ جان لینے کے بعد فیصلہ آسان ہو گیا تھا۔ اگر مجبوری کا عقد نہیں کرتے کہ وہ غیرت کی مجبوری یا جان کے خوف سے اس مذکورہ کاروبار میں شریک تھے تو مجھے ہونا پڑتا لیکن اب اس عالم فاضل نے خود ہی اعتراض کر لیا تھا کہ وہ رہنا کارائہ طبع ہر اس دھند سے میں شریک تھے اور ان کی فتنہ ملازم کی نہیں پارٹنر کی تھی۔ ان کا وہی انجام ہونا لازمی تھا جو ہر پارٹنر کا ہوا۔ وہ ایک چالاک آدمی تھا۔ اس نے سب بول کے اہم مقام معلومات فراہم کر کے وہی رعایت حاصل کر کے۔ کو شش کی تھی جو مدد معات گواہ کو مل جاتی ہے لیکن یہ لوگ بھی اس قانون کو نہیں مانتی تھی جس کو مجرم بھی قانون میں مانتے تھے چنانچہ ہم ایم آر ایس کے نظام انصاف کے مطابق مزادین میں حق بجانب تھے اور ہمارے لیے اطمینان کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ راج ملک، ہم نے انصاف کے نام پر کسی بے گناہ کو سزا سنائی وہی تھی مگر وہ جو مجرم تھے اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے تھے کہ وہ قانون کو خرید سکتے ہیں اور بدلے میں قانون سے کھیل سکتے ہیں، قانون کے عمل کو معطل کر سکتے ہیں اور غیر کر سکتے ہیں اور اسے تماشنا بنا سکتے ہیں اور قانون ان کے تابع ہے، وہ قانون کے تابع نہیں ہیں۔ ایسے سب مجرموں کے لیے ایم آر ایس کے نظام انصاف کی گرفت میں آ جانا بے گناہ ناممکن ثابت ہوا تھا۔ ثبوت مٹانے، شہادت لٹھ کرنا۔“

”یوں سے فہمت حاصل کرنے کی کیا کوئی گنجائش تھی۔ سارے فیصلے جانے واریات پر وہیں ہوتے تھے جہاں زبان خوب چب رہی تھی اور ذہن کا تین کا نمور۔“
 ”مجھ پر کوئی؟“ غالب نے اچانک کہا۔
 ”میں نے چونک کر سوچ کر دیکھا جو سمندر سے اچھی بھی ہو رہا۔ اس کا زرد کچلا کچلا بھٹا سا لگتا تھا۔“

”آج جماعت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم پہنچ گئے۔“
 ”غالب سکر لے لگا۔“ ہال، ”شام سے پہلے پہنچ گئے۔“
 ”مدا کرنے وہ بھی غیرت سے پہنچ گئے ہوں۔“ میں نے محل ناز اور حسن کا تاہم ایسے بغیر کہا۔ ”معلوم نہیں ان کا سفر کیا گزرا؟“

”ان کے پاس اسباب ضرورت تھا۔“
 ”سفر کی تنہی تو وہی تھی اور ہم دونوں کے مقابلے میں صرف لن کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اتنی ہی قوت پر برداشت رکھتا تھا۔“

”نازد۔ مجھ سے زیادہ سخت حال ہے۔“ غالب نے کہا۔ ”مگر میں کل کی طرف سے مجھے بھی تشویش ہے۔“
 ”کل اور ناز کے نام پر لاچ چلانے والے نے ہم پر چوک کر دیکھا لیکن میں نے اپنی ہیمن دی مان کے سامنے ہم فصل کے بات کر سکتے تھے ان سے یہ غلط نہیں رہتا کہ وہ ہمارا راز افشا کر سکیں گے کیونکہ ان کی زندگی کا سفر بھی اس سفر کے ساتھ ہی تھا۔“

”تم ہمیشہ کے ساحل سے کس حد تک واقف ہو؟“ میں نے انہی پلنے والے سے کہا۔

”میں ہر ساحل سے واقف ہوں۔ بمبئی سے اس کماری اور ملک کے ساحل سے گلگت تک۔“ وہ خوش سے بولا۔

”ہوں۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”بمبئی کے ساحل ہمایاں کے قریب کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم جماعت کرتے ہیں۔“

”اُسے سب یقین ہو جاتا تھا کہ اپنی افادیت ثابت کر دینے کے بعد وہ ہمارے ساتھ کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔“ میں سمجھ گیا۔
 ”مخوف لیجئے۔ یہ باتاں تلاش کرتے رہتے ہیں ہر بار ایک ہی جگہ سے اور انہیں ہوتے۔“ وہ بولا۔

”ایجنٹسے داری پر لاچ کو ایسی جگہ سے چلو جو بمبئی سے ملے تو کوئی سرچ نہیں مگر اس جگہ کو عام طور پر کوئی بھی استعمال نہ کرتا ہو۔“ میں نے کہا۔

”وہ آج آج سے میں صرف بند کرنا استعمال ہوتی ہے۔ تمام غیر آج سے اس وقت ویران ہوں گے۔ پولیس اور چھاپے ملنے لگی ہوئی نہیں ہوں گے۔ ویسے آپ کو جانا کہاں ہے؟“ وہ بولا۔

”میں کہاں جا رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جانا ان بد نصیب عورتوں کو ہے۔“ میں نہیں جانتا کہ کسی کو بھی ان کی واپسی کی خبر ہو وہ یہ پھر پکڑیں جائیں گی۔“ میں نے کہا۔
 ”اس کے بعد تم تو خفا ہو رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے خیال میں اب کتنی مسافت باقی ہے؟“ میں نے کہا۔

”اُس نے لکائی کی گھڑی دیکھی۔“ وہ گھٹنے، زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں ہم ساحل پر ہوں گے۔“

”میں نے اسے غالب کی نگرانی میں چھوڑا اور باہر گیا۔“
 ”رہائی پانے والی زیادہ عرصہ میں مرے پڑے پڑے سمندر کا نظارہ کر رہی تھیں۔ وہ سب شریف عورتیں نہیں تھیں۔ ان میں سے چاروں میں ناکافی لباس کے باوجود بے فکر سی تھیں۔“
 ”اور سرکین میں رہی تھیں۔ ان سب کو کھانے پینے کا دافر سامان مل گیا تھا۔ سرگٹ اور شراب جو پچھلے لاچ کے مالک چیتے تھے، اب ان کے تقوت میں تھی اور وہ چاروں مرے کے کٹہرے پر چھکی تھیں۔“
 ”ان کے ہاتھوں میں بوتلیں تھیں اور بیوں میں لگتے ہوئے سرگٹ۔“
 ”میں نے باہر نہیں پر فواز۔ ایک سی فہمت رکھنے والی چاروں اور باہر عورتوں کی منڈلی سب سے الگ ہو گئی تھی۔ باقی عورتوں میں سے کچھ مطمئن انداز میں ٹھہر رہی تھیں، کچھ مستقبل کے اندیشوں میں گرفتار تھیں اور شاید یہ سوچ رہی تھیں کہ معاشرے نے ان کو واپس قبول نہ کیا تو وہ کہاں جائیں گی؟ چند ایک ابھی کپ لپنے قید خانے سے ہی برآمد نہیں ہوئی تھیں۔“

”میں نے اس لڑکی کو بلایا جو میرے لیے کافی لے کر آئی تھی۔ وہ لپک کر آئی۔“

”ان سب نے اچھی طرح کھا پی لیا ہے؟“
 ”میں سر۔ آپ دیکھ رہے ہیں ان کی حالت میں تبدیلی؟“
 ”میں نے کہا۔“ ہو سکتا ہے کہ ان کو آگے جا کے کئی گھنٹے بھوکے پیاسے گوارے پڑیں۔ کیا یہ سب واپس جانے کے خیال سے خوش ہیں؟“

”سب کے ہارے میں کیا کہہ سکتی ہوں ہیں؟“ وہ بولی۔
 ”خوش ہونا تو چاہیے انھیں، لیکن وہ چاروں بے حیا طوائف ہیں۔“
 ”وہ یہاں بھی خوش تھیں۔“
 ”تم خوش ہو؟“

”یقیناً خوش ہوں ہیں۔“ اُس نے ممنونیت کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”کہاں رہتی ہو تم؟“ میں نے کہا۔ ”کیا کرتی ہو؟“
 ”میں نرسنگ کے آخری سال میں تھی۔“ آپ نے میرا

کیر پڑھ رہا ہوں سے بچا لیا۔ میں واپس پہنچ کر کورس پورا کر لیا۔
 گی۔ چند دن کے بعد وائس چانسلر کو کسی کو احساس بھی نہیں ہوگا۔ وہ بولی۔
 "نوٹیفکیشنز میں ہوم کے پوسٹل نمبر ایکس میں سے
 رہتی ہوں۔"
 "والدین ہیں؟"
 "میں منگودوں سے پہلے مال مرگتی تھی تو باپ نے
 دوسری شادی کی۔ پھر باپ مر گیا تو ماں نے۔ اُن سے میرا
 کوئی تعلق نہیں۔"
 "اُن کے بچے ہیں کیسے پڑ گئے؟"
 "میں کاماتی ہے سر۔ یوں لیکن قیمت نہیں مقرر خراب
 تھی۔ میرا مشیت ایک ڈاکٹر ہے جو اصل تعلیم کے لیے باہر گیا
 ہے بہت اچھا اور نیک آدمی ہے، بس وہ بد صورت ہے۔
 میں نے اس لیے قبول کیا تھا کہ ایک ڈاکٹر کی بوی ہونے کے
 ساتھ ساتھ میں کو الیفا ٹرنس بن کے اس کی مدد کر سکوں گی اور ہم
 اپنا لکینک قائم کر لیں گے تو کامیاب رہیں گے۔ بعد میں ایک
 جرنل میں میرے پیچھے پڑ گیا۔ وہ بے حد دلکش شخصیت کا مالک
 تھا۔ اس نے پھر اپنا ایجاد کیا کہ میں اپنے سنگیہ کو بچوں گئی۔
 میرے لیے مزاحمت نامنم ہو جاتی تھی۔ کوئی ایسی بات تھی
 اس میں کہ وہ عورتوں کو ایسے کھینچ لیتا تھا جیسے مقناطیس کو ہے
 کو کھینچ لیتا ہے۔ یہ میں نے کئی بار دیکھا۔ اور میں خود اس کی مثال
 تھی۔ جب اس نے مجھ سے شادی کے لیے کہا تو میں غرضی سے
 ہاں بولی۔ جو اس نے کہا میں نے مان لیا۔ ہم نے سول میریج کی۔
 ایک ہفتے بعد وہ مجھ اس لاچ پر چھوڑ کے غائب ہو گیا۔ یہ
 مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرے ملاہ بھی اس کی دو بیویاں اس لاچ
 پر ہیں۔ وہ ایک ہی آدمی تھا جس کی تصویر ہم سب کے پاس
 تھی لیکن ہم تینوں اس کو منفعت ناموں سے اپنا اپنا منظر ہر
 مانتی تھیں۔"
 "کیا تم تینوں ملے تلاش کرو گی؟"
 "کیا فائدہ اس سے ہے وہ اٹھی کا آدمی تھا اور ظاہر نہیں
 کا کوئی نام اصل نام نہیں ہوگا۔ باقی دو کا تو مجھے پتا نہیں مگر میں اس
 سے دور رہی رہنا چاہتی ہوں۔ ورنہ اُسے میرے منظر ہر لاحق ہوا
 تو وہ مجھے اٹھا کر لے گا یا قتل کر دے گا۔ اس کو کوئی اعمال اطمینان
 حاصل رہنا چاہیے کہ میں اس کے خلاف کوئی انتقامی جذبہ نہیں
 رکھتی۔ اس سے کوئی تعلق بھی رکھنا نہیں چاہتی۔"
 "لیکن تم انتقام کو کی اس سے؟"
 "ہاں۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ سال دو سال۔۔۔ پارسل ایڈ
 جب میری شادی اس ڈاکٹر سے ہو جائے تو میں بدلہ ضرور لوں گی۔
 کسی دن موقع ملے گا میں اس کو ایسا الجھن لگا دوں گی کہ وہ پاگل ہو
 جائے گا، یا مر جائے گا تڑپ تڑپ کے۔"

"ایسا ضرور کرو گا۔۔۔ اور اگر ہو سکے تو ان سب کو جہنم
 لینا چاہتی ہیں یہ سمجھا کہ ان کو ذرا غلا کے فروخت کر دینے والے
 عاشق ہی اصل جرم ہیں۔ اُن کے ساتھ عفو و درگزر کرنا ایسا ہی ہے
 جیسے خطرناک سانپ یا پاگل گتے کو مارنا معاشرے میں یہ
 سب کا لازم بنتا ہے کہ ایسے لوگوں کو ختم کیا جائے تاکہ اُن سے
 دوسری لوگیاں اور خلیف عورتیں محفوظ رہیں۔ یہ کام قانون نہیں
 کرتا، کر بھی نہیں سکتا۔ اپنے مجرم کو خود مرادو۔ اپنی مظلومیت کی
 تشہیر سے صرف رسوائی ملتی ہے۔ لاشی ٹوٹ جاتی ہے سانپ
 نہیں مرنے۔"
 وہ ہلک جھپکے بغیر مجھے دیکھتی رہی اور میری بات
 سنتی رہی۔ "اب نے ٹھیک کہا سر۔ لیکن اتنی جرات سب
 میں نہیں ہوتی کہ قتل کریں اور چھپائی چھڑ جائیں۔"
 "حوصلہ ہونا چاہیے، اب وہ شخص جس نے تمہیں دھوکا
 دیا تھا تم سے پہلے نہ جانے کتنی لڑکیوں کو ایسی ہی لالچوں پر
 روا نہ کر چکا ہوگا اور زندہ رہے گا تو آئندہ نہ جانے کتنی اور تم
 جیسی لڑکیاں جلا وطن ہو کے دنیا کے بازار میں بک جائیں گی۔
 کیا یہ احساس تمہارے لیے باعث طمانیت نہیں ہوگا کہ
 اُن جان بیکار کے تہ نہ ایک شیطان کو ختم کر دیا۔ ایک بڑی
 کو مٹا دیا اور بہت سی لڑکیوں کی عزت بچائی۔ اگر ہر لڑکی جو کسی
 بھی عورتوں کے بے باوری کے ہاتھوں جہنم بازار میں تھی ایک لڑکی
 کے سبب کو ختم کر دے تو سوچو کتنی خرابیاں ختم ہو جائیں گی۔ یہ
 ضروری تو نہیں کہ سب بچوں جائیں۔"
 "اب سب کو قاتل بنا چاہتے ہیں؟"
 "میں سب کو اپنے مقصد کے نام پر اور منصف خود بنا چاہتا
 ہوں۔ میں نے کہا۔ "خدا سے فریاد کرنے اور حاکم کے آگے
 روٹنے بیٹھے سے کچھ نہیں ہوتا۔ شکایت کرنا بھی سزا بن جاتا ہے
 ہر ظلم کو برداشت کرنے کی عادت ظالم کو شرہ دیتی ہے۔ فوائد
 ان سب کو پیچھے پھینچا دو۔ اُن سب سے کمزور ساحل پر پہنچنے
 کے بعد بھی جب تک ہم نہ لکھیں کوئی باز نہ آئے۔"
 اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کو شش کرتی ہوں کہ دنیا کی
 بات سن لیں۔"
 "ان سب کے پاس نقد رقم ہے؟ کچھ لاکھ ہاں؟"
 "بہت کچھ لاکھ سارے سب نے آپس میں تقسیم کر لیا ہے
 بلکہ میں نے تین لاکھوں کی مدد سے ہر ایک پر تقسیم کیا ہے ورنہ وہ
 مفروض ہو جاتی۔ ہر لڑکی کو بچپاس بچپاس ڈالر مل گئے ہیں اور باقی
 پانچ سو روپے۔ وہ بولی۔
 "ٹھیک ہے۔ سفر میں پیسہ بھی کس آئے گا۔ ہم انہیں اپنی
 کے ساحل سے رخصت کر دیں گے۔ میں نے کہا۔
 وہ ایک بھدار اور ذہین لڑکی تھی، صرف وقت گزارنے

کے لیے میں نے اس کی کامیابی کی گنجائش کے اندازہ تھا کہ باقی سب
 کی کہانیاں بھی مختلف نہیں ہوں گی بس کروڑوں کے نام اور مقامات
 لازمی ہو جائیں گے۔ اُن کو ظلم کے خلاف جہاد کا وہ فلسفہ بھی
 پڑھا دیا تھا جو ایم آر اے کے فلسفہ تھا۔ مائٹ از رائٹ۔ آگے
 سب کی اپنی اپنی مرضی اور اپنی اپنی تقدیر جسے جہاں چاہے
 لے جائے۔
 اب ہمارے چاروں طرف کشتیوں اور لالچوں کے ساتھ
 ہری جہازوں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی لیکن ساحل کا ہنوز
 دور دور تک پتہ نہ تھا۔ صاف آسمان پر سورج خاصا بلند ہو گیا
 تھا اور سورج دم پر واز کرنے والے آبی پرندوں کی قطاریں بھی اب
 دکھائی نہ دیتی تھیں۔ سمندر اس سفر کے دوران پر سکون رہا تھا
 اور ہوا بھی تیز نہیں تھی ورنہ جہازیں نے کتنا کتنا سمندر کا دھڑ
 ... سا بھونکنا اور طوفانی گرداب بڑے بڑے کھیر جہازوں کو
 ڈبو دیتے ہیں۔
 عرشے پر ٹھٹھنے والی عورتیں اب سمٹ کر واپس مچے جا
 رہی تھیں۔ جس لڑکی سے میری بات ہوئی تھی وہ ایک اچھی غفلت
 تھی۔ اس نے تین دوسری عورتوں کی مدد سے اس مرد کو گریہ بھرے
 ہونے اور لاوارث ہوجم کو سمجھا بھیجے کے قائل کر لیا تھا کہ یہ دقتی
 پابندی اتنی کے خدا میں ہے اور پابندی لگانے والے اٹھی کے
 نجات دہندہ ہیں۔
 وہ چار عورتیں جو بے شرمی کی حد تک بے ہاک تھیں باقیوں
 سے مڑ گئے تھیں یہی عورتیں اور لٹے سے مغلوب تھیں۔ انہوں نے
 اس حکم کی تعمیل سے صاف انکار کر دیا۔ ان میں سے تین اپنی اپنی
 خالی بوتلیں سمندر میں اچھال چکی تھیں مگر چوتھی نے آخری گھونٹ
 لے کر بوتل سے سس لڑکی پر وار کیا تو میرے لیے دور کھڑے
 لاکھ کر مٹا دیا تھا مشکل ہو گیا۔ اس نے میرا مقابلہ کرنے کی کوشش
 بھی کی اور مجھے وہ سب گالیاں بھی سننا پڑیں جو وہ حقیقت فروغ کے
 لیے تھیں مگر اُسے دے نہیں گئی تھیں پانچویں اس کو گھسیٹ کر لے
 گیا اور تھانے میں جھینک دیا۔ باقی دو کا نشانہ نہ ہونگیا اور وہ
 غلوٹی سے نیچے آکر گئیں۔ آخری عورت جاتے جاتے میرے
 سامنے ٹھٹھ گئی۔ اس نے بچوں پر صرف کوٹ پہن رکھا تھا اور
 اسے بھی زندہ نہیں کیا تھا۔
 وہ مجھے دیکھ کر لوٹا لنگی کے انداز میں ہنسنے لگی و تم
 ملے نرو۔۔۔ سب ایک جیسے گتے ہو۔۔۔ وہ گھٹیا نسل
 کے۔۔۔ گتے تھے۔۔۔ تم۔۔۔ اچھی نسل کے ہو۔۔۔ مگر
 گتے ہو۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔۔۔ تم بھی وہی کرو گے۔۔۔
 جو ہم سب کر رہے ہیں۔۔۔ پھر ڈرتے کیوں ہو۔۔۔ آؤ میرے
 ساتھ۔۔۔ میں نہیں ڈرتی۔۔۔
 میں نے ہمارا وہ اس کے چھاپڑ مار دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ

ایک فاختہ جب خراب کے نشے میں بو لے گی تو بھی اور شرافت
 کی باتیں نہیں کرے گی۔ وہ مگر اور چند ایک سگڑ ساکت، بیٹھی رہی۔
 "ہنٹ۔۔۔ ہاچھی نہیں ہے۔۔۔ تمہارے پاس؟
 ... ٹائم تو ہو گیا ہے۔۔۔ وہ بولی۔ پھر اُس نے کوٹ اتار
 کے پھینک دیا اور جھک کر کے انداز میں جھک گئی۔ اس کی
 کمر پر آڑی طرحی سیاہی مائل نیلی کپڑوں کا حال سا پھیلا ہوا تھا۔
 میں نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور دو عورتوں سے کہا کہ اسے
 اٹھا کے لے جائیں۔ اس کی ہڈیاں ہی ہنسی بہت دیر تک میرے
 احساس پر کھڑے برساتی رہی۔ یہ میں کس عذاب میں پڑ گیا
 میرے خدا! میں نے کہا۔ جسم کی لذت ہی بہتر تھی اس سے تو
 میں نے عرشے کی رینگ پر رکھ کے سوچا۔
 ساحل کی کیر جمع کے پونے کو نیچے منور ہوئی میں اُس
 لکیر کو آؤ۔۔۔ سا بھو کے واضح صورت اختیار کر کے دیکھتا رہا۔
 عورت مجھے کچھ بھی نہیں کرنا تھا۔ لاچ کی سمت کو نہ بڑھنا۔
 رہا تھا اور بظاہر سب ٹھیک تھا۔ جھڑپم جا رہے تھے آکر
 بہت کم سمندری لکیر کے ظاہر کرتا تھا کہ ہم بھی کئی کل بند لگا
 سے اس کے نکل گئے ہیں۔ کئی میل پیچھے نظر آنے والی موٹر بولس اور
 کشتیاں، لالچیں اور کچھ جہاز ایک مخصوص علاقے میں رواں
 دھال تھیں۔
 ساڑھے نو بجے میں نے پام کے درختوں اور اونچی ہاٹیوں
 والے ساحل کو اپنے سامنے پایا۔ لاچ کی رفتار اب کم ہو گئی تھی
 اور یہ سفر بلا ختم ہونے والا تھا۔ اُس پاس مجھے کوئی دوسری
 لاچ دکھائی نہ دی۔ جولا محل میرے ذہن میں تھا۔ اس کے
 مطابق سب سے پہلے ان بدبخت عورتوں کو روانہ کرنا ضروری
 تھا۔ مگر کدواں ویران ساحل پر اُس کے روانہ ہوجائیں گی؟ وہ
 پوچھیں گی نہیں کہ یہ میں کہاں لاسے چھوڑ دیا؟ اس حالت میں
 ایک ساتھ اتنی عورتوں کا ہجوم جہاں بھی جائے گا شکوک پیدا
 کرے گا۔ غیر ہماری صحت پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑے
 گا۔ وہ کچھ بھی کہیں اور نہ جائے۔ اسے میں جہاں بتائیں لیکن
 انہوں نے جانے سے انکار کر دیا تو پھر۔۔۔ پھر ترکیب میری
 سمجھ میں آگئی۔
 لاچ اب پھر چل پٹاؤں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔
 لاچ کو چلائے والا خفیہ جہاز کا بونے کے جہاز نے کو سمجھنا تھا
 اور ہمیں محفوظ مقام پر پہنچانے کا وعدہ اس امید میں پورا کر رہا
 تھا کہ اس طرح وہ ہم سے رعایت کا مستحق ہو جائے گا۔ یہ اُس کی
 خام خیالی تھی۔ یہ اُس کی موت تھی جو اسے کبھی کبھی لانی تھی۔
 میں نے اُس لڑکی کو لایا جو اب تک عورتوں کے معاملات
 کو سمجھنے میں میری مدد کا ثابت ہوئی تھی۔ میں نے اُسے
 تالید کی وہ ہار اُس سے پہلے دروازے کو بند کر آئے۔ لاچ اب

دو چٹانوں کے درمیان ٹک چکی تھی، تیسری چٹان سمندر کا جانب تھی چنانچہ لالچ کے نظر اچلنے کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔ چوتھی جانب سمندر کا ساحل تھا جو اب بھی پچاس گز دور تھا۔ لالچ اگر اس سے آگے جاتی تو خشکی پر چڑھ جاتی۔

”آپ نے بلایا تھا سر“
میں نے کہا ”ہاں، تم نے بتایا تھا کہ تم زنگ لکھو گے کہ رہی ہو۔ اس کے علاوہ کیا کر سکتی ہو؟“
وہ میرے سوال کی نوعیت پر حیران ہوئی ”وہ... سب کچھ ہو ایک لڑکی کر سکتی ہے... سر“
”گوئی چلا سکتی ہو؟“

وہ خوفزدہ ہو گئی ”نہیں... نہیں سر“
”دروغ نہیں، مجھے معلوم ہے کہ تمھارا پیشہ تم کو زخم سینا اور ان پر رحم رکھنا سکھا ہے۔ میں نے کہا... لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات کے تقاضے... وہ سب کرنے پر مجبور رہتی ہیں جو آدمی نہیں کرنا چاہتا... مجھ پر بھی ایسے وقت آئے چپ میلا خیال تھا کہ میں کوئی کام نہیں کر سکتی لیکن میں نے کیا...“
”آپ کیا کرنا چاہتے ہیں سر؟ صاف کہیے“
میں نے تعجب سے دیوالور نکالا ”لو... پکڑو“
وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی ”کیا... کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے...؟ میں نہیں کروں گی یہ کام... جو کرنا ہے خود کرو“

”پہلے میری بات سنو“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”نہ تم کو قتل کرنا ہے کسی کو اور نہ میں اتنا گیلا گردا ہوں کہ تم سے ایسا کام کراؤں کیا تم نے دیکھا نہیں تھا کہ میں نے ہی ان کو گتے کی موت مارا تھا... لو پکڑو اسے یہ خود بخود نہیں چاہتا“
اُس نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ آگے بٹھایا اور دیوالور لے لیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے اُسے دیوالور کو صحیح طرح پکڑنے کا طریقہ بتایا۔

”یہ دیکھو، یہ سیفی کیچ ہے، یوں سمجھو اس کا لاک ہے۔ جب تک اس پوزیشن میں بیٹھا نہ غلطی سے کسی نہیں ہو سکتا۔ اس کو پٹانے کے بعد“ میں نے کہا ”یہ دیکھو اس کا رخ سلنے کی طرف رکھو...“

”میں... نہیں نہیں چلا سکتی اسے...“
میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا ”میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی“ میں نے کہا ”لبر تم اسے ایک ہی رخ میں رکھنا“ جو بھی سامنے ہو گا وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکے گا اس کی ہرشت ہی کافی ہوتی ہے۔ اب دھیان سے میری بات سنو۔ میں اور میرا ساتھی یہاں اتر جائیں گے تم اور باقی سب عورتیں اس لالچ میں بیٹھ کر بند کھاؤں گے پچھنے

کے بعد تمھاری مرضی چاہو تو اس کو گولی مار دینا، ایسے لوگ دنیا اتنے قریب سے نشانہ خطا نہیں ہوتا یا پھر اسے پولیس کے حوالے کر دینا۔ پولیس تو آ ہی جائے گی۔ اگر تم اپنی جان پولیس کے جکڑوں سے بچھڑانا چاہو تو اسے گولی مار دینا، یہ خبر لو جو چاہو اتنی لڑکیوں کو ایک لالچ سے ایسے عجیب لباس میں اکر سنے دیکھ کے جمع تو اکٹھا ہو گا اور لو پوچھا بھی جائے گا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ تم سب کو جھوٹ بولنے کی قطع ضرورت نہیں، جو بڑا وہ سب کو جادینا۔ اب آؤ میرے ساتھ“

بادل ناخدا سترہ میرے ساتھ چل پڑی۔ غالب لالچ کے رنگ جانے کے بعد میرے اختلاف میں مستعد تھا۔ اچھا تھا کہ غالب کو اس ناخوشگوار فریضے سے نجات دلانی جس میں وہ ایک لمحے کے لیے غافل ہونے کا ریسک نہیں لے سکتا تھا۔
تم اس بندے کو ساتھ لے جاؤ... میں نے لالچ جانے والے کے دوسرے ساتھی کی طرف اشارہ کیا ”اور میرا انتظار کرو“

”میں کہیں نہیں جاؤں گا“ وہ سرکش لہجے میں بولا۔
”جاؤ گے کیسے نہیں؟ تمھارا تو باپ بھی جانے گا“ میں نے کہا ”اب یہ یاد کرو کہ سرطرح چاہنا ہے ہو، اپنے ہر دہلیہ چل کر عالم ایک ہیں کی صورت میں یا اعلیٰ بنو آگے“
”مجھے گولی مارنی ہے تو اسی جگہ مار دو“ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔

”یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے“ میں نے کہا ”اوکے نہیں گنا ہوں پانچ تک۔ پانچ سینکڑا بعد تمھاری خواہش پوری ہو جائے گی“ میں نے صریح وقت کے ساتھ پانچ تک گنا۔ وہ نہیں اٹھا تو میرے لیے اس کو موٹ کر دینا ضروری ہو گیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو خود اپنی نظریں گر جا کر میں خود سب کے سامنے ایک بات کہہ کے اس پر عمل کر سکتا تھا۔ مزے موت و لیے ہیں ان کا معتز جو بھی چکی اور شاید وہ بھی یہ بات سمجھ گیا تھا۔

اس کی موت نے میرے ساتھ آنے والی لڑکی کو زور بھی کیا تھا۔ سکر اس کے اعتماد میں اضافہ بھی کیا تھا۔ تیوری کے ساتھ میں نے پریکٹس کر کے بتا دیا تھا کہ دشمن کو گولی مارنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ اس کے واحد ذمہ بچ جانے والے ساتھی کی نظریں پھلے لاش پر مرکوز رہیں۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔
”میرے لیے کیا حکم ہے سر؟“ اس نے خشک بوٹوں پر زبان بچھر کے کہا ”میں نے کوئی حکم عدلی نہیں کیا ہے پورا اتفاق کیا“

”طے تو ہم نے ہی کیا تھا کہ تمھارا اسم بھی مختلف نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا ”لیکن تم زندہ رہنے کی رعایت حاصل کرنے میں تقریباً کامیاب ہو گئے ہو پس تھوڑا سا کاٹا ہی ہے

اب ہم جا رہے ہیں، تم ان سب لڑکیوں کو ہمیں کی بندرگاہ پر لے جاؤ گے اور خود کو پولیس کے حوالے کر دو گے۔“
اس کا رنگ فنی ہو گیا۔ ”پولیس...؟“
”ہاں، یہ بات یقینی ہے کہ تم کو سزا موت نہیں ہوگی۔ تم پولیس کو وہ سب کچھ بتا سکتے ہو جو سچ ہے، جو تم نے کیا، دیکھا یا سنا۔ اعتراض کی صورت میں قانون تمھیں رعایت ضرور دے گا۔ تھوڑے سال شاید جیل میں گزارنے پڑیں گے مگر تم زندہ رہو گے۔ تم بھاری کا مڈ بھی پیش کر سکتے ہو یہ شرط سے اجازت ہے کہ خود ہر دن جاؤ۔ یہ کہو کہ تم ان کے ساتھی ہی نہیں تھے اور تم نے ہی ایک غیر متدانشان ہونے کی وجہ سے بردہ فزوشن کو مار دیا اور لالچ کے کرسائل پر آگے تم لالچ پر کسے پیسے تھے اس بارے میں قابل یقین اسٹوری خود بنا دیا اسات سال کی جیل جوں کر کے سابقہ زندگی کا کٹا رہا کرو۔ دھین سال بھی نہیں لگیں گے کہ تم کو پھر زندگی گزارنے کا اختیار حاصل ہوگا۔“

”میں... میں کروں گا“ وہ بولا۔
”یہ لڑکی ہمیں تک تمھاری عمر گنی کرے گی“ میں نے کہا ”اس کو عام لڑکی سمجھ کر غلطی مت کرنا۔ میں نے اسی لڑکیوں میں سے اس کو چنا ہے تو اس کی وجوہات میں تربیت یافتہ نہ سی مگر ہے یہ لڑکی کا مڈ اور اس کا نشانہ بھی میں نے دیکھا ہے۔ اگر نہیں کہوں تو وہ میں فٹ کے فاصلے سے تمھاری دائیں آنکھ...“

”اس کی ضرورت نہیں، میں زندہ رہنا چاہتا ہوں“ وہ بولا۔
”بس تو پھر تم جاؤ“ میں نے کہا اور لڑکی کے شانے پر تھپکی دی۔ میری تقریر نے اس کو کسی حد تک بے خوف کر دیا تھا وہ دیوالور لے کر وہیں بیٹھ گئی جہاں پہلے غالب بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے باقی میں اس کو کرسائل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ لہریں میرے گھٹنوں سے اوپر تک آ رہی تھیں اور چٹانوں کے درمیان جھاک بن کے ٹوٹ رہی تھیں۔ لالچ آہستہ آہستہ گھوم کے واپس ہوئی۔ میرے خشکی پر قدم رکھنے تک لالچ بھی سمندر میں رواں ہو چکی تھی اور ہمیں کی بندرگاہ کی سمت جا رہی تھی۔
”خوش آمدید“ غالب نے کہا اور ہم ایک دوسرے سے بغلیں ہو گئے۔ اجنبی سرزمین پر خدا کے بعد ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔

”یہ کیجیے نا کہن ہی گلتا تھا جو کہن ہو گیا“ میں نے کہا۔ ہم دونوں سوٹ اور ٹائی میں تھے مگر ہماری پٹوئیں بھیج جلی تھیں اور جو تو میں باقی بھی گیا تھا۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر کھجور یا ناریل کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ اس کے آگے باکس تھا لڑکی تھیں اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے وہ جگہ بہتر بن گئی، ہم پٹوئیں اتار کے کھٹنے کے لیے ڈال دیں اور خود ریت پر دراز ہو گئے۔ فضا ساکت تھی۔ دور دور تک سمندر

کے شور کے سوا کوئی صدا نہ تھی۔ تحفظ اور عاقبت کا احساس سورج کی تمازت سے حاصل ہونے والی راحت اور اعصاب کی کشش کی یکجہت ختم ہوجانے سے ہلنے لگے سکون اور سرور میں ڈوب گئے۔ میں نے نیلے آسمان کو دیکھا اور سوچا کہ گریٹ نکال کے ملاؤں مگر اس سے پہلے رابعہ کے تصور نے آیا۔ وہ ایک خواب تھا جو نیند کی آغوش میں بیٹھتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ بعد میں غالب نے بھی اعتراض کیا تھا کہ وہ سنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا سب کے بارے میں اور اچانک اس کے خواب پر ناز و قابض ہو گئی تھی۔

میں نے کہا ”تم نے دیکھا رابعہ، میں آگیا ہوں“
وہ ہنسی ”سمنے کے لیے آئے ہو کیا؟ شام تریس ہیں جاتے گی“

میں ہڑلے کا اٹھ بیٹھا۔ اس کی بس ایک جھلک ہی بھی میری تصور ہنوز قائم تھا۔ دوپہر چل چکی تھی جس کا مطلب تھا کہ میں کسے کہ میں کھٹنے ستار رہا تھا۔ ریت پر گر گئی، بیٹھے نیند آگئی تھی جو آئی گری تھی کہ بے ہوشی سے کم تھی۔ خواب گری نیند میں نہیں آتے چنانچہ میں نے تین گھنٹے بعد اس وقت رابعہ کو دیکھا جب شور و خرابہ تھا مگر لاشور بیدار ہو چکا تھا۔ رابعہ کے تصور نے مجھے اتنا بے قرار کیا کہ میں نے غالب کو جھجھکے کے جگایا۔ اٹھ مڑے۔ ”آنکھیں کھول“
”کیا ہے۔ کیا مصیبت آگئی اب؟“ وہ اٹھ کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ”سمنے کے لیے آئے ہو کیا شام تریس ہیں جاتے گی“

غالب چڑکا ”... کیا تم کو نے... پھر کتنا؟“
”کیوں؟ آنا حیران کیوں ہے تو؟“
”کمال ہے یار۔ بالکل ہی نازو نے کہا تھا“ ابھی ابھی تو دجگا نا مجھے تو کوئی بات اور بھی ہوتی“
حیران ہونے کی اب میری باری تھی ”یہ نازو نے کہا تھا؟ تجھے یقین ہے کہ... بالکل ہی الفاظ تھے۔ میں نے تو جانتے ہو مجھے تو بڑے تھے“ میں نے کہا۔
”دوہرا تھے تھے کیا مطلب؟“

”مجھ سے یہ بات رابعہ نے کی تھی۔ میں بھی تو ابھی جاگا ہوں“ وہ خواب میں آئی تھی۔
غالب مجھے یہ دونوں کی طرح دیکھتا رہا ”کیسی عجیب بات ہے کیا تو ضیع کرے گا کوئی اس کی؟ ہر ایک پر ہی وقت میں تو نے رابعہ کو خواب میں دیکھا اور میں نے نازو کو۔ اور ایک ہی بات کی دونوں نے ہم سے“
”یہ سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی کے ماہرین کے لیے

214

ساتھ۔ اللہ اجر دے گا اس نیک کا۔

”اللہ نہیں، بھگوان“ غالب نے سرگوشی میں جھگڑا دیا۔
اور میرے ساتھ دھکا لگانے لگا۔ خاتون کی پہلی کوشش ناگہانی
”ایک بار اور بھائی فقیر حیدر“ میں نے آہ بھر کے کہا۔
”اب ہم لفٹ کے حق دار تو ہو ہی چکے ہیں بھائی امیر حیدر“
غالب بولا۔

میری ہدایات کے مطابق دوسری بار خاتون نے گاڑی کا
چلچل اس وقت چھوڑا جب اس کی زقارتی نیزہ جو تکی پر ماس
کے پیچھے ڈھکے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ خاتون اتنی عقل مند
تھیں کہ انھوں نے دوسرے پیرسے ایکسپریٹ پر دوبارہ کھڑا
نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑی اشارت ہوتے ہی ایک جست لگا کھاگی
میں اور غالب منہ کے بل مرکز پر گرے۔ تخریب سے گزرنے والی
ایک بس کے مسافر اس منظر پر خوش ہو کے ہنسنے
خاتون نے کار کو روک لیا تھا۔ انھوں نے کھڑکی سے سر
نکال کے کہا: ”تھینک یو۔ پیسے کتنے ہوئے؟“
میرا غصے سے برا حال ہو گیا۔ ”بہت افسوس کی بات ہے۔“
”اوکے... یہ یو۔ پورے پچاس؟“ عورت نے تنک کے
کہا۔ ”یہی تو مصیبت ہے تم میکینک لوگوں کے ساتھ مجبوری سے
فائدہ اٹھاتے ہو؟“

میں نے پیچھے والا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔
”ہیں بیٹی جانا ہے۔ سو روپے دیں گے؟“
”کیا... اسے ٹیکسی سمجھتے تم نے؟ وہ سچ بولی۔
”آپ نے ہمیں ٹیکس کیسے سمجھ لیا؟ میں نے کب...“
غالب کے لیے دوسرا دروازہ کھول دیا۔
”ہم آپ کی ریکارڈ میں کھڑے کھڑے نقد خرید سکتے ہیں؟“
غالب نے کہا۔ ”بولیے کیا قیمت لیں گی؟“
”میں سیٹھ امیر حیدر ہوں اور یہ میرا بھائی فقیر حیدر مشہور
پروڈیوسر ہیں میں نے کہا۔

میں نے ہندوستان کی فلم نگری ہے۔ میں نے سنا تھا کہ یہاں
ہر قسم کی عورت ایکٹریں، ہر چہ تمام انڈیا پر پانچواں نمبر پر
اور ہر چہ ڈائریکٹر ہو سکتا ہے۔ باقی بھی فلم کے کسی نہ کسی شعبے
سے متعلق ہوں گے خواہ وہ اسکرپٹ رائٹر ہوں یا فوٹو گرافر، سائونڈ
ریکارڈسٹ ہوں یا میوزک ڈائریکٹر۔
وہ بڑی عجیب نفوذ سے ہمیں دیکھتی رہی۔ اس کے
لبوں کی مستی خیز مسکراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم لمبے لفٹ
گھنٹے میں ناکام رہے ہیں۔

”آئی ایم سوری؟“ اس نے بالآخر فٹ کو دبا پس اپنے بیگ
میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”مجھے غلطی ہوئی“
”کوئی بات نہیں“ میں نے کہا۔ ”کسی کی صورت پر توجہ نہیں

کھا ہونا کہ وہ کیسا ہے؟“

گاڑی کچھ دیر خاموشی سے دوڑتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔
”آج کل آپ کو نئی فلم پروڈیوس کر رہے ہیں؟“
”جی... وہ ابھی اس کا نام طے نہیں ہوا“ میں نے کہا۔
”آئی سی... کاسٹ تو فائنل کر لی ہوگی؟“
”کاسٹ... بھی زیر غور ہے ابھی“ میں نے کہا اور خدا
کا شکر ادا کیا جب اس نے اگلا سوال نہیں کیا۔ خود کو فلمی پروڈیوسر
کہنا ایک غلطی ثابت ہو سکتا تھا۔ میری میں قدم رکھنے پہلے
ہم اس فلم نگری کے باسے میں بہت کم معلومات رکھتے تھے۔
اس عرصت کی باتیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اس کا فلمی دنیا سے
کوئی تعلق ضرور ہے۔

اب تک اس سے تمام گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی اس
سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہونا کہ وہ اردو نہیں جانتی۔
غالب نے میرے کان میں کہا: ”خود کو فلم پروڈیوسر کہنے کا
پتہ لپٹنے کی کیا ضرورت تھی؟“
”میں نے کب فلم پروڈیوسر کا تھا۔ فلم کا تو نام بھی نہیں
لیا تھا میں نے۔ صرف پروڈیوسر کا تھا“ میں نے کہا۔
”اور کیا مطلب ہو تو لے پروڈیوسر کا؟“

”پروڈیوسر کا مطلب ہے پیدا کرنے والا۔ بحسن بھی پروڈیوسر
ہے جو اناج پیدا کرنا ہے۔ صنعتکار بھی۔ اور گیارہ بج کر باب
ایک زبردست پروڈیوسر ہے۔“ میں نے کہا۔
”اگر اس نے پوچھ لیا کہ پہلے کون سی فلمیں بنائی ہیں
تو کہ دینا مشکل، اعظم، مددائیا، مستم، بہت مشہور فلمیں ہیں؟“
غالب نے جتنا کہہ کیا۔
”بہت بہت اہمیت باتیں کر رہے تھے اور ساتھ شرمیل
فی گھنٹا کی رفتار سے گاڑی چلانے والی عورت ہماری طرف
متوجہ بھی نہیں تھی۔

میں نے کہا: ”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا ابھی تک؟“
”وہ مسکرا کے بولی: ”میں فلم ایکٹریں ہوں؟“
”جی... کیا نام ہے آپ کا؟“ میں نے کہا۔
”شرمیلہ ٹیگور“ وہ بولی ”کمال ہے آپ نے مجھیں پہچانا؟“
صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے کہا۔
”آپ ہرگز شرمیلہ ٹیگور نہیں ہیں؟“

وہ ہنسی: ”آپ بھی تو فلم پروڈیوسر امیر حیدر ہیں؟“
”صورت حال اچانک خراب ہو گئی تھی مگر میں نے نروس
ہوئے بغیر کہا: ”پھر آپ کے خیال میں ہم کون ہیں؟“
”دوہر پیسے“ وہ بولی ”جو اپنا چہرہ بدل کے پھر رہے ہیں
معلوم نہیں کیوں؟“
”یہ آپ نے کیسے جانا؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میں ہی کام کرتی ہوں۔ روپ بہروپ بدلنے کا یہاں
ہر ایک آپ آرٹسٹ کہا جاتا ہے، وہ بولی: ”میں آرکے اسٹوڈیو
میں سال سے ہوں۔ سونگراشی پرتوی راج نے لکھا تھا مجھے“
”ٹیکس کیسے ہو گیا آپ کو...؟“
”پہلے تو میں نے غور نہیں کیا تھا لیکن جب آپ نے خود کو
شرمیلہ پروڈیوسر کا تو میں نے غور سے دیکھا۔ میں مبینہ کے سب
شرمیلہ پروڈیوسر کو جانتی ہوں۔ آپ لوگ جو بھولے بالوں کی
بناوڑی ڈانچے لگا کر پھر رہے ہیں اسے عام آدمی عقل
نہیں سمجھے گا سونگراشی تو یہ پیشہ ہے۔ میں نے تو ایک نظر میں دیکھ
باتھا“ وہ بولی۔

غالب نے میری طرف اور میں نے غالب کی طرف دیکھا۔
”کیا فلمی گئی نیشن تھی۔ وہ ہوشیار عورت تھی اور نظر ناک بھی
بہت ہو سکتی تھی۔ ابھی تک ہم نے زبردستی کار میں بیٹھنے کے
براہی زیادتی نہیں کی تھی نہ کبھی ایسی وجہ تھی کہ شرمیلہ
کے مددہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتی۔ ہم نے اس کی مدد کی
تھی اور اجرت کے طور پر لفٹ لے لی تھی حساب برابر ہو کر
ان کے شکی ذہن کا کیا بھروسہ۔ جس نے یہ تاڑ لیا تھا کہ ہمیں
بل کے پھر رہے ہیں وہ ہماری اصلیت جاننے کی خواہش مند
نہ ہوگی۔

”تم چپ ہو؟“ وہ بولی۔
”مجھ کو نہیں آتا کہ میں کیا کہوں؟ میں نے کہا: ”آپ کا
بائیاں ہیں، ہم کون ہیں؟“
”چہرہ چھپانے والے وہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یا
ہم اور گناہ کار“ وہ بولی ”یا بڑول اور شریف آدمی جن کو دشمنوں
سے جان کا ڈر ہو؟“
”بہت منطقی بات ہے“ میں نے کہا: ”اپنے اس معیار
سے دیکھئے ہم کیسے لوگ نظر آتے ہیں پہلی قسم کے یا دوسری
الہاکے؟“

”فی الحال میں اپنی رائے محفوظ رکھوں گی“ وہ بولی ”ابھی
میرے ساتھ تھا رائیو نے شرمیلہ نے چن چن تھیں بھی مجھ
سے ان کے کوئی ضرورت نہیں؟“
”آپ کو تو زور ناچا جیسے آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں گئی“
میں نے کہا۔

”کیا ان کے تم مجھ سے مشکل سے دو ہزار روپے ہوں
میں نے کہا: ”ایک یہ انگوٹھی ہے اور ایک دست واچ؟“
”بھئی تو یہ تو کہہ رہے ہو تو پہلے ہی لیتے، اس کے لیے
بڑا گاڑی ٹیکس کرنے اور اسے دھکا لگانے کی ضرورت نہیں
تھی۔ اہل کون تھا جو میری مدد کے لیے آتا؟“
”ٹھیک یومیٹم کو آپ نے ہمارے باسے میں غلط

لائے قائم نہیں کی۔ عام عورت سوچے سمجھے بغیر جھوٹا بیک
اپنے لیے بھی پریشانیاں پیدا کرتی۔ اور ہلانے لیے بھی؟“
”آپ کی طرح؟“ میں بھی صرف مدد کی ضرورت تھی، غالب
نے کہا: ”کوئی لفٹ دینے کو تیار نہیں تھا؟“
”ایسی جگہ پر کوئی کسی کے لیے نہیں لگتا میری تو گاڑی ہی لگ
گئی تھی؟“ وہ بولی۔

”آپ نے نام نہیں بتایا ابھی تک اپنا...“
”میں لاتی ہوں۔ پہلے لاتی فیوز تھی۔ چار سال لاتی تاج ہری۔
اب پھر لاتی فیوز ہوں۔ اپنے بیٹے میں صرف لاتی؟ وہ بڑے تکلفنا
پر اعتماد لہجے میں بولنے والی عورت تھی؟“ اور میں رہتی ہوں۔
آرکے اسٹوڈیو میں آکے کسی کو بھی بولو کہ لٹی سے ملنے پر کوئی
نہیں روکے گا تم کو۔ اگر روکے گا تو راج پوراس کی ایسے چھٹی کر
دے؟ اس نے پچھلی بجائے کہا: ”اپنے فادر کی وجہ سے بہت لحاظ
کرتا ہے میرا“

”آپ... اس کے والد پرتوی راج کے زمانے سے یہ کام
کرتی ہیں۔ تو کیا پانچ سال کی عمر سے لگوں کے چہرے بنانے اور لگاتے
مشروع کر دیے تھے؟“ میں نے کہا۔
”نائی لگتے۔ میری عمر پانچ سال ہے“ وہ ہنسی۔
”کیا زبردست ایک آپ کیلئے آپ نے چوبیس کی

لگتی ہیں؟“
”اس نے پلٹ کر مجھے غور سے دیکھا یہ تو تعریف ہے،
خوش دیا ہے وقت بنانے کی کوشش؟“
”لا حول و لا...“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔
کیا ضرورت ہے... مگر چہ یہ کمال کی بات۔ میں نے اب دیکھ
لیا ہے کہ آپ نے کوئی ایک آپ نہیں کیا؟“
”اب ایک بات میں بھی پوچھ لوں؟“ وہ سکرائی ”تم یہ
ایک آپ کو کہے دہاں کیوں جھٹک رہے تھے؟“
”کیا ادھر فلم کی شرمیلہ کے لیے بھی کوئی نہیں جاتا؟“
”جانتے ہیں ایگر پورائیوٹ ہوتا ہے کوکشن پر تم لوگ
تو اب لگتا تھا کہ سمندر میں سے نکل کے آئے تھے؟“

”میں چونکا یہ... کیسے اندازہ کیا بات نے؟“
”ایک تو پڑھوں سے جو بیگ خوشک ہوئے ہیں، پھیر
جو توں سے۔ اور اس کے بعد چہرے سے۔ شاید پہلے یہ ٹیکٹ
آپ ٹھیک ہوگا، پانی سے سب خراب ہو گیا ہے؟“ وہ بولی۔
”یہ بڑی لمبی کمانی ہے؟“ میں نے کہا: ”اور ہمارا ساتھ
بہت مختصر شاید یقین بھی تو کریں آپ؟“
”تھانے یہ نام تو اصل ہیں؟“ فقیر حیدر امیر حیدر؟ وہ بولی۔
”اگر میں کہوں کہ ہمارے باپ کا نام دطری لال تھا تو
آپ کو یہ سب نام زیادہ مضحکہ خیز لگیں گے؟“ میں نے کہا: ”لیکن

اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ آپ میرا پاسپورٹ دیکھیے اور میرے بھائی کا بھی۔

”نہیں نہیں... میں یقین کر لیتی ہوں!“ اس نے کارکو اچانک ایک روڈ سائیکل سٹورنٹ کے احاطے میں روک لیا۔ میں اسی وقت ایک پرانے ماڈل کی کھلی سیٹلانے بہت غلط طریقہ پر سامنے سے آتے ہوئے موڑ کاٹا۔ اتنی بڑی سمارت سے اپنی گاڑی کو بچا لیا۔ اس میں کچھ شاہد خونی تغیر کا بھی تھا۔ وہ پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ اسے گاڑی کو ریسٹورنٹ کی جانب موڑنا ہے۔ اگر یہ ارادہ وہ سامنے سے آنے والی گاڑی کو دیکھنے کے بعد کرتی تو حادثے سے بچنا ناممکن ہوتا۔ وہ گاڑی لٹی کی کار کو سائیکل سے ٹکرا دیتی اور شاید ہم کار کے ساتھ تین چار قلابا زیاں کھاتے تو اندر ہی پچھڑ ہو جاتے۔ اس لمبی چوڑی جہازی قسم کی گاڑی کا کچھ نہ بگڑنا کیوں کہ اس کا سامنے والا پھر بہت جست خورٹ ناک تھا۔

خیر ارادی طور پر لٹی نے کار کو روکتے ہی پلٹ کے دیکھا اور زیر لب ان کو فٹنٹاپ کو گولی دی جو شاید نشتے میں تھے۔ مگر جواب میں انھوں نے چیخ کر جو کچھ کہہ وہ ہم نے بھی منساہد ہوئی تھی۔ اسے اندر سٹورنٹ کے باہر بھی جگر میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی لٹی کا پھر و شرم اور غصے سے سرخ ہو گیا۔ سیاہ سیٹلانے جس طوفانی رفتار سے آتی تھی اسی رفتار سے وھول اڑا کر غائب ہو چکی تھی۔

میں نے نرمی سے لٹی فیور سے کہا: ”جانے دیں۔ ایسے گتے تو بھونکتے ہی رہتے ہیں“۔ غالب نے کہا: ”آپ کی کسی نیکی نے؟“۔ ”میں بھی بچایا۔ چلیے بھول جائیے اس بات کو اور مشکل اور کیجیے“۔ لٹی نے ایک گرمی سانس لے کر سر ہلایا اور کا سے اتر آئی۔ ہم ایک ٹیبل پر جا بیٹھے۔

”میں صرف جانے بیوں گی“۔ لٹی نے کہا۔ ”ہم کھانا کھا لیں گے“۔ ”میں نے کہا۔“ ”کھانا تو اس وقت نہیں ہے“۔ ”ویر نے کہا“۔ ”ختم ہو گیا“۔ ”توچر جانے کے ساتھ جو کچھ بھی لاسکتے ہو سب سے آؤ۔ ہم کھانا سب کے کھا لیں گے“۔ ”میں نے کہا۔“

”ان کے کلب سینڈوچ اور شامی کباب اچھے ہوتے ہیں اگر پریٹ کھڑا ہے تو وہی منگوا لو“۔ لٹی نے کہا۔

”ایسی صورت میں ہمارے لیے جانے نہیں کافی“۔ ”میں نے آؤ میں تو یہ کہتے ہوئے تھا: ”دیری بلیک، دیری ہاٹ“۔ ”تم لوگ کہاں جاؤ گے؟“۔ ”میں... میں...“

”آپ ہمیں اپنے راستے میں کہیں بھی آمادیں دہاں سے جڑ۔ جیلے جائیں گے حاجی ملی کے مزاد پر“۔ ”میں نے کہا۔“

”میں بھی دہاں ہر جمعرات کو جاتی ہوں“۔ وہ بولی دھیر دھیر ساتھ چلو۔

میں نے غالب کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا بہت ہوش ہوتی ہیں یہ پیش کش قبول کر کے لیکن انفسوس میں لٹی کو یہ ممکن نہیں ہے میں نے کہا: ”ہم آپ کے ساتھ نہیں جا سکتے“۔

”تھیں کہیں اور جانا ہو گا یا کسی اور کے ساتھ جانا ہو گا؟“ بولی: ”ویسے بھی میں تو مغرب کے بعد جاتی“۔

اس کے بعد غامضی کا ایک وقفہ آیا جس میں لٹی نے جانے اپنی اور ہم نے بہت مضطرب ہوئے۔ کلب سینڈوچ کی پلٹ صاف کرنے میں نڈیرے کن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تاہم میرے لیے دوسری پلٹ نہ منگوانا مشکل ہو گیا۔

”کلب سے بھوکے ہوں لوگ“۔ لٹی نے ہنس کے کہا۔ ”اب تم سے کیا پردہ۔ صبح سے کھانا نہیں کھا تھا“۔ ”میں نے کہا۔“

جب لٹی کی ادائیگی کا وقت آیا تو لٹی نے پہل کر دی۔ میں نے دیگر کو روک لیا۔ لٹی کا دیا ہوا نوٹ ہٹا کے میں نے جبب میں سے نوٹوں کی گولی نکالی اور اس میں سے ایک نوٹ پلٹ میں ڈال دیا۔ ”تم لوگ واقعی میری کار فرما کر سکتے تھے“۔ لٹی نے غصے سے کہا۔ ”میں خرم نہ ہو گیا“۔ ”میرا مقصد تھیں یہ بتانا نہیں تھا کہ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ حضرات کی موجودگی میں خواتین ادائیگی کریں؟“ وہ ہنس پڑی۔ ”میں لٹی ٹیکس کو بھول گئی تھی تم مجھے یہی کہہ رہے دالے نہیں گتے“۔

”وہ کیسے؟“۔ ”میں نے کہا۔“ ”میں ہی کے رہنے والوں کا کوئی براڈ یا ٹریڈ مارک ہے ہمارا پلاٹ“۔

”ہاں، ہر شکر کا ایک براڈ ہوتا ہے۔ آدمی اسی سے بچا جاتا ہے کہ کہاں کار رہنے والا ہے؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولی: ”لیکن اس براڈ کو وہی بچا تھا ہے جو بیوی میں پیدا ہوا ہو۔ پلا اور بٹھا ہو لٹی والا اور کھنڈ والا سب اپنے اپنے براڈ رکھتے ہیں؟“

”تم ایک حیرت انگیز صورت ہو“۔ میں نے کہا: ”میں واقعی نہتے ہیں۔ بیوی میں۔ تاہم یہ ریت سمجھنا کہ ہم جیل کے مفوضین ہیں اس لیے جیسے بدل کر کچھ رہے ہیں“۔

”کچھ کچھ سمجھنے کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ بولی: ”جب تم کچھ نہیں بتانا چاہتے یہ مطمئن رہو، میں کسی سے اس ملاقات کا تذکرہ بھی نہیں کروں گی“۔

”مگر ہم ضرور کریں گے“۔ میں نے اس کا موڑ ٹھیک کر کے لیا: ”اور بہت اچھے الفاظ میں“۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور گاڑی اشارٹ کر دی۔ ابھی ہم ٹرک پر آئے ہی تھے کہ میں نے اپنے پیچھے اسی ایک سیٹلانے کو آتے دیکھا۔ وہ شاید کہیں سائیکل میں رک کے ہائی روائی کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ میں نے نہی

اڈر کو دیکھا۔ ان میں سے ایک آگے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بالکل گنجا اور برسی ہاتھ شخص تھا۔ اس کے ساتھ والا بھی گنجا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے اپنے اپنے سر استروں سے صاف کرانے تھے۔ دونوں پیچھے بیٹھے ہوئے بدماشوں کو میں صاف نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ان سب کے عزائم کی جانت بالکل واضح تھی۔ ”س لٹی“۔ ”میں نے کہا۔“

”س۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ وہ بدعاش پیچھے آ رہے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں ان سے کہ کیا بات ہے۔ کیا غلطی میں نے کی تھی؟“

”نہیں۔ آپ ملتی جائیں۔ یہ بات اب ہم ان سے پوچھیں گے“۔ ”میں نے کہا۔“

”دیکھو... جھگڑا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں...“ ”وہ جھگڑا چاہتے ہیں میں لٹی۔ آپ کے نہ جاننے سے کچھ نہیں ہو گا۔ آپ بس گاڑی کو جتنا دور لے جا سکتی ہیں لے جائیں اور ان کو موقع دیں ہمارا راستہ روکنے کا“۔ میں نے کہا۔

شاہد لٹی نے میرے لیے کو سمجھ لیا۔ اس نے ایک دم قند بڑھائی۔ تباہ میں آنے والی سیٹلانے ابھی تک غاصلے سے چل رہی تھی۔ وہ لوگ ریسٹورنٹ کے قریب بدعاشی کے مظاہرے سے گزر کر رہے تھے۔ ہمیں فرار ہوتا دیکھ کر انھوں نے بھی گاڑی کو اندھا دھند دوڑا نا شروع کر دیا۔

گنجا ڈرائیور بڑے زور زور سے فقیر لگا رہا تھا۔ اس کا ماسٹی سیٹ پر تقریباً کھڑا ہوا تھا۔ پیچھے والی سیٹ پر بھی جو دو افراد بیٹھے ہوئے تھے، وہ شوخ لباسوں کے علاوہ اپنے ریت سے بھی خود کو بدعاشی ثابت کرنے میں کوشاں تھے اور معلوم نہیں کیا چلا رہے تھے۔

لٹی نے بڑے صبر سے وقت پران کرانے کیل کے راستہ روکنے کا موقع دیا۔ ان کی لمبی چوڑی کار بیک جام ہونے سے گھوم کر سامنے آ گئی۔ بیٹوں کی رگوں سے گرد کا بگولا اٹھا۔ ”تم بالکل باہرمت آنا خواہ کچھ بھی ہو جائے“۔ ”میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا: ”اور موقع ملے تو جھگڑا جانا“۔

”ہماری نکرمت کرنا“۔ غالب نے کہا۔

غلاف ترنق وہ اترتے ہی ہم پر حملہ آور نہیں ہوئے۔ ان میں سے ایک چیونٹ گم جاتا اور بیل کی طرح جڑ سے ہلانا آگے آیا۔ میرے سامنے آ کے اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور پیر پھیل کے کھڑا ہو گیا۔ باقی تین ایک نفع داترے کی صورت میں اس سے ایک قدم پیچھے رہے۔

”تم ہی وہ عورتی جس نے فرش کار کو ہارے دوستوں کو لٹا تھا؟“ وہ بولا۔ پھر اس نے چیونٹ گم میرے منہ پر ٹھوک دی۔ میں نے غصے سے سمجھنے کے بعد مضبوط سے کام لیا۔ ان سب

گتوں کو مارنے کا نیک کام مجھے ہی کرنا پڑا۔ ”میں نے چہ صاف کو کہے۔“

”وہ ہمارے دوست تھے۔“ پیچھے سے ایک مونچھوں والے نے غرے کر کے کہا۔

”تم نے ہمارے کاروبار میں بھی ہانگ اڑائی ہے؟“ وہ دھڑلایا۔ ”آپ تم اس کی قیمت چکاؤ گے؟“ تبسیر نے کہا۔

”دیری گڈ، ہم سب اپنی اپنی کہہ چکے“۔ ”میں نے کہا: اب میں بھی کچھ کہوں؟“

اس کے ساتھ ہی میں نے پوری وقت سے اس کے پیٹ میں مگھاتا۔ وہ پیٹ پیٹ کے جھکا اور دھڑکا۔ میں نے ایک قسمی سے اس کی گڈی پر داری کر کے بڑھ آنے والے دوسرے گتے کے لات ماری جو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان لگی۔ اس نے چیخ کر مجھے ایک فٹش گالی کی۔ باقی پیچھے سے مجھے سے چٹ گئے تھے۔ ایک نے میرے سر پر مگھ مارا جس نے دوسری دیر کے لیے مجھے جکڑا دیا۔ پھر میں نے گھوم کر اس کے نخرے پر بائیں ہاتھ کی ایچی پھیل ماری۔ اس کا سانس رک گیا اور وہ ہاتھ پھیلا کے بیٹھے گرا۔

غالب کو میں نے منع کر دیا تھا کہ وہ گولی چلانے سے گریز کرے اور جب تک ناگزیر نہ ہو جائے ریا اور نہ نکالے۔ وہ گاڑی کے پیچھے تھا اور غاصلے محفوظ غاصلے سے ساری کار روائی دیکھ رہا تھا۔ لٹی کے اندر دھشت زدہ بھی چلا چلا کر سب سے لڑائی بند کرنے کی اپیل کر رہی تھی مگر وہ ناس ریت سے آگے تھے کہ شرافت سے بات کو کہہ چکے تھیں اور زہم انھیں سبق سکھانے بغیر واپس بھیجنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میرے تینوں حریف اب ایک ساتھ پھر حملہ آور ہوئے۔ ایک کو میں نے ڈانچ کیا اور وہ مجھے ٹکرائے کے شوق میں میرے ہاتھ کیا اور گاڑی سے ٹکرا گیا۔ دوسرے کو میں نے دھو بیٹھنے کے انداز میں پیچھے سے آگے لاکے زمین پر پڑے مارا، لیکن تیسرا مجھے پیچھے گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ہاتھوں سے میرے گلے کو پانا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ بڑے بڑے اور سخت تھے۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ ایک جھٹکے کر میں نے اسے گولنے کی کوشش کی مگر وہ بڑی مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ پھر میری گردن پر دباؤ بڑھانے کے لیے وہ آگے جھکا اور مجھے اس کی آنکھوں میں انگلیاں فیرنے کا موقع مل گیا۔ وہ درد سے جیتا ہوا دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کے زمین پر لٹنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ایک آنکھ ضرور چوٹ گئی تھی کیوں کہ میری ایک انگلی خون میں گھر رہی تھی۔ ابھی میں اٹھا ہی نہ تھا کہ دوسرے گتے نے بڑی آواز کے ساتھ کھٹنے والا لائی دار چاقو نکال لیا۔ اس نے مجھ پر وار کرنے کے لیے جھبٹ لگائی اور میں نے اپنی جگر چھوڑ کر اٹھنے

ہوئے اس کی کلائی پر ہاتھ مارا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھٹ گیا اور وہ اپنے ہی زور میں منہ کے بل گرا۔ میں نے غالب کو رولور کے ساتھ آگے آتا دیکھ لیا تھا مجھ چاقو سے حملہ ناکام رہا تو وہ پھر حرکت کیا۔

میں نے پیچھے ہٹے ہوئے شخص کو بے درپے ٹھکر ہاں لیا۔ لیکن صورت حال اس وقت اچانک ہی بدل گئی جب مجھ سے شخص نے غالب پر حملہ کیا۔ وہ کالے منہ کے بعد ذرا سی دیر کے لیے بے ہوش ہو گیا تھا یا بعض اس کی اداکاری کر رہا تھا۔ اس نے غالب کو سامنے دیکھا تو اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

جب اس نے پیچھ کر کہا "بس کرو، ورنہ میں اس صورت گولی مار دوں گا" تو میں اپنا ہاتھ دوکنے پر مجبور ہو گیا۔ ان چالوں کے پاس اسلحہ نہیں تھا اور غالب کا رولور انھیں نہ ملتا تو وہ زیادہ دیر تک مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ صرف جسمانی طاقت کے بل پر ہمیں زیر کرنے آئے تھے اور ہمارے ہاتھ میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے ورنہ خالی ہاتھ نہ کرتے۔

صاف ظاہر تھا کہ رجب اسٹی برائے فردخت لڑائیوں سے بھری ہوئی لالچ سا ماں تجارت سمیت واپس پہنچی ہوگی۔ تو ان سب کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان کے نقصان کے ذمے دار کون تھے۔ انھوں نے فروش کی اور اس کے دونوں ہاؤس کا گارڈ کی لاشیں بھی دیوں کی اور شدید اسٹی لٹوئیں میں سے کسی نے ان کو تفصیل سے سبب بتا دیا ہوگا کہ ہم لالچ سے کسی جگہ اترے تھے۔ انھیں تلاش کے لیے روانہ ہونے میں یقیناً کچھ وقت لگا ہوگا۔ اگر ہم ساحل پر اترنے کے بعد آرام کے لیے نہ رکتے تو ان کے وہاں پہنچنے تک بمبئی پہنچ جاتے اور پھر ان کے ہاتھ نہ آتے۔ ہم نہیں سمجھتے تھے کہ سوتے رہے اور پھر لٹی کی گاڑی ٹھیک کرتے رہے۔ اس دوران میں انھوں نے پورا ساحل چھان مارا ہوگا۔ ہم درختوں کے ایک ٹھنڈی پناہ میں تھے اس لیے انھیں فوراً دکھائی نہ دیا، ورنہ ہوتا یہ کہ ہم آنکھ کھولتے اور خود کو ان کی تحویل میں پاتے۔

لیکن ٹی کے ساتھ روانہ ہو جانے کے بعد ہم ان کی نظر میں نہ آئے وہ ایسی طرح پرگرداں تھے کہ اچانک انھوں نے نہیں دیکھا۔ اس وقت ہم ریسٹورنٹ میں داخل ہو رہے تھے چنانچہ انھوں نے چھپ کر انتظار کیا۔

رستورنٹ کی طرف سے آئے والی دو گاڑیاں دھڑ دھڑ کر رک گئی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی ہمیں مدعا شوں کی اسسٹنٹ میں نہ فریٹ بنا جاتا تھا نہ گواہ۔

"اس کچھ روڑو" میں نے کہا۔ یہ عورت ہمارے ساتھ نہیں تھی۔

"اچھا تم اس کے ساتھ تھے مگر یہ تمہارے ساتھ نہیں

تھی؟ ٹی کی کہنٹی پر رولور رکھ کر اٹھنے والا لولا۔

"اس نے نفٹ دی تھی ہمیں" میں نے کہا۔

"اور جانے میں چلائی تھی سینڈ ویج بھی کھلائے" ایسی نفٹ کہی ہمیں نہیں ملی۔ وہ بولا۔ چلو اب اگر ہم گاڑی میں بیٹھو۔

ان کے باقی تین ساتھی بھی اب شہر ہو گئے تھے اور یہاں بیلے رولور نکالنے کی مہلت بھی نہ رہی تھی۔ میں خاموشی سے ان کے ساتھ جا بیٹھا۔ رولور والا میرے پیچھے بیٹھ گیا۔

"ایم ایس سوری؟ میں نے بڑی مشکل سے ٹی سے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں؟ اس نے مجھے پتہ نہیں چلا۔

بد معاش تھا اور کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ افسوس تو مجھے ہے کہ وہ جسے تم مجبور ہو گئے۔ ہمارا آدمی ہر تم امیر چند؟

"چلو اب گاڑی چلاؤ دیکھ صاحب" اس نے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے رولور لے کر کہا۔ ورنہ اس کی ساری بھاری نکل دوں گا میں ایک سو راج کر کے۔

ٹی چلائی "لیسٹ" واسطے ایسا تم کو زیادہ میں نے دیکھا کہ غالب کو باقی دو نے اپنی کار میں بٹھا یا ہے۔ دراز رنگ بھی غالب کے سپرد کر دی گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ ایک اگر ڈرائیو کے فرائض انجام دیتا تو غالب کے مقابلے پر ایک رہ جاتا۔ انھوں نے یہ رسک نہیں لیا تھا کیونکہ ان کے خیال کے برعکس میرا خیال یہ تھا کہ اس طرح انھوں نے زیادہ بڑا رسک لیا تھا۔ سیاہ میلان آگے روانہ ہوئی اور ٹی نے اپنی کار اس کے پیچھے رکھی۔ تقریباً پانچ چھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب بمبئی شہر کے مضافاتی کی گاڑی ٹی ہو چکی تھی میاہ کار بائیں جانب مڑی۔ ٹی نے بھی اپنی کار کا رخ موڑ لیا۔

اس پچھلے راستے پر کچھ دور چلنے کے بعد دی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔

کسی وجہ کے بغیر غالب نے ایک دایرہ میں سے اسے تیزی سے واپس آتے دیکھا۔ غالب نے حاضر و ابھی بہترین مظاہرہ کیا تھا جس سے دونوں ساتھ بیٹھے ہوئے چھانپنے کی طرح مستعد ہونے کے باوجود چھوٹا کھا گئے۔ وہ اوسط سے بھی نہانت کے مالک تھے اور اسے اندازہ کیے کہ کتنے تھے کہ تعاون۔ تاہم اس کی تعویذ نظر آئے والا غالب خاموشی سے ایسی شکل کی بھی کر رہے گا۔ وہ جھپٹے سے کے کوڑھک گئے۔ میں نے ایک کا سر ڈش پورٹ سے مڑایا ہوگا تو دوسرے کا ہیٹ کی ایک سے اس سے پہلے کہ وہ سنبھلے غالب نے رولور میں گرا کر کچھ کیڑے دیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ سب پہلے اس کے ذہن میں تھا چنانچہ

لوہی کے اچانک زکے اور جھٹکے کر تیزی سے واپس آنے کا عمل پانچ گز سے بھی کم وقت میں پورا ہو گیا۔

دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ تیس گری ہو گیا۔ جب ان کے واپس آنے کی کوئی کا یا فائل غیر لازمی طور پر پھیلے رہ گیا مگر اتنی دیر میں گاڑی میں گرا گئے جا چکی تھی اور مخالف سمت سے آنے والی گاڑی بھی دس گز کا فاصلہ ضرور طے کر چکی تھی۔ تصادم کو بچانا شاید میرے لیے بھی ناممکن ہوتا مگر میں نے دیکھا کہ ٹی نے آخری وقت میں پاؤں بریک سے ہٹا کر کچھ کیڑے پڑھ کر دیا تھا۔ شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ غالب کی نینت کیا ہے اور حیرت انگیز وقت فیصلہ کے ساتھ یہ معمولی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے بھی گاڑی کو ٹکرایا۔ میں آگے تھا اور سب دیکھ رہا تھا چنانچہ چند سیکنڈ کی طے والی مہلت میرے لیے کافی ثابت ہوئی۔ دونوں گاڑیوں کے ٹکرائے ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں جھپٹ کے آگے گیا اور ڈر عمل کے انداز میں دونوں پہرہ کی قوت سے واپس آیا۔ یوں جیسے میرے سپر نہیں اسپرنگ ہیں۔ اپنے بھونکے مددے میں نے جسم کو واپس کھینچ دیا تھا۔

میں سیٹ کے اوپر سے گزرنے کے پیچھے والے دونوں پر معاشیوں پر گرا۔ وہ گاڑیاں کتنے ہونے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں نے انھیں اندر ہی رگید دیا۔ ایک کے سر پر میں نے لیٹ اسٹی ماری کر اس کی پٹنی دروازے کے ہینڈل پر لگی۔ رولور اس کے پاس تھا جو کہیں نہ بچے رہا تھا۔ دوسرا سر اٹھا رہا تھا کہ میں نے پلٹ کے اس کی گردن پر ہاتھ مارا جو اشتعال کی بے انتہائی کے باعث زیادہ قوت سے ٹوٹ گیا اور جب میں نے اس کی گردن کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز سنی تو مجھے خود زحمت افسوس ہوا۔ مار پیٹ اور دو دھماکوں کے گرد ہوں میں ہواور کچھ ٹوٹ چھوٹ ہو چکا ہے تو پولیس کے نزدیک یہ کوئی خاص بات نہیں ہوتی کہ کوئی مارا جائے تو قانون کو حرکت میں آنا ہی پڑتا ہے۔

رولور والا گینڈے جیسا شخص اب بے سرحہ آتا رہا ہوا تھا۔ شہر کی طرف سے روانہ کھول کے ماہر نکلنا تو وہ بھی ماہر گرا تو پھر کدو کی اندر چھلی تو مجھے فرش پر گرا ہوا رولور نظر آیا۔ میں نے جھپٹ کے اپنے قبضے میں لیا اور پھر لٹی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خون سے بھرا ہوا تھا کہ وہ ہوش میں تھی اور مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے سرخراہی تھی۔

ویلڈن بولنے "تم میری فکر مت کرو"

"میں ٹی۔ آر۔ شیور... کہ تم جھپٹ ہو؟" میں نے غالب کی طرف دیکھ کر کہا۔ غالب اپنے دونوں اعوا لنگن گان سے فری اسٹائل لڑا۔ ہاتھ اور اس میں کوئی شے نہیں کر پڑا ہاتھ محسوس نہیں کیا تو کوئی ناہن اور کچھ مارا تھا۔ وہ دو فٹیش لوگ تھے چنانچہ ان کے چہرے انھوں کا کوئی وار خالی نہیں جاتا تھا مگر مرزا غالب جو بلحاظ پیشہ معافی لکھا شاعر اور مزاح کے اعتبار سے عاشق تھے، وہ ہاتھ چلاتے

تھے تو ایک کسی کے لگ بھی جاتا تھا اور قطعی بے عزتایت ہوتا تھا۔ تاہم کمال اس کی پھرتی کا تھا جس کی وجہ سے ابھی تک وہ دونوں اسے قابو نہیں کر پاتے تھے۔

میرے میدان جنگ میں کودتے ہی طاقت کا توازن غالب کے حق میں ہو گیا۔ اس کے ایک حریف کو میں نے پہلے درپے کئے تاکہ اس کے چوٹ پر کدو رہا۔ وہ چھلکے کرنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے سنبھال لیا۔ وہ کسی نشے میں دھت شرابی کی طرح ڈھلتا رہا۔

"کتنے... ہوسو... چوںک کھاؤ گے؟" میں نے اسی کے گالوں پر جھٹ مار کے کہا۔ یہ وہی سورما تھا جو چوںک کھا کے بیل کی طرح چٹکا کر رہا تھا۔ اس کے جڑے نہ صرف یہ کہ رسات تھے بلکہ عاصی دھیلے پڑے ٹک گئے تھے۔

اس نے بے پرواہی سے کہا "میں اس کا انصاف ماننے کی نفع لیتی سہی کوشش کے بعد ہاتھ کھلا جو اس طرح گھوما جیسے کا کے انجی کا پنکھا پٹری کا کچھنا بیٹھ جانے کے بعد گھوما ہے۔ میں نے آخری ضرب مجاہد سے اس کی ناک کو افسوس ناک بنا دیا اور پھر اسے رولوں زمین پر ڈال دیا جیسے بغیر عید پر قصاب چھری پھیرتے ہی بکے کو دیں ڈال کے دوسرے بکے کی جانب پلٹے ہیں۔

دوسرا باجڑی پچھتر فیصد افواج کی تصور پر حرکت دیکھ کے جھلکے لگا تھا کہ مرزا غالب اس کے پاؤں پر گئے۔

جہاں سے ہوس طرف کو کہہ کر خیال ہے؟" غالب نفاس کو مڑنے کے بل گراتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کو قبضے کا لار پکڑے اور برا ٹھایا۔ اور اکیلے کیوں چلتے ہو۔ ہم بھی چلیں گے تمہارے ساتھ"

"ہمیں یہ لینے آئے تھے تاہم؟ غالب نے کہا۔ اب اپنے مرنے چھوڑ کے بھاگنا چاہتے ہو۔ پہلے تم ان کو دفاندو۔ پھر ہم تمہیں دفاندیں گے۔ بلا معاوضہ"

وہ ہاتھ پر جوڑنے لگا۔ مجھے... جانے دو... میں ان کا ساتھی نہیں ہوں... یہ تو مجھے... ساتھ لے آئے تھے۔

میں نے اسے زمین پر رکھ دیا۔ وہ چھوٹے ڈکا آئی تھا چنانچہ اس کے پیر زمین سے اوپر اٹھتے ہوئے تھے اور وہ ٹھکر خیز انداز میں لائیں چلا رہا تھا۔

"تم ان کے ساتھ آئے تھے مگر ساتھی نہیں ہو ان کے۔ کیسی عجیب بات ہے؟" میں نے کہا۔

"انھوں نے... دوسروں سے دیے تھے..."

"اچھا اچھا... گویا کر کے پر چلنے والی چیز ہو مگر چلو یہ اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی بتا دیا۔ اب ہم تمہیں دوسروں سے دیں گے۔ تم ہمارے ساتھ دو ہیں چلو جہاں یہ جا رہے تھے۔" میں نے کہا۔ اب تم ہماری طرف سے لڑو گے۔

آئی ہی بہادی کے ساتھ غالب نے طنز سے کہا۔
 مجھے... نہیں معلوم... ان کو کہاں جانا تھا... وہ بولا۔
 شاید تم کو یادیں آ رہا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ذہنی حصے کا
 عارضی اثر ہے۔ میں نے کہا۔ جب جیٹی کا دودھ یاد آئے گا اور نانی
 یاد آئے گی تو یہ بھی یاد آ جائے گا کہ صرف دو سو روپے میں تمھاری
 زندگی کو اپنی بازی کے لیے واؤ پر لگانے والا کون تھا؟
 میں نے اسے تقریباً اٹھائے بلیک سیڈل کے کھلے
 دروازے سے اندر چمک دیا۔

غالب نے میرے قریب آ کے ہاتھ جھاڑے۔ بڑے
 پرعاش بنے تھے۔ غالب کو کیا سمجھنے والوں کے دونوں اتر آئے
 تھے مقابلے پر۔ اچھا ہوا تم بیچ میں گئے تھے۔
 ”ورد تم ان کے بیچ میں آ جاتے۔“ میں نے کہا۔ ”اور سینڈ وچ
 ہوجا تے اطلاقاً یہ لوتوپ...“ میں نے اسے رولوا اور ہٹا کے کہا۔
 ”اس کرٹے کے گویے کو سنبھال کے رکھو۔ کرٹے کی پیڑ ہے خراب
 یا ضائع نہ ہو۔“
 لٹی کی ہنسی پر میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کار سے باہر نکل
 آئی تھی اور ٹوپ پر سے چہرہ صاف کر رہی تھی۔
 ”تم دونوں بہت... پراسرار ہو...“ وہ بولی۔ ”کیا فائنٹ
 دی ہے تم نے؟ یہ شائستہ کسی فلم میں آ جاتا تو لوگ تالیں ہلے بیٹ
 کے پاگل ہوجاتے۔“ ریل فائنٹ کہاں ہوتی ہے فلموں میں؟
 ”میں لٹی! تمھارے چہرے پر گہرے زخم تو نہیں ہیں؟ میں
 نے کہا۔

”نہیں۔ خراشیں ہیں معمولی“ وہ بولی۔
 ”مجھے اب واقعی افسوس ہو رہا ہے... تمھاری گاڑی کی
 حالت دیکھ کر بھی...“
 ”یہ وقت ایسی باتوں میں ضائع کر دو گے تو تمھیں زیادہ افسوس
 ہوگا۔“ وہ بولی۔ ”بس ایک نکل چلو یہاں سے۔“
 ”تم پھوس گاڑی میں؟ میں نے کہا۔ ”میں باقی سب کو سیٹ
 لوں۔ ان کو یہاں چھوڑ کے تو نہیں چل سکتے۔“
 ”اور میں اپنی گاڑی چھوڑ جاؤں؟“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”گاڑی ہم بعد میں لے جائیں گے۔ میں نے اسے سمجھانے کی
 کوشش کی۔

”بعد میں کب؟“
 ”ہم پہلے ان چالوں کو کہیں پہنچا دیں؟ میں نے کہا۔ ”غالب ایک
 تو جملے کا سرکاری مردہ خانے۔ باقی تو ہیں...“
 ”کیا ایک کو قتل کر دیا ہے تم نے؟“ وہ خوفزدہ ہو کر بولی۔
 ”قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا میرا۔ مگر وہ قتل ہونے کے
 لیے آیا تھا مجھے اس کی خواہش پوری کرنی پڑی۔ میں نے کہا۔ ”تم فکر
 مت کرو تم نے کچھ دیکھا نہ سنا۔“

”کیس باتیں کرتے ہو؟ وہ بولی۔ ”میری گاڑی کی یہ حالت
 نہیں تھی پہلے۔ کیا پولیس نہیں پوچھے گی مجھ سے؟“
 ”میں لٹی! تم بہت زبردست ہو۔ حالانکہ مگر مدت سے وقت کمزور
 خاصی جرأت دکھائی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”یہ سب خرابی ہماری وجہ سے
 ہوئی۔ زخم و زل درمقولات کرتے زخم کو ان معاملات میں لوٹ
 ہونا پڑتا۔“ مگر کوئی بات نہیں۔ ہم سب ٹھیک بھی کر دیں گے۔ ہر
 تم آگے بیٹھو۔ میں ان سب کو لٹی میں ڈالتا ہوں۔
 ”میں لٹی گاڑی یہاں نہیں چھوڑوں گی؟“

”اوکے۔ اوکے۔ اسے بھی لے جیتے ہیں؟ میں نے کہا۔
 ”وہ اس قابل نہیں ہے کہ تم اسے چلا کے جا سکو۔ تم اسے لو کہ
 لے جاتے ہیں؟“
 ”لیکن...“

”پلیز...“ میں نے سخت لہجے میں کہا اور اس کا بازو سے
 کے بلیک سیڈل کی اگلی سیٹ پر بٹھادیا۔ ”یہاں بحث مت کرو
 سے میں راستے میں سب تمھارے دونوں گا۔“
 وہ میری درشتی سے سہم گئی اور اس کے اندر جمع ہوجانے والے
 خوف کے طوفان کی جہولہ سے ہمارے جانے والی تھی وہ لوٹ کر
 میں نے اٹھ کے لاش کو بلیک سیڈل کی ڈکی میں ڈالا جو اب بڑی
 تھی کہ آٹھ دس مہرے اس میں آسانی سے سما جاتے۔ باقی دو
 بے ہوش تھے اور اس بات کا ڈر تھا کہ وہ کسی بھی وقت ہوش میں آگے
 تولتے میں ایک اور ہنگامہ رکھ کر دوں گے۔ احتیاطاً میں نے ان کو
 ڈکی میں ڈالنے کے بعد تاک کے ان ٹکڑوں سے بانٹھ دیا جو ڈکی کے اندر
 تھے اور ٹیل لائٹس تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ تانہ یادہ بغیر وہ نہیں
 لیکن وہاں اور کچھ دستیاب بھی نہ تھا۔ ڈکی میں ایک ہی مضبوط تار
 تھی جس کی مجھے لٹی کی گاڑی کو ٹوک کرنے کے لیے ضرورت تھی۔

لٹی کی گاڑی کا سامنے والا حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ اس کا فائنٹ
 اندر چلا گیا تھا۔ میٹر لائٹس کا پتھر تو سب سے پہلے ہوا ہوگا۔ پھر
 درمیان سے اندر چلا تھا۔ شاید اس سے گاڑی کا ٹیڈی ایلر ہوتا تھا
 کہ سب پانی نیچے بہ رہا تھا۔ ہونٹ کو کھلے بغیر میں اندازہ کر سکتا تھا
 ریڈی ایلر میں بھی ٹوٹا ہوا تھا اور اس حالت میں انجن اشارت بھی جاتا
 تو کار کو چلایا نہیں جاسکتا تھا۔

بلیک سیڈل میں اور اونچی گاڑی تھی چنانچہ اس کا صرف وہ
 حصہ تباہ ہوا تھا جس میں ٹیل لائٹس تھیں اور ڈکی کا چمکا حصہ بلیک
 سیڈل سے جدا تھا۔ انجن کا محض نا بھٹا چنانچہ ہر عمل کی کار کو کچھ
 سے کھینچ کر بھی لے جاسکتے تھے۔ آہستہ آہستہ پورے پلان میں بے ڈکی
 میں واضح ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے فکر تھی کہ صرف لٹی کی ان باتوں
 نے اس کی کار کو دیکھ لیا تھا۔ ہم تو غالب ہو جائیں گے لٹی کی کرک
 گی۔ ان سے پتہ کر کہاں جائے گی۔ وہ کوئی کٹا مورت نہیں تھی۔
 کار کے نمبر سے اس کا پتا چکا نہ معلوم کرنا کوئی مشکل کام تھا۔

میں لٹی جانے کی کیم کون تھے اور کہاں گئے؟
 لیکن ان سب سوالات کا جواب فوراً لاش کرنا بھی ممکن نہ تھا۔
 نے انکیشن کی جاپاں نکال کے لٹی کی کار کی ڈکی کھولی تو اس میں
 بچے دوسری رتی مل گئی۔ ہر جھلکا کار ڈیٹا پورٹی کا کار مالک
 انڈیش ہو تو بڑے وقت سے نیچے کے اسباب پہلے سے بیٹھا
 لہتے رہ گاڑی کسی ویرانے میں ٹھہر جائے اور چلنے پر کسی صورت
 ”وہ نہ ہو تو ایک نئی بہت کام آتی ہے۔ کوئی زکوئی زحملا کار والا
 تہ اپنی گاڑی کے پیچھے ہانڈھ کے گھر یا میکینک کے دروازے
 چھوڑ جاتا ہے۔“

اس دوسری رتی سے میرا پہلا مسئلہ حل کر دیا۔ میں نے ان دونوں
 بچوں کو اپنے انہی کی رتی سے ایک ساتھ لٹوں ہانڈھ کا وہ سیرنگ
 لگے۔ دونوں کی پشت مل گئی اور جیسے مختلف سمتوں میں بہے۔
 کے اکتھوں کو سیرول کے تھوڑی کر کے میں نے پوری رتی نیچے
 ہاؤس تک پھیلت دی۔ وہ ایک بکڑی کے لٹھکی طرح ہونگے
 لڑو لڑکھ نہیں سکتے تھے۔ اگر وہ لٹھکے تو باری باری ایک دوسرے
 ہاؤس سے گزرتے۔ جو پہلے پھٹنے لگاڑی کو صاف کرنے کے
 پہلے ہونے تھے وہ ان کی آواز میں بند کرنے کے کام آئے۔
 یہ سب کام میں نے بڑی پھرتی سے پانچ منٹ میں ختم کر
 آؤ جرت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس کے لیے میں نے لٹی کی
 خری گاڑی کو جہاز جیسی بلیک سیڈل کے ساتھ ایسے ہانڈھا جسے
 سڈل کی شادی میں پھیرنے کی رقم کے وقت ڈھکا کے ساتھ دوہن
 دھانڈھا جاتا ہے۔

”اب ہم واپسی کے سفر کے لیے تیار ہیں۔ میں نے مرزا غالب
 کو لگا۔ ”لاڈی تو پ مجھے دے دو۔“
 ”میں اسے ٹھوٹ کر دوں گا۔ غالب نے کسی فدی پہنچنے کی
 لڑ ٹھٹک کر کہا۔“

”کر لینا جانا۔ میں نے اسے ایک شائق باپ کی طرح ڈانٹ کر
 کما بھڑکیا۔ ”چلو شایاش! اس گاڑی میں؟“
 غالب کو پیچھے والی کار میں بیٹھ کے صرف اسٹرنگ سنبھالنا
 غلام ضرورت کے وقت پر ایک لگا کے دونوں کاروں کا درمیان
 نامور بار کھنٹا تھا اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑتا تھا کہ تو کراہ دوں
 ایزس بار بھی لگے مل جائیں تو نقصان جہاں سیر تھا وہاں سوا سیر
 ہوتا۔ لیکن لٹی اپنی گاڑی کے بارے میں بہت فکر مند نظر آتی
 تھی۔ میرے جیت تھی کہ اسے اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا خیال
 نہ کیا۔ ایک مرد کے متعجب ذہن سے سوچتے ہوئے میں نے
 ”کے اگرت ذات اتنی دور کا کیسے سوچ سکتی ہے۔ اسے تو بس
 اپنے نقصان دکھانی دے رہا ہے۔“
 ”میں لٹی! کیا تم یہ شب چلا سکتی ہو؟ میں نے کہا۔“

”میرا خیال ہے کہ چلا سکتی ہوں۔ اس میں وہ سب چیزیں
 ہیں نا؟ کلچر بریک۔ ایکسپلرٹ وغیرہ۔ وہ مسکرائی اور ڈیڑا ہوئی
 نشست پر کھسک گئی۔ ”میں نے انکیشن میں بگی جاتی لاش کی اور
 اسے آن کر کے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔
 میں نے اقرار میں سر ہلایا اور پورا ڈاڑھ بند کر کے اپنا رخ پیچھے
 کی طرف کر لیا۔ ”میں لٹی! گاڑی کو کدھا گاڑی سمجھ کے چلاتا۔ وہ نہ اس
 کا انجن بے قابو ہو گیا تو تمھارے لیے دونوں گاڑیوں کو سنبھالنا مشکل
 ہوجائے گا۔ بالکل بائیں جانب رہنا...“

”ول! پلیز سٹاپ! وہ جھٹکا کے بولی۔ ”میرے ڈرائیونگ
 انٹرکٹریشن کی کوشش مت کرو۔ میں کئی بار لٹی کی گاڑیوں کو کھینچ
 کر لے جا چکی ہوں جن کے مقابلے میں میری گاڑی بالکل نئی سمجھی
 جاسکتی ہے۔ اور یہ بھی پہلا موقع نہیں ہے کہ میری گاڑی لٹی کی جا
 رہی ہے۔ آخری بات تمھاری اطلاع کے لیے ہے کہ میں لاچ
 بھی چلائی ہوں اور چھوٹا جہاز اڑانے کا لائسنس بھی رکھتی ہو۔ جو
 فنانسنگ نہ کرنے کی وجہ سے ری تو نہ ہو سکا ورنہ...“

”میں امپرسس ہو گیا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن دیکھو! ایسے بچکی
 لے گا انجن تو جھٹکے سے وہ نازک رشتہ ٹوٹ جائے گا جو اس پرانی
 اور تمھاری بالکل نئی گاڑی کے درمیان قائم ہے۔ پھر میرا دوست
 اور تمھاری گاڑی... دونوں پیچھے رہ جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے
 پچھڑا رہیں گے۔“
 ”وہ ہنسی۔ ”فقی۔ تمھارا بھائی اب تمھارا دوست ہو گیا؟“
 ”سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ میں نے متانت سے
 فلسفیانہ لہجے میں کہا۔
 ”وہ بھی تمھارے بھائی ہیں جو ڈکی میں لیٹے ہوئے ہیں؟“ وہ
 ہنسی۔ ”کیا رشتہ اخت ہے۔“
 ”کام اتنی دیر میں ایک لمبا چکر کاٹ کے نیم دائرہ بناتی ہوئی
 واپس بڑی سڑک پر آ گئی تھی۔ وہ سب کا ردائی اور ویران کی سڑک
 پر پہنچی تھی کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ ایک تو بڑی سڑک بھی بہت
 بڑی نہیں تھی اداس پر ٹریفک برائے نام رہتی تھی۔ پھر یہ کہ ہمارے
 اور سڑک کے درمیان درخت اور چھوٹے پلوں کی دیواری حائل رہی تھی۔
 ”یہ بھی میرا بھائی ہے؟ میں نے پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے
 شخص کے سر کو رولوا کر لی نالی سے دبا کے کہا۔ ”ایک سگا بھائی ہوتا
 ہے۔ ایک سوتیلا۔ کوئی رشتے کا اور کوئی نام۔ یہ بڑا نصیب تھا بھائی ہے
 ہے نا؟“

اس نے مجھ کو اقرار میں سر ہلایا۔
 ”اس کی یادداشت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے
 اندھا کوئی بڑے ٹوٹ گیا ہے یا دھبلا ہو گیا ہے؟ میں نے کہا۔ ”کھڑکی
 کو کھول کر دیکھنا پڑے گا۔ پچھارے کو نام لکھا یاد نہیں رہا پتا۔
 کیا ہے یہی تیرا نام؟“

۶. جو بھی ہو دیکھ لینا وہ بوللا اور موٹر سائیکل کو رک مارنے

”معلوم نہیں کون اس کو لڑنے پر بلانا رہا۔ دودو روپے دے کر
مرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ کون ہے وہ بدعاش؟“ میں نے کہا۔
”دیکھو... میں تم کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ تم چاہو تو مار ڈالو مجھے
لیکن جس بات کا مجھے علم ہی نہیں وہ میں کیسے بتاؤں۔ مجھے اس میں
سے ایک نے بلایا تھا کہ دوا ہی دیر کے لیے آ جاؤ۔ ایک چھوٹا سا کام
ہے۔ میں آ گیا۔ اس نے مجھے دودو روپے دیے اور کہا کہ چلو ذرا سندر
تک ڈراؤ پھر آتے ہیں۔ یہاں آ جانے کے بعد اس نے بتایا کہ ایک
آدمی کو ساتھ لے جاتا ہے۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ کہاں آدمی کوں۔“
”یہ تو بتایا ہوگا کہ وہ آدمی کون ہے؟“
”بس یہ کہا تھا کہ ایک... ہے۔“ اس نے میرے بارے میں
خاصی فحش گالی استعمال کی۔ خواہ مخواہ مانگ اڑا کے ہمارا کام خراب
کیا۔ سیٹھ نے کہا ہے کہ اسے سامنے لاؤ ورا؟“
”اور یہ سیٹھ کون ہے؟“
”سیٹھ...؟ سیٹھ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ جو پورے دسے وہ سیٹھ“
وہ بولا۔ ”ہم نہیں پوچھتے فالو ماتین۔ اور کوئی نام بتاتا بھی نہیں۔“
”یہ سیٹھ کا آدمی کون تھا جس نے تمھیں بلایا تھا؟“ میں نے محسوس
کیا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔
”وہی... جس کو مار دیا تم نے۔ دادا تو نہیں تھا مگر اپنے کو
شیامودا بولتا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”باقی دو کو بھی اسی نے بلوایا تھا۔
ایسے چھوٹے موٹے کام بھول تو کام کرنے والے بہت ہوتے ہیں۔
اسی لیے دام بھی کم ملتے ہیں۔“
”دو افراد کا انچھوٹا کام ہے؟“
”ہاں۔ شیامو نے بولا تھا کہ بس ان کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنا
ہے۔ سیٹھ کے پاس میں خود لے جاؤں گا۔ یہ گاڑی بھی ایسی ہی ہے۔“
وہ بولا۔
”بڑا کام کیا ہو رہا ہے؟“
”بڑے کام بہت ہیں۔ اپن نے کبھی کیے نہیں۔ جو لوگ کرتے
ہیں بڑا مال کھاتے ہیں۔ شراب کی اسمگلنگ۔ جوئے کا ڈال۔ عورت کا
دھندلایا۔ یہ شیا پور کرتا تھا۔ قتل اور ڈاکا سب بڑے کام ہیں۔“
”تم باقی دو کو نہیں جانتے؟“
”نام نہیں معلوم۔ دیکھا پہلے بھی تھا۔ ایک ہی دنیا ہے اپنی
اس لیے ملتے بہتے ہیں۔ وہ بولا۔ ”ان کو بھی دودو روپے ملے
ہوں گے۔“
”اور شیامودا کو؟“
”پتا نہیں۔ اپنا خیال ہے کہ اس نے سیٹھ سے دو ہزار روپہ
لیے ہوں گے۔ تم اس سے معلوم کر سکتے تھے کہ وہ سیٹھ کون ہے
جس نے تمھیں بلوایا تھا۔“
”اس نے ایک آدمی کا کہا تھا؟“

تھی کہ کیا۔
میں نے اس کی تائید کی، "سائزن کوئی ٹاؤڈ اسپیکر نہیں ہوتا
کر نام لے کر بکارتے۔ ویسے بات کیا ہے؟"
تم اپنا منہ اس وقت تک بند رکھو جب تک کہ میں تم
سے کوئی سوال نہ کروں وہ میری انگریزی سن کے کچھ دہ گیا۔
"قانون آپ نے بہت غلط طریقے پر چونک کر اس کیا تھا۔ ایک
حادثہ ہوتا ہوتا رہ گیا۔"
"سری افسر! لئی ٹیک وکٹس مسکراہٹ میں آگیا کہ تم
شامل کر کے کہا، "میں اپنی طرف سے تو متناہی تھی۔"
"میں ڈراؤنگ لانسس دیکھ سکتا ہوں آپ کا؟" وہ رکھائی
سے نڈر م لٹے میں ہولا۔
"ضرور۔ وہ میری گاڑی میں ہے۔" لئی نے انگوٹھے سے نیچے
کی طرف اشارہ کیا اور نیچے اتری۔
"کیا بولتے آپ کی گاڑی کا؟" وہ بولا۔
"ہاں... بولنے والی بات تھی۔ اور پھر افسوس سے کہنا پڑا
ہے نیچے کہ وہ جی میری ہی غلطی تھی... لئی نے کہا کہ شرمندگی
سے کہا۔
"گو آپ غلطی اکثر کرتی ہیں۔ ایسی ہی خطرناک قسم کی...
وہ مسکائے بولا۔
"وہ... نہیں... دراصل اس کی وجہ سے میں کچھ نزوس
تھی۔ لئی نے اسے نیچے لے جا کر اپنی اسٹوری سنائی۔ کافذات
اس کی گاڑی کے گورڈیئر فٹسٹ میں تھے جو لئی نے بڑے اعتماداً وہ
اعلاؤ درباری کے ساتھ پیش کیے۔
وہ بی بی طرف آنا، تم کیسے کیونیک ہوئے تھے جو ان آدمی
ہو کے بیٹھ جو۔ ڈاؤنگ ٹوگ یہ نازک سی بڑی کردہی ہے۔"
"لی کو بڑی کہنے کا مطلب یہ تھا کہ قبول کی جاتی ہے میرے
کا بگاڑ چکا ہے۔"
"میرے دامن ہاتھ اور دامن یعنی میں جوٹ آگئی تھی۔ اسی
نازک سی بڑی کے ٹوگڑی چڑھا دی تھی تھپہ پڑا میں نے مطلع لے
لے کہا۔
"و کاش کہاں ہے تھہرا؟"
میں اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا لیکن میں نے کہہ دیا
"ماور میں۔"
"اچھا۔" بولیا کا ڈو، اس نے مجھے ایک کا ڈو تھا کہ کہا
میں وقت میں ہی گاڑی کو چپ کر لینا۔ "حوال دینے کی ہے۔"
"رنگ۔ بیٹھ گئے، ہلے گئے" میں نے میکینک حضرات کے
مخصوص انما میں فیصد زیادہ کر دیا۔

لگا کر اس سے خدا کا سکرا دیا۔ رسیدہ ہو ملا۔ میں اپنے اس جنگی قی کی کبھی شکر گزار تھا جس کی غاوثی نے مجھے زیادہ بڑی خطرہ نہ پہنچنے دیا۔ وہ دیکھ کر مجھے اس کو بھی قاتل قرار کرنا پڑا اور پھر پولیس سار جنٹ سے ملنے کے بعد نہ زیادہ صرف کرتا رہتا۔ لیکن وہ خود ایک خرم تھا۔ مجرموں کا قاتل وہ مہاجر تھا اور انہی کی دنیا کا پاس تھا۔ وہ بولتا تو اپنا راز کھولتا مگر ہم سچ جانتے کہ ان کے خیال میں ہم مجرم نہیں تھے۔ ہم نے مجرموں کے ایک گروہ کو مار دیا۔ ہمارے نقصان پہنچایا تھا چنانچہ وہ ہمارے دشمن ہو گئے تھے۔ یہ بالواسطہ طور پر پولیس کی مدد تھی اور اس سے ہم قاتلوں کے مفاد ثابت ہوتے تھے۔ مزید یہ کہ وہ خود غوا کر کے لوں پر شامل تھا۔ انہوں نے جانے والے ہم تھے چنانچہ قاتلوں کی ہمارا طرز ثابت ہوتا۔

یہی سب کچھ سوچ کے اس نے بھی پولیس کے دلچ ہوجانے پر خدا کا شکرا دیا۔ ہو گا کہ آسمان سے گرے گے مجبور میں آنکھ کی ٹوہنت نہیں آتی۔

سار جنٹ کے کارڈ کو میں نے دیکھے بغیر جیب میں ڈال لیا تھا۔ جب وہ واپس چلا گیا اور ہم آگے نکلے تو میں نے کارڈ کو نکال کے دیکھا۔ اس پر نام سب ہندی میں لکھا ہوا تھا اور میں لکھ پر نظر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مجھے اس ویل میں کیا شائبہ نہیں آتی۔

بس لی جھڑی کو یہاں روک لوں۔ میں نے کارڈ واپس رکھ کے کہا۔ جس جگہ کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا وہ ایک پانی کی دھوسے سا نیلہ رنگ کی جوتی سے زیر سوال نہ ہونے کے باعث یہی کی اس بات کی غلوں کا مستقل ٹھکانا بنی ہوئی تھی جن کا کوئی ٹھکانہ انہیں ہوتا۔ ایسے انکوں لوگ یہی میں ہر طرف پاتھ پڑ پاکستان میں دکانوں کے تھیلوں پر یا پولوں کے نیچے اپنا بیسرا رکھتے ہیں۔ یہ سنگ سامنا تو محارہ ہے۔ غلام جہاں بھی آدمی کے سامنے کی آنی جگہ تھی کہ وہ لمبا لیٹ سکے۔ وہاں ہر بات کوئی سونے کے لیے آجاتا تھا اور یہ آؤں ہر گز نہ کہنے۔ ابھی ضاکی میں آدمی انسان کی چیت کو اپنا حق سمجھتا تھا اور انہیں مار سکتے تھے اس کے لیے وہ جگہ کے خلیکے یا لوگوں کا ہاتھ دیکھتا دیکھتا دیتے تھے۔ جیت دیے بغیر نہ کوئی کسی کی جگہ سے کسا تھا اور نہ کسی کو اپنی جگہ مار کر کستا تھا۔ یہی کی زندگی کے یہاں سارہ وقت ہم پر بد میں آشکار ہوتے تھے۔

رہوے سا نیلہ رنگ پر پہنے ہوئے بستر میں کے ضد وقوں پر بڑے بیٹے اور قریب سے رہے ہوئے تھے۔ کتابوں۔ رسالوں خصوصاً کرشن چندر کے ناولوں میں ہمیں کا جو نقش میں نے دیکھا تھا وہ میرے ذہن میں تھا۔ اور جو تصویر میرے سامنے تھی وہ اس نقشے سے مختلف۔ نقش چنانچہ میں نے لی کے سامنے کسی حیران کا اظہار نہیں کیا۔

ہوئے کہا۔ "مگر زنا اور ہمارا اس کے ساتھ تعلق بھی تو کسی طرح کم خطرناک نہیں...!"

انی کے آگے سے ہماری بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے چہرہ دھوکے صاف کر لیا تھا اور ہالوں کو برقی کر لیا تھا لیکن کسی تہہ کا کیا کیا نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود ملی کا چہرہ اچھا اور نکھرا ہوا مل گیا تھا اس نے چائے کی ٹیبلٹیں میل کر رکھ دی۔

"کس سوچ میں تم ہو؟" وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

"سوچ رہا تھا کہ اس سگریٹ کو جلاؤں یا نہ جلاؤں؟ میں لے کر آیا۔"

"بیک وقت اتنے بے تکلف بھی ہوا تو پر تکلف بھی؟ اجازت مانگ لے پتلے مجھے؟" وہ بولی۔

"اجازت تو دے دو گی تم۔ مجھے ہی کچھ عجیب سا ملتا ہے۔ اس صاف ستھرے ماحول میں دھوئیں اور تباہی کو کیوں کر ناپایا سا ہو گا جیسے دار چادر پر میں ان جوتوں سمیت چمک جاؤں؟ میں نے کہا۔"

اس نے کہا: "اچھا تم چائے بناؤ۔ سگریٹ میں جاتی ہوں اور ایک سائڈ میبل پر سے نازک نہیں اور منہ سے رنگ کا سگریٹ کیس اٹھا لیا۔"

"یہ لیڈر سگریٹ ہیں اگر تم پینا چاہو تو... اس نے ویسے ہی لائٹر سے اپنی سگریٹ جلائی۔ غالب چائے خانے لگا۔"

میں نے لائٹر اٹھا کر تھوکی انداز میں دیکھا اور اپنی سگریٹ سدا کے کہا: "تم نے مجھے احساسِ جرم سے بچا لیا۔"

"اچھا کہاں ہے؟" وہ بولی: "دن میں کتنی بار احساسِ جرم میں مبتلا ہوتے ہو تم؟ زندگی میں تو ہر دم پر کچھ نہ ہو جاتا ہے... ایسا کون ہے جو کوئی غلطی نہ کرے، لگنا نہ کرے اور جرم نہ کرے۔ ایسے تو شاید زمین پر چلنا بھی گناہ ہو کہ چرواہوں کے پیچھے کوئی چوٹی بنگاہہ مچھلے گی۔" اس نے لائٹر ابھی سزا ہوئی۔

"بس لئی... یہ بہت مشکل کام ہے... یہ فیصلہ کرنا کہ کون کون عظیم ہے اور کون گناہ گار؟" میں نے کہا: "اور ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے صرف خدا ہی وہ مصنف ہو سکتا ہے انسان نہیں مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے وہ سب کیوں کیا جو بالکل ضروری نہیں تھا۔ جب تم نے سمجھ لیا تھا کہ ہمارے چہرے تعلق ہیں یہ دیکھ لیا تھا کہ ہمارے چہرے وہاں رہتے ہیں۔ تمہارا بہت نقصان بھی کر دیا ہے تم نے تو سمجھتے تھے ہمیں پولیس کے حوالے یوں نہیں کیا؟ تمہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ ہم دھوکے باز، جعل ساز، بیل سے جھگڑے ہوئے قیدی کچھ بھی ہو سکتے ہیں؟" پتلے مجھے یہ خیال آیا تھا۔ روبرو میں بدل گیا۔

"چھہہ... کیا ضرورت تھی ہمیں یہاں لائٹس کی آتی ہمدردی کے اور مہمان نوازی کے غماز سے کی؟"

"کیا میں نے کوئی غلطی کی؟ تم کہہ دو ہر جان کے اور تم پر بھروسہ کر کے؟" وہ ہزارمان کے بولی۔

"ہاں۔ بہت سخت غلطی کی۔ تم پر مصیبت بھی آ سکتی ہے دو دو ہماری وجہ سے؟" میں نے کہا: "یہ بتاؤ وہ گاڑی تمہارے نام پر ہو گئی ہے؟"

اس نے کچھ سوچ کے کہا: "نام... نہیں... اس کا بھی نہیں وہی نام مل رہا ہے۔ جواب کہیں نہیں، سوائے اس جگہ کے؟ وہ اپنے دل یا نگلی رکھ کے بولی: "اور ایک شگ مرمر کے کھنکھنے کے نزدیک قبر کے سر ہانے لے رہا ہے۔ یہ دل بھی ایک پتھر ہے۔ دو گنا بھی اور نام اچھا تک فیر دیا جائے؟"

آئی ایم سوری؟ میں نے کچھ دیر بعد کہا: "مجھے مجبوراً یہ ہال کرنا پڑا تھا۔ کیا وہ طور پر تھا تمہارا؟"

لئی نے اقرار میں سر ہلایا: "گاڑی اسی نے خریدی تھی میرے لیے۔ یو۔سی۔ آتھالیا تھا اسے سیرا اور ادب بھی ہے۔ وہ مجھے ہال سے ہنسی۔ آج بھی اسی کے نام کی وجہ سے محفوظ ہوں ہیں۔ وہ اگر کار کی رجسٹریشن دیکھ کے سیرا سرائے لگائے گی کوشش کریں گے تو ان کو ناپاوسی ہوگی۔ وہ چاہتا تھا اب تک کا غنا میں مل رہا ہے؟"

"تمہاری اس کار سے ایک ہڈی ڈال دیں؟" میں نے کہا: "اگر میں یہ کہوں کہ اسے بھول جاؤ؟ تو تمہارے لیے مشکل ہوگا؟"

"مشکل ہوگا... اس نے غالب سے چائے کا کپ لے کر کہا: "مگر نام نہیں؟" میں نے کہا۔

نام تک کچھ تو اتنا ہی فیروز کے بغیر زندہ کیسے۔ جی۔ آخراے بھی تو سمجھا ہی دیا میں نے۔ اب ایسے ہی اس کا ذکر آجاسے کہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ زندگی گزرتی ہے۔ تم چائے چمکنا یہ بہت آسان اور آدھار ہوتا ہے؟"

میں سخت مذہباتی تھیں میں گرتا رہ گیا تھا۔ لیکن لئی کے روپ نے مجھے حیرت دیا۔ مس لئی اقم کو یہ عہد بھی بروا کرتا ہوگا۔ مجھ کو کہہ سکتا ہے شو بہر کی ایک عزیز لائٹ تھی۔ آج وہ بھی کھو گئی۔ قصور وار ہوں میں۔ صرف سوری کہنے سے زیادہ شرمندگی ہوگی؟

"مجھ کیا ہو سکے؟" وہ مسکرائی: "ہمارا دل رکھنے کے لیے؟"

"جو میں کہوں گا۔" مانو گی؟" میں نے کہا: "صاف بات یہ ہے مس لئی کہ تمہارے اور ہمارے درمیان ابھی تک کوئی چھبائی رشتہ ہے یہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری وجہ سے تم کو بہت نقصان ہوا اور شاید آئندہ بھی ہو۔ اس لیے میں چھ کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں مزید نقصانات سے بچانے کے لیے اگر تم نے انکار کیا تو میرے دل پر ایک وجہ ہمیشہ رہے گا۔ چہرے سے لیے لوٹ کر نا بالکل نامی ہو جانے کا۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ بہت اچھی بات ہے مس لئی۔ تم حقیقت میں ہی سوائی بھی چیز بے بیزار سا نہیں دیتی۔ اس کو تو تم تک کہہ سکتے تھے۔ وہ اتنی پرانی تھی کہ دو چار سال میں جواب دے جاتی۔ اس کے

بعد مر اسے اپنے ذاتی میز پر میں میں منجھال کے تو رکھ نہیں سکتی تھیں۔ وہ نیچے کی کھڑکی دیتی۔ اسکرپ ہو جاتی۔ تم نے کبھی گاڑی کو کھڑا رکھا ہے؟ آہستہ آہستہ لئی کے علاوہ مریض کی طرح۔ ایسے ہی دھس جاتی۔ اس کی لاش بھی تمہارے دروازے پر رکھی رہتی تو کتنے دن؟ بالآخر لوگ اعتراض کرنے لگتے تھے کہ اسے شاید کچھ تنگ ہے اور ہمارا رستہ روک رہی ہے تمہارے مرحوم شوہر کی یہ نشانی۔ گاڑی اسے لے جاتے پھر گاڑی پر نشانی والے۔ ہم سب کے لیے اپنے گھر لے گئے۔ وقت کی سب نشانیوں کو سمیٹ کر رکھنا ممکن ہی نہیں کیونکہ ہم آگے چلنے پر مجبور رہیں۔ تم مجھے شگل کو یا سفاک۔" مجھیں وہی کہوں گا جو مجھے کہنا چاہیے۔ اس گاڑی کو بھول جاؤ؟"

وہ کچھ دیر غامض سے سٹریٹ کے کش لگاتی رہی۔ "ہاں... ایک ڈاک دن یہ ہونا ہی تھا۔ خود مجھے بھی یاد خیال آیا کہ اس گاڑی کو اب بدل دینا چاہیے۔ جو لوگ ملائی نہیں اڑاتے وہ محض میرا دل رکھتے ہیں... دروازے کے کتنے نام رکھے ہیں دوسرو۔"

میں نے کہا: "کچھ نہیں۔ وہ وہاں لاوارث کھڑی رہے گی۔" جولاہٹ لوگ وہاں سوتے ہیں انہی میں سے کچھ کا بھلا ہو جانے گا۔ ایک ایک کر کے وہ اس کے نام اور کارآمد کرنے سے نہ لگتے جائیں گے اور بیچ کر کھاتے جائیں گے۔ کوئی اس کی سیٹ نکال لے گا۔ انانکھ بنانے کے لیے۔ یا ممکن بنے کوئی اسی میں رہنے لگے گا۔ ایک حوصلہ مند عورت ہو۔ جیتا جاتی ہو اور جیتا جاتی ہو۔ تم دوسری گاڑی میں آتی جاتی ہوگی اور زندگی پہلے کی طرح تیز چلے گی۔

وہ ہنسی: "میں نے تم کو بتایا تھا کہ میں دوسری گاڑی میں نہیں لے سکتی کیا تم نے اس پر یقین نہیں کیا تھا؟"

میں نے کہا: "دوسری کار میں لائیں گے تمہارے لیے؟"

وہ ایک دم پرہیز ہو گئی: "تم... تم کیوں لاؤ گے؟ تم کو کیا حق پہنچتا ہے؟"

حق پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ ہماری وجہ سے ہی تمہاری کار کوئی حق تو تم کو بھی پہنچتا ہے کہ تمہارے نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کرو۔ تمہیں دے سکتی ہو اور ضرورتی کر سکتی ہو۔ مگر تم نے ایسا کیا اور ہم نے اسے کچھ ضرورتی کوئی ہم سے کچھ وصول کر کے۔ تمہارے دینے والے ہی ہمارے دل میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ اس نقصان کو جو اگر نا ہماری اٹھائی دینے والی ہے۔ اس کا کہہ کے بدلے نہ کر۔ یہ ہی بے عزت ہو گئی؟"

"گوں ہی تو وہ ستر آمیز ہے جس میں بولی۔" بالکل نئی ٹرینڈرز؟"

میں نے کہا: "اگر تم ڈاک یا اسٹور جو تے تو ضرور ایسا ہی تمہارے حق تو تمہیں ہے؟ تم کو بہت عزت نہیں کر سکتے؟"

میں کسی انجینی سے تمہارے قول نہیں کر سکتی۔ یہ بھی ہے عزتی جلدیری..."

"ہم اب انجینی نہیں رہے؟" غالب نے کہا۔

"اور یہ شخص تھیں تالی ہے۔ تم کو دوسری گاڑی کی۔ بالکل نئی شاید نہ ہو مگر اچھی سے اچھی لائے گی کوشش کریں گے ہم؟"

مجھے یہ تالی تو نہ ہوتی... تم کو تو زیادہ سے زیادہ وہ شخصیت لگتی چاہیے جو مجھے مل سکتی تھی؟ لئی نے کہا۔

"اس میں اپنی پریشانی کا سوا دھڑی شامل کرو؟" میں نے کہا۔

"اس کے ذمے دار بھی ہم ہی تھے۔ پھر جو دہم تم نے کی؟ اور آئندہ گویا؟ اس کا مجازی طرف سے کوئی صلہ۔ ہذا زنا عام، کچھ تو ہوگا۔" اس سے ایک تقریر خانی گاڑی آجائے گی؟"

وہ ہنس پڑی: "تم بہت چالاک آدمی ہو۔ لیکن مسٹر چالاک! میں نے کسی صلیب یا انعام کی خاطر تمہاری مدد نہیں کی تھی؟"

"مجھے معلوم ہے۔ شاید میں نے غلط انداز استعمال کیے۔ تم یوں کر کر رہے ہو اس کیلئے کہ جواب میں ایک معمولی سی نیکی کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اپنی حقیقت کا اظہار کرنے کے لیے..."

"دیکھو۔ یہ بہت مشکل ہے میرے لیے۔ میں بس میں آجاسکتی ہوں۔ ابھی دس سی سال بھر کے بعد سے لوں گی نئی گاڑی۔ ویسے تو وہ سب میری آتی عزت کرتے ہیں۔ راج کچھ رشتہ کچھ اور ان کی فیمل کے سب لوگ۔ آج میں ان سے کہوں تو صبح مجھے دروازے پر ملان کی اپنی کا کھڑی ملے۔ میں ایڈوالس یا دھس بھی لے سکتی ہوں۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری خواہش اور عروج ہوگی اس سے؟" میں نے کہا: "اور اگر تم نے میں بھی انکار کیا تو تم آج کے بعد لوٹ کر یہاں نہیں آئیں گے۔ حالانکہ میں تمہاری مدد کی اور پناہ کی ضرورت ہے۔ اپنا چہرہ بدلانے کے لیے؟"

"اچھی سے دیکھی دس دسے رہے ہو؟"

"ظاہر ہے جب تم انکار کر گئی تو تلقین خود ہی ختم ہو جائے گا؟"

غالب نے کہا: "درز تم ہمارے جذبات کی قدر کر دو تو پھر ہم ضرور آئیں گے اور تم ہمارا اصل چہرہ بھی دیکھو گی؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا: "معلوم نہیں کیوں میں تمہاری ہر بات ماننے پر مجبور ہوں۔ تم مجھے ایسی ویسی عورت مت سمجھنا جیسے کہ ہمیشہ میں عام ہیں۔ میں نے کسی مرد کو اتنی ٹکٹ نہیں دی کبھی؟"

"وہ تمہیں ضرور معلوم ہوگی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا: "اسلام ہر ماننے کی اس ملاقات کو تمہارے تعلق کی بنیاد کیوں بنالیا۔ اور وہ بھی کچھ جانے لیتے۔ تم نے تو ہمیں تک ہمارا نام بھی نہیں پوچھا۔ ہمارا اصل نام؟"

"تم خود ہی بتاؤ گے؟" اس نے اپنی آواز کو بشارت میں بدلنے کی کوشش کی: "کبھی نہ دیکھی؟"

میں نے غالب کی طرف دیکھا لیکن وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے غریب کے بعد فیصلہ کیا کہ نام میں کیا

وہ جیسے پھر اپنے خیالوں میں گم ہو گئی۔ ہاں، مگر بعض اوقات اپنے خیالوں سے بھی دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ زیادہ بڑی خوشیوں کے لیے۔ یا کسی اور کی خاطر۔ کم سے کم تین لڑکیاں ایسی ہیں جن کے لیے میں نے راج کے کہہ راج کہہ کر سے۔ اور ان میں سے ایک ٹاپ کی بیروٹن ہے آج۔

”تم سے نہیں کہا انھوں نے۔ راج کو براہِ شعی کہہ دینے؟“

اس سے کیا ہوگا؟ دوجار دن بعد وہ بھرا چلا گیا۔
 دوجار دن بعد کیا ہوتا ہے، یہ بعد میں دیکھیں گے۔ ہم بھی
 اتنے بے وقوف و تنہیں میں ہی رہے۔ ہم معلوم کریں گے کہ کون کیا تھا
 کہ اس بیٹے سے آیا تھا۔ تم یہ کہہ کر اپنے دونوں ہسالیوں کو بدلیات

لکھن کی اوپر ملک پر آجائے گئے بعد ایک مہینہ کی روک روک جیپ مکیسی
 وارڈ ہوئی تو یککھت میں سے اب تک کے واقعات میرے ذہن
 سے ہو گئے۔ اس وقت کا تصور ابھر آیا جیپ سن دل آگئی وہی دھج
 ہوئی۔ اور ان بقول سے بس ہوں گے یہ تر سے ہوئے تھے کیا ایسا
 ہوگا کیا سچ ایسا ہو جائے گا کہ اب آخر یہ سافٹ جبرال تمام ہوگی
 ادھر سفر حیات میں فرق کا صحرا کبھی نہ لے گا۔ صرف اس کی رفاقت
 سے ہمکا راستہ ہوگا اور محبت کے روشن رنگوں والے پھر لکھن کی راہ میں

”تو میں سمجھ گیا۔ لیکن ایسی کوئی سن دجہ آپ نے معلوم کر لی
 وہاں بیٹھے بیٹھے“ میں نے کہا۔ ”آپ کب سے ایسے ملا سکتے ہو؟“
 کلمات جو کہنے لگا۔
 ”وہ تو خیر مگر گناہ گار ہو ہی نہیں سکتے۔ مگر وجہ سامنے تھی۔
 عقل کا اندازہ نہ سمجھے تو اور بات ہے۔ آپ کی آنکھوں نے بھی اسے
 نہیں دیکھا تو میرا کیا تصور ہے؟“ غالب نے کہا۔ اس کے پیڑروم
 میں سر ہانے کی طرف ایک تصویر بھی لٹھی ہو تھی۔ ڈیل فریم والا ایڈیٹ

تھا اور اس میں ایک تصویر تو خود لٹی تھی۔ دوسری تصویر میں آپ مسکرا رہے تھے۔

سبحان اللہ! یہ تو کمال ہو گیا، میں نے کہا، یہ یعنی میں ملی کا محرم شوہر بھی ہوں۔ یہ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا۔ ایسے ہی سداں اچانک پتا چل گیا کہ میں آپ کا دادا بھی ہوں یا آپ میرے سسر بھی رہے ہیں۔ کسی پچھلے جنم میں؟

ہواس کی کھڑوت ہے۔ صاف مان لے کر تو نے تصویر ہی نہیں دیکھی جو میں نے دیکھی۔ جہاں تو بیٹھا ہوا تھا وہاں سے شاید نظر بھی نہیں آتی ہوگی۔ بہر حال میں نے اس پر خود کیا تو یہ دھم میری کھجھر کی گئی؟

میرزا جی! آپ ہوش کے ناخن لیں۔ میرا یہ چہرہ اصلی نہیں ہے۔ یہ ہاؤن بال اور ہاؤن داہمی۔۔۔

اس تصویر میں ایک ایسا ہی شخص تھا، غالب نے میری بات کاٹ دی۔ اور میں غارت تھیں کے ساتھ کھڑے کھڑے ہوں کر لٹی کو اس کا احساس تھا۔ ممکن ہے یہ احساس دیتے ہو، اور جو کچھ تھا کچھ ایسا ہی معاملہ کبیری صورت میں اسے ایک آشنا چہرہ ملا جس سے اس کی زندگی کا دایں و بائیں رہی ہیں۔ اور تو نے دیکھا کہ وہ کتنی جذباتی عورت ہے؟

میں بھی سوچتا رہ گیا۔ یا ر غالب! اگر ایسا ہی ہوا تو پھر اسے میرا یہ چہرہ عزیز نہ ہوتا پاتے۔ جب یہ چہرہ اپنے اصلی روپ میں سامنے آئے گا تو اس کے جذبات بدل جائیں گے؟

میں شرملا گئے تو یاد ہوں کہ وہ تیرا بہہ نہیں بدلے گی۔ غالب نے کہا: وہ میرا نیک پیک مزو بدل دے گی لیکن تیرے ذاتی میک اپ کو باقی رکھے گا البتہ کچھ خشک کر دے گی۔ اور جہاں بوجھ کے با ملازادہ فعل کو مطلق اصل کے منالے گی؟

اگر تیرا دعویٰ سچا ہوا۔ تو سچی تو خود سلنے آجائے گی؟ میں نے تنقید ہو کے کہا: مگر یہ بہت پر فریب بھائی ہوگی۔ میں اس شخص خود قسمی کے کہیں میں شریک ہونا پسند نہیں کروں گا؟

اور شریک ہونا چاہا تو؟ غالب نے سکایا۔

تو کیا؟... کیا ریل ہو جانا جیسے میلز۔ میری سچ تو ہوتا تو کیا کرتا؟ میں نے گڑبڑا کے کہا۔

معلوم نہیں کیا کرتا؟ غالب نے باہر دیکھتے ہوئے کہا: تو نے اچھا کیا جو اس پر اعتماد کر کے ہونے پناہ نام نہیں بتایا۔ وہ پہلے ہی اس پر نشہ میں ہے کہ نہیں... یعنی تجھے دیکھ کر کہنے؟

وہ لہجہ عورت نہیں ہے...؟

وہ ایک عورت ہے۔ جہاں اور تو بصورت عورت جس نے خود کو آج تک وفاداری کے زلف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس نے جہاں بات پر پہرے بجا دینے تھے اور شاید اپنے جسم کی آواز کو بدلنے میں کامیاب بھی تھی۔ مگر کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی جھوٹے نہج

ہالے بھوک کے احساس کو دنی طور پر مار دیتے ہیں اور... ہرگز نہیں کہتے ہیں اور ان کیسے کے خیال سے گریزاں رہتے ہیں۔ مگر کیا جھوٹ ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتی ہے ہادی بنیادی طور پر جہاں ہے اور ہر جہاں جہالت لکھا ہے؟

لیکن آج تک اپنی زندگی گزارا ہے...؟

ہاں۔ مگر وہ ابھی زندہ ہے۔ اور مرنے کا بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اپنے آپ سے بڑھتے ہوئے اسے کتنا وقت گزرا ہے۔ لیکن میں یہ قاطع ہوں کہ یہ جگہ تا عمر جاری نہیں رہ سکتی۔ وہاں چلنے کی اور اسے پہلے فرسٹریشن کا شکار ہوگی۔ ڈیڑھ بیس میں ہونا ہوگی۔ شریک کے دوسرے اور اچھا لگے ہیں۔ یہ سب کچھ تو اسے مادہ ہو سکتا ہے۔ ملی کے ساتھ بھی؟

میں نے اپنا سر ہکا دیا۔ یا ان کیوں مجھے پاگل کرتا ہے۔ اب یہ تو ناممکن ہے کہ میں اس کے شوہر کی جگہ لے لوں؟

جگہ تو خالی ہے۔ اب یہ مرضی ہے تیری لے دینے؟ غالب نے لگا۔

وہاں خراب ہے تیرا۔ اس خالی جگہ کو بیکر نہ لے تو اپنی صورت بنالے فیہ دہیسی۔ وہ اگر اتنی ہی بے تعل ہے کہ فیرونی جگہ اس جیسی صورت والے کسی بھی شخص کو قبول کر سکتی ہے تو کچھ بے تک کہوں فارغ تیرے بھی تھی۔ خود میک اپ آرٹسٹ ہے۔ بنا تیری دوسرا فیروزہ جسے حالت کی۔ ایسے بھی کوئی دیکھا کرتے سکتا ہے خود کو؟

غالب صرف مسکراتا رہا: کہتے ہیں جس کو عشق 'غلل ہے وہاں کا؟

صرف دعا کا غلل ہے۔ اول تو میرا خیال ہے کہ یہ تیرے دعا کا غلل ہے۔ لیکن تیری بات کو درست مان لیا جائے تو کچھ بچر پہلے اس کے سوا کچھ نہیں رہتا کہ میں لوٹ کر ہی نہ جاؤں۔ یا ایک بار جاؤں اور اپنا قرض ادا کروں۔ کھاؤں اس کے سپرد کر کے کوئی کچھ مان تمہیں سکھائی رکھے اب اچھے نہیں ملیں گے؟

جبکہ تیرا یعنی آکا گوں کے فلسفے میں یہ ضمانت نہیں دی گئی کہ جو اس جنم میں جیسا ہے وہ ایسا ہی اگلے جنم میں بھی ہوگا چنانچہ میں ممکن ہے کہ اگلے جنم میں وہ ہو ایک لومڑی اور آپ ہوں اگلے کے گیدڑ۔ یا لال بیک تو ہر صورت میں ملاپ ہوگا۔ وہ پہلے ہی آج رات وہ کسی فریڈے کے پاس رہے گی۔ فریڈے تو کچھ پتا نہیں چلنا کہ وہ ہڈی کے یا ٹوٹ؟

جہاں میں گیا فریڈے کا حوضہ میں نے جتنا کہہ کیا یا کوئی اور بات کر؟

غالب اس صورت حال سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن میں سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ غفل کی کسری نے غالب کی بات میں ایک فیصد کھوٹ دکھائی دیتا تھا۔ اس نے خود کو اپنے

نہاں سے اسی سے اور اس کا بھرنے کو سو فیصد درست معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اس کی گئی تو میرے خیالات کی پر واز بھی نہ کر سکی۔ میں نے ملی کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور حاجی علی کی دنگا کو جانے دیا۔ عقیدت مندوں کے جہنم میں شامل ہو گیا۔ یہ بڑی عجیب دنیا ہے۔ ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ بالآخر ایک ہی سمت میں ہوتے ہیں۔ ان میں ہم جیسے نفی جیسے رکھنے والے ہیں تھے، ان کے نام بھی اصلی نہیں تھے۔ اور اگر کیا ملامت سے دیکھا جاتا تو ہمارے جذبات بھی وہ نہیں تھے جو دوسرے خرابوں کو گول لے تھے۔ ہم حاجی علی کی دنگا پر زندہ عقیدت پیش کرنے کے لیے جاننا نہیں ہوئے تھے۔ شاید سچے جہنم میں ہم جیسے دوچار ذاتیں ہوں گے۔ چور اور گھوٹا جس کے ظاہر و باطن میں آشنا و غریب ہوگا۔ مجھے اس خیال پر شرم آتی۔

دنگا ہندو کے پنج میں واقع تھی اور یہ پراکٹش نظارہ تھا۔ ہندو دنگا کی جانب بڑھتے والوں سے الگ ہو کر دیکھی تو میرا دل بالواسطہ شکار ہونے لگا۔ اس جہنم میں اہانت و وسیع علاقے میں بھوک پریت لاش کروں گا۔ شاید یہی غالب سوچ رہا تھا کہ وہ اب تک میں گئے جن کو یہاں پہنچنا تھا۔ ناز داود رحمن کے علاوہ اس تک بھی نہیں تھے جس جہالت کی شام کو حاجی علی کی دنگا پر ملنے کی بات کی تھی۔

ہمیں بچتے بچتے ایک بہت شاندار مسجد نظر آرہی تھی۔ الگ کے سامنے وہ بازار تھا جس کی ساری رونق نازنیں کے دم سے نمودار ہوئی تھی۔ ایک دکان چھیل کے جوس کی تھی جس کے سامنے ہم چلے ہوئے تھے۔

کیا خیال ہے؟ اس سے پوچھیں؟ غالب نے کہا۔

یہ کیا بتائے گا؟ میں نے کہا۔

یہ حاجی صاحب کا پستان ہے۔ اور سوات کا بٹنے والا ہے؟

نہیں نہ۔ ابھی میں نے وہاں فراڈ کو اس سے باتیں کرتے سنا ہے۔ لاہور میں پاکستان سے گئے ہوئے تھے۔ حاجی بڑے تپاک سے اٹھتا تھا۔

میں نے پتہ نہیں چھپایا۔ میں نے کہا یا آدمی نیک بگھٹتے؟

نیک بگھٹتے۔ کیا خیال ہے تیرا؟ ہم اسے بتا دیں کہ ہم کو کاش میں ہیں۔ ہمارا نام کیا ہے اعلان کا کیا ہے؟

میں نے دیکھ لیتے ہیں کہ آدمی بھروسے کے قابل ہے یا نہیں۔ مجھے نام بھی بتا دیں گے۔ اور نام کے مسئلے میں آپ یہ بار بار دہرائیں گے کہ میں نے فیکہ چند نہیں بولے۔ ہر جگہ امیر چند نہ تھا۔ فیکہ چند لال...؟

میں نے سر ہکا ہاتھ مارا یا یہ تو بڑی بھول ہو گئی تھی مجھے۔ فیکہ کبھی اسے ایک نیک کسی نے ثبوت نہیں مانگا۔ وراصل میں

کے ساتھ رہے کے یہ نام ایسا زبان پر چڑھا کہ اب بے خیالی میں منہ سے نکل جاتا ہے سڑے چاروں؟

ایسے تو کسی جگہ نہیں جاسکتے۔ بڑے نام کی جگہ نئے نام ہی استعمال کرنے کا نہیں سب کو اس کے بغیر غارت نہیں ہو سکتا۔ مجھے آنا مت قائلو۔ تم خود بھی ناز کو لڑا نہیں سکتے۔ میں نے کہا۔

جب میں بھری جہاز پاس کے ساتھ تھا تو کسی کے سامنے کیا ہنسیاں میں بھی ایک دوسرے کا اصل نام لینے کی غلطی نہیں کی۔ اس نے نہیں لے نہیں لے۔

یہ ایک پراگٹ انڈا رہتے۔ تمہاری کب کہاں اور کبکے میسٹر کی تھی اور اس نے تمہاری کاسٹرف...؟

تمہاری میں ہم مشن کرتے تھے اور وہ سب کرتے تھے جو عشق میں ہوتا ہے۔ یا نہیں ہوتا؟ غالب نے جتنا کہہ سکیا تھا۔ ہاں بھائی! میں کیا؟ میں نے سرواٹ بھجورے کہا۔ تمہارے کمر بستہ ہو جاؤں تاکہ کوئی نہ...؟

غالب نے مجھے حاجی صاحب کی دکان کی طرف کھینچ لیا، ان کی دکان کے مشروبات نازنیں میں ہاتھ مقبول نظر آتے تھے۔ اپنے وطن میں بھی ہم نے انار، سیب، اور کچھ کھائے۔ جوس اکثر بیٹھا تھا مگر حاجی صاحب جوس ایک پیوٹ تھے اور مختلف اقسام کے جوس کی کاک ٹیل بڑے کمال سے بنا تے تھے۔ ایک دو تین بھلوں کا جوس ملا کے ہاں کے مناسب میں کی پیش کر کے وہ ایک نیا واقعہ پیدا کر لیتے تھے۔

ہم پیسے کا تجربہ کار کے چلے گئے کرنا مشکل ہو گیا کہ ترجیح دی تو کس کاک ٹیل کو۔ بالآخر ہم نے فیصلہ انداز چلنے والے چھوڑ کرے پر چھوڑا۔

فیصلہ تمہارے حق انتخاب پر چھوڑا تو پھر؟

توہ قلم کوئی ڈرنک نہیں ہے؟ چھوڑ کر لے کر لے جاتے ہوئے کہا۔ ابھی جلدی ہو لو۔ اپنی شیل لاؤ۔

واہ واہ! ایک دم اپنی شیل لاؤ؟ میں نے کہا۔

چھوڑ جاؤ فادی! آئیز اور وہ نہیں سمجھا تھا مگر اس جملے پر حاجی صاحب نے پلٹ کر دیکھا اور ہمارے قریب آگئے۔

ماشاء اللہ سے اتنی اچھی آواز نہ سنا کچھ نہ تو نہیں گئے ہو آپ؟ انھوں نے بیس ہونے کا حوالہ دیا۔

آپ تو مجھے پاکستانی گئے ہیں حاجی صاحب؟ میں نے کہا۔

حاجی صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔ الحمد للہ تم پاکستانی ہیں؟

لوہر تباہ کر آپ سوات یا گلگت سے تعلق رکھتے ہیں؟

غالب نے کہا۔

حاجی صاحب ہماری چالاکی کو کیسے سمجھ سکتے تھے کہ یہ تمام معلومات تو میں ابھی ابھی حاصل ہوئی ہیں۔

”سچ بولے آپ سبحان اللہ سے“ وہ ہمارے پاس بیٹھ گئے۔
 ”لیکن ابھی بس اچھا ہو گئے۔ جو ہمارا خدا کو منظور۔“
 ”آپ مستقل یہاں آگئے ہیں! کیوں حاجی صاحب! کیا وطن سے اچھی ہے یہ جگہ۔ پاکستان آتی خراب جگہ ہے؟“
 ”استغفر اللہ سے ایسا مت بولو! انھوں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ پاکستان پر ہمارا جان قربان۔ سو بار بار بارقراں ہیں۔ اپنا وطن کا گنا بھی عزیز ہم کو۔ لیکن ہم ادھر سے کیسے جاوے۔ اتنا سال ہو گیا۔ بچہ لوگ ادھر بڑا ہوا۔ اپنا سواٹ جاتا ہے کبھی تو دیکھتا ہے اپنا لوگ کوئی نہیں۔ سب باہر چلا گیا یا امر گیا۔ نا لوگ ہم کو نہیں پہچانتے۔ بڑا افسوس ہوتا ہے ان کا حالت دیکھ کر۔ ابھی تک غریب ہے اور جاہل ہے جو پورا چھوٹا بات پر تکل کرتا ہے۔ دُشمنی کرتا ہے۔ باپ کے بعد بیٹا، بھروسا کا بیٹا۔ ہمارا دل بہت دکھی ہوتا۔ آپ پاکستان سے آئے ہو؟“
 میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”عاجی و زار! آئے تھے چندہ دن کے لیے۔ وہی گئے اور! جمیر شریف!“
 ”ماشاء اللہ سے! جمیر شریف کیا آپ؟ خواجہ صاحب کی دہگاہ پر رہا کرتی دیا، بہت خوش نصیب ہے آپ؟“ حاجی صاحب نے کہا۔
 ”مجمعی کئی بار گیا۔ یہ سب خواجہ صاحب کا برکت ہے جو آپ دیکھتے ہو اور الحمد للہ سے خدا کا خاص مہربانی ہے، ہم پر۔“
 ”کاروبار تو خوب چل رہا ہے آپ کا؟“
 ”دودھ و ہزار کا آمدنی ہوتا ہے ماشاء اللہ سے“ حاجی صاحب نے خوش ہو کے بتایا۔
 ”دودھ و ہزار کی آمدنی تو واقعی بہت اچھی ہے“ میں نے کہا۔
 ”اللہ دیتا ہے۔ ہم اللہ کے واسطے خرچ کرتا ہے۔ آپ اچھے مسجد دیکھتے ہو؟“ حاجی صاحب نے کہا۔ ”وہ ہم بتایا۔ اس کا سالانہ جمع کرنا الحمد للہ سے۔ مسافر لوگ کے واسطے کھانا رہتا ہے جو بیس کھٹے۔ سب ہمارا مہمان ہوتا۔ ہندو مسلمان، سکھ عیسائی جو بھی آوے۔ اللہ کا گھر ہے، ہمارا نہیں۔ ہم تو خدمت گزار ہے اللہ کا اور سب کا میزبان ہے۔“
 میں نے حیرانی سے اس اللہ کے خدمت گزار انسانیت کے نام لیا۔ اپنی شرافت کے نمونے کو دیکھ کر جس کو اپنے پاکستانی ہونے پر فخر تھا اور جو صاحب ثروت ہونے کے باوجود عجز و انکسار کا پیکر تھا۔
 ”آپ کا مہمان خانہ تو ہر وقت بھرا رہتا ہوگا؟“ میں نے کہا۔
 ”الحمد للہ سے“ وہ اوپر اٹھکی اٹھکے بولا۔ ”ہم تو خادم ہیں مہمان خاں اللہ کا ہے۔“
 ”میرا مطلب تھا کہ یہاں جب سونے اور کھانے کا انتظام ہے تو وہ سب بھی آجاتے ہوں گے جو سافر نہیں ہیں؟“
 اس نے مسکراتے نفی میں سر ہلایا۔ ”اللہ عقل دیا ہم کو۔ ہم محنت

بے ایمان کو نہیں گھنٹے دیتا۔ سب دیکھتا کہ کون سا فریہ پاہیز دیکھتا اگر کوئی پاکستان سے آتا۔ آپ بھی ادھر ٹھہرو۔“
 ”نہیں حاجی صاحب! میں نے جلدی سے کہا۔ ہم کوئی نہیں ہیں اور آپ کی دعا سے ایک دوست کے گھر ٹھہرے ہیں۔“
 ”کہہ رہے آیا آپ صاحبان؟“
 ”میں کیر خان پشا ور سے آیا ہوں۔ یہ میرا دوست ہے مسافر۔ یہ راولپنڈی سے آیا ہے۔ میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔ ہمارا ایک تیسرا ساتھی گل خان تھا۔ وہ بھی پشا ور سے ساتھ چلا تھا۔ کئی میں بچھڑ گیا۔ آج ہم سب کو یہاں حاضر ہونا تھا۔“
 ”گل خان! ماشاء اللہ سے! نوجوان ہے؟ بہت اچھا نوجوان لڑکا؟“ حاجی صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔
 ”گلاس میرے ہاتھ میں کھینچنے لگا۔ جو گھونٹ میں حل سے آتا رہا تھا وہ سینے میں اٹک گیا۔ جی... بالکل... میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ وہ آیا تھا یہاں؟“
 ”ابھی۔ تو یہاں نہیں وہ کہہ رہے گا۔ آنا بھیڑ بھاڑ ہے مگر پھر کئے گا تو ہم بولے گا اس کو۔“ حاجی صاحب نے کہا۔
 ”میرا دل بھر مایوسی میں ڈوب گیا۔“ اس نے اپنا کئی تانہیں دیا۔۔۔ وہ آیا تھا۔“
 ”یہی ہم سوچتا۔ ایک اور جوان آدمی تھا اس کا ساتھ۔۔۔ اپنا نام بولا۔۔۔ کیا بولا؟“ انھوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے سوچا۔ ”ہاں۔ خان شیر وانی۔ نہیں۔ شیر وانی خاں۔“
 ”بالکل ٹھیک حاجی صاحب۔ وہ بھی ہمارے ساتھ آیا۔“
 ”سے آیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کے پاس کیسے آگئے تھے وہ؟“
 ”مجھے آپ آیار۔ ادھر پاکستان سے جو آتا وہ حاجی کمال ہزارو آتا الحمد للہ سے۔“ حاجی صاحب نے کہا۔ ”کوئی اس کو بولا کہ حاجی کا ڈکان پر جاؤ۔ وہ تم کو تلاش کرتا تھا۔“
 ”ان کو چاہیے تھا کہ پیغام چھوڑ جاتے۔ کہ وہ کہاں بولے؟ وہ دوبارہ یہاں آسکتے تھے۔“ میں نے کہا۔
 ”ہم ان کو بولا، مغرب کا بعد آجاؤ۔ رات کو آجاؤ شام کا نماز کے بعد۔ ہم کچھ رادوست کو بتا دے گا انشاء اللہ سے۔“
 ”آپ نے کہا تھا ان سے؟“ غالب خوش ہو کے بولا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ جو ہم نے ملے تو یہاں ضرور مل جائیں گے۔ آپ انھیں ادھر ہی روک لیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“
 ”مہربانی کیسا بھائی! ہم خادم ہیں۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔
 ”حاجی صاحب! کیا انھوں نے ہمارا نام بتایا تھا آپ کو؟“ میں نے کہا۔
 ”تھہرا نام بولا۔ کیر خان۔ اس کا نام نہیں بولا۔“ حاجی صاحب نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے منہ سے غلط نام نہیں نکلا اور میں نے یہ راوی نام کیا جو حق معروف تھا۔ ایک بار پھر میں نے اسے اپنے اور حسن کے خیالات کی ہم آہنگی اور سورج کی کائنات کہاں سمجھا۔ ایسے لاتعداد مواقع ہمارے حباب میں تھے جب اس نے اور میں نے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ہی لائحہ عمل اختیار کیا۔ ایک سے تاج افخیز کے اور ایک نے وہی کیا جو دوسرا کرتا۔ یہ پیدائش کے دن سے اب تک کی دوستی اور ذہنی رفاقت کا ثمر تھا۔ سن تو شرم تو سن شرمی۔
 پہلے میرا خیال تھا کہ حاجی صاحب کو لٹی کے گھر کا فون نمبر دے دوں گا۔ لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی فون کو ہم نے رات کہیں اور گزارنے کا شورہ دیا تھا۔ حسن اگر فون کرتا تو اسے کوئی جواب ہی نہ ملتا۔ تاہم اس فون نمبر کی مدد سے وہ ہمیں ہمیں میں تلاش کر سکتا تھا۔ یا شہر خدی حاجی صاحب پر غامی مہربانی تھی کہ اسے ہر سہی کرنے کی توفیق دی۔ مسجد کو کوئی بھی پیسے والا کھڑی کر دیتا ہے مگر وہ اللہ کا خدمت گزار اور اس کی مخلوق کا خادم نہیں بنتا۔ حاجی مسافروں کی خدمت کر رہا تھا اور بلا امتیاز کر رہا تھا۔ وہ چھڑے ہوئے گولوں کو مل رہا تھا اور دیا غیر میں ہم سے غریب لوگوں کو کاک میل پلا کے خوش کر رہا تھا اور شرافت سکھار رہا تھا اور انسانیت کا درس دے رہا تھا۔ اتنی ساری نیکیاں اور اتنے بہت سے گولوں کی دعا میں سینے والے کے بارے میں میں کون شک کر سکتا تھا کہ وہ جیتی نہیں ہے۔
 حسب توقع حاجی صاحب نے ہم سے اسپیشل جوس کے پیسے نہیں لیے۔ اس کا ذاتی مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں نے حاجی صاحب سے پوچھ لیا۔ بڑا کہ انھوں نے اس میں کتنے پھولن کا جوس کس تناسب سے شامل کیا تھا تو شاید کبھی زندگی میں پھر میں خود وہ کاک میل تیار کرنا اور اس بقیہ مشروب کے ذائقے سے پھر لطف اندوز ہوتا کرنا یاد ہوا اور اب فقط اس کی یاد باقی ہے۔
 باہر کتے ہی میں نے غالب سے ہاتھ ملایا۔ ”اللہ بہت بڑا نسبت الاسباب ہے۔“
 ”خدا کے بند تجھے میرا شکر گزار بھی ہونا چاہیے کہ جب تو ہوتوں گل پر کھڑا ہوا اس مجمع کو گھور رہا تھا تو میں نے حاجی صاحب کا ہاتھ میں کی تھیں! غالب نے کہا۔
 ”بڑا بیک خان والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔“
 ”میں۔ اتنی ناقص اور نا کارہ ہو گئی ہے تیری سمجھ۔“
 ”میں نے کہا۔ گل زخمی تھی۔ راتوں رات وہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اتنی سخت مند نہیں ہو سکتی کہ یہاں حسن کے ساتھ آجانی؟“
 ”غالب نے کہا۔ وہ نازو ہوگی۔“
 ”میں! چھل پڑا اور بے اختیار میں نے غالب کے شانے پر ہمارا واہ سبحان اللہ سے کہا کہ دیا۔ ماشاء اللہ سے کیا صحیح

تیر چلا یا ہے اندھیرے میں صل کے اندھ سے۔ اور وہ نشانے پر جا لگا۔“
 ”میری ذہانت کی داون دنیا آپ کی کم ظرفی ہے چیف کے ڈو؟“ غالب نے کہا۔
 ”لیکن نازو... مردان لباس میں...؟“
 ”سودا کا شہر تیرم کے ساتھ لوں ہوگا کہ غالب جو مرحال ہے ایسا تو نہیں وہ کیا جاسیے میں نے اسے کس حال میں دیکھا۔ تو بارڈر میں اس گل پیر کو کس ناز میں دیکھ چکا ہوں۔“
 ”اس کے غلط معنی لیے جائیں تو اکرام! شیخ تجھے شہید الفت کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”جو غلط معنی کلمے میں اسے پہلے جعفر سیدز کراؤں! غالب نے بگڑ کے کہا۔ نازو کے ہاتھوں۔ وہ مردان لباس جواز بھی پہنتی رہی ہے۔ میرے ساتھ اس نے بھی جانا کے اندر کھوم پھرنے کے سبب معلوم کیا تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ اس نے ایک وردی حاصل کر لی تھی۔ اس کے باوجود ممنوع علاقوں میں جانا خطرناک تو تھا۔ وہ محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہی۔ یہ خوش قسمتی تھی اس کی۔“
 ”اسے اپنی قوت بازو پر بھی بھروسہ نہ ہوگا۔ کوئی اسے پکڑ لیتا تو گویا موت کو پکڑ لیتا۔“ میں نے کہا۔
 ”صرف تین بار اس نے جاسوسی کی۔ پھر میں نے اسے سن کر دیا۔“
 ”اور وہ مان گئی؟“
 ”ہاں۔۔۔ قسم جو دے دی تھی میں نے۔ اپنی! غالب نے کچھ شرمائے کہا۔
 ”میں نہیں پڑا۔ یہ ٹرپ کارڈ ہوتا ہے۔“
 ”مگر اس نے کہا۔۔۔ کہ آئندہ قسمت و مینا ہی۔ ورنہ... قسم تو خیر نہیں توڑوں گی لیکن دانت توڑ دوں گی تمھارے! غالب نے خفت سے کہا۔
 ”استغفر اللہ سے۔ اب بھی وقت ہے مرزا۔ باز آجا اس کے عشق سے ورنہ ہونے جی تم ہونے سے پہلے وہ تیرے جسم کے سارے قابل شکست حق تو پھوڑو لے گی اور تجھے اسٹر پچر بد ڈال کے نمونے کے طور پر ساتھ لیے پھرنے کی روکھو یہ ہے وہ ناقص العقل جس نے میرا شوہر بنا قبول کیا تھا۔“
 ”ابھی میں عاشق کارول کر رہا ہوں۔ جب شوہر کارول شروع ہوگا تو دیکھنا، پاؤں کی جوتی بنائے رکھوں گا اور ابتدا کروں گا پاکستان میں ایک بلی کے مرڈر سے“ غالب نے کہا۔
 ”تیرے خیالات بہت نیک ہیں۔ میں ناز و ک پر ہنچاؤں گا۔“
 ”ہم اپنا مزناک جلنے والی میٹھیوں کے قریب کھڑے ہوئے تھے اور آتے جاتے لوگوں کے چہروں کو دیکھتے جا رہے تھے۔ سورج مغرب کے سمندر میں ڈوب رہا تھا اور شام کا گہرا سایہ

دو گاہ کے اندر دھیرا میں کے پھل چکا تھا۔ سیکڑوں چراغوں کی روشنی ہزاروں امیدوں کے ساتھ گئے والوں کے تھکن کی علامت تھی۔ قیبن کا مذہب کیا ہوگا۔ قیبن خود تو ایک مذہب ہے۔ ایک مافوق الفطرت۔ سب سے عظیم۔ ازل سے ایک مہیلا برہمن پر قادر مطلق کی ذات جو انسانوں کی تقدیر پر اختیار رکھتی ہے۔ جس کے دست اندکان میں وہ سب کچھ ہے جو انسان مانگ سکتا ہے چنانچہ وہ مانگتا ہے۔

کیا خیال ہے تم بھی اندھ چلے ہو؟ فاتحہ کے لیے ہاتھ ہی اٹھالیں۔ اور کوئی دعا بھی مانگ لیں۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ دعا میں تو بہت سی مانگی جا سکتی ہیں؟ میں صرف ایک دعا مانگوں گا۔ میں نے کہا۔

میں نے ایک دوسرے سے سوال نہیں کیا کہ وہ ایک دعا کیا ہوگی۔ ہم جانتے تھے کہ ہماری دعا وہی ہوگی۔ زائرین کے دھیلے نے ہمیں بالآخر اندر پہنچا دیا۔ اندر دو گاہوں کی مخصوص فضا تھی۔ بہت تغیر پر مجبور کر دینے والی۔ اثرانگیز۔ خود وہاں اگر اگر کسی نے سطر لنگوں کو دھوس سے بھری ہوئی۔ حاجی علی کی قبر کے گرد و درون کا اوجھار تھا۔ ہم بڑی شکل سے مزار تک پہنچے۔ اس پر سبز سرخ اور سفید رنگ کی گونا گوی چادریں تھیں۔ پڑی تھیں اور دھیروں لگا پڑے تھے۔

دھاسے فارغ ہو کر میں نے ہجوم کو دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر حقیقت مندوں کی اس بھڑ میں مجھے ہر قسم کے لوگ نظر آئے جو اپنے غلطے سے واقف ہو کر مسلمان، ہندو یا سکھ سمجھتے تھے۔ ان میں پارسی یا عیسائی تھے تو انکے نہیں پہچانے جاسکتے تھے۔ لباس کے اعتبار سے وہاں سب عزیزیوں نے اسٹریٹ پہن رکھے تھے یا ساریاں باندھ رکھی تھیں۔

ایک میرے کانوں لے کر آواز اذان سنئی۔ اور نہ جانے کیوں اس وقت مسجد گناہ گاہ کے دل میں خیال آیا کہ آج خدا کے حضور بھی حاضر ہونے دوں۔ بندہ بڑا خود غرض اور کینہ ہے۔ خدا کو صرف اس وقت یاد کرتا ہے جب اپنی زندگی کے مسائل کے مقابل خود کو بے بس پاتا ہے۔ اپنی تدبیر کو بے اثر اور اپنی عقل کو بے خبر پاتا ہے۔

غالب دعا لے کر کہاں نہ گیا تھا۔ پھر میں ہم خود ہی الگ ہو گئے تھے لیکن یہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ وہ دو گاہ کے باہر مل سکتا تھا یا حاجی کی دکان پر۔ آہستہ آہستہ جیسے جیسے ہوتا میں دو گاہ سے نکل آیا۔ اپنے جوتے تلاش کر کے پہنے تو غالب کے جوتے نظر نہ آئے۔ وہاں نہ رکنا بے قصد محسوس ہوا اور میں مسجد کی طرف چل پڑا۔ حاجی صاحب کی بنوائی ہوئی مسجد واقعی شاندار تھی۔ اس کا دروازہ دنیا کی عظیم یا خوبصورت ترین ساجد سے کرنا غلط ہوتا۔

قابل متعلق وہ جذبہ تھا جس نے اس جگہ ایسی مسجد کی تعمیر کی کہ کچھ کے سوا کسی دھن کے رہنے والے حاجی صاحب کو توفیق و استعداد ملے۔ فطرت ہی اور ایک ایسے ملک میں جہاں اسلام کے نام پر اتنے میں تھے اور ایک ایسے شہر میں جہاں مذہب سے معاشی مزاج نہ تھا بلکہ میں شالوی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ یہ سہلک رشتہ تھی۔ اندھ نمازی صاف بستہ ہو رہے تھے جب میں بڑی جلدی دھوکہ کے نماز میں شامل ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیا فتنہ شروع ہونا کے وہ جذبات میرے دل میں کیسے پیدا ہو گئے جن سے میں آواز نہ آتا تھا۔ جب نماز ختم ہوئی اور لوگ ہانے لگے تو میں وہیں دوڑا تو پھر ہمارا۔ یہاں تک کہ مرکزی صف میں پہنچنے لگا۔ وہ لوگ اس وقت میں نے غالب کو دیکھا جو مجھ سے آگے چوتھی صف میں بیٹھا تھا وہاں تک رہا تھا۔

میں جو بچہ نکال رہا تھا۔ کیا یہ اتفاق تھا؟ اس ماحول کا اثر تھا یا کچھ اور۔ کہ ایک وقت میرے اور غالب کے دل میں ایک ہی خیال آیا جو پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور پہلے ایک ہی سمت میں رجوع کیا۔ شاید یہ حاجی علی کی کرامات کا پھر تو تھا۔ خدا کے برگزیدہ بندے دلوں کو متعلق کر سکتے ہیں۔

غالب نے میرے قریب آکر کہا کہ کیسی عجیب بات ہے؟ میں نے کہا۔ ہاں۔ کیسی عجیب بات ہے؟

میں مسجد سے نکل آئے۔ باہر رات پھل چکی تھی۔ حاجی علی کی حرکت پر عاجزی دینے والے واپس جا رہے تھے۔ میں اور غالب چلتے گئے اور اپنی نظروں سے ہر سمت دیکھتے گئے کہ گزرنے والی کی صورتوں میں کوئی آشنا ضرورت ہے۔ مایوسی رفتہ رفتہ بڑھانے پر غالب آگے بڑھ گئی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ملاقات کے لیے جگہ کا تعین کر لے۔ ہونے تم نے ملاقات کے باعث کسی ایک خدا کا انتخاب نہیں کیا۔ ہم ایک سمت ہی مقرر کر لیتے۔ شہر وہ سمت بدھ سے جا نہ ظور ہو رہا تھا۔ چودھویں شب کا پورا چاند اس کا اجالا بھی مدھم تھا۔

میرے دل کی بے قراری کا عجب عالم تھا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ میرے قریب ہے۔ اسی جگہ کہیں اور اپنی نگاہیں بھی تلاش کر رہی ہیں مگر کہاں؟ اتنے قریب ہو کر بھی دوری دہی۔ سیکڑوں میل کی مسافت ہے کہ اسے اور سترہوں سے اور وہ طلب میں عاجز ہونے والی سب مشکلات سے بڑے بالآخر میں وہاں پہنچا تھا جہاں اس نے مجھے طلب کیا تھا مگر ہنوز بارگاہ جن میں بارگاہی گناہ نہیں آتی تھی۔

بار بار میں اس خیال کو دہراتا تھا کہ شاید وہ آتی نہ ہو۔ اس لیے جا بوجھ صرف جانتے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کی مانگ ہوئی تو مجھے چھوڑے گی کیوں آئی۔ اسے یہاں لانے والے بظاہر ہمدرد تھے۔ خود پردہ دشمنی کر رہے تھے۔ یا پھر دشمن تھے جو

ات داری کے جذبات کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چاند بھائی کی نیت ابھی تک میرے لیے ایک مٹا تھی۔ وہ درد جو غیاثی رنگ میں ایک دنیا کی مریض۔ ایک خطرناک کارہ بار میں دلاور شریک کار اور دوسرے محالے سے اس کا دشمن۔ مجھے جانتا تھا کہ وہ ایک عشق میں گرفتار ہے مگر اب اس سے الگ کر لی تھی۔ میرا انتہائی طاقتور حریف ثابت ہو سکتا تھا لیکن ابھی تک اس کا ہاتھ وہ اپنے کام کی ثبوت سامنے نہیں آیا تھا۔

ماہوں سے آج رات یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا تو اس میں بھی اندھ بھائی کی رہی کو دخل تھا۔ وہ اسی آگے بڑھتے چھین کر لے گیا تھا۔ بڑی دلیل یہ تھی کہ یہ سب میرے فائدے کے لیے ہے لیکن سب جذبات کے ساتھ یہ ایسے مفادات کے برعکس تھے۔ اور میں بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ رات کو کچھ سے دو دروازہ اندھ بھائی کی مخالفت میں رہنا کس طرح میرے یا اس کے مفاد میں ہو سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کر سکتا تھا کہ رات کو بہت سی پریشانیوں سے بھرنا۔ مگر ان کے دل میں بھی تو بعضی حالات کو برداشت پاتا۔ رات کو ان سے زیادہ آواز کی شایعہ جانتی تھی۔

تیرا کیا اب بھی یہ خیال ہے کہ وہ غلطی کی؟ غالب نے کہا۔ ہاں۔ جب اس نے وعدہ کیا تھا۔

وہ اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے آزاد نہیں ہے؟ کیا بات وہ نہیں جانتی تھی؟ میں نے کہا۔ کیا ضرورت تھی مجھ سے وعدہ کر لے گی؟

اس نے چاند بھائی پر اعتبار کیا ہوگا۔ چاند بھائی نے کہا ہوگا لیکن تم کو وہاں پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ بعد میں اس کا قبضہ بدل گیا۔ اسی اور وہ جسے یہ منکر رہا۔ تو رات کو ایک کڑی سختی سے لگے۔ شہر سے وہی اس نے جھوٹ بولا ہوا غالب

کہا۔ وہ آگے گی؟ میں نے ہر دم ہمسے کے اور چلا کر کہا۔ اسے آنا ہمارے نہیں۔ اس نے کہا۔ تو کیا وہ غالب نے کہا۔

تو میں نے کہا۔ میں نے گہری سانس لے کر مایوسی سے کہا۔ غصہ کر کے اسے قیامت تک۔ غصہ کر کے قیامت سے دو اور نوازے ہوئے چلتے ہوئے۔ اس کا فاصلہ طے ہو چکا تھا۔ وہ حاجی علی کی بارگاہ میں پہنچنے سے پہلے کہ وہاں جانے والے اب کبھی وہاں سے لوٹنے سے پہلے کہ وہاں گھر اور پھیل پوری چائے اور چھوٹی بوتل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک مخالف سمت میں اسے لالہ سے پہنچا۔ تو پھر ایک شخص نکلا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

اور غلاب خراب ایسی ہی انہیں جواب دے گئیں۔ انہیں خراب

کے کہا۔ تیری آنکھیں واقعی خراب ہو گئی ہیں؟ غالب نے کہا۔ ہاں۔ زہریلا۔ آخر کون ہے تو؟ تم کو نہیں جانتے تھے؟

اب محسن نے لپٹ کے لے کر بچھا۔ اچے گوشہ شہر کی زم جنوں کی اور دلاور محالی کے گھوڑے، وہ مجھ جیوٹ کے غالب کو کھٹ گیا اور وہ ایک دوسرے کو دبانے اور کچلے مارنے لگے۔ ان کے درمیان زیادہ ناقابلِ شفاء تھیں۔ گالیوں کا تہا دل بھی در تنک جاری رہا۔ بالآخر میں نے انہیں الگ کیا۔

میں نے کہا۔ بس کر دیار۔ یہ کیا دیوانگی ہے؟ لوگ دیکھ رہے ہیں؟

لوگوں کی... غالب نے کہا۔ ان کو کیا معلوم کہ یہاں ہم کیسے اکٹھے ہوئے ہیں؟

میں تو سمجھا تھا کہ تو بھولی غرق ہو محسن نے کہا۔

اب یہ تو ایک چھوٹا سا سندھ تھا۔ میں پھر ادیکھا تو سرتیر کے پار لیتا۔ تھکلات میں گھوڑے دوڑا کے آنا۔ تیرا بیڑا غرق نہیں ہوا؟ غالب بولا۔

گل اور ناؤ کہاں ہیں؟ میں نے کہا۔ گل کے پاس سے اور تیرے پاس سے تو حاجی صاحب نے بتا دیا تھا؟

تم کو تم مل چکے ہو ان سے؟ میں نے کہا۔

نام بتاتے تھے کہ تمہیں اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہو؟

حاجی صاحب کے پاس جانے کا خیال کیسے آیا تھا تمہیں؟

مل گیا تھا ایک خدا کا نیک دل بندہ۔ اس نے مجھ سے

پوچھا کہ حاجی صاحب کی دکان کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ کون حاجی۔

یہاں نہ جانے کتنے حاجی ہوں گے۔ وہ کہنے لگا کہ حاجی صاحب

سوات والے جن کی یہاں جوس کی مشہور دکان ہے۔ بعد میں مجھے

خیال آیا کہ یہ اپنا ہم وطن حاجی صاحب ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔

میں ناؤ کے ساتھ گیا۔ وہ بڑا دلکش صفت آدمی ثابت ہوا۔

دکان سے ایسی سوچ کے ہم بھی گئے تھے۔ غالب نے کہا۔

یہ بتا گل کا حال ہے؟ میں نے کہا۔

وہ بالکل ٹھیک ہے۔ محسن نے کہا۔

اور ناؤ۔ وہ تیرے ساتھ تھی تو اب کہاں ہے؟ غالب

نے کہا۔

وہ علی گڑھی واپس۔ اسی فایا اشارہ بول میں میرا حال ہمیشہ

ہوئے ہیں؟ محسن بولا۔

فایا اشارہ بول؟ یہاں؟

محسن ہنسنا۔ ایک جانا شاکہ نہ بھڑکا ہوا تھا ہے۔ ہم نے

کون دیکھا۔ ہونے تو بھوت ہوں گے یا کڑی بولوں

لیکن پادریہ ہمیشہ سنی میں تو وہاں بھی نہیں چھوڑے انسانوں نے۔

شیشان اور قبرستان تک نہیں چھوڑے جہاں پر بھوت و دیو

رہ سکیں۔ اس میں بھی ایک نہیں چارہ خانان آباد تھے۔ بڑے بڑے بھٹاک سے رہتے ہیں اور بہت خوش ہیں کہ ساحل سمندر پر ایسی رہائش گاہ ملی۔
”وہ بھی بالکل مفت۔۔۔“

”مفت یہاں موت بھی نہیں ملتی۔ فی خانان پانچ سو روپے ادا کرتے ہیں کسی کو جس نے کہا۔ ایک خاندان نے ہمیں عارضی رہائش کے لیے ایک کوریڈور میں جگہ دے دی۔ اس کے پانچ سو روپے مقررہ بہت محفوظ جگہ ہے۔ صبح میں ایک ڈاکٹر کے گئے تھے۔ اس نے کوئی بچہ اور تروادی زخموں پر لگانے کے لیے۔ اور کھانے کے لیے۔ بعد میں میزبان فیملی کی کوئی رقم دل خانان حاجی علی کی دیکھائی گئی تھی کہ کسی کو یہ پیسہ اور اس کو زخموں پر لگاؤ۔ اور اب میں ناندو یا گل میں سے کسی کو قائل نہیں کر سکا کہ حاجی علی کی کامت نہیں۔“
”میں دو تھکے ہوئے ہوئے بیٹھتے ہوئے۔۔۔“

”راہروہی ملی۔“
”میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ابھی تک تو نہیں ملی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ملی تو کہاں ملے گی اور کب ملے گی؟ ملے گی یا نہیں؟“
”ملے گی یا نہ۔ مالوس مت ہو۔ غالب نے کہا۔ جب تک وہ ملے گی نہیں ہم یہاں سے جائیں گے نہیں۔“
”تلاش تو میں بھی کر رہا تھا لیکن مسئلہ وہی ہے کہ اس پورے جزیرے پر کوئی ایک جگہ ہوتی تو ہم وہاں چلے جاتے۔“
”اس نے دنگا دنگا کہا تھا۔ میں نے کہا۔“

”دنگا سے لوگ واپس جا رہے ہیں۔“ محسن بولا۔ ”اور دنگا بھی چھوٹی جگہ تو نہیں ہے۔ اس کے آگے پیچھے غیر ہم طرف ننگا دھکیں گے۔“

”یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے آئے۔ جب یہ بھر جرم ہو جائے۔“
”غالب نے کہا۔“ یہ مشکل تو اسے بھی ہوگی کہ کہاں دیکھے۔“
”یاد رہے ایک تو نہیں آسکتی۔ وہ خبیث چاند بھائی ضرور اس کے ساتھ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”مردود غلامی فوجدار۔ زبردستی راہروہ کا پناہ بنا ہوا ہے۔ اس کے دوسرے حکم کے غلام بھی ساتھ آ سکتے ہیں۔“

”ہمارا نقصان ہے اس میں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم انھیں نہ دیکھ پاشیں مگر وہ ہمیں تلاش کر لیں۔“ غالب نے کہا۔
”اس بار کچھ بھی ہو جائے۔ بس ایک بار مل جائے راہروہ پھر ایسی کی تھی چاند بھائی کی۔ یاد نہیں یا نہیں۔ میں راہروہ کو واپس نہیں جانے دوں گا۔“ میں نے کہا۔

”خواہ مخواہ اپنا خون مت جلا۔ ابھی تک چاند بھائی نے کوئی دشمنی نہیں کی ہے ہمارے ساتھ۔“ محسن بولا۔ ”وہ دوست اور مددگار ہی رہا ہے۔“

”نہیں چاہیے مجھے اس کی دوستی اور مدد۔ میں نے چلا کے

”کہا۔“ میں نے بتا دیا ہے کہ راہروہ ہمارے ساتھ رہے۔
”بھئی جاؤ جرم میں۔ اگر راہروہ ساتھ نہیں ہوگی تو میں نہیں چلاؤں گا۔“
”ساتھ۔“

”اچھا اچھا۔ یہ مت سمجھ کہ ہم تیرے قتلے میں چاند بھائی حمایت کر رہے ہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”میرے ذہن میں ایک ایک جگہ ہم ایک ساتھ رہنے کے بجائے الگ الگ ہو جائے ہیں۔ چاند بھائی طرف دیکھتے رہیں گے۔ ایک طرف میں۔ دوسری طرف غالب۔ تیسری جانب ناندو اور چوتھی طرف آپ خود۔“
”لیکن نازو ہے کہاں؟“ غالب نے کہا۔

”اور ہمارا آپس میں رابطہ کیسے رہے گا؟“ میں نے کہا۔
”ناندو اس آبی ہوگی۔ وہ ایک چیز بنے گی بھی جو ہم نے تین سو ڈالریں خریدی تھی۔ اس خیال سے کہ کام آئے گی۔ بلکہ شخص جو رہی ہے بڑے مشہور انداز میں بیچ رہا تھا۔“ محسن نے کہا۔
”ایسی کیا چیز ہے۔۔۔“

”دو دو ٹائی ہیں۔ بہت چھوٹے، ٹیلی فون ریسیور جتنے بڑے کو میٹر کی طرح ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”پینسل تاریخ سیل سے چلتے ہیں۔“
”کہاں آئے گی وہ؟“

”محسن ہنسنا۔ اسے بھولی، باطن کی آنکھ سے ہمیں ظاہر کی آنکھ سے دیکھ۔“

”ایمانک میں نے بھی نازو کو دیکھ لیا۔ ہم چلتے چلتے پھران ڈکانوں کی قطار تک آ گئے تھے جس کے آڑ میں حاجی صاحب کا جو سب سے بڑا نازو بڑے اطمینان سے ایک مجھے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی ہوئی تھی اور ہم اس سے بہت کم فاصلہ برداشت سے باتیں کر رہے تھے۔ یقیناً ہماری نظر نے کئی بار بجلی کے کھبے کو اور اس کے نیچے والے کھبے اور تیلن میں ملبوس بے پستے شخص کو دیکھا ہوگا مگر کسی نے بھی اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ ہم سب ذہنی طور پر نازو کو اس جیلے میں قبول کرنے کے لیے تیار تھے اور ہمارے خیالات کا محور بھی راہروہ کی ذات تھی چنانچہ نازو کو روٹی میں ہونے کے باوجود کسی نے نہیں ہیچانا۔“

”غالب سخت خفیہ ہو کر اس کی طرف بڑھا۔“ نازو۔
”کون ہے یہ تو؟“ نازو نے غم کے کہا اور ایک قدم آگے آئی۔
”اے یار۔۔۔ یہاں بھی؟“ غالب نے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔
”یہ کوئی جگہ ہے بد معاشی جتانے کی؟“
”کس کو بولا بد معاش؟“ نازو اور گے اگلی۔

”میں فوراً درمیان میں آ گیا۔ دیکھی نازو، معاف کر داسے۔“
”اور میں بھی۔ ہم سب دھوکا کھا گئے۔“
”نازو ہنسنے لگی۔ ”خوب نظر ہے آپ دونوں کی۔ چنانچہ کتنی بار دیکھا ہوگا مجھے۔ ایسے ہی دیکھ رہے ہوں گے آپ بھی۔“

”کیا یہ بات تمہارے آج ہی صبح نہیں کہی تھی؟“ میں نے کہا۔
”مگر جان میری نہیں سمجھا رہے ہیں یا سڑی گئی۔“
”تمہارا کیا خیال تھا کہ تم اتنی آسانی سے چھوڑ دیں گے تمہارے دوسرے نے بھی رولا اور کو دبا کے کہا۔“

”میں نے نفی میں سر ہلایا۔“ نہیں۔ کچھ لوگ آسان موت قبول نہیں کرتے۔“

”میرے اطمینان کی وجہ ایک تو یہی تھی کہ رولا اور سے ملتے ہونے کے باوجود میرے حریف پر اعتماد نہیں تھا۔ ان میں سے ایک کی بہادری میں دیکھ چکا تھا۔ سنا چہرا اپنی بد معاشی کا اشتہار اپنے من کا میاں ضرور تھا لیکن وہ ایک ہی تھیلے کے پٹے پٹے تھے۔ وہ سب ملتے نظر نہاک بد معاش نہیں تھے جتنا خود کو ظاہر کرتے تھے۔“

”زیادہ بد معاشی اس والی ٹائی پر تھا جو میری شرٹ کی اوپر ہی جبب میں تھا جیسے ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھے دونوں طرف سے محسوس کر لیا گیا ہے میں نے بڑی صفائی سے ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے والی ٹائی کے ایک ٹین کو اوپر کھسکا دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ٹین بالکل نیچے دائیں طرف ہے چنانچہ جبب کے باہر ہی سے اس کے اجمار کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اپنا کام کر لیا تھا۔“

”میں جب اوپر والی پوزیشن میں ہوتا تھا تو والی ٹائی ٹرانسمیٹر بن جاتا تھا اور میں محسوس سے بات کر سکتا تھا۔ درمیان کی پوزیشن میں میں سے ریسیور آن ہوتا تھا اور میں محسوس کی آواز سن سکتا تھا۔ جن کو بالکل نیچے کرنے سے والی ٹائی آف رہتا تھا۔“

”اب سمجھ یقین تھا کہ ہماری سب گفتگو محسوس کے کاؤسے تک پہنچ رہی ہوگی لہذا کسی سے مدد کی درخواست کرنے کی ضرورت نہیں۔ محسن فوراً غالب اور نازو کو تباہے گا کہیں گرفتار ہوں اور وہ میرے کچھ کرنے سے پہلے ہی ان دونوں دلاؤں کو گھیر لیں گے جو راہروہ کی طاقت سے جو بڑے شیخ حاصل کر کے بہت اکر رہے تھے۔ خالی ہاتھوں سے بھی میں ان کی فتح کو شکست دینے کے لیے تیار تھا لیکن میں نے خطرہ مول لینا ہے سو دیکھا۔“

”میرے کہاں چلے جا رہے ہو؟“ دائیں طرف دلے۔
”میں نے ڈانٹ کر کہا۔“ ادھر چلو۔“
”آؤ می کو مدد دے رہے ہیں چلنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔“
”نہیں نے کہا۔“ ویسے تم کو تو میں ٹیڑھا تر چھا چل کے بھی دکھا سکتا ہوں اگر بڑی طرح سلیپے۔۔۔ اور خطرانی کی طرح جھومتا ہوا۔۔۔“

”ایسے۔۔۔“
”بس بس۔۔۔ ہم تمہارا اسکرین ٹیڑھ لینے نہیں آئے۔“
”دوسرے نے درشت لہجے میں کہا۔ میری چال کے عملی مظاہرے نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔“

”میں نے کہا۔“

”اس مسئلہ کا ایک آسان حل ہے۔“ غالب نے کہا۔ ”ایک بچہ اور نازو کو دے دو۔ دوسرا تم اور محسن رکھو۔“

”محسن ہنس پڑا۔ انھیں والی ٹائی کی کیا ضرورت ہے؟“
”یہ بھی کچھ غلط نہیں کہا آپ نے؟“ غالب بولا۔ ”ہم واک بھی رکھتے ہیں۔ اور نازو بھی۔“

”ہاں بھئی۔“ محسن نے ٹھنڈی آکھیر کے کہا۔ ”یہ سب تمہارے لیے تو ہے۔ یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی چوچو تو تم دونوں سامنے بیٹھے نظر رکھو۔ مگر دیکھو نظر سے اوجھل مت ہونا۔ اور ضرورت بالک مت کرنا۔“

”چونکہ نازو مردانہ لباس میں تھی اس لیے غالب نے بڑی بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ لکھا اور پھر کمر میں ہاتھ ڈال کر چل باز گل خان۔ دوسرے لمبے وہ زمین پر لپٹا لپٹا ہوا نظر آیا۔“

”ساتھ چلنا ہے۔ تم مجھ سے اتنی دور ہو کر پھر یہ نوبت نہ کہ۔“
”نازو نے کہا۔ تم کو سونپنا چاہیے۔۔۔“

”غالب اٹھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ مجھے تو ڈوب مزنا چاہیے اس میں۔“

”میں اور محسن ہنستے ہوئے آگے چل پڑے۔ پھر ایک جگہ ہم غائب ہوئے۔ اپنے اسٹے پر الگ جہانے کا فیصلہ کر۔ والی ٹائی بہت گامہ مات ہوا۔ میں اور محسن اطمینان سے باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی جگہ ہمارے درمیان یہ فاصلہ ایک کوی میٹر سے زیادہ نہیں رہا۔ میری نظر دنگا کے قریب دو چار میں شخص پڑھی۔ رات کے ساتھ ساتھ رونق ماند پڑتی جا رہی تھی اور دنگا سے لنگھنے والے آگ بہت کم رہ گئے تھے۔“

”مجھے بالکل اندازہ نہیں ہو کر ان دو افراد نے کہاں سے اور کب یہ اتفاق شروع کیا۔ وہ تو اچانک میرے دائیں بائیں آ گئے اور پھر مجھے سے قدم ملا کے چلنے لگے۔ ان میں سے ایک کو میں غمزدہ پہچان لیا۔ یہ انھی میں سے ایک تھا جو مجھے اور غالب کو ان کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا تھا اور دوسرا ہم سے وعدہ کر کے جھاگ گیا تھا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہے لیکن باقی دوسرے کے متعلق میں نے اپنے ان کے زیادہ دغلازمت نہ کی تھی۔“

”تم کچھ آگئے؟“ میں نے خود کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا۔
”ہاں۔“ ابھی سیدھے چلے جاؤ۔ ایک نے میری پیسلوں کے پتھر لپٹا اور لگا کے کہا۔ تم نہیں جاؤ گے تو تمہاری جان جلے گی۔“

مین صوفی کے پیچھے وہ شخص پیش نظر ہوا تھا جس نے مجھے ایک دو تین کر کے گولی مار دی تھے کا ارادہ غلام رکھا تھا۔ اس کا دوسرا ساقی محال کی دیوار سے لگا ہوا میرے پیچھے کودتا تھا۔ دو ایسے ہی حکم کے غلام ادائیں اور بائیں جانب بھی، اڈا بلا محاذ پر بشارت فرما رہے تھے وہ سب خونخوار شکاری سگنوں کی طرح اپنے آقا کے ایک اشارے کے منظر تھے اور شکار کو یعنی مجھے یہ تاثر دیتے ہیں مصروف تھے کہ بس اب کوئی دم کی بات ہے چنانچہ مجھے کلمہ شہادت منور پڑھ لینا ہے۔

لیے ہم اس کا متحہ اوپر نہیں اٹھا۔ میری توقع کے برعکس اس نے اس خبر کے شفقہات سطر پر محسوس ہوا اور کچھ تلاش نہیں کی۔

نہ قبول ہو گئے ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ اسے کوئی بات

ایک ڈوری کھینچ کے اس نے پردہ ہٹا دیا۔ درمیان میں ایک شفاف چوکھٹا نمودار ہو گیا اور اس شیئے کی پارٹیشن کے

پارہ دوسرے کمرے کا منظر شکوٹ لیسے روغن ہو گیا، جیسے سینہ پال کی تاریں ہیں اس کمرے پر غم کو منظر آجاتے۔

وہ کمرہ اجیرا انداز آرائش میں شان امارت کا منظر تھا لیکن اس وقت میں نے کمرے کو نہیں اس شخص کو دیکھا جو میرے ملاقات کا مقصد تھا اور ایک دم مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے ہزاروں سال پہلے پہلے میں نے غریب گرجا میں ہوں یا ایک کنوینشنل کمرے کی شکل کے نکل کے تو رہیں اور کیا ہوں نہیں سگار تلمذ میں دبانے پھر کا جسم بنا رہ گیا کوئی کمرے سے دل کی طرف گئی تھی اس شخص کا ایک ہی تھی اور میں دیکھ کر تھی میری روح آنکھیں پھر اس کے ایک ہی جگہ تھی تھیں اور میں جیسے کہ تریں ساکت اور بند ہو کر ہو گیا تھا میری عقل کے ساتھ میرے دل میں بھی خواب دے گئے تھے۔

دو لوٹ لے کر وہ پارہ کیا اور واپس آئے ہوتے پر یوں اس جگہ بیٹھ گیا یہاں سے وہاں تھا لیکن یہ وہاں سے ہوئے کے ہتھ مڑتے اس شخص کو دیکھتے ہیں جو میرا دل واہی حریف چوہدری دلاور تھا۔ یہ سب ایک ناقابل یقین دار ناخواب لگتا تھا۔ ایک ایسی سنگین حقیقت جس کو تسلیم کرنا ہوتے میرا جو خوف کی سرد برفانی سب کے نیچے غلوں ہوتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چوہدری دلاور۔ یہاں۔

"کیا تم اس سے ملنا چاہو گے؟" دو لوٹ لے کر۔

میں جیڑی طرین چو نکا۔ سگار میرے ہاتھ سے گر گیا۔ دو لوٹ مجھے گھونٹا رہا۔

"کیا میرے اختیار میں ہے؟" میں نے سفارشات اعتماد و بحال کرنے کی کچھ بوجہ دہر دہر کرتے ہوئے سگار کو اٹھا کے بلانا مشورہ کیا۔

ہاں اگر تم نہیں چاہتے تو میں اسے واپس کر دیتا ہوں حالانکہ میں اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ دو لوٹ لے کر۔

"اس سے مجھے بہت معمولی شکر ہے؟"

"کس قسم کی پیش کش؟" میں نے جواب دیا۔

"گفتی ہے اس نے میری زندگی؟"

"یقین کی بات انہیں نہیں کوئی لیکن وہ پرس میں اپنے یقیناً تصانیف زندگی کی اس کے نزدیک معمولی قیمت نہیں ہو سکتی گمان ہے؟"

سوچا اس نے کہا کہ کیا تھا اور میرے پہلے ہی متونی ما متار میں نے کہا کہ کیا مطلب... اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

دو لوٹ لے کر اس نے کہا کہ اب نہیں بتایا۔

"کہنا تو بتاؤ ہو گا؟" میں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص تمہارے اس عمل کے ایک کمرے میں اتنے طرین ناخ

سے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو چکا ہے۔ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں بہت کچھ جاننا ہو گا۔

دو لوٹ لے کر اس نے تھکے سے اسے بتایا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر دو کوسوں پر ہاتھ رکھ کر دوڑا۔ دو لوٹ کا دھڑکتا ہوا چپ پھر انداز ہوتے لگے تھا۔ میں نے غم سے بریک ڈاؤن کا شکار رہ کر تھا۔ میں نے لگائی کہ وہ میری قوت پر ہوا داشت کو نامہ دے گا۔ اس نے مجھے ہتھ دلا کر ایک ہتھک دھکا کے ایک پڑاؤت کیا یا کالہ کر دیا تھا۔ وہ اپنی ہر حال سے لطف اندوز ہونا تھا تھا۔ ہاتھ نہیں لہاتی حالت پر قابو پا لیا۔ میں نے سگار بڑی عجیب صورت حال سے۔

میرے اس شخص کے۔ میں نے اسے دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ ممکن ہے تمہیں سب کچھ معلوم ہو لیکن تم نے بتا دیا ہے۔ باقی ابھی تک تمہیں کچھ پتا نہ چلا۔ وہ کچھ دوسرے شخص میں بہت متاثر ہے۔ وہ بدست ایکن ہے۔ کبھی کبھی باطن کا پتا نہیں چلتے دیتا اور حقیقی زندگی کو ایسا دور بنا دیتا ہے جسے کوئی نہیں سمجھتا۔ بالکل شہد بہت پڑاؤت میں ہے اور اتنا ہی پڑا دھوکے باز، جیسا کہ وہ میری روش میں ہے۔ فاسیا آج کی دنیا میں کامیابی کے لیے آدمی کا ان بدعات سے مزین ہونا ہے ضروری ہے۔

"میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اگر جان کی مالان ہوں تو عرض کروں کہ تمہیں اس کے کچھ ہاتھ لگتے ہو؟" میں نے کہا۔ پہلا اثر غلط بھی ہو سکتا ہے۔

"اب کچھ اپنے بارے میں بتاؤ؟"

"پہلے بائیسویں... کیا بتاؤں اور کیا بتاؤں؟ یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ مختصر یہ کہ وہ میرا حال و معن ہے۔ شاید تم میری سگار ابھی تک میرے اور تمہارے درمیان دھنکی کا قاعدا لگاتے نہیں ہوا ہے۔ یہ اس شخص کا ہر حال ایک دھنکی ہوں۔ دھنکی کو سب کے ہی بہت ہوتے ہیں اس کے سبب لڑائی لڑائی ہوتا ہے۔ مشکل سبب لڑائی کے کھولنے اور قانون کا احترام کرنے والے میں ایک غلط رنگ دھنکی ہوں جس سے وہ زیادہ دلتا ہے اتنا ہی نہیں میں اس سے ڈرتا ہوں۔ ہماری دھنکی کے رشتے ایک ہمواری میں ہیں۔ میں اسے اپنے ہاتھ کا قائل سمجھتا ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ سے وہ کچھ بھی ہاتھ لے کر وہ سب کچھ جو آپ لے میرے لیے چھوڑا تھا اسے مل جائے۔

"کیا وہ تمہارا تھا؟"

"میں کسی شخص یا سوز کا۔" اسٹیلان کا کھال کھانا پڑ گیا۔

مگر اس کا نہیں، میں نے میری سے کہا۔ میرے لیے تو اس کی

میں نے بائیسویں... کیا بتاؤں اور کیا بتاؤں؟ یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ مختصر یہ کہ وہ میرا حال و معن ہے۔ شاید تم میری سگار ابھی تک میرے اور تمہارے درمیان دھنکی کا قاعدا لگاتے نہیں ہوا ہے۔ یہ اس شخص کا ہر حال ایک دھنکی ہوں۔ دھنکی کو سب کے ہی بہت ہوتے ہیں اس کے سبب لڑائی لڑائی ہوتا ہے۔ مشکل سبب لڑائی کے کھولنے اور قانون کا احترام کرنے والے میں ایک غلط رنگ دھنکی ہوں جس سے وہ زیادہ دلتا ہے اتنا ہی نہیں میں اس سے ڈرتا ہوں۔ ہماری دھنکی کے رشتے ایک ہمواری میں ہیں۔ میں اسے اپنے ہاتھ کا قائل سمجھتا ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ سے وہ کچھ بھی ہاتھ لے کر وہ سب کچھ جو آپ لے میرے لیے چھوڑا تھا اسے مل جائے۔

"کیا وہ تمہارا تھا؟"

"میں کسی شخص یا سوز کا۔" اسٹیلان کا کھال کھانا پڑ گیا۔

مگر اس کا نہیں، میں نے میری سے کہا۔ میرے لیے تو اس کی

میں نے بائیسویں... کیا بتاؤں اور کیا بتاؤں؟ یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ مختصر یہ کہ وہ میرا حال و معن ہے۔ شاید تم میری سگار ابھی تک میرے اور تمہارے درمیان دھنکی کا قاعدا لگاتے نہیں ہوا ہے۔ یہ اس شخص کا ہر حال ایک دھنکی ہوں۔ دھنکی کو سب کے ہی بہت ہوتے ہیں اس کے سبب لڑائی لڑائی ہوتا ہے۔ مشکل سبب لڑائی کے کھولنے اور قانون کا احترام کرنے والے میں ایک غلط رنگ دھنکی ہوں جس سے وہ زیادہ دلتا ہے اتنا ہی نہیں میں اس سے ڈرتا ہوں۔ ہماری دھنکی کے رشتے ایک ہمواری میں ہیں۔ میں اسے اپنے ہاتھ کا قائل سمجھتا ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ سے وہ کچھ بھی ہاتھ لے کر وہ سب کچھ جو آپ لے میرے لیے چھوڑا تھا اسے مل جائے۔

"کیا وہ تمہارا تھا؟"

"میں کسی شخص یا سوز کا۔" اسٹیلان کا کھال کھانا پڑ گیا۔

مگر اس کا نہیں، میں نے میری سے کہا۔ میرے لیے تو اس کی

میں نے بائیسویں... کیا بتاؤں اور کیا بتاؤں؟ یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ مختصر یہ کہ وہ میرا حال و معن ہے۔ شاید تم میری سگار ابھی تک میرے اور تمہارے درمیان دھنکی کا قاعدا لگاتے نہیں ہوا ہے۔ یہ اس شخص کا ہر حال ایک دھنکی ہوں۔ دھنکی کو سب کے ہی بہت ہوتے ہیں اس کے سبب لڑائی لڑائی ہوتا ہے۔ مشکل سبب لڑائی کے کھولنے اور قانون کا احترام کرنے والے میں ایک غلط رنگ دھنکی ہوں جس سے وہ زیادہ دلتا ہے اتنا ہی نہیں میں اس سے ڈرتا ہوں۔ ہماری دھنکی کے رشتے ایک ہمواری میں ہیں۔ میں اسے اپنے ہاتھ کا قائل سمجھتا ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ سے وہ کچھ بھی ہاتھ لے کر وہ سب کچھ جو آپ لے میرے لیے چھوڑا تھا اسے مل جائے۔

"کیا وہ تمہارا تھا؟"

"میں کسی شخص یا سوز کا۔" اسٹیلان کا کھال کھانا پڑ گیا۔

مگر اس کا نہیں، میں نے میری سے کہا۔ میرے لیے تو اس کی

میں نے بائیسویں... کیا بتاؤں اور کیا بتاؤں؟ یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ مختصر یہ کہ وہ میرا حال و معن ہے۔ شاید تم میری سگار ابھی تک میرے اور تمہارے درمیان دھنکی کا قاعدا لگاتے نہیں ہوا ہے۔ یہ اس شخص کا ہر حال ایک دھنکی ہوں۔ دھنکی کو سب کے ہی بہت ہوتے ہیں اس کے سبب لڑائی لڑائی ہوتا ہے۔ مشکل سبب لڑائی کے کھولنے اور قانون کا احترام کرنے والے میں ایک غلط رنگ دھنکی ہوں جس سے وہ زیادہ دلتا ہے اتنا ہی نہیں میں اس سے ڈرتا ہوں۔ ہماری دھنکی کے رشتے ایک ہمواری میں ہیں۔ میں اسے اپنے ہاتھ کا قائل سمجھتا ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ سے وہ کچھ بھی ہاتھ لے کر وہ سب کچھ جو آپ لے میرے لیے چھوڑا تھا اسے مل جائے۔

"کیا وہ تمہارا تھا؟"

"میں کسی شخص یا سوز کا۔" اسٹیلان کا کھال کھانا پڑ گیا۔

مگر اس کا نہیں، میں نے میری سے کہا۔ میرے لیے تو اس کی

”غلط فہمی۔ یعنی وہ مجھے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے، اور میں نے ان کے عزائم کو سمجھنے میں غلطی کی تھی؟ کیا تم تباہی و قوت سمجھتے ہو مجھے؟ میں نے بگڑے کلمہ“

”جس شخص کی بے وقوفی نے غلط فہمی پیدا کی تھی وہ پہلے ہی مارا جا چکا ہے۔ باقی میں اس کا حکم ماننے کے پابند تھے اگر وہ جی جاتا تو اس غلطی کی سزا مجھ سے ملنا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے تمہاری مخالفت کے لیے ان کو بھیجا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تمہارے اصل دشمن پہلے نہ پہنچ جائیں۔ یہ کوئی بہت بڑا کام نہیں تھا لیکن جسے میں نے بھیجا تھا وہ احمق ثابت ہوا۔ اس نے غلط افراد کا انتخاب کیا اور غلط طریقہ اختیار کیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب وہ تم سے ملے تھے تو تنہا میں تھے“

میں اس کی باتیں جھڑپ سے سن رہا تھا اور ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اس کی کس بات کا یقین کروں اور کس کا ذکر کروں؟ میرے اصل دشمن آخر کون ہیں؟

”جین کو تھماؤں دجہ سے نقصان ہوا“ وہ بولا ”کیا تمہاری ان سے کوئی کاروباری رقابت تھی؟“

”کن سے۔۔۔؟“

”جین کی لاچ تھی، بھانوسہ“

میرے تن بدن میں الگ جھرجھی، کاروباری رقابت ان سے جو برودہ فروش ہیں، اس کا مطلب ہے تم مجھے برودہ فروش کہہ رہے ہو، برودہ فروش نظر آتا ہوں میں صورت سے؟ میں نے جیج کر کہا۔

”چلاؤ دست۔ یہ صورت کون سی اصلی ہے تمہاری؟“ وہ بولا ”اور اگر یہ کاروباری جھگڑا نہیں تھا تو پھر تم نے یہ حماقت کیوں کی؟“

”کیسی حماقت؟ میں سمجھتا ہوں یہ خوش قسمتی سے میری مجھے فخر کرنا چاہیے اور مزدور کرنا چاہیے اب بات پر کمر نہ لانا نیت فروشوں کی ایک کوشش برحال نا کامی ہوئی۔ میں ساری دنیا کی عورتوں کو نہیں بچا سکتا اور سارے برودہ فروشوں کو جینٹر رسید نہیں کر سکتا لیکن مجھے بے حد خوشی ہے کہ کچھ عورتوں کی زندگی میری وجہ سے بچ گئی“

وہ پہلی بار سکرایا ”تم لاکھ بڑا باقی احمق ہو۔ تم نے ملاوچہ ہانگ اڑائی تھی اس معاملے میں۔ نہ تمہارے لیے کوئی فوریات ہے اس میں اور نہ خوشی کی تم سے کسی کی زندگی نہیں بچائی۔ وہ سب آج رات پولیس کی تحویل میں ہیں، کل انہیں سبے سہارا عورتوں کے آشرم میں بھیج دیا جائے گا، پھر تحقیقات شروع ہوں گی اور ختم ہو جائیں گی، ان سب کو پولیس پھر اکٹھے کے پاس پہنچا دے گی جو انہیں ایک چھوڑ کر رہے تھے کیونکہ اخلاقی طور پر پولیس اس کی پابند ہے“

”اخلاقی طور پر؟ میں دم بخود رہ گیا۔“

”ہاں، کیونکہ اپنا حقد وہ پہلے ہی وصول کر چکے تھے اور ان لوگوں کو دو دو چار چار کے الگ الگ جہازوں پر بھیجا جائے گا۔“

صدرے اور احساس شکست سے میرا دل ٹوٹنے لگا مگر اُن کے دلی وارث۔ کیا وہ معلوم نہیں کریں گے۔۔۔؟

”کیسے معلوم کریں گے؟“

”اخبارات میں ان کے نام تصویریں۔۔۔ سب ملنے ہونے کے بعد۔۔۔“

اُس نے کہا ”تم واقعی بے وقوف بوراں میں سے نفوذ تو اپنی مرضی سے جاری نہیں۔ باقی دور دراز کے علاقوں سے لائی گئی تھیں، اخبار لکھنے کو گھر بڑھتے ہیں اور بیجی کے اخبارات نکلنے آسمان ہمارا ڈھاکا بک جلتے ہیں۔ یہ خبر بیجی تک محدود رہے گی، اس کے علاوہ تصویریں صرف ان کی خانہ بوں کی جو اپنی مرضی سے جاری ہیں تھیں، انہیں واپس لے جانے والا کوئی نہیں باقی کے نام پتہ شانہ، ہوں گے تو وہ غلط ہوں گے، کیونکہ سب معلومات پولیس ہی فراہم کرے گی۔ نفیثش کے محل ہونے تک اُن کے بارے میں خبریں شانہ بونی رہیں گی آج مزید بارش لگناں آشرم سے فرار ہو گئیں، آشرم کوئی جیل نہیں ہے کہ ان پر فتنے داری عائد کی جا سکے، وہ دو چار مہینے بعد کوئی مذہبی لوگ ان کی ملازمت اور نہ گواہ۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تم نے ایک جذباتی حماقت کی تھی“

میں نے غصے میں سر ہلایا ”میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا تھا ٹھیک کیا تھا اس کے بعد کیا ہوتا ہے اس کا مجھ پر کوئی فتنے داری عائد نہیں ہوتی، میں دنیا میں اس انسان فروشی کے کاروبار کو ختم نہیں کر سکتا تو یہ میری بد قسمتی نہیں ہے، فروشی اور اس کے ساتھیوں کو مار دیا، بڑی نیکی کا کام کیا“

”یہ نیکی تم کو بہت مشکل پڑتی، معلوم نہیں کیسے تم ان کی نفرت میں نہیں آئے جو فوراً ہی تم کو سامنے پر تلاش کرنے پہلے گئے تھے۔“

”شاید وہ ہی نہ تھے میرے کام آگئی،“ میں نے کہا۔

”وہ تمہیں حاجی علی کی درگاہ پر بھی تلاش کر رہے تھے تم وہاں کیوں گئے تھے؟“ اس نے کہا۔

”وہاں میرے علاوہ بھی ہزاروں لوگ تھے، وہاں کیوں جلتے ہیں لوگ؟“ میں نے کہا۔

”سوال کے جواب میں سوال مت کر دو،“ اس نے کہا ”وہاں دو قسم کے لوگ جاتے ہیں، حاجت مند یا اسمگلر۔۔۔ تم کیا ہو؟“

”میں۔۔۔ حاجت مند۔۔۔“

”اب اگر تمہارے آدمی جیج میں نہ کوئی دھڑکتے“ میں نے بیخالی اس ایک آنکھ جو میرے اندر دفن ڈھکی کھڑ تھی۔

”انہی کی دجہ سے تم بچ گئے۔۔۔“

”میں اس جھوٹ کا مقصد نہیں سمجھ سکا، اگر وہ میرے غلط تھے تو انہوں نے میری جان لینے کی کوشش کیوں کی تھی؟ میں متشکل تھے میں نے کہا ”ملاؤ اسے جو ابھی یہاں بڑا مسکین سا بچا ہوا تھا۔ اس غمگین کے بچنے نے مجھے تقریباً گولی مار دی تھی، میں تھا کہ میں تین تک گنوں گا۔ اور اس کے بعد کیا ہوا میرے ہاتھ؟ یہ دیکھو،“ میں نے اپنا سر جھکایا، سر کے پچھلے حصے میں ایک دھڑکتی نایاں تھا۔

”السا کرنا مزہری ہو گیا تھا، تم اُن کا پھر وہی حشر کرتے ہو جن کی کر چکے تھے“ وہ بولا ”گوئی مارنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ غور سے غور کو بچایا اور تمہیں اٹھالائے۔“

”وہ مجھ سے خرافات سے درخواست بھی کر سکتے تھے؟“

”نہ وہ شریف آہی تھے اور نہ انہیں تمہاری خرافات کا یقین تھا کیا تم اُن کی درخواست قبول کر لیتے؟“

میں نے کہا ”ایمانداری کی بات ہے کہ نہیں۔ ایک بار اُن عداوت پر چکا تھا، دوسری بار میں کیسے اُن کے ساتھ چل چڑھا تو وہ مجھے جنت میں لے جانے کے لیے آتے، مگر انہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ میں اس وقت حاجی علی کی درگاہ پر ہوں گا؟“

”انہیں پتی نے بتا دیا تھا۔“ وہ بولا۔

”پتی نے۔۔۔ میں نہیں مان سکتا۔۔۔“

”وہاں، میں تمہیں مجبور تو نہیں کر رہا ہوں ماننے پر ایسکین کی ایک ذریعہ تھی تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا تم اسی کے ساتھ تھے“

ایک نئے دہشت زدہ کر دینے والے خیال نے میرے ذہن کو بھی گرفت میں لے لیا۔ یہ شریف لوگ نہیں تھے اور پتی پر بے پورا بھروسہ تھا کہ وہ دعا دینے والی عورت نہیں تھی۔ اُسے کھانکا کہ دشمن ہمارے پیچھے گئے ہوں گے، اس سے پہلے ہی میں نے معلومات حاصل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ انہوں نے یقیناً غلط طریقہ اختیار کیا ہو گا۔

”کیا۔۔۔ طریقہ اختیار کیا تھا انہوں نے؟“ میں نے جانا سنا ”انہوں نے ضرور تشدد کیا ہو گا اس پر۔“

”کیا ہو گا۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔“

اس کے لبوں سے الفاظ نکلے ہی تھے کہ میں نے ایک است لگائی اور اس کے اوپر جاگرا۔ میں نے اس کی کوئی گردن کو اٹھایا۔

”معلوم کرو، منور کے بچے۔۔۔ پوچھو ان نکوٹوں سے کہ

انہوں نے پتی کے ساتھ کیا کیا۔۔۔ ورنہ۔۔۔“

اُس نے بڑی پھرتی سے اپنا ریلوور نکال لیا تھا۔ ہرٹ جلاؤ میں تم کو ماننا نہیں چاہتا، وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

دو منیوٹا انہوں نے مجھے ایک جھٹکے سے بچھڑکھینچ لیا اور اسی صوفے پر بچھڑک دیا یہاں سے میں نے اشتعال کی یونانی میں جھلاگ لگائی تھی، صوفے پر گرے تھے ہی میں پھر اٹھا تھا مگر مجھے اپنے مقابل وہی دونوں نظر آئے جو مجھے یہاں لانے تھے۔ ان دونوں نے ریلوور سے میرے سر اور سینے کو نشانہ بنا رکھا تھا۔

دو بوٹے اپنی ٹانگی کی ٹاٹ درست کی اور ریلوور جیب میں ڈال کے پھوٹوں بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

”پتی کے پاس تم دونوں تھے کتنے؟“

”میں سر۔۔۔ ان دونوں نے بیک زبان کہا۔“

”وہاں کیا ہوا تھا؟ تم بولو“

جس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا وہ فخر بولنے لگا ”وہ پست بتانے پر آمادہ نہ تھی اس نے کہا کہ تم کسی کی بات کر رہے ہو میں نے کہا اُسی کی جو تمہارے شوہر کا ہم شکل تھا اور جسے تم شوہر بننے کے لیے یہاں بھیج لائی تھیں“

”میرا خون کھولنے لگا“ تم نے یوں نہیں کہا ہو گا میں جانتا ہوں تمہارے جیسے لوگوں کو۔۔۔“

”پہلے پوری بات سن لو“ وہ بوٹے نے کہا ”پھر کیا تم نے مارا ہے؟“

”نہیں سر۔ اس کی ضرورت نہیں آئی“ وہ بولا ”ہم نے دو ملا طریقہ اختیار کیا۔ ہم نے کہا کہ خود کو خراب مت کرو پولیس تم کو اٹھا کر لے جائے گی رات بھر میں تم سے وہ دس شوہروں کے نام پتے پوچھ لیں گے، وہ پھر بھی خوفزدہ نہیں ہوں گی اور ہم پر چلائے گی کہ جاؤ پولیس کے پاس اور جو تمہارا جی چاہے کرو۔ کوئی سیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، میں ابھی رات کو فون کرتی ہوں، ہم نے کہا راج صاحب سے یہ بھی کہنا کہ کئی ستمبری (دھڑکتا، میں جھٹکے شوہر کی قبر پر بھی ہزار گواہیں دن رات، سارا سال کے لیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چور ڈاکو تمہارے شوہر کا ڈھانچا نکال کر لے جائیں، ڈھانچے بڑے بڑے ڈنگ فروخت ہوتے ہیں، میڈیکل کے طالب علم خرید لیتے ہیں، ڈاک فید اور فاسفٹ بنانے والے بھی لے لیتے ہیں۔ سر پتی کا بیک ڈاؤن ہو گیا۔ وہ جتن بٹائی، ہم کو مارنے کا نئے دھڑکی، لیکن ہم نے اس کو اور کچھ نہیں کہا، میں ایک تھوڑے ضرور مارا تھا تاکہ وہ بولیں میں آجائے، خوش میں آنے کے بعد اُس نے بتا دیا کہ حاجی علی کی درگاہ پر جا کدیکھو، ہم نے کہا کہ دیکھ لیتے ہیں مگر یہ جھوٹ ہوا تو ہم پھر آئیں گے، آج کل

لزام موجود تھے۔ میں تقدیر کے اس انوکھے مذاق پر بیک وقت ہنسنا اور رونا پاتا تھا۔ میرے ذہن میں بہت سے اگر، تھے جو سانپوں کی طرح پسٹکار تھے۔ آگہیں نے لافٹ بوٹ سے لایچ پر پہنچنے کے بعد مغل سے کہا لیا ہوتا۔ اگر میں جذباتی ہو کے اپنے مقصد کو فراموش نہ کرتا۔ وقت کے تعاون کو قبول کرتے ہوئے تھوڑی سی بے بسی، تھوڑی سی خود غرضی اور تھوڑی سی شرمندگی کو قبول کر لیتا۔ یہ سمجھ لیتا کہ مجھے اپنی آنکھیں بند رکھنے ہوتے اس راستے سے پہچاننا نہیں ہے جو منزل کی کارستہ ہے خواہ میرے دائیں بائیں ادا آگے پیچھے کچھ بھی ہو جائے، اگر کسی سمجھاؤشی کے سامان تجارت کو جاننے کی کوشش ہی نہ کرتا، اگر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بروہہ درخشاں گروہ ہے تو میں ان کے خلاف اعلان جنگ نہ کرتا۔ حالانکہ یہ ناممکن نہ تھا تو فریضے کسی بھی جبری جہاز کے سپرد کر دیتا اور میں خاموشی سے بمبئی پہنچ جاتا۔

بڑھوڑے نے دلاؤ کو مطلع کر دیا تھا کہ ہم جاڑ کو تباہ کر کے بمبئی پہنچنے والے ہیں چنانچہ دلاؤ پہلے سے ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اگر ہم خاموشی سے پہنچتے تو وہ ہمیں تلاش کرتا رہ جاتا مگر اتنی جری بمبئی کی آبادی میں ہمارا سرخ رنگ دکھانا لیکن ہم تو پہنچنے پوری ہر گھنٹہ آدائی کے بعد یوں کہ بندر گاہ کے علاقے میں خود ہی گیا۔ اگر اس کے بعد ہمیں ہم درپوش ہو جاتے اور تلی کے ساتھ نہ جاتے تو ہمیں کوئی کیے تلاش کرتا۔ تلی ہی ایک ذریعہ بن گئی اور اس پر جانے لگی۔ سانی سے میرا سرخ رنگ دکھایا جس نے مجھے اپنا باڈی گارڈ مقرر کیا تھا اور دلاؤ سیدھا اس کے پاس آ گیا۔

یہ سب جھوٹ تھا کوئی ایسا ڈراما تھا جسے میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ میری بہادری سے متاثر ہونے والی بات فقط زرب داستان کے لیے تھی۔ وہ مجھ سے کچھ اور کام لے گا، یا وہ دلاؤ سے میرا سوکارے گا۔ ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہو رہا تھا یا کوئی خطرہ کہ شتم کا جو ٹھکانہ وہ لے لیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی جیسے لوگ تھے۔ ان کے کاروبار کے اصول اور مقاصد ایک تھے۔ ان کے درمیان اشتراک ممکن تھا۔ روپوٹ مجھے بلیک میل کرنا پاتا تھا۔ یہ یا میرے بدلے میں دلاؤ سے زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کے فکر میں ہے۔ بہر صورت میں اس قصرِ عالی شان میں قید تھا اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ روپوٹ نے مجھے اپنے سب سے بے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن مجھے جھوٹ کے جال میں اسیر کر لیا تھا۔ اس طرح کچھ سیری کا احساس بھی نہ ہو۔

اب حقیقی صورت حال یہ تھی کہ میں اور غالب سے بچ کر چکا تھا۔ رابعہ کا صرف تصور کر سکتا تھا۔ وہ میرے لئے قریب آ چکی تھی کہ میں اس کی آواز سن سکتا تھا اور پھر میں خود کسی کو کچھ بتائے

بغیر غائب ہو گیا۔ اب کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے پاس ان سے بچھرا رابطہ قائم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ بے شک رابطہ کی ایک جگہ تو ملی گا کھر ہی تھا۔ دوسری جگہ حاجی صاحب کا بھائی سٹر تھا اگر وہاں میرا بیٹا ایک ہی صورت میں ممکن تھا کہ میں اس محل کی قید سے فرار ہو جاؤں۔ یہ کام اتنا جیسے مشکل تھا جتنا میرے ساتھیوں میں سے کسی کا اندازہ بھیجنا جانا معلوم نہیں بعد میں ان سب پر کیا جیتی... کہیں وہ بھی...

اجا ملک مجھے ایک اور خیال آیا۔ روپوٹ کے کہنے کے مطابق اس کے آدمی تلی سے میرے بارے میں معلومات حاصل کر کے حاجی ملک کی دکان پہنچے تھے۔ دلاؤ کے آدمی وہاں کیسے پہنچے؟ تلی نے تو زیادہ سے زیادہ میرے اور غالب کے بارے میں بتایا ہوگا۔ وہ محسن، نازا اور گل سے تو واقف ہی نہیں تھی۔ لیکن دلاؤ کے آدمی گل کے سوا سب کو پہچانتے ہوں گے۔ بچہ کیا انھوں نے باقی لوگوں کو بچھوڑ دیا ہوگا، بگل شاید محفوظ رہی ہو۔ کیونکہ وہ ساحل پر موجود تھی مگر باقی سب پر کیا جیتی؟ جو مجھے گرفتار کر کے تھے، کیا وہ ناکام لوٹ گئے ہوں گے؟ نہیں۔ انھوں نے تلاش جاری رکھی ہوگی اور اس وقت جب کہ زائرین بھی بہت کم رہ گئے تھے، رابعہ کے ساتھ محسن اور غالب کے ساتھ نازا انھیں مزبور مل گئے ہوں گے۔ بچہ کیا ہوا، کیا ان کے درمیان مقابلہ ہوا، یا غلامانہ سنجار ڈالنے والے تو وہ لوگ بھی نہیں تھے۔ اب جس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ ایک ہی تھا کہ دلاؤ کے آدمی میری تلاش میں وہاں کیسے پہنچ گئے؟ کیا انھوں نے بھی تلی سے ہی سب کچھ معلوم کیا ہوگا؟ اس کے سوا تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ہم یہاں بل سکتے ہیں اور ملنے کی کار کے خبر نہ اُن کا مسئلہ کر دیا ہوگا۔ یہ ہماری خوش فہمی تھی کہ گنگنی کی رجسٹریشن اُس کے شوہر کے نام پر ہے جو میرے پاس ہے اور پتا بھی پڑتا ہے اس لیے تلی ملک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ تلی نے خود اتنی گنگام بھی نہ تھی۔ اس کے پاس ٹیلی فون بھی تھا اور ٹیلی فون کا فہر ڈائریجری میں ہوگا۔ غمیر کے ساتھ اس کا پورا پورا دائرہ ہوگا۔

میں ٹپٹے ٹپٹے اور سوچتے ہوئے تھک چکا تھا۔ گنگنی ملک کچھ نہیں سمجھ پایا تھا کہ میں کہاں ہوں کہ اس کے ساتھ ہوں اور میرے ساتھ کیا ہوئے دلاؤ ہے۔ مجھے اپنے لئے پڑا سرکار باس کے باڈی گارڈ کی تنہیت سے کیا کرنا ہوگا اور اگر دلاؤ کے ساتھ جانا پڑا تو کیا ہوگا۔ میری حالت اس راہ کم کہ وہ مسافر کی تھی جو پورے ملک میں بے گھر رہا ہو مگر بھلی آگے جا کے بند ہو جائی ہو میرے سب خیالوں کے راستے میں ایک جگہ پہنچنے کے خیال میں گم ہو جاتا تھا۔

بالآخر میں نے طے کیا کہ قریب طور پر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میری کوششوں کا کامیابی یا ناکامی کا اندازہ دار نہ دلے وقت کے فیصلوں پر ہوگا۔ جبکہ اور سماجی مکان بہر حال ذہن کو تیار کرتی

ہے۔ رہنا دھوکہ پیٹ بھرنے اور سکون سے رات بسر کرنے کے بعد میں یقیناً میری قوت فیصلہ بہتر ہوگی اور میں جہاں طور پر بھی حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ یہی سوچ کے میں نے باختر دم کا رخ کیا۔

لیے باختر دم میں نے فلموں میں دیکھے تھے۔ باختر ہوں کے مملات تو اب تاریخی عمارات بن چکے تھے مگر یہ یاد دینا کہ دولت مندوں کی شان و شوکت کے انسانی عام تھے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی باختر دم تھا جس کی تزیین پر بلا سافرا لکھوں روپے صرف کیا گیا ہوگا۔ اس وقت مجھے خاصی خفت اٹھانی پڑی جب میں نے ایک سوچ دہانے کا تجربہ کیا۔ سوچ پر مددگار لکھا ہوا تھا۔ چند یکنزد کے بعد ہی لڑکی اندر آ گئی مجھے اس خواب گاہ ملک لائی تھی اور اس نے بڑی دلنشیں مسکراہٹ کے ساتھ تلی کی غسل میں میری مددگار اداہ ظاہر کیا تو میں گھبرا گیا۔ اپنی اماں کے ہاتھوں کے سوا جنھوں نے مجھے نو سو سال کی عمر تک تنہا لیا تھا، آج ملک میں نے اپنے ہاتھوں سے خود ہی غسل کیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اندھکسی میں آ رہی ہو؟ میں نے خشکی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ عجیب بے شرم لڑکی ہو۔ دیکھتیں نہیں کہ میں نہاد ہوں؟

"لیکن آپ نے ہی مجھے طلب کیا تھا سر؟" وہ میری گھبراہٹ سے کلفت اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ "آپ کی مددگار میرے رقص میں شامل ہے؟"

"بھالائیں گئے فائنل۔ تم جاؤ یہاں سے؟" میں نے ٹپ میں غرق ہو کر اپنی ستر پڑی کا اہتمام کیا۔

"لا حول و لا قوۃ" میں نے اس حسین مددگار کے باپس لوٹ جانے کے بعد کہا۔ یہ انجام تو نامے سوچے سمجھے بغیر کچھ کرنے کا۔ جب اس سوچ پر صاف لکھا ہوا تھا، مددگار، تو پھر لرزے دبا کر نگاہ لینے کی کیا ضرورت تھی، اس نیک شائستہ باختر تو ایسی ہی مددگار سکتی تھی۔ یہ سب دولت مندوں کے پیش پرستی کے انداز میں جن میں بنیادی ضرورت کی نذرانہ خور کو گھما جاتا ہے۔ رہنما کو صرف بھانہ ہوتا ہے اس خیال کی تصدیق میرے چاروں طرف دیواروں پر محیط آئینے بھی کرتے تھے، جس میں دو بوں تو آنکھ نظر آتے ہیں اور ایک آدمی بھی ایک حمام والے کا در سے پرخیز کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

آدھے گھنٹہ تک میں نے اسٹیم باختر لیا اور جسم کی ساری تھکن کو خود بخود ارحیاب سے بھرے ہوئے گرم پانی کے ٹپ میں دھو ڈالا۔ ڈرنک روم میں ہر سزاوارہ ہر ضرورت کے لیے مردانہ اور زنانہ کپڑے موجود تھے۔ میں نے سمند کے پانی میں بیچے ہوئے کپڑے دھوئے جو پھولے پہلے اپنے لیے خراب خوانی لکھا۔ اس شہنشاہ کی گھر کا روادہ بل دیا بغیر میں محال

مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع ملا تو یہ ٹائٹ سوٹ بدلنے میں وقت ضائع ہوگا۔

ایک آدمی آستین والی روفیس اور گرسے پتلون مجھے فٹ آگئی۔ دو خاتونیں مجھے ہونے جوتوں میں سے کافٹ لیدر کے دو جوتے بہت قیمتی تھے گریں نے جانگنٹ ٹوڑ کا انتخاب کیا جو دوڑ لگانے کے لیے بہترین ہوتے ہیں۔

باہر نکلتے ہی مجھے ایک اور صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ کمرے میں ایک ہی تنگ سائز بیڈ تھا۔ اٹھ ٹھٹھ لمبا اور اونچائی چوڑا۔ اس کے ساتھ ہی گول ٹیشری قالین پر اٹھوٹ کی کپڑی اور باختر دانت کے کام والی گول منڈریل تھی اور ٹیبل کے گرد چار کٹھن چیرہ تھیں۔ ان میں سے ایک کرسی پر ایک لڑکی فلم فیئر کا آئہ شادہ بچھ رہی تھی۔

اُس کا بڑا سا ریلے کے نیچے بنایا ڈرنک ڈو کا دروازہ کھلا تو اس نے رسالہ پٹایا اور میں نے اپنے سامنے ایک آشکھوت کو دیکھا۔ اُس نے اس کی معاون و مددگار تھی جس نے اپنے شہنشاہ کے سب سے بڑے کو کٹر و ل کیا تھا۔ لایچ پر بیٹھیں اسے بہت مستعد دیکھی تھا اور میں اس متاثر بھی ہوا تھا۔ میں نے مسوں کی آٹھار وہاں وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن مجھے اس سے براہ راست بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"تم؟ یہاں؟ میں کچھ بچھا رہا گیا۔" وہ آہستہ سے مسکرائی اور اُس نے رسالہ بچھ رکھ دیا۔

"اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟"

"میں تو سمجھا تھا کہ وہ بھی تنگ خواب ختم ہو گیا لیکن ابھی تک میں اسی لایچ پر ہوں۔" میں نے انھوں سے سر ہلایا۔

وہ ہنس پڑی۔ دیکھ لو کہیں یہ تو خواب نہیں ہے؟" اُس نے ہاتھ بڑھا کے میرے بازو پر چسکی لی۔

میں نے بازو پر نمودار ہو جانے والے لال نشان کو دیکھا جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ "خواب میں تم نے چٹکی لینے کے بھانے مجھے نوحہ کیا ہے۔ بہت تیز ناخن ہیں بھالائے۔"

وہ چہرہ ہنسی اور میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ اب ایک بالکل مختلف لڑکی تھی اس نے میوون کر کے جارحیت کی ساری باندھ رکھی تھی اور ایسا بلاؤز پہن رکھا تھا جس کی ماہر فن درزی نے اس کے جسم کی ایک ایک شکن، قوس اور عم کو بدن میں رکھ کے سیاتھا اور اس کے بھر پور بدن کو درستی پڑے کے ساتھ میں ڈھال دیا تھا۔

"میں تھا اگر یاد آ کر دے آئی ہوں کہ تم نے مجھے بچا لیا۔" وہ چلیں جھکا کے بولی۔ "ہم معلوم نہیں کیا ہوتا؟" "جو سب کے ساتھ ہوتا؟" میں نے کہا "اور مجھے تو بتایا گیا ہے کہ میں نے تمھارے مادی بطن کی ناگامی اڑا کر، ہوگا اب بھی وہی جو پہلے ہوتا تھا ان سب کے ساتھ؟"

پارٹنر بننے کو ترجیح دے رہے تھے۔ "کمانے کہا؟ اُس نے اپنے کھروار میں ڈیڑی کو مرا کر مارک شریک بنانے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن تم سے بات کرنے کے بعد ڈیڑی شک میں پڑ گئے تم نے کہا تھا کہ یہ شخص پہلے ہی اپنے دو بڑے پارٹنرز کو شکاٹے لگا چکا ہے جس میں ایک تمہارے چاچے تھے ایسے شخص کا بڑے پارٹنر بننے میں خطرہ تھا ظاہر ہے ڈیڑی سمجھے سوچے بغیر فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے دلاور کو مال دیا کہ میں جملت میں فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔ پھر جب وہ چلا گیا تو انہیں نے ڈیڑی کو بچھڑایا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں جس شخص نے میری زندگی بچائی اُس کے احسان کا یہ بدلہ دیں گے؟ ڈیڑی نے کہا کہ اس کے احسان کو میں نہیں مانتا۔ ہاں اگر میں اُسے بھیجتا کروں فلاں لالچ پر سے سکلا کو بھڑا لاؤ اور وہ تمہیں لے آتا تو احسان مجھ پر بولتا یہ تمہاں سے جو کچھ کیا تھا اپنے لیے لے گیا تھا۔ ڈیڑی کی اس بات پر میرا بہت جھگڑا ہوا اُن سے کہ یہ تو آپ جان بوجھ کر خود کو بھار رہے ہیں ورنہ احسان تو ہے۔ آخر کس کی وجہ سے میں واپس آئی اور وہ شخص اگر اپنی جان بڑھیل کے بچا تو ایسی کوئی دلاور نہیں لانا تو میں کہاں جاؤں کچھ اناڑہ ہے آپ کو کہ میرے کون خیریتا اور میں کس کے حرم کی فریفت ہستی؟ کیا آپ کے سامنے مجھے آپ کی ساری دولت اور افسوس، سب مجھے تلاش کرنے میں کام آ سکتے تھے؟ ... کہاں سے واپس لائے آپ مجھے ..."

"ایک بات بتاؤ۔" میں نے درمیان میں اس کی بات کاٹ کے کہا۔ "آپ آخر تھکے ڈیڑی جیسے شخص کی بیٹی کو اغوا کر کے لے جانے کی ہمت کس نے کی؟"

"ان کے دشمن بھی بہت ہیں اور سب کہتے ہیں چھپ کر داکر نہ والے۔ خیالاً راکھوں کو اغوا نہیں کوئی بدعاشی ہے؟"

"تھکے ڈیڑی ایسے نہیں ہیں؟"

"اُس نے کچھ تامل کے بعد کہا۔ "اب نہیں ہیں۔"

"کیا اس کا مطلب ہے کہ پہلے تھے؟" میں نے کہا۔

"اُس نے نظر جھکال دیا، جو کچھ میں نے جھگڑتا ڈیڑی کے اعمال کا ہی حجازہ تھا انھوں نے کسی کی بیٹیا اغوا نہیں کی وہ وقت گزر گیا اور میں جوں ہو گئی۔ کوئی انتظار کرنا ہر نامناسب وقت کا بھڑکنا نہیں ہے اُن کا کیا کہیسی عجیب بات ہے۔ تمہارا باپ کہتے ہیں سزا والا کو ملتی ہے۔ مجھے بھی ملے تو قصور کس کا تھا؟"

"کیا تمہاری ڈیڑی جانتے ہیں اُسے؟"

"آپ جان گئے ہیں۔ وہ بولی۔ میں نے کہا کہ آپ دشمنوں کے بچانے محنتوں کو سزا دیں گے۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی اور اگر ایسا تو سزا گندہ مجھے اپنی اماں کی، میں خود کشی کر لوں گی۔ بس اس کے بعد ڈیڑی کا جو صلہ جواب دے گیا۔ وہ شراب کے نشے میں تھے۔ انھوں نے مجھے کالیاں دی کر مارا، تو میں چلی جا

اپنے بار کے ساتھ۔ دفع ہو جاؤ دونوں۔ میں دونوں کی صورت نہیں دیکھوں گا وہاں دیکھ کر میرے دل میں ہلچل مچے گی۔ اصل بات یہ تھی کہ انھوں نے تم کو میرے خولے کر دیا تھا؟"

"میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے ایک نیکی کا صلہ عطا کرنے میں مدد نہیں کی۔"

"گو یا میں بال بال بچ گیا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، دلاور کی قید میں جانے سے تو بچ گئے۔ وہ ٹوٹی ہوئی شکر کے بولی۔ "مگر اب میری قید میں جو ہے سزا موت ہو جائے اُس کی تم کی درخواست پر کیا فیصلہ ہوتا ہے؟"

"میرے کان کچھ بولے۔" کیا فیصلہ ہوتا ہے؟"

"سزا موت کو عمر قید میں بدل دیا جاتا ہے۔" وہ بولی۔ "مگر عمر قید کا ٹٹا ہو گیا اب ... میرے ساتھ ..."

"میرا دل ڈوبنے لگا۔" لیکن ... تم نے تو کہا تھا ..."

"میں نے کہا تھا کہ چاہنے کی لو، پھر چلے ہیں۔" وہ بولی۔ "میں کہا تھا نا؟"

"مگر ... تمہارے ساتھ ..."

"ایکے جا سکتے ہو تم؟ ذرا جا کے دکھاؤ۔" وہ ہنس کر باہر نکلتا تو دھڑک بات ہے، اس کمرے سے باہر کہاں تک جا سکتے ہو۔

"کوشش کرو۔"

"مگر میرے ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟" میں نے دل کو ضبط کر کے کہا۔

"جہاں تک تم لے جاؤ گے۔" وہ بولی۔ "یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں تم سے کوئی بھی ایکل نہیں رہ سکتا۔ نہ میں نہ تم شرط یہی ہے ..."

"میں اس شرط کو نہیں مان سکتا میں رہ سکتا ہوں تمہارے بغیر بھی۔" میں نے ہنسی سے کہا۔

"لیکن میں بہر حال نہیں رہ سکتی۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہ میں نے ڈیڑی کو بھی بتا دیا تھا۔"

"کیا بتاؤ یا تمہارا دانا ..."

"وہاں تو اسی وقت خراب ہو گیا تھا جب میں نے تمہیں دیکھا تھا لیکن میں اُس وقت مجبور تھی۔ تمہیں حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اب تم مجبور ہو ..."

"میں بالکل مجبور نہیں ہوں۔ یہ خیال نکال دو اپنے دماغ سے کھلا دیو کی تم مجھے عمر بھر کے لیے قید کر سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"ناممکن ہے۔"

"کیوں ناممکن ہے؟"

"اس لیے ... کہ تم ہندو ہو اور یہ شک پاسپورٹ پر لکھا ہوا ہے۔" لیکن وہ دھڑکی لال لکھا ہوا ہے ایک دھڑکی نہیں سکندہ بخت ہوں ہر قوم و مذہب کا بیٹا نہیں ایک مسلمان ہوں۔"

"پھر کیا ہوا، عشق کا کون سا مذہب ہوتا ہے۔" مگر میں نے نیل دت سے شادی کی تھی یا نہیں اور وہ والائے جس کا اصل ہم ممتاز بیگم تھا شکر کمار سے، مینا کمار سے، کمال مراد ہوی سے ..."

"بس بس، یہ فلمی دنیا کے کس میں اور حقیقی دنیا میں بھی ایسے کس ہیں تو مجھے کیا؟" میں نے کہا۔ "جس کام کو تم آسان سمجھتی ہو وہ میرے لیے ناممکن ہے۔"

"پہریشان کیوں ہوتے ہو۔ میں مسلمان ہو جاؤ گی، پھر تو کوئی اعتراض کی بات نہیں رہے گی نا؟"

"میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔" کمال! خدا کے لیے مجھے کسی کو شش کر دہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے فیصلے ہوں نہیں کیے جاتے اور جو فیصلے کرتے ہیں وہ مرانا ہی چاہتے ہیں؟"

"میں نہیں بچتا ہوں گی۔"

"کمال! میں کسی اور کو پھانتا ہوں۔ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔" میں نے رو دینے کے انداز میں کہا۔ "پھر شادی کا کیا سوال؟"

"تم مسلمان تو دو خدا دیاں بھی کر لیتے ہو ..."

"لا حول و لا قوہ کیا غلط ہو گئی ہے اب؟" اسے بابا کو کوئی فرق نہیں ہے۔ مجبوری کے تحت انتہائی سخت شرائط کے ساتھ مخصوص حالات میں اس کی اجازت ہے۔ میں نے شتعل ہو کے کہا۔ "میں جنت کی بات کر رہا تھا، مجبوری کی نہیں۔ مجھے کوئی مجبوری نہیں اور محبت میں صرف ایک سے کر سکتا ہوں وہ مجھے رابہ سے ہے۔ جب تک رابہ کی محبت میرے دل میں ہے کسی اور سے محبت کرنا میرے لیے انتہائی ناممکن ہے جتنا ایک وقت زندہ رہنا اور جرات نا۔"

"مجلو تم محبت نہیں کر سکتے مجھ سے، مت کرو۔ محبت تمہیں اُس رابہ سے ہے تو اسی سے رکھو مگر مجھے کیوں روکتے ہو؟ اگر میں تم کو محبت کرنے سے نہیں روک سکتی تو کیا تم روک سکتے ہو مجھے؟ میری بھی تو مجبوری ہے۔ اسے سمجھو۔ تم رابہ سے محبت کرو۔ میں تم سے کرتی ہوں گی۔ اس میں تو کسی کا نقصان نہیں ہے تم تمہیں خوش رہ سکتے ہیں ..."

"کمال! تم پاگل ہو گئی ہو۔" میں نے دھماکے کے ساتھ کہا۔ "ناممکن ہے ... وہ ناممکن ہے۔ نہ تم میرے ساتھ جاؤ گی کیوں نہیں تمہارے ساتھ جانا چاہتا کروں گا میں دلاور کے ہاتھوں مر جانا قبول کروں گا۔"

"اُسی وقت وہ رازہ کھلا اور چہ ہری دلاور کے ساتھ کھلا کلاپ اندا گیا۔ اس کی آنکھوں کو میں اب بھی سیاہ شیشوں والی عینک کے نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر نفرت کی آگ کی تپش لوہوں دودھ سے بھی محسوس کر سکتا تھا جو اس کے چہرہ کو چلا رہی تھی۔ میں نے اس کی بیٹی کو کھلا کر اُس کی ناٹھو کر ماری تھی۔"

"میں نے کیا کہا تھا ... میں جی ... جو ہری دلاور نے اپنے مخصوص انداز میں شکر کے کہا۔" اپنے سکندر اعظم صاحب بالکل وہ ہیں، کیسے کہتے ہیں اسے گتے کی دم ... میرے ہونے والے نہیں ہیں۔"

"کمال! رنگ فٹ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے خشاروں پر بیٹھے والے آنسوؤں کے اوٹ سے میری طرف دیکھا پھر اپنے باپ کی طرف جو غم غم وہ سناپ کی طرح بھنگا رہا تھا۔ اس کی ہر سانس میں زہر بھرا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ اوپر اٹھا۔

"خیال تھا کہ اب وہ چٹکی بھائے گا اور جیسے چراغ کو گڑھتے ہی رابہ کے سلسلے جن کو نشہ لایا تھا ایسے ہی کوئی کھم کا غلام فوراً حاضر ہو گا پھر چاکل کسے جاؤ گی طرح اس کے ہاتھ میں رابہ اور آ جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

"غالباً ترلونی نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ حد درجہ چالاک اور عیار آری تھا جس کی جس خطرے کی کوکبہ میں گتے کی جس کو مات کرتی تھی اور اس کی آنکھیں کالے پستے کے نیچے سے ناہلیت تھیں کر دال میں کچھ کالا ہے۔ شاید اسے سید دکھا ہی نہ دیتا ہو۔ سادوں کے اندھے کو ہر ایسا برا کو جیتا ہے تو کالے دھندلوں سے کالا دھن بنانے والوں کو کالہ لای کا لاف نہ سکتا ہے۔

"ترلونی کی بیٹی کو کبھی یہ صفات دشنے میں ملی تھیں۔ فرق صرف ان کی عمر اور تجربے کا تھا نا، ہم باپ کے معاملے میں وہ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے کا مطلب بول سمجھ لیا جیسے بوشیار لوگ خط کا معنوں عجیب اپنے لیے لٹاؤ ڈیکھ کر۔

"یہ نہیں ہو گا ڈیڑی۔" اس نے میرے سامنے آ کے کہا۔

"ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" ڈیڑی نے کہا۔

"مجھے آپ کی نیت پر شک پہلے ہی تھا۔ آپ مجھے ٹریپ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔"

"تم خود ٹریپ ہو جاؤ گی۔ یہ معلوم نہیں تھا مجھے۔" اس نے کہا۔

"یہ اُور اے نول۔"

"آپ اس شخص کو کیوں لائے ہیں یہاں؟" کمانے دلاور کی طرف انگلی اٹھا کے کہا۔

"تم خود کیوں آئی ہو یہاں؟"

"آپ کے حکم کی تعمیل کرنے۔" وہ طنز سے بولی۔

"اچھا تو پھر میں حکم دیتا ہوں کہ اب واپس اپنے کمرے میں جاؤ۔" ترلونی نے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" کمال اڑ گئی۔

"مکمل بسنے کچھ باتیں کرنی ہیں ..."

"ترلونی نے لہجہ بدل کے کہا۔

"باتیں آپ میری موجودگی میں بھی کر سکتے ہیں ..."

"فعلول خدمت کرو۔ میں زبردستی بھی کر سکتا ہوں۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ بیٹی کے سلسلے تریوینی کے لیے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔"

کملانے نئی میں سر ہلایا۔ آپ ایسی غلطی نہیں کریں گے ڈیڈ جس باپ کو چھٹا تا پڑے۔ آپ ایسا کوئی کام کرتے ہی نہیں جس کی وجہ سے چھٹانے کی نوبت آئے۔ میں بھی تو آپ کی ہی بیٹی ہوں۔ آپ کو اتنا ہی سمجھی ہوں جتنا آپ مجھے سمجھتے ہیں۔ میں خاموش تماشائی بن رہا رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کلا کی حیرت نے فوری طور پر مجھے اتنا غصہ خور و زحام کر دیا تھا کہ تریوینی یا اس کا کوئی غلام یہ سب سے نزدیک نہیں آ سکتا تھا اور مجھ پر کوئی نہیں چلا سکتا تھا۔ اس سے یہاں بہت حال حاصل نہیں ہوتی تھی کہ میرے لیے خطرے کی بات ہی نہیں رہی اور میں کلا کی مدد سے آزادی بھی حاصل کر سکتا ہوں۔ اگر تریوینی حالات کے بل پر مجھے غلوب کرنے کی کوشش کرتا تو میں کلا کو حمال کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ یہ موقع مجھے خود کمانے فراہم کیا تھا اور اچھی تو وہ رضا کارانہ طور پر ڈھال بنی ہوئی تھی۔

چوہدری دلاور بھی باپ بیٹی کے مکالمے سننے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی صورت پر تریوینی میں مایوسی کا سایہ نظر آتا تھا۔ اس غیر متوقع صورت حال نے اس کی سیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ جہاں شکاری بن کے نہیں چلا رہے تھے نہ ان کے ہاتھ شکاری کو اپنا نشان بظاہر بوجھانے کے ان کا نام کو مقلد بظاہر رکھنا پڑتا ہے لیکن یہ شخص پھر سے میں نہ مریخی خریدے جاتا ہے۔ اس سے تو یقین ہوتا ہے کہ مریخی ہانے نامالک ایک ہاتھ سے مریخی کو دلوچ کر اس کے حوالے کر دے گا۔

خاموشی کا ایک بہت مختصر وقفہ آیا جس میں میری نذر دلاور کی نظر سے ملی اور میں اپنے لبوں کی مسوڑاڑنے والی سکاٹس سے اس کی مایوسی میں اضافہ کرنے میں کامیاب رہا۔ دلاور کی آنکھیں شکر لگیں۔ مانتے پر شکوک کی تعداد بڑھ گئی اور اس کی چہرہ راز فاحشہ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

تریوینی سیاہ چھٹے کے چیمبر سے اپنی نالائق بیٹی کے ساتھ ساتھ مجھے بھی گھوم رہا ہو گا۔ اس کی آنکھوں کی حرکت نظر ہی نہیں آتی تھی اور گردن گھمانے کا وہ قائل ہی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی بے جان جیسے کی طرح ساکت تھا مگر اس کے روشن گلوب نما سر کے اندر عقل کا کچھ بڑا پوری طرح فعال و متحرک تھا۔ اچانک کملانے صورت حال کو مزید غراب کر دیا مگر صرف اپنے والد صاحب کے لیے اور ان کے مہمان کے لیے۔ اس نے اپنے ملاؤں کے زمانہ سیٹ ڈیباٹ والٹ میں ہاتھ ڈالا اور ایک ننھا سا خوبصورت ریلواری ڈال لیا۔ یہ اعشاریہ بائیس کا لیلیز ڈال کو بلاولٹ تھا جس کے سفید ہاتھ دانت والے دستے پر

بلتے دلفریب نقش و نگار تھے۔ نقل کا سامان کرنے والے بھی کیا کمال کرتے ہیں۔ رنگا رنگ اور ادا رانے جس سے کوئی بھی بچ جائے تو اس باتوں میں اتنا حسین دلاور دیکھ کے مرنے کی تمنا کرنے لگے۔

"نکل، پاگل ہو گئی ہو کیا؟"

"جی میں بدقسمتی سے باطل پاگل ہو گئی ہوں۔" کملانے کہا۔

آپ ہوش میں ہیں۔ اگر آپ نے کوئی سوچا کیا ہے تو اسے سنو کر دیں اور جانیں اس خبر پر کیا دیکھ کر رھت کریں۔"

دلاور ہنس پڑا۔ کبھی وہ یہ کیا باتیں بوری ہی میں آتی دیر سے۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔

"وہ کیا ہے اپنے چوہدری صاحب! میں نے کھلا کے اگلا صاف کیا۔ اگر بات تو بڑی کوئی سی ہے۔ یہ جو خیال ہے اپنے تریوینی صاحب کی نور چشم نسبت بچہ دینے ہے۔ یہ اس وقت مرنے مارنے پر کمر بستہ ہے۔ اور یہ جو اقل اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بھی تو فائدہ اٹھاتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس باغی بیٹا کو کیا خیال ہے۔ مگر اتنے کم فاصلے سے آپ کے سر پر بڑی کیڑے ہیں۔"

"خواب تو آپ پہلی شب سے آگے اپنی پانی پانی پڑاؤ نے طغیان کیا۔ انہوں نے آپ کا دوا۔ اور بڑی دانا بنی ہے اور بھانڈوں کی جوڑی خوب رونق لگاتی ہے۔"

"وہ ایسا بے چارہ چوہدری صاحب! کیا بار بار نہ وصیت باقی۔ آپ آپ پہلے ہی جان دیا۔ اچھا ہے۔ میں نے کہا۔ یہ بھو کہ معاملات زمانہ ہاتھوں سے دانا ہاتھوں میں آجائیں۔"

"دلاور! تریوینی نے کہا۔" تم میری بات نہیں مانتے۔"

"ہاتھ تو بچ گئے۔ فائنل! دلاور نے برہمی سے کہا۔"

"کون سی بات دوبارہ ہو گی؟"

"مجھے... مجھ سے جو چاہئے گا۔ تریوینی نے کہا۔"

"اتنے بڑے کاروبار کے مالک ہونے پر مجھ سے سوچ گئے؟ دلاور نے تلخ لہجہ میں کہا۔" یہی ہے تمہاری قوت فیما۔"

"فیصلے حالات کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور حالات اب اگر فیصلے بدل دیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ تریوینی نے کہا۔"

"تم اپنے گھر میں اپنی بیٹی کے سامنے اتنے مجبور وارنے پہلے ہیں ہو..."

"کیا تمہاری کوئی بیٹی ہے؟" آئی بی بی۔ اگوتی سرکش اور ہڈی، "تریوینی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔" مجھے معلوم ہے کہ نہیں ہے۔ اس لیے تم میری بات نہیں سمجھ گئے۔ کملانے کہہ کر دوا مشورہ کر دیا ہے تو اسے سنو۔ یہ سمجھتی احوال کل پھر کی بات بن جائے تو میں نہیں کہہ سکتا۔ میں کوشش کروں گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں ڈیڈ۔ آپ اس آدمی کو جتنا کریں اور اسے اپنے گھر کی حد دے دیں۔ میں اسے ہر حال میں۔ میں کسی قسم کے ہول نہیں لوں گی۔" کملانے کہا۔

"چوہدری دلاور! تریوینی نے کہا۔" ابھی کوئی خاص نقصان نہیں ہوا ہے۔ اور ہوا ہے تو میں اس کی تلافی کے لیے تیار ہوں۔"

مگر بعد میں ایسا نہ ہو کہ یہ پاگل آدمی کچھ اور مانگ بیٹھے۔ مثلاً تمہاری جان۔ میں اسے انکار کیسے کروں گا۔ آج تک اس نے اپنی بات کو اتنی بڑے "اتنی زیادہ اور ایکٹنگ ذکر کر ڈیڈ۔" کملانے کہا۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں آپ کے الفاظ کو اور مطلب کو صرف مجھے مطلب کرنے کے لیے ایسی بات کہہ رہے ہیں آپ۔ یہ تو کیوں آپ سمجھتے ہیں یہ میرا سہرا ہے اور اس دوسرے کی خدمت کو اسی طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے ڈیڈ۔ میں بالکل پریکٹک اور نابل ہوں۔"

ڈیڈ نے سر ہلایا۔ اچھا... جو نہ سوال تھا اور نہ یقین کا اظہار نہ حیرت تھی اور نہ حقیقت کو تسلیم کرنے کا انداز۔ دلاور کی مایوسی البتہ قابل دیدھی۔ وہ اچھا لکھا تھا اور عموماً اپنے حقیقی جذبات کو چھپا لیتا تھا مگر اس وقت جو کچھ ہوا اس کی توقعات کے بالکل برعکس تھا چنانچہ وہ اپنے جذباتی رد عمل پر قابو پانے سے قاصر رہا۔ یہ بالکل بے باک سے دوچار ہاتھ دور رہ جانے والی بات تھی۔ یہ قدرے اس کے ساتھ بہت رسوا کن مذاق کیا تھا۔ وہ مدت سے میری تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس کے شکاری گئے میری یوسٹھجھ پر رہے تھے مگر اس کو آج تک جتنی خبریں ملی تھیں ان کیوں کی ملی تھیں اور ان نقصانات کی ملی تھیں جو اسے اٹھانے پڑے تھے۔ پھر اچانک ایک حادثے نے اسے میرا سراخ دے دیا۔ یہ حادثہ تھا تو سچی، "کی واپسی تھی جس نے مجھے میرا پہلے میری نیک نامی کا چرچا کر دیا۔ مجھے تو حالات نے بھانڈوئی" کے معاملے میں دخل و مقولات پر مجبور کیا تھا لیکن اس معاملے نے میرا راز افشا کر دیا۔ جو مجھے کسی قیمت پر منظور نہ تھا وہ ہو گیا لیکن مجھ کو دلاور کو میرا پتلا لگا دیا۔

ایسے حالات میں دلاور کا کام و نامزد واپس جانا اس کے لیے ایک دلی حد درد تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ تریوینی کس حد تک قابل اعتبار ہے۔ وہ سوداگر کے فیصلہ واقعی مشورہ کرنے پر مجبور ہے یا صرف بیٹی کے سامنے ایسا ظاہر کر رہا ہے۔ اس کا احتجاج اور غصہ سبب کا رکھا۔ نہ یہ اس کا شہر تھا اور نہ گھر تھا اس کی بدعاشی چلتی تھی۔

جب وہ واپس جا رہا تھا تو شاید اسی خیال سے افسردہ بھی تھا کہ میں سچ سچ اسے کلا کی خواہش کے مطابق اس گھر کی حدود سے باہر نکال دیا تو وہ کیا کرے گا۔ دوبارہ مجھ تک کیسے پہنچے گا؟ میرے بارے میں اس کو خوش فہمی کبھی تھی تو اب نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اس بار دوا م سے نکل گیا تو پھر اس کے

خیال کی رہا۔... میں دو نکل جاؤں گا۔ میں اپنا دم بڑھتا ہوں۔ اب بدل لوں گا۔"

جانتے ہوئے دروازے میں رک کے میں باہر پھوٹا نگاہ کی وہ اس کے دلی جذبات کی ترجمان تھی۔ اس کی سس کی جھنجھلاہٹ، بے بسی، غصے اور نفرت کے اس کا ہر رنگ تھا۔ دھمکی تھی کہ اپنے سکندر اعظم، عالم تمام قلعہ دارم خیال ہے۔ زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں کہ ایک احمق کوئی کم پر فریڈ نہ ہو گئی تو تم نے یہ بازی جیت لی۔ دیکھو کہ دلاور کی اگلی چال کب ہوتی ہے اور کیا ہوتی ہے۔

"ڈیڈ ایک بات اور سن لیں۔" کملانے کہا۔

تریوینی نے پلٹ کر اسے دیکھا اور زبان خاموشی میں پوچھا کیا؟

"میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ اور آپ نے کوڈ پکڑ لیا۔ تو... اس نے ریلواری کو کچھ پر رکھ کے ٹرانڈ دیا۔"

"کلا...!۔" بیٹی انسان کی طرح بے حس و حشر آنے والا۔

چھٹے اور بولنے والا۔ لیکن باپ بن کے چلا۔

کلا ہنس پڑی۔ ابھی نہیں ڈیڈ۔ مجھے معلوم تھا کہ ریلواری پر سفری کیج ہے۔ مگر میں سفید کیج ہا بھی سکتی ہوں۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن مجھے سفری کیج ہالک کے ٹرانڈ دے جانے کے لیے روک سکتے ہیں۔ مگر شہر باپ کی جیت گئے تھے۔ اس بارے میں مجھے اپنی نظر سے گریا تھا۔ میں دوسری بار اپنی شکست قبول نہیں کروں گی۔ اس بار آپ ہار جائیں گے۔ اور تب آپ کو احساس ہو گا کہ ہار کیا ہوتی ہے۔ آپ ہار جیت کر یہ کہتے تھے مجھے کہ ہار ہمیشہ دوسروں کی ہوتی ہے تو آئندہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں ایسا نہ ہو کہ اس بار آپ کو شکست ہو جائے۔ آپ کو اس کا تجربہ نہیں ہے۔ آپ کو احتیاط سے کام لینا ہو گا ورنہ آپ خود اپنے لیے عذاب مولیٰ لیں گے۔"

"بس! پھر اور... ہر تریوینی پھر روٹ بن گیا۔ احساس سے عاری۔ غیر جذباتی۔ بیٹی انسان۔"

دروازہ بند ہو جانے کے بعد بھی چند سیکنڈ سکوت کی کیفیت میں گزر گئے۔ پھر کملانے پلٹ کے مجھے دیکھا اور سکاٹنی۔ بے اقتدار میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس سے پہلے جب تک تریوینی اور دلاور ایک چیخ بن کر میرے سامنے تھے، کلا میرے سامنے میرے اتنے قریب تھی کہ اس کی پشت سے میں بہت کچھ دیکھ اور کسی کر سکتا تھا مثلاً بالوں کے ریشم سے جھوٹے، والی ہیک کو اور ان کی دھندلی سی سنہری چمک کو۔ اس کے شانوائی گولائی سے نیچے بتدریج کم ہونے والے کمر کے خم کو اور کمر سے اوپر بلاؤڈ

کے نصف دائرے میں روشن چلے۔ وہ تقریباً مجھ سے لگ کر کھڑی ہوئی تھی مگر مجھے اس سے ڈر نہیں لگا تھا اب مجھے یوں لگا بیٹھے میں نے مدافعت نہ کی تو اسی جذباتی لمحے کی طاقت سے وہ مجھ پر غالب آجائے گی۔ یہ احساس اس کو تقویت دے گا کہ محبت میں جان دینے کا عادی کیے بغیر اس نے ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ میری خاطر کیا کر سکتی ہے۔

"کیا مجھے تمھارا شکر ادا کرنا چاہیے گا میں نے کہا۔

"مجھے کھو کھلے الفاظ کی ضرورت ہی نہیں" وہ بولی اور اپنے ریلو اور کو بڑی مہارت سے تھوڑا سا اچھال کے پھر بیچ کرنے لگی۔ "جو کچھ کیا میں نے اپنی مرضی سے کیا۔"

"کافی شوق ہے تمھیں اس کھیل کی" میں نے اسے بلو اور کو ہوا میں دو تین بار گھما کے بالکل صحیح نوڈ میں پکڑ لیا۔

"ہاں۔ کھلونا اچھا ہے یہ" وہ بولی "ڈیڈی بھی جانتے ہیں کہ میں جان پکھل جاتی۔ بہت جلدی لڑکی ہوں میں" میں بڑے کنا سے پرہیز کیا۔ "ایک بار تم ہانچ کر ہو، جتنے سے ہارنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ پھر تمھیں یہ احساس کیوں تھا کہ تم اپنی نظر سے گر گئی ہو؟"

وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ "یہ بات تو بہت پرانی ہو گئی ہے مگر مجھے کئی بات ملتی ہے۔ ایک میڈم میں دن بعد پورے چار سال بوجا میں گئے۔ اس وقت میں بی اے کے فائل ازم میں تھی اور ایسی نہیں تھی جیسی اب ہوں۔ میں بہت خوبصورت تھی؟"

"تم اب بھی خوبصورت ہو؟"

وہ ہلکی سے ہنسی۔ "اور کیا کہہ سکتے ہو تم۔ سب ہی کہتے ہیں میرے منہ پر مگر میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ میں واقعی بہت حسین تھی اس وقت تم نے مجھے دیکھا ہوتا تو..."

"تو کیا؟" میں نے اس سے نظر چرائے کہا۔

"تو مجھے یوں مستور نہیں کر سکتے تھے" وہ بولی "تم آرزو کرتے میری۔ مجھے چاہئے گی، جیسے اور سب کرتے تھے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے ایک مسکراہٹ کا انداز پانے والے خود کو کتنا خوش نصیب جانتے تھے۔ پھر وہیں تمھیں ایک تصویر دکھائی ہوں؟"

اس نے گلے میں پڑا ہوا لاکٹ میرے سامنے کیا اور پھر ایک چٹکی سے اسے کھول دیا۔ دل کی شکل کا لاکٹ کسی کتاب کی طرح کھل گیا۔ اس کے ایک صفحے میں خود کو کھلا مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ دوسرے صفحے میں ایک نوجوان کا جس کی آنکھوں بڑی عجیب سی پرکشش آوازی تھی۔ تصویر دیکھ کے مجھے کلا کے سچ کا احساس ہوا۔ بلاشبہ وہ پہلے قیامت تھی۔ اس کا حسن پہلے اگر شعلہ تھا تو

اب ایک بجتی ہوئی چنگاری صرف چار سال میں اس کا آئینہ حسن گمن میں آگیا تھا۔ وہ اب بھی پرکشش تھی لیکن وہ قہر بہت نمایاں تھا جو چار سالوں میں پڑ گیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے کہا جالاکٹر میں پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کیوں ہوا۔ اس عمر میں جب حسن کے ماہ کا دل پر شباب کا سمندر چڑھتا ہے۔ اس کی تابانی اور کشش کو کیا ہوا۔

"یہ میری بدصورتی کا ذمہ دار ہے" کلا نے کہا۔ "یہ بھی ایک سکندر تھا جس نے مجھے فتح کیا۔ پہلی بار کسی کوشش کے بغیر اس سے پہلے مٹنے آئے منہ کی کھا کر گئے۔ بڑے خوب رو جوان۔

ذہن اور باصلاحیت۔ شریف زادے اور بارگدار لوگ۔ انھیں مجھ سے ایسی محبت ہوئی کہ وہ تقریباً پاگل ہو گئے۔ وہ مرزا ہوئے اور خوار ہوئے مگر میں کیا کرتی ہوں مجھے ان سے محبت نہیں ہوئی۔

بہت افسوس ہوتا ہے ان کے حال پر اور ان کے ساتھ اپنے دیتے پر۔ لیکن میں زبردستی نہیں کر سکتی تھی اپنے ساتھ۔ ان سب کی بد دعا کی تھی۔ میں اس شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھو ایک معمولی آدمی تھا۔ بالکل گنہگار سا شخص تھا جو ایک باریک شوقی

سلسلے میں میرے پاس آیا تھا۔ میں کالج کی بیرونی تھی۔ ہر ڈرامے میں حصہ لیتی تھی۔ اور بہت کامیاب تھی۔ میری کامیابی کے دو اسباب واضح تھے۔ ایک تو میرے مقابلے پر کوئی بھی نہیں تھا۔

اداکاری کیسی ہے یہ بعد میں دیکھتے ہیں لوگ۔ پہلے اداکارہ کو دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میری وجہ سے ڈرامے کرنے والوں کو ہزاروں کے چیک ملتے تھے۔ میرے ڈیڈی کی طرف سے۔

جب وہ میرے سامنے آیا تو میرا خیال تھا کہ میں اس پر برس پڑوں گی کہ آخر کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟ میں کوئی ایسٹرا ہوں جو بھٹی میں خوار پھرتی ہیں جیسا کہ لے۔ میں ایک ٹیبل بنا جاتی تو میرا باپ خود غم پر دو ڈس کر سکتا تھا میرے لیے۔ اور شوقی

لیے پیسہ چاہتے تو اسی کے پاس جاؤ۔ مگر جب میں نے اسے دیکھا تو... بس دیکھتے رہ گئی۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کی

نسبتی رہی۔ اس نے کہا کہ وہ ایک اچھے ڈرامہ ہے اور ویسے تو بہت سے کھیل کر چکے ہیں مگر ان دنوں ایک چیز نے شوقی انتظام

میں مہر دہ ہے جو ماضی کے ایک نامور اداکار کی مدد کے لیے ہوگا۔ بھٹی میں یہ ہوتا رہتا ہے۔ اپنے وقت کے بہت سے کامیاب لوگ جو فنی دنیا کے کھیل گاتے آتی پر روشن ستارے

تھے فٹ پاتھ کی ڈھول میں پڑے دکھائی دیتے ہیں اور کوئی نہ انھیں جانتا ہے۔ نہ پہچانتا ہے۔ کبھی اچانک کسی کے دل میں ہمدردی کی لہر اٹھتی ہے اور وہ کسی ایسے ہی جھولے بسرے دنوں کے فنکار کی خاطر پیرہنی شوقا اسٹنٹ چلا دیتا ہے۔ جو ملتا

ہے جب میں ڈالتا ہے اور جھگ جالتا ہے۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ ایسے خیراتی شوقی واقعی کسی کو خیرات ملی ہو۔ خیر! جب اس نے

یہ باتیں بتائیں تو میں جواب میں اسے بتا سکتی تھی کہ سب ڈھونگ ہے۔ اول تو وہ مدد دے سکتے تھے نہیں جو کبھی اتنے دو تندر تھے کہ

دنیائیں پر رشک کرتی تھی۔ اب وہ نیا ان کی حالت سے محبت پکڑتی ہے تو غیرت کے ایسے نغزوں کو اسی حال میں رہنے دیتا کہ

آج کے بڑے فنکار پنا آئے والا لکھ سکیں۔ پھر یہ کہ وہ فنکار تھا کہ کیا لگتا ہے؟ تم کیوں پریشان ہو اس کے لیے؟ کیا

اٹیچے جو پیر میں رہا ہے وہ کم ہے؟ وغیرہ وغیرہ مگر میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا اور آخر میں جب اس نے پوچھا کہ تیرے

آپ کام کریں گی؟ تو میں نے کہا کام کی بات تو بعد میں ہوگی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ علیحدہ کتنا دل و دیر مان لیا۔ اس نے کہا کہ

آپ کا تعاون ہی سب سے بڑا عطیہ ہے۔ مگر میں نے اسے پانچ ہزار کچیک دیا اور کہا کہ میں مزید عطیات بھی دلا سکتی ہوں

اور خود بھی کام میں شامل ہو سکتی ہوں بشرطیکہ میرے ساتھ وہ خود بھی ہو۔ اس کا چہرہ ترکا کہ کوئی کمزوری کردار کو کوئی اور کر رہا

تھا۔ میں نے ابھی تک نام نہیں بتایا اس کا؟ اصل نام تو تھا جان محمد محمد اٹیچے پر وہ جانی کے نام سے کام کرتا تھا میری کوشش

سے جان کو مرکز کی کردار لیا۔ اور میں۔ وہیں سے قدر کا پتھر شوقی ہوا۔ میں اس سے ملنے لگی۔ صبح دوپہر شام۔ اس نے مجھے بتایا کہ

وہ شادی شدہ ہے۔ اس کے دو بیٹے ہیں اور وہ مسلمان ہے۔ میں نے پورا نہیں کی اور اس سے کہا کہ سب کو چھوڑ دو میرے لیے۔

اس نے کہا کہ تم سب کو چھوڑ سکتی ہو میرے لیے؟ میں نے عملیہ کر کے دکھا دیا۔ پیسے کی مجھے کمی نہ تھی۔ میں نے اپنے لیے اور اس کے لیے الگ ٹلیٹ لے لیا۔ میرے ڈیڈی کی بہت بدنامی ہوئی۔

وہ بہت پیچھے چلائے مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ اب میں زندہ رہوں گی تو صرف جان کے لیے دیر مر جاؤں گی۔ میرے ڈیڈی

نے اسے میری دھمکی سمجھا اور مجھے اٹھوایا۔ مرنا تو ان کا مشکل کام ہے۔ میں نے وہاں آتے ہی خود کشی کی کوشش کی جو تقریباً

کامیاب ہو گئی تھی۔ لیکن بڑے بڑے ڈاکٹروں نے مل کے مجھے بچالیا۔ جانی کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ اسے بھی

جانی کے اور میرے مرا سہا کم علم ہو گیا تھا۔ جانی میرے ساتھ رہنے کے لیے آزاد ہو گیا۔ لیکن یہ آزادی اسے راس نہ آئی۔ ایک لاسٹ

ڈیڈی نے اسے بتایا۔ انھوں نے ظاہر کیا کہ وہ میری خدمت کے سامنے ہار گئے ہیں اور اب یہ چاہتے ہیں کہ جانی مجھ سے شادی کر لے مگر

شادی سے پہلے یہ فروری ہے کہ وہ معاشرے میں اپنا کوئی مقام بنا لے جو تریوٹی کے دماغ کے شایان شان ہو۔ انھوں نے جانی کو

اپنے کاروبار میں شریک کر لیا اور اسے اہم ذمے داریاں سونپ دیں۔ وہ باہر کے دورے کرنے لگا اور بے حد مصروف ہو گیا۔

صرف چھ مہینے میں اس کا کاروبار سن اور اس کے انداز بدل گئے۔ وہ دو تندر ہو گیا اور اس نے دولت مندوں والے سب شوقی اختیار کر لیے۔ مجھے سب بعد میں معلوم ہوا۔ میرے ڈیڈی نے

اسے آزمایا تھا۔ انھوں نے اسے دولت فراہم کی اور آزاد چھوڑ دیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ دولت آجانے کے بعد اس کے دل میں کتنی

محبت رہتی ہے۔ وہ اس آزمائش میں پورا نہیں اترتا۔ بڑا شراب اور عورت اس کے شوقی بن گئے۔ میرے لیے وہ بالکل فکر مند نہیں تھا۔ میں تو اس کے لیے گھر کی مرمتی تھی۔ وال برابر؟

اور یہ سب کچھ تمھیں کیوں معلوم نہیں ہوا؟" میں نے کہا۔ "مجھے کیلئے معلوم ہو سکتا تھا" وہ بولی "میں تو انہی اعتقاد

میں آنکھیں بند کیلئے بیٹھی ہوئی تھی اور کیا کیا ہی بہت خوش تھی اور اس خیال پر نازاں تھی کہ میں سب کو شکست دے کر دیتے

چاہا اسے حاصل کر لیا۔ میں نے اپنے ان گنت طلب گاروں کو شکست دی جو اپنی قوت خرید یا قوت تسخیر سے مجھے حاصل کر لینے کے

یقین میں مبتلا تھے۔ میں نے جانی کے غرور کو شکست دی۔ اس کی بیوی بچوں کے ساتھ وابستگی اور ان کے حقوق ملکیت کو شکست

دی اور... میں اخیال تھا... کہ میں نے اپنے ڈیڈی... ناف اب شکست تریوٹی کو بھی شکست دی۔ اور ایسے ہی بہت سے باطل

خیالات تھے جو میرے ذہن پر حاوی تھے۔ میں نے کئی بار ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اپنے عشق کا تجربہ کیا اور یہ سوچا کہ آخر جانی

میں ایسی کیا بات ہے جس نے مجھے دواؤں کر دیا ہے۔ عقل کی کسوٹی پر رکھنے سے جانی ایک بہت معمولی صلاحیت رکھنے والا

اوسط سے بھی کم ذہین۔ پہلے طبقے سے تعلق رکھنے والا ہے نام و نسب لاوارث نوجوان تھا جس کا مقابلہ میرے کسی بھی پرستار یا دعوے دار

سے کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ بس مجھے اس میں ایک عجیب سی بے بس کر دینے والی، تقناطیسی یا جیوانی کشش محسوس ہوتی تھی۔ جس کے خلاف مزاحمت ناممکن تھی۔ اور جس کے بغیر میں اپنی زندگی کا تصور کرتی تھی تو ڈر جاتی تھی۔ اس پاگل پن کو محبت کا نام دینا غلط تو نہ تھا؟"

میں نے کہا "یہ نام تو بہت پہلے دیا جا چکا ہے۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ یہ سچ ہے؟"

"میں بھی سہی سمجھتی تھی۔ اور بھی بہت سی باتوں پر یقین تھا۔ میرا۔ مثلاً یہ کہ دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی۔ اور کہ جہیز عشق سلامت ہو تو محبوب کچھ دھکا گئے سے بندھا پڑا آتا ہے اور عشق

سچا ہو تو پتھر کو بھی ٹوم کر دیتا ہے۔ یہ افسانوی فلمی تصورات ہیں

نہ کا لچ کے زمانے میں قائم کیے تھے۔
”تو بھی بہت یاد کیے ہوں گے۔۔۔“

”ہاں۔ بہت بازی اور باسٹوں میں کام آتے تھے۔ مجھے خطبہ تھا کہ میں سب کچھ کر دوں اور ایسے کر دوں کہ سب دنگ رہ جائیں۔ کوئی بے شک نہ کر دے نہ بس صورت ہی دی۔ دولت بن مانگے مل گئی۔ اور کارخانہ تو خالی پڑا ہے۔ عورت ذات ہونے کے ناطے ناقص العقل تو طے شدہ طور پر تھی۔ بعد میں سارے تقورات غلط ہو گئے۔ ایک کروڑا بیج باقی رہا جس کو میرے جماندیر، تجربہ کار اور قابل رشک عقل رکھنے والے ڈیڈی جانتے تھے اور مانتے تھے۔ ان کی نظر سے بیج کا یہ روپ پہلے ہی دیکھ لیا تھا مگر انھوں نے اس بیج کو مجھے تسلیم کرانے کے لیے کوئی ٹیکہ نہیں دیا اور کسی سترقا کا حوالہ نہیں دیا۔ انھوں نے فقور ڈاسا سپر خرچ کیا۔ لاکھوں کی رقم ان کے لیے فقور ڈاسا سپر یعنی۔ یہ سب انھوں نے جانی کو دیا اور بیج کو جمع کرنے گئے۔ سچ سننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بیج دیکھنے اور بیج کے تجربے سے گزرنے میں جو عملی سبق ملتا ہے وہی قائل بھی کرتا ہے۔ یہ بیج اچانک میرے سامنے آ گیا۔ اپنی تمام کمائیت اور بدنامی کے ساتھ کچھ ماہ کے بعد ڈیڈے نے مجھے بلا یا اور کہا کہ ’جانی کے بارے میں اب میرا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ خیال کوئی بدل جانے والی چیز ہے؟‘ وہ مسکرائے اور انھوں نے کہا کہ ’ہاں خیال بدل جاتا ہے۔ تمھارا خیال بھی بدل جانے کا جب تم اپنے جانی کا اصل چہرہ دیکھو گی۔ آدمی کی فطرت کو حالات کے انیسے میں دیکھنا چاہیے۔ اگر آئینہ بدل جانے کے باوجود فطرت نہ بدلتی تو یہ سب کمال کی بات۔ مگر ایسا آدمی ملتا نہیں۔ ملے تو پھر وہ فرشتہ ہی ہوتا ہے۔ غریب میں خودداری اور قناعت کا فلسفہ بکھارنے والے کو دو لہندری سے روشناس کر کے دیکھو۔ مزدور اور محنت کی عظمت کا پرچار کرنے والے سوشلسٹ شاعر کو سرمایہ دار ناکے دیکھو۔ دشمن اور بدعنوانی کے خلاف وعظ کرنے والے کو عیش و عشرت کی زندگی کے مواقع فراہم کر کے دیکھو۔ محبت اور وفاداری کے دعوے کرنے والے کو لہذا سچا میں ہمارے دیکھو۔ سارا جھڈ کھل جائے گا۔ اصل فطرت سامنے آجائے گی۔ ڈیڈی کا یہ جھانسن میں نے کہا کہ ایک شک آپ نے ایسی ہی دیکھ لی تھی۔ یہ آپ کے تجربات میں چنانچہ آپ نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے میرا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ’چلو تم بھی یہ دنیا دیکھو اور دیکھو کہ کیا تجربہ غلط تھا؟ اس کے بعد انھوں نے جانی کی زندگی کی ایک فلم دکھائی جو انھوں نے بڑی محنت سے تیار کروائی تھی۔ اس میں کوئی کیرہ بڑک نہیں تھی مگر میں نے اس پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔“

”کیا تمھارے ڈیڈی کے کیرہ میں سامنے کی طرح اس کے پیچھے لگے۔ سنئے؟ میں نے کہا ڈیڈی کے آخری کیسے ممکن ہے کہ وہ بزرگ پہنچ گئے اور شوٹنگ کرتے رہے۔“
وہ ہنس پڑی۔ ”وہ کوئی حقیقی فلم نہیں تھی۔ میرا مطلب یہ سنا فلم نہیں تھی۔ وہ تو میں اعلان کر رہی تھی۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہ اس کی زندگی کا عکس تھا۔ وہ زندگی جو میرا جانی دو لہندری ہی جانے کے بعد گزار رہا تھا۔ فلم بھی تو ایک عکس ہی ہوتی ہے۔ فلم میں کیرہ بڑک چل جاتی ہے۔ جو کچھ میں نے دیکھا اس میں کیرہ ضرور استقامت ہوا تھا مگر بڑک چل نہیں تھی۔ گزشتہ تین ماہ میں میرے ڈیڈی نے اپنے نظریے کی صداقت ان زمانے کا جو تجربہ کر لیا تھا وہ کامیاب رہا تھا۔ انھوں نے جانی کو وافر پیسہ دیا جسے وہ اپنی مرضی سے خرچ کر سکتا تھا اور جس کا حساب دینا ضروری نہیں تھا۔ یوں سمجھ لو کہ ڈیڈی نے اسے بغیر اندازہ کرنے کے مواقع فراہم کیے اور اس نے میرے ڈیڈی کو ایسا نہیں کیا۔ وہ چھ سات ایسے ماہر دل میں رہا جو بڑے رنگین ہیں۔ ظاہر ہے اسے بیجا گیا تھا۔ یہ پیسہ اس نے کہاں خرچ کیا؟ اس کا بیج تو فقور دل کی صورت میں موجود تھا۔ یہ تو میری کچھ تو باہر کی کئی تھیں۔ مگر کچھ بھولوں کے انداز ان کی کئی تھیں۔ وہ کس باہر میں کس ناش کلب میں بیٹوئے خانے میں گیا۔ کس کے ساتھ گیا۔ وہاں اس نے کیا کیا۔ اس سب کی ایک مفصل رپورٹ میرے سامنے رکھ دی تھی مگر، بہر قسم کے ثبوت کے ساتھ۔ مگر میں نے کہا کہ یہ سازش ہے۔ جانی کو جان بوجھ کر پھینکا گیا ہے۔ اسے دغا دیا گیا ہے۔ اس کے پیچھے شکاری غورس لگا رہی تھی ہیں۔ وہ کون سا عابد و زاہد ہواد و پیر، بزرگوار، بھونے کا دعوے دار ہے۔ وہ انسان ہے آخر؟ یہ سب دلائل میں خود کو بچانے کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ جانی کا دفاع کرنے کے لیے نہیں۔ مگر ڈیڈی بھی جانتے تھے کہ میرا یہی یہ عمل ہوگا۔ انھوں نے مجھے چند لوگوں سے ملوایا۔ وہ سب عام قسم کی لوگوں تھیں جن کو جانی نے محبت اور شادی کا بھانسا دیا تھا۔ انھیں اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ وہ فیاضی شدہ ہے اور بہت بڑے بڑس کا مالک ہے۔ کسی بھی شریف اور اچھی لوگوں کو دغا لانے کے لیے جس قسم کا جھوٹ ضروری ہوتا ہے وہ اس نے بولا تھا اور ان سب کو ایک جیسا دھوکا دیا تھا۔ ان میں سے دو اس کی پرستل سیکرٹری بن کر بیرون ملک سفر میں بھی ساتھ رہی تھیں۔ چنانچہ وہ چشم دید گواہ تھیں۔ میں آخری وقت تک مزاحمت کرتی رہی اور بیج کو جھوٹ کہنے خود کو شکست سے بچاتی رہی مگر بالآخر یہ سب ناممکن ہو گیا۔ ڈیڈی نے مرحلے وار مجھے شکست دی۔ آخری مرحلے میں انھوں نے مجھے جانے دار و تار بھیج دیا جہاں جانی رینگے ہاتھوں پکڑا

”اس کے لیے کسی بھی بات سے ٹکرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایک بہت جیسٹاںک اور بد صورت، انتہائی شرمناک منہ تھا جب جانی میرا محبوب، میرے سامنے ایک بھرم بنا کر پناہ دیا اور اپنے ہر جرم کا خود اقرار کر رہا تھا۔ ہر بیج آنا ناقابل تردید تھا کہ اس کے لیے انکار کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ ڈیڈی کی جھوٹی پھر درست ثابت ہوئی تھی۔ میرے اعتماد کی شکست اتنی عبرت ناک تھی کہ اس نے مجھے بالکل کروا۔ محبت استا بڑا فریب دے سکتی ہے۔ محبت کرنے والا اپنی ہی کی اس ہمتاںک جاسکتا ہے۔ یہ میرے لیے ناقابل برداشت اذیت دینے والا تجربہ تھا۔ معلوم نہیں کیوں میں بیج کو جھوٹ کہتے کہتے ڈرنے لگی تھی کہ اگر یہ بعد میں سچ نکلا تو کیا ہوگا۔ جیسے جیسے ثبوت میرے سامنے آ رہے تھے میرے اندر سب کچھ ٹھنکا۔ غلا بھتا ہوا تھا۔ زبان سے اقرار نہ کرنے کے باوجود شکست کا آسیب مجھ پر مسلط ہوتا رہا تھا۔ چنانچہ فلم کا آخری سین اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد وہی ہوا جس کا فیصلہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ کچھ بھی مجھے شک تھا کہ دقت آنے پر میں شاید اپنے فیصلے پر عمل نہ کر سکوں۔ مگر جب دقت آیا تو میرے لیے کوئی مسکن پیدا نہ ہوا۔ میں نے بولا اور کہا لا اور اسے گولی مار دی۔ خود اپنے ہاتھوں سے۔ اس سے پہلے میرا خیال تھا کہ میں اسے قتل کر سکی تو خود کو گولی مار لوں گی۔ مگر اس کے بڑک کی سزا میں اپنے آپ کو نہ دے سکی۔ میں نے سوچا کہ یہ تو بڑی ہی بے وقوفی کی بات ہوگی کہ جس نے میرے ساتھ استا بڑا دھوکا کیا وہ زندہ رہے اور اس کا یہ کھیل بھی اسی طرح جاری رہے۔ دیکھ لے۔ یہ کئی بات ہے کہ اگر میں اسے وہیں سزا نہ دیتی تو بعد میں ڈیڈی میرا یہ کام خود کر دیتے اور ان کے لیے کوئی مشکل پیدا نہ ہوتی۔ تو میری بے وقوفی کے باعث ہوئی۔ مجرّمہ مشکلات کو فریڈ لینے تھے۔ مسائل کے بارے میں وہ بھی جذباتی نہیں ہوتے تھے۔ ان کا تو سیدھا اصول یہ تھا کہ پیسہ ہونے کو فکرت خیز نہ رہے۔ لہذا یہ خیزدہ۔ اپنی فکریں دوسروں کو دے دو مثلاً پیسہ کمانے کا فکر بچانے کی فکر۔ جمع کرنے کی فکر۔ ان سب کے لیے ہی تو میرے سامنے لازم رکھے ہیں میں نے۔ گھر اور گھر سے باہر خود کیا کرنا۔ جو کام ہو اس کے لیے لازم کر لے۔ جو چیز چاہیے وہ خرید لو۔ مکان۔ کاروبار۔ عیش و عشرت کے اسباب۔ انسان اور اس کا ایمان وغیرہ۔ قانون اور انصاف کرنے والے۔ سب کو خسر رو لو اور بس۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ یہی انھوں نے میرے لیے بھی کیا۔ میں نے ان کے لیے ایک مشکل پیدا کی۔ انھوں نے مشکل کو خرید لیا۔ کافی گودہ مارنے تو میں ان کے لیے مزید مشکلات پیدا کرتی۔ جب میں نے اسے مار دیا تو ایک جھوٹی سی قانونی مشکل پیدا ہوئی۔ اس مشکل کو انھوں نے آسانی سے خرید لیا۔ میرا نام نہت کسی کی

زبان پر نہیں آیا۔ کسی نے بوجھ بھی نہیں کر جانی کدھر گیا۔“
فماوتی کا ایک مختصر و قند آیا جس میں کھلا کھلی کھڑکی سے باہر اندھیرے میں اپنے ماتھی کی تحریک پر چھائیال دیکھتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا مضمون نظر کرنے کے باوجود وہی خطرناک عورت تھی۔ نڈرا دوسرے باک۔ نہ بیٹھے سے ڈرنے والی نہ مرنے سے راجانی تو اس کی محبت کی جھینٹ پڑھ گیا تھا۔ میرا کیا ہے گا؟ میں نے تو اسے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ اس سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا ہے کہ میرے لیے اس کی محبت کو قبول کرنا ممکن ہی نہیں اور میں بالآخر سے محبت کرتا ہوں۔ کیا وہ میرے انکار کو اور اس توہن کو برداشت کرے گی، کہیں بیج میرا جرم تو نہیں بن جائے گا؟
”معلوم ہے میں نے بعد میں کیا کیا؟“ وہ اچانک بولی۔ ”میں نے بد صورتی اختیار کر لی۔ خوبصورتی کو محبت کا نام ہے۔ جب آدمی نفرت میں ڈوب جائے تو وہ بد صورت ہو جاتا ہے۔ میری طرح۔۔۔“
”خدا کے واسطے کھلا خود کو بد صورت بھٹنا چھوڑ دو۔۔۔“
”شٹ اپ“ وہ چیخ کر بولی۔ ”مجھے جھوٹ کی طرف لے جانے کی کوشش مت کر۔ تین سال سے میں اس گڑبش ہوں۔ نفرت اور غلاطت کے گڑبش۔ اپنی مرضی سے میں نے خود کو اس میں گرایا تھا۔ کیونکہ اسی میں ڈوب کر جانی مر گیا تھا۔ کھلا اس کے ساتھ سختی ہو گئی تھی مگر میں زندہ ہوں۔ تین سال سے زائد ہو گئے مجھے مرتے ہوئے گڑبش زندہ ہوں۔ محبت چھوڑ کر نفرت اختیار کرنے کے بعد میں نے وہی کیا جو میرا جانی کر رہا تھا۔ جب اسے دولت ملی تو وہ عیشی کرنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں کیا بے وقوف ہوں کہ اتنی دولت مند ہونے کے باوجود عیش نہیں کرتی۔ خواہ مخواہ اس شرافت اور عزت۔ محبت اور شادی کے بجز میں اپنی خوبصورتی اور جوانی پر خود ہی پیسے دلا رہی رہی۔ سب کا دل توڑتی رہی۔ دل توڑنا کوئی اچھی بات ہے۔ پس نہ اس کے بعد میں نے سب پر اپنے دے۔ دواڑے کھول دیے اور وہ سب جو میرے پرانے پرستار تھے ایک دم اڑ گئے۔ بیٹے نئی رہنے ہوئے والی فلم پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ میں نے کہا کہ سب آؤ بیچ باری باری۔ بلیک نہیں چلے گی۔ لائن بٹلاؤ۔“ وہ قہقہہ مارنے لگی۔ ”میرے ڈیڈی نے مجھے ماہر نفسیات کے سپرد کیا۔ وہ بھی میرے پرستاروں میں شامل ہو گیا۔ میں نے کہا کہ یہ حسن اور جوانی اب کسی کی ملکیت نہیں۔ یہ تو بہشتی لنگاہ ہے۔ آؤ۔ ہاتھ دھو کے پوتر ہوتے جاؤ۔ اس کے بعد تم نے مجھے دیکھا۔ اس بہانہ پر میں اپنی مرضی سے سوار ہوئی تھی۔ اور میرے ڈیڈی ابھی یہ فیصلہ نہیں دے۔ تم نے مجھے واپس بھیجے کہ کوئی ٹیکہ کی ہے یا نہیں۔ بے شک میں نے دہلی سے انھیں قائل کر لیا تھا کہ تم نے ٹیکہ کی

بہے مگر وہ جانتے ہیں میری نیکی بڑی کو۔ وہ میری خاطر اپنا نقصان نہیں کریں گے۔ میں نے تو اپنا جو نقصان کیا وہ کسی کھلتے میں نہیں...۔۔۔

”کلام دہری...۔۔۔ میں نے پریشان ہو کے کہا۔“ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ نقصان نہ تھا۔ اچھا ہوگا نہ سمجھاؤ ڈیڈی کا نقصان مجھے ہوگا حالانکہ میں نے کوئی جرم کوئی گناہ نہیں کیا کہ اس کا لالچ واپس لے آیا جس پر بد قسمتی سے تم سوار تھیں۔ مجھے بیٹی پہننا تھا اور اس کی بھی ایک صورت تھی۔ میرا مقصد ہرگز تمھاری ذاتی زندگی میں مداخلت نہیں تھا۔ یہ تمھاری زندگی ہے۔ اسے تم جسے چاہو کرنا۔ جس کو چاہو خریدتے دو اور جسے چاہو انعام میں۔ تم جب اسے نہ گزارنا چاہو تو ختم کرنے کا اختیار بھی رکھتی ہو۔ لیکن خدا کے لیے مجھے یہ بتا دو کہ میں کیا کروں...۔۔۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ نہ لکنا چاہتا ہوں اس پاگل خانے سے جہاں صرف خرید و فروخت ہوتی ہے۔ نہیں خریدار ہوں اور نہ برائے فروخت...۔۔۔“

”تم جا سکتے ہو۔ میرے ساتھ...۔۔۔ وہ سیٹ لے کر چلی۔ میں نے سر ہڈ ہاتھ مار کے کہا۔“ سمجھنے کی کوشش کرو۔ کلام۔ میں ایک ایسا شخص ہوں جس کی زندگی مسلسل فرار کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہرگز شکاری میرے تعاقب میں ہیں۔ وہ یہاں بھی پہنچ گئے ہیں اور میں جان بچا کے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ تم کہاں تک جا سکتی ہو میرے ساتھ؟“

وہ ہنس پڑی۔ ”جب تک زمین تم پر تنگ نہ ہو جائے...۔۔۔ میں نے کہا۔“ تنگ تو آج بھی ہے۔ لیکن میں پھر بھی اس طرح پکڑا جانا نہیں چاہتا جسے چاہے وہ دن میں جو پکڑا جاتا ہے۔ مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے۔ تمھاری زندگی کے دکھ دیکھنا بہت برے ہیں لیکن میں انھیں بانٹ نہیں سکتا۔ تم اپنے ڈیڈی کی بات چھو دو۔ اپنی لہو کو جو کچھ میں نے کیا وہ اچھا تھا یا برا۔ تم اسے کیا سمجھتی ہو؟ کیا تمھارے نزدیک تمھیں اس کی سزا ملتی چلی ہے؟“

”میں تمھیں کوئی سزا نہیں دے رہی ہوں۔ تم خود سزا مانگ رہے ہو...۔۔۔ وہ گڑبگڑا۔

”کلام! کاش ہی ممکن ہوتا۔ میرے پاس کوئی جگہ ہوتی۔ کوئی گھر ہوتا میرا دوست ہوتا یہاں کوئی میرا۔ پھر شاید میں تمھیں لے جاتا اور تمھاری مدد کرتا...۔۔۔“

”مجھے تمھاری مدد کی نہیں، تمھاری ضرورت ہے...۔۔۔ وہ چلا کے بولی۔

”انہیں نے سخت پریشان ہو کے سوچا۔ یہ میرے کہاں بھینس

گیا۔ وہ لڑکی ایک نفسیاتی مرلین تھی۔ ایک ایسی لڑکی جو ان دنوں کے اجتماع میں سب دنیا کو شک کر رہی تھی۔ اس کی ذہنی حالت دیکھتے ہوئے کوئی بھی اسے پاگل نہیں کہہ سکتا تھا مگر جو کہ خود اس نے مجھے بتایا تھا اس سے میں میں اندازہ کر سکتا تھا کہ کھلنے سے اسے بڑی طرح توڑ بھجوا دیا تھا۔ اسے اپنے عورت ہونے پر غرور تھا۔ اپنے جنس پر ناز تھا اور اپنی پاک دامن پر فخر تھا۔ ایک شخص جسے کلام نے پسند کیا اس نے دوسری عورتوں کو فروخت عطا کر دی جو بد صورت تھیں بد کردار تھیں اور بد نام تھیں۔ اس کا ذہن نے کلام کی شخصیت کو اس طرح سبک کر دیا جیسے عورت کے ہاتھوں خود اس کا شمار کر رہا ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اس کے جنس کو سہلنے کے بجائے کسی گھٹیا علمی رسلے کے سرورق کو اس سے بہتر قرار دے دے۔ کلام نے اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ وہ عورت سے فاختہ بن گئی۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ کسی حد تک جتنی ہون میں بہتر تھا تو غلط نہ ہوگا۔

”معلوم نہیں تریوٹی کی دولت اس کی بیٹی کے لیے ذہنی نکل اور شخصیت کا توازن کیوں نہ خرید سکی۔ وہ تو ہر چیز کو خرید لینے کا قائل تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کلام کے لیے مجھے بھی خرید لے۔ یہ بات اس نے دلاور کے سامنے بھی کہی تھی کہ میں اپنی بیٹی کی کسی فرمائش کو رد نہیں کر سکتا۔ بیٹی نے کہا کہ مجھے سکندریا ہے تو وہ کئے گا کہ رکھ لو۔ اور مجھے سکندریا کے گا؟ ایک طرف دلاور کا حال دوسری طرف کلام کی جیل۔ جس میں قید یا بشت بھی نہ تھا۔ سے زیادہ وہ ذہنی تھی۔ آگے کلام کو مجھے خندق۔ اس پاگل خانے میں کہیں میں بھی پاگل نہ ہو جاؤں۔ تیری آنکھیں سے خندہ بہت دور تھی حالانکہ رات کے دو بج چکے تھے۔ ابھی تک مجھے علوم نہ تھا کہ اس شب کی سحر کیسے ہوگی۔ مجھے یہاں سے لکنا نصیب ہوگا تو کس حال میں ہوگا۔ میں جانتا تھا کہ رات کے بارے میں سوچوں کہ وہ کب ملے گی۔ عین کے اور غالب کے بارے میں سوچوں کہ وہ کہاں ہوں گے لیکن میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

”کافی پیو گے؟“ کلام نے ایک انگریزی لے کر کہا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کے نظر دوسری طرف کر لی۔ خداوند مجھے اس امتحان سے بچا دے۔ دل ہی دل میں کہا۔ میں وہی جنت سے نکالا ہوا انسان ہوں جس کے لیے گناہ کی ترغیب سے زمانہ مشکل ہو گیا تھا۔ میں اس حاکم کی سے کیسے بچوں گا اگر میں اسی طرح محصور رہا۔

میرے دماغ کا جواب فوراً ایک خیال ہی کے آیا۔ میرے دل نے کہا۔ ”سکندر اعظم۔ گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ ایک عبت کو طاقت سے شکست نہیں دے سکتے تو کیا ہوا عقل استعمال کرو۔

مردِ اجالات کو سمجھو۔ اور پھر اپنا راستہ بناؤ۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”کیا تمھیں نہیں آ رہی ہے؟“ اس نے کہا۔ ”وہ قلاب اکثر نہیں آتی۔ رات ایسے ہی گزر جاتی ہے۔ خراب آدرو گولیاں بھی اثر نہیں کرتیں۔ اکیسے تو بالکل نہیں آتی...۔۔۔“

”وہ...۔۔۔ کافی...۔۔۔ میرا خیال ہے...۔۔۔ میں نے کہا۔“ کوئی درج نہیں اگر تم دونوں ہی لیں...۔۔۔“

اگر میں خور اپنا ردیو بدل لیتا تو اسے ضرور شک ہوتا کہ یہ میری چال ہے۔ میرے لیے محتاط رہنا ضروری تھا ورنہ وہ لڑکی پوچھ کر کشتی تھی۔ اس کے لیے نامکمل کچھ نہیں تھا۔

”کیا تمھارے ڈیڈی سو گئے ہوں گے؟“ میں نے کافی پینے کے بعد سر گیٹ ہلا کر کہا۔

”معلوم نہیں۔ ان کی فکر کیوں ہے تمھیں؟“

”میرا مطلب تھا کہ...۔۔۔ وہ ایس کیوں نہیں آئے۔ انھوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا کہ میرے بارے میں انھوں نے کیا فیصلہ کیا ہے...۔۔۔“

”فیصلہ تو میں نے بتا دیا تھا۔ ان میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اس فیصلے کے خلاف کچھ کر سکیں۔“ وہ بولی۔

”کیا دلاور واقعی چلا گیا ہوگا؟“ میں نے کہا۔

”جہاں میں جاتے دلاور۔ وہ اندر بھی ہے تو تمھیں ڈرنے کا ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمھارے سامنے آئے تو اسے گولی مار دنا۔ بالکل آسان ہے۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔“ وہ بولی۔ لاش میں اٹھنا دول کی۔

”میں اپنا اطمینان چاہتا تھا۔ کہ اب اس کی طرف سے مجھے لگتا نہیں...۔۔۔ میں نے کہا۔“ وہ بہت عیاں آدمی ہے۔“

”یہ ضمانت میں آخر کیسے دوں؟“

”ضمانت کی کوئی ضرورت نہیں...۔۔۔ میں نے کہا۔“ تم نے کہا ہے کہ اسے گولی مار دنا تو میں سوچ رہا ہوں کہ کھالی ہاتھوں اسے میں گولی کیسے ماروں گا۔ اگر وہ اچانک آ گیا...۔۔۔“

”یہ کو...۔۔۔ میرا روالہ...۔۔۔ اس نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ تم خود ”دو ٹالو۔“ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ تمھارے گھر میں کسی کو تکرار کروں خواہ وہ میرا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ اب تمھیں لگنے کی سوچنا چاہیے۔“

”سوچنے کی تو اس میں کوئی بات نہیں۔ ہم صبح جوتے ہی کھائیں گے“ اس نے کہا۔

”صبح! یعنی ابھی نہیں جا سکتے؟“

”ابھی کیسے جا سکتے ہیں...۔۔۔ سامنے گیٹ بند ہیں۔ کوئی گاڑی گیارے سے نہیں نکل سکتی جب تک ڈیڈی کا حکم نہ ہو۔ گاڑوں میں چاروں طرف بڑے خوشنوار قسم کے گتے پھیر رہے ہیں۔“

”کیا وہ تمھیں بھی نہیں پہچانتے؟“

”وہ کسی کو نہیں پہچانتے۔ ہوائے اس شخص کے جس کے ہاتھوں میں ان کی زنجیر ہوتی ہے“ کلام نے کہا۔ ”اگر وہ زنجیر کھول دے تو گتے کسی کو کھینچنے والے نہیں۔ اس کے علاوہ دیواریں تم نے شاید نہیں دیکھیں۔“

”جس حالت میں مجھے لایا گیا تھا“ میں نے کہا۔ ”وہ تم نے تو دیکھی ہوگی۔ کیا میں کچھ دیکھ سکتا تھا؟“

”دیواروں کے اوپر بالکل جیل جیسا حفاظتی حصہ پہنے خاردار تاروں والا۔ جن میں برقی ردور ہوتی ہے۔“ وہ بولی۔

”صبح ہم کیسے جائیں گے؟“

”صبح کوئی سڑ نہیں ہوگا۔ گیارے کھل جائے گا۔ میری گاڑی آجائے گی۔ میں تمھیں لے جاؤں گی، جہاں تم کہو گے۔“ وہ بولی۔

”میرے پاس تو کوئی بھی ایسی جگہ نہیں...۔۔۔ تم لے جا سکتی ہو مجھے کہیں؟“ میں نے کہا۔ ”جہاں میں کچھ عرصہ روکوں رہ سکوں۔ اور کسی کھلے گھر کے ڈیڈی کو کبھی ملوں۔“

”ایسی تو کوئی جگہ بھی نہیں ہو سکتی...۔۔۔ وہ سوچ کے بولی بہت سے فلیٹ ہیں۔ ساحل سمندر پر کراچ ہے۔ مگر وہاں ڈیڈی سے چھپ کے رہنا ناممکن ہی سمجھو۔ انھیں تو میری ہر سہیلی، ہر بولنے فریڈ اور آشنا کا پتا لگھکا نا بھی معلوم ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ ایسے ہزاروں مقامات ہوں گے جہاں تمھارے ڈیڈی کا خیال بھی نہیں جا سکتا۔“

”تمھیں معلوم ہے تو مجھے یہ کیوں پوچھ رہے تھے؟“

”صرف معلوم ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی بھی جگہ معنت تو نہیں ملتی اور پھر میرے پاس ہے نہیں۔ جو تمھارے ڈیڈی نے تمھیں لیا۔“

”پھر میرے پاس ہے۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں ہے۔“ وہ اس خیال سے جذباتی ہونے لگی تھی کہ میں اسے ساتھ رکھنے پر آمادہ ہو گیا ہوں۔

”بینک کو کوئی مارو۔ نقد کی بات کرو جو اس وقت تمھارے پاس ہے۔“ میں نے کہا۔

”نقد...۔۔۔ ہوگا آٹھ سو ہزار۔ لیکن میرے زیورات بھی ہیں۔ کئی لاکھ کے...۔۔۔“

”زیورات کے بدلے مکان نہیں ملتا۔ اور انھیں بیچنے گیا تو پھر لیا جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”کہاں ہے یہ رقم۔ لاؤ لگا لو۔“

”یہاں کیا ہے میرے پاس۔ بیڈروم میں ہے۔“
 ”کیا ہم وہاں نہیں جاسکتے؟“ میں نے کہا۔
 وہ ہنسی۔ ”میں اپنے بیڈروم میں نہیں جاسکتی، کیسی باتیں کرتے ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔“
 میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر کسی نے دیکھ لیا؟“
 ”کون دیکھے گا؟“ وہ بولی۔
 ”کوئی محافظ۔۔۔ نوکر۔“
 ”اند کوئی نہیں ہوتا۔ سب باہر پھاڑتے ہیں۔“
 ”میرا تو خفیہ کمرے اور مائیکروفون سب کچھ ہیں۔ کہیں یہ گنگو کوئی بھی نہ دبا ہو۔“
 ”کیمبرے تو ہیں۔ لیکن میں تم کو محفوظ رستے سے گزار کر لے جاؤں گی۔“ وہ بولی۔ ”یہ باتیں کوئی نہیں سنی رہا ہے۔“
 ”پھر تمھارے ڈیڈی کیسے آگئے تھے۔۔۔؟“
 ”وہ میرے پاس نہیں آئے تھے۔ تمھارے پاس آئے تھے۔ اور باتیں کچھ بھی نہیں سنی تھیں انھوں نے۔ سب کچھ کو کن ہے۔“
 ”کھانا ہے۔“ اس رستے میں مت بولنا۔“
 ”کیا تمھارا بیڈروم محفوظ ہے؟“ میں نے کہا۔
 وہ بڑے معنی خیز طریقے پر ہنس کر لائی۔ ”ہے تو نہیں۔ مگر میں اپنی پرائیویسی کی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ چلو آؤ، اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔“
 باہر کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں مکمل مجھے بہت کچھ بتا چکی تھی۔ اب میں اندر کا نقشہ دیکھنا چاہتا تھا اور باہر نکلنے کی کوشش کرنے سے پہلے باہر جانے کا راستہ سمجھنا چاہتا تھا۔ دروازے سے نکلنے ہی میں نے ایک بہت بلند چھت والی وسیع راہداری دیکھی جس میں یکساں فاصلے سے تین فانوس آویزاں تھے۔ اس وقت یہ فانوس روشنی نہیں تھے۔ راہداری میں لمبے جیسی وال لائٹس کاؤ حندلا آگالے تھا۔ میرے قدموں کے نیچے دینر قاتیل تھا جو مجھے تمام روشنی میں گمراہ کر لگا۔ راہ داری میں چار دروازے کھلتے تھے۔ دو ایک طرف اور دو دوسری طرف۔ مکمل نے مجھے دروازے لگ کر چلنے کو کہا اور ایک انگلی سے فانوس کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا مطلب واضح تھا۔ فانوس میں یہاں بھی کیمبرے پوشیدہ تھے۔
 کھانے آخری دروازے کو کھولا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ایک اور مختصر سا کوریڈر والاؤچ تھا جس میں اوپر سے زینہ آتا تھا۔ زینے کا کنبہ آگ لگاتے نہایت پتیل تھا اور دیلنگ پر چاندی جیسی سفید دھات کی پالش تھی۔ گھوم کر اوپر جانے والے نیچے پر بھی وہی گہرے سبز رنگ کا قاتیل تھا اور اسے

تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بھی ہوئی وال لائٹس نے روشنی کر رکھا تھا جن کی شکل بالکل نئی کے تیل سے چلنے والے لمبے جیسی میں گرد و پیش کا جائزہ لینے کے ساتھ اس پلان پر بھی غور کرتا جا رہا تھا جو میرے ذہن میں فاضل ہو چکا تھا۔ ابھی تک میں نے کسی بھی ملازم یا محافظ کی صورت نہیں دیکھی تھی اور اپنے ماحول پر ایک پریہت خاموشی مسلط تھی۔ کھانا دینے والوں کوئی بہت کیے بغیر چلتی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس قدر عالی شان میں کھانا کس کے باپ کے ساتھ رہنے والے کون لوگ ہیں؟ صرف ملازم اور محافظ۔ کھانا مال، تریوینی کی بوی، اس کے بجائے ہمع، وہ سب کہاں ہیں؟
 اچانک کھانا نے ایک دروازے کو ہٹل کھانے کھولا اور مجھے ہاتھ پکڑ کے اندر گھس لیا۔
 بیڈروم کی شان و شوکت دیکھنے میں دنگ رہ گیا۔ مکمل بڑی احتیاط کے ساتھ کچھ سوچ آن کر ہی تھی اور میری طرف چور نظروں سے دیکھ کر سکرا رہی تھی۔ بیڈروم میں نے پہلے بھی دیکھے تھے جو بہت عالی شان تھے۔ کچھ فنوں میں اور کچھ حقیقی زندگی میں۔ لیکن یہاں سب پر بازی لے گیا تھا۔ یہ ایک ایسی خواب گاہ تھی شاید میں خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسی خواب گاہ کچھ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مثلاً وہ جو فٹ پاتھ پر یا پھر کسی پارک کی بیچ پر کسی مال گاڑی کے ڈیسے میں کھنڈر میں یا قبرستان کی چار دیواری کے سامنے میں اور قریش خاک پر باتیں گزار لیتے ہیں۔ قدرت کی کیا تمام طریقے سے کہ وہ کوسمی پریشانی کے بغیر گہری نیند سوتے ہیں اور جو اپنی خواب گاہوں کو عیش و عشرت کے سارے لوازمات۔ آرائش کے تمام اسباب۔ آرام و آسائش کے ساز و سامان اور دولت کی قوت خریدیں آنے والی ہر خواہش چہرے سے بھر لیتے ہیں وہ خواب آوروں کو لیاں کھاتے ہیں۔ دوسرے میں مبتلا ہوتے ہیں اور کمرے میں بدل کے راتیں گزارتے ہیں۔
 ”بیٹھ جاؤ۔ کیا سوچ رہے ہو؟ اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کے بید پر دھکیل دیا۔
 میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ تمھارے اس محل میں ایسی کتنی خواب گاہیں ہوں گی؟“
 وہ ہنسی پڑی۔ ”ایسے سات بیڈروم ہیں۔“
 ”اور چوری بہتی میں ایسے کتنے محل ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”تمہاری صرف ایک خواب گاہ کی آرائش پر قینا پیر خرچ ہوا ہوگا اس سے ایک ہزار افراد کو سونے کے لیے ایک کمرے کی چھت پر تھوڑا سا آرام کی جاسکتی تھی۔ اور پورے بیٹھی شہر کو دیکھا جلتے تو۔۔۔“
 ”ایسی باتیں کہاں سے آئیں تمھارے دماغ میں۔ ایک بیٹی

کی بات کیوں کرتے ہو؟ وہ ایک الماری کھولتے ہوئے بولی۔ ”ساری زینا کو دیکھو۔ نیویارک۔ پیرس۔ سوئٹزرلینڈ۔۔۔“
 ہاں۔ میں نے اپنے اپنے کمرے میں ہر دولت مند شہر ایسے ہی تضادات کا تجربہ ہوتا ہے۔ بیٹنی میں لوگ فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں تو کیا راج میں تھکوں میں نہیں رہتے؟ کیا نیویارک میں۔۔۔۔۔
 زیب بستیاں نہیں ہیں، امریکہ کے محل بھی کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے مقابل اور اتر بے خانماں لوگوں کا بئیرا بھی ہے جہاں زندگی میں صرف بد صورتی ہے۔ عزت اور غلامی ظلت ہے۔ جھوک اور بیماری ہے۔ معلوم نہیں وہ غریب کہاں ہیں جن کو غلامی راقبال نے کہا تھا کہ اٹھو۔ کاٹھ آکر اے درویش دروازہ دلاؤ۔ کیا ان کا احساس تک مرچا ہے اور ان کے خون میں اتنی کم بھی سرایت کر چکی ہے کہ وہ قدر پر فراع رہتے ہیں اور انسانوں کی طرح جینے کا حق تک نہیں مانگتے۔ چنانچہ امراد بھی محفوظ ہیں۔ ان کے کاٹھ بھی اور دروازے بھی۔۔۔۔۔
 ”یہ لو اس وقت یہی ہے میرے پاس۔“ مکمل نے ایک بیگ میرے سامنے اٹھ دیا۔ پھر اس نے دوسرا بیگ خالی کیا۔ پھر پھر اس نے غمی سلط والے بید پر نوٹ ہی نوٹ پھیل گئے۔ میں نے خود کو سمجھا اور نوٹ گئے لگا۔ بے اندادہ ہنس جانے والی نظروں اور خیالات کے انتشار سے بچنے کے لیے۔
 ”یہ تقریباً ہزار روپے ہیں؟“ میں نے کہا۔
 اس نے وارڈ روپ کی طرف دیکھا۔ ”صبح اور مل جائیں گے۔ میں اپنی چیک بک ساتھ لے چلوں گی۔“
 میں نے کہا۔ ”کیا تمھارے ڈیڈی اتنے ہی بے وقوف اور بے ہیں۔ کہ تم کو میرے ساتھ جاتے دیکھ کر کچھ نہیں کہیں گے اور کچھ نہیں کریں گے؟“
 ”ان کو جو کتنا تھا کچھ اور وہ کیا سکتے ہیں؟ ہاں وہ کچھ کریں تو پھر میں بھی کچھ کر سکتی ہوں۔“ اس نے پھر اپنا رول اور نکالا۔ ابھی سر کی طرف ہاتھ بڑھا ہی رہی تھی کہ میں نے جھپٹ کر رول اوڑھ اپنے قبضے میں کر لیا۔
 ”یہ کیا ہے قوفی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”مذاق بھی نہیں کرنا چاہیے اس شخص کا۔“
 وہ ہنسنے لگی۔ ”آنا ڈرتے کیوں ہو۔ سو فیصدی لاک۔۔۔“
 ”مجھے معلوم ہے۔ مگر دسک لینے سے فائدہ ہاں میں نے کہا۔
 اور رول اوڑھ کر بیٹنی میں لکھ لیا۔ ”تمھارے پاس ہونا ہی نہیں چاہیے۔ ایسا خطرناک کھلونا۔ میں حیران ہوں کہ تمھارے ڈیڈی منہ میں کرتے۔“
 ”انھیں تو آج پتا چلا ہوگا۔ کہ رول اوڑھ بھی میرے پاس۔“

”وہ کہاں سوتے ہیں؟ اوپر کون ہے؟“ میں نے کہا۔
 ”اوپر آخری بیڈروم آٹھی کا ہے۔“ وہ بولی۔
 میں نے ایک کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے کی طرف اشارہ کیا۔
 ”اُدھر کیا ہے۔ یا میں باغ؟“
 اس نے پردہ ہٹا دیا۔ ”اُدھر سے بیٹنی نظر آتا ہے۔ وہ دیکھو۔ اُدھر ایک میل کے فاصلے پر سمندر ہے۔ میرا حرم درانیو۔ تم کو روشنیال نظر آ رہی ہیں؟“
 مجھے ہر سمت روشنیال نظر آ رہی تھیں۔ یہ بلادغریب نظارہ تھا۔ زمین پر جنگلے والی اسٹریٹ لائٹس سمندر میں روشن جہاز۔ آسمان پر نظر کرنے والے ستارے۔ سب مل کے ایک ہو گئے تھے۔ مگر میں نے زمین کو آسمان سے الگ کر کے دیکھا اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے شہر کے جزائر اور کچھ کچھ زمینیں کرنے لگا۔ سمندر کے پھیلے ایک سیل دور ہونے کی اطلاع ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ دوسرے آنے والی ایک کار کی ہینڈ لائٹس سیدھی مجھے پریشان۔ کار قریب آئی اور پھر دایں طرف گھوم گئی۔ اس سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں مدد ملی کہ تریوینی کے محل کی بدورتی دہلا کے ساتھ ساتھ بھی متحرک چل رہی ہے اور غالباً بالکل سامنے وہی متحرک ہوگی جو مجھے ساحل تک پہنچا دے گی۔
 کلاک نے اپنی ٹمرٹی آواز میں تین بجائے تو میں چونک کے پلٹا۔ جب میری نظر کھار پڑی تو میں سمجھ پٹا۔ اس نے اپنا لباس بدل لیا تھا۔ عراب جو لباس پہنتا تھا وہ کتنے کو شب خرابی کا لباس تھا۔ گورڈر حقیقت کچھ نہیں تھا۔ وہ شفاف ہالی والا پیر تھا جس کی ہر شے کلاک کے جسم کی ایک نئے انداز سے نمائش کرتی تھی۔ میں نے کلاک کی کھنکھتی ہنسی سنی۔ ”کیا ایک ساری رات باہر رہی دیکھتے رہو گے۔“
 ”کھانا انھیں کچھ معلوم ہے۔ میرا سالان کہاں ہے؟“ میں نے اس کیلین کو ختم کر دینے کا فیصلہ کیا۔
 ”کون سا سالان؟ کوئی سوٹ کس وغیرہ تھا؟“
 ”نہیں۔ ایک یا پورٹ تھا۔ ریڈیو اور تھا۔ اور کچھ قدر رقم تھی جو ایک بیٹل میں لپی ہوئی تھی۔“
 ”مجھے نہیں معلوم۔ ڈیڈی کے پاس ہوگا اگر ہوا۔“ وہ ایک توبہ جھکن اگلائی کے رول بولی۔ ”مل جائے گا صبح۔“
 ”سوری کھادی؟“ میں نے اس کے قریب جا کے کہا۔ ”صبح تک میں نہیں ٹھہر سکتا۔ میں جا رہا ہوں۔ ابھی اسی وقت۔“
 کلاک رنگ نئی ہو گیا۔ ”جا رہے ہو؟“
 ”ہاں۔ میں مجبور ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں تم کو ساتھ نہیں لے جاسکتا۔۔۔۔“

”مگر... تم نے... کہا تھا...“

”میں نے جھوٹ بولا تھا۔ بے وقوف بنایا تھا تمہیں“ میں نے کہا۔

”ذلیل... کہنے... کھلا چلائی۔“

میں نے اسے ایک دم دبوچ لیا۔ میرا ہاتھ اس کی نازک گردن پر جم گیا۔ ”میں کو مار کے جانا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ ریت سمجھنا کہ میں ایسا کر نہیں سکتا کی تم نے سنا نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ جانے پر میں نے دلاؤ کے ساتھ جانے کو ترجیح دی تھی۔ اس کے باوجود تم نے اعتبار کر لیا مجھے؟ تم اتنی آسانی سے بے وقوف بن جاؤ گی، یہ امید نہیں تھی مجھے۔ تم نے خود کو بالآخر وہی عورت ثابت کر دیا جس کو مرنا نقصی العقل کہتے ہیں تو غلط نہیں کہتے۔“

وہ میری گرفت میں کسائی اور اس نے سانس لینے کی ہمدردی میں منہ کھول دیا۔ اس کی بھی پھٹی آنکھیں دہشت سے مجھ دیکھتی رہیں۔ میں نے اسے بہت پرچھینک دیا۔ وہ نرم خودہ شیرینی کی طرح اٹھی اور مجھ پر جلا آور ہوئی۔ میرا لٹا ہوا ہاتھ حرکت میں آیا اور وہ گھٹوم گھچر بستر بد جا گری۔ میں نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ میں نے اسے ایک گھنٹے سے دایا اور پھر اس کے منہ میں اینار وال ٹھوس دیا۔ اس کے نائٹ گاؤں کو کھانے کے لیے اٹھتا ہوا دیکھنے میں مجھے کوئی ڈھمکائی پیش نہیں آئی کیونکہ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ کھانا کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد میں نے اپنی حالت درست کی۔ رہائی کی جانب اگلا قدم اٹھانے سے پہلے میں نے بڑے سکون سے جوجانا بہتر سمجھا۔ وہیں بندے کنارے پر تنگ کر میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور مجموعی صورت حال کا جائزہ لیا۔ مجھے کھانا کی زندگی کے مسائل سے ہمدردی تھی مگر اس ہمدردی کی خاطر میں عملاً کچھ بھی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے اس کی بالکل فکر نہیں تھی کہ بعد میں اس کا رد عمل کیا ہوگا اور وہ خودکشی کرے گی یا پھر کسی ’جھاو مٹی‘ پر بھرا ہو جائے گی۔

کھانا کے دہے ہوئے بارہ ہزار روپے میری جیب میں تھے۔ اس سے کہیں زیادہ وہ رقم تھی جو مجھے انفرنگ کرنے کے بعد مجھ سے چھین لی گئی تھی۔ اس میں اس پانچ ہزار تو انڈین کرنسی بھی اور پانچ ہزار ڈالری بھی تھے۔ اس طرح بارہ ہزار روپے مل کر مجھے ہر حال حق تھا۔ اب سوال تھا لاکھوں کی مالیت کے زیورات کا۔ جو کھانا کی وارڈرو میں بڑے ہوئے تھے۔ یہ دشمن کا مال تھا اور دشمن کی حوالہ دہانی کا بھی نہیں تھا۔ دوسری طرف پیسے ہمارے بہت سے مسائل حل کر سکتے تھے لیکن میں بنی اخلاقی جواز سے مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ مجھے یہ چوری مگنی تھی۔ بالآخر میں نے زیورات کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے

ایک نظر وارڈرو میں ڈالی۔ اس میں سے دلاؤ پر خوشبو کا ایک مضر جھونکا آیا۔ ساڑھی دار کھولنے پر مجھے فرانس کی اعلیٰ ترین پرفیوم کی رنگ رنگ و خوشبو کی ڈالنی والی شیشال صفت بستہ دکھائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی مختلف قسم کی کیم اور درجنوں شیشی لب اسٹیک، نیل پالش وغیرہ بھی بڑی تھیں۔ ٹیچے کی دلاؤ کھول کر دیکھنے پر مجھے غلط اور تھکا دیر کا ایک بندل ملا۔ یہ سب کھانا کے پرستاروں کے غلطو دھتھے۔ ان پرستاروں کے حواسِ عبت کے نام پر دھوکا دے کر دنیا کی ویرانی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ کر چل گئے۔ ان میں کچھ کے ساتھ کھانا کے تصور میں بھی بڑی تھیں۔ ہر تصویر کے پس منظر سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ تصویر کھانا کی کئی بڑی تاہم ان میں کوئی بھی تصویر قابلِ اعتراض یا ایسی نہیں تھی جس پر کوئی اسے بلیک میل کر سکتا۔

میں نے سائڈ ٹیبل کی دلاؤں میں مجھے وہاں تک تابل اور تصویروں کا ایک انفرنگ ٹاک ڈھیر ملا۔ یہ سب بھی کھانا کی ذہنی بے لادہ روی کا سبب بنے ہوں گے۔ میں نے اسے پھر بند کر دیا۔ مزید وقت ضائع کرنے کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔

میں نے کھانا کو دیکھا تو وہ سر کا اھر سے اُدھر بچ رہی تھی اور اس کی بے چینی بڑھ کر رہی تھی کہ وہ ہوش میں آئے ہی والی ہے۔ اس حالت میں کھانا کا بے ہوش پڑے رہنا ہی بہتر تھا چنانچہ میں نے اس کو اپنے ہاتھ کے ہلکے سے وارے سے جس کی اور پھر بند سے اٹھالے کہ ہاتھ دوں میں لیا اور وہ دروازے کو باہر سے لاک کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا کہ اب کم سے کم وہ گھنٹے تک کھانا کھائے گی۔ اسے تلاش کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ اگر آگیا تو لڑکھائی دیکھ کے چلا جائے گا۔ وہ خود صبح چھینے تک ہوش میں آئے گی۔ پھر دروازہ پھینکی اور یہ ٹورس کر کوئی آئے گا تو اسے دروازہ توڑنا پڑے گا۔ اگر میں باہر نکلنے میں کامیاب رہا تو میرے لیے اپنی ہلت کافی ہوگی۔

کمرے سے باہر کے میں نے نقشہ کو ذہن میں رکھا اور بائیں جانب چل پڑا۔ دروازہ داری کے آخر میں ایک دروازہ تھا جو بند تھا میں نے اس کا دروازہ لاک گھما کے دیکھا۔ دروازہ باہر سے مفلک کی لگا تھا۔ ابھی میں نے واپس جا کے کسی دوسرے دروازے پر قسمت آزمائی کا سوچا ہی تھا کہ باہر سے نعل میں جالی گھانے کی آواز سنائی دی۔ میں دیوار کے ساتھ چپکے کھڑا ہو گیا۔ کوئی شخص دروازہ کھول کے اندر آیا۔ اس کے کندھے سے ایک شیشی گن بھی ہوئی تھی۔ اندر کسی کو نہ دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ شاید وہ اسی طرح اندر سے خفیہ سی آواز سن کر دروازہ کھول دینے کا غالی تھا۔ اس کا حال کام یہ تھا کہ باہر سے کسی غیر متعلقہ فرد کو اندر نہ جانے دے لیکن اندر

واپس کے لیے ضرورت پڑنے پر فوراً دروازہ کھولنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اسے زیادہ حیرانی ہوئی جب میں نے چھینے سے کھانا دیا ہوا دیوار اس کی گڑی پر رکھ دیا۔ بالکل خاموش کھڑے رہو، میں نے اسے حکم دیا۔

خوف سے زیادہ اسے حیرت نے منجمد کیا۔ ”کون ہو تم؟“ ”موت کا فرشتہ؟“ ”موت دوت؟“ میں نے کہا۔ ”واپس جا رہو۔ آہستہ آہستہ بیٹ کے اور ہاتھ اوپر اٹھا کے۔ پھر قیچی چھینے۔“ ”مگر اس کا غیر ضروری مظاہرہ تمہاری وفات کا سبب بن سکتا ہے؟“ میں تم کو سلوٹھ میں اس حکامات کی تعمیل کر کے دیکھنا پسند کر رہا تھا۔ پہلے یہ شیشی گن آتا رہو؟

اس نے ہاتھ سیدھا کیا اور میں نے شیشی گن خود اتار کے اپنے شانے پر ڈالی۔ وہ بیٹ کے دروازے سے گزرا اور میں نے پوری طرح مستعد ہوتے ہوئے دیوار کو مارا واکم نہیں ہونے دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی گھومتا گیا اور باہر آ گیا۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں“ وہ بولا۔ ”تم باہر نہیں جا سکو گے۔ یہ دروازہ بھی باہر سے بند ہے۔“

میرے سامنے اب ایک اور دروازہ آگیا تھا۔ اس مختصر سے کمرے کو جس میں آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے آگے چھینے دو دروازے تھے، حفاظتی نظام کا ایک حصہ سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک شخص کو میں نے قافلوں کا ایک محروم دوسرا محافظ جو باہر تھا بالکل آزاد تھا۔

”کیا تم اپنے ساتھی سے نہیں کہو گے کہ وہ دروازہ کھول دے؟“ میں نے کہا۔

”وہ میرے کہنے سے دروازہ نہیں کھولے گا۔“ ”پھر کب کھولے گا؟ جب فائز کی آواز اور تمہاری دردناک چیخ سنے گا؟“ میں نے کہا۔ ”میں اس شیشی گن سے دروازے کا ٹالا توڑ سکتا ہوں۔ وہ بھی خواہ مخواہ باہر جا رہا ہے گا۔“

”تم چور ڈاکو۔ جو بھی ہو۔ شاید یہ نہیں جانتے کہ...“ ”میں سب جانتا ہوں۔ میں نے کہا۔ ”میں اسی دروازے سے گزر کے اندر گیا تھا۔ میں کوئی اجنبی نہیں ہوں۔“ وہ شاید قائل ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کے دروازے پر دستک دی۔

باہر سے کسی نے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“

”دروازہ کھول مار“ میرے قہر نے کہا۔ باہر والا اسی کا ماتھی تھا پانچ آواز پہنچا تھا تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی وجہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھی۔ اسے یہ شک کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی

دشمن اندر سے بھی آ سکتا ہے۔

میں نے جیسے ہی دروازے میں جالی گھنے کی آواز سنی اپنی پوری قوت کے ساتھ دیوار اور سے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے سر پر وار کیا۔ دیوار پر ہوتا تو اس کا سر جھٹکا جاتا۔ اس چھوٹے سے نازار دیوار کی ضرب نے اسے ناک آؤٹ کر دیا لیکن وہ گرتے گرتے پراڈتیت آواز سن چلا یا۔

باہر والا اس چیخ پر دھڑکھٹک گیا ہوگا مگر میں نے اسے دوبارہ جالی لگا کے دروازہ مفلک کرنے کی ہمت نہیں دی۔ میں نے بندل کھانا کے دروازہ اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک جھٹکے سے وہ بھی اندر آ گیا۔ میں نے شیشی گن کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے اور اپنے ساتھی کو دیکھنے لگا جو میرے قدموں میں لپٹا ہوا تھا۔

”یہ... کیسے آخر... کون ہو تم؟“

”میں تمہارا دوست نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”دشمن ہوں۔“

مجھے کسی رعایت کی امید نہ لگنا۔

”تم نے... اسے مار دیا ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے وعدہ خلافی کی۔ تم اپنی جان بچا سکتے تو اگر مجھے یہاں سے باہر نکلے کا راستہ بتا دو۔ اور باہر نکلنے میں میری مدد کرو۔ اس نے بڑی مشکل سے ہنسی نکلا۔ ”میں... میں کیسے کر سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں کر سکتے۔ کیا تمہیں رستے معلوم نہیں؟ یا اپنی جان عزیز نہیں؟“ میں نے کہا۔

”میرا مطلب تھا... باہر جانے کے لیے... میں کیا مدد کر لوں۔ اور مجھی بہت سے لوگ ہیں... اور اس وقت تو گتے بھی کھٹے ہوئے ہیں۔ پھر باہر کا گیٹ بجلی سے کھلتا ہے۔“

”میں گیٹ کو چھوڑ دو۔ پیچھے سے جانے کا بھی تو کوئی راستہ ہوگا؟“ میں نے کہا۔ ”جہاں چوکیلا دروازے گتے نہ ہوں۔“

”راستہ تو ہے۔“ وہ بولا۔ ”لیکن اس دیوار کو تم کیسے عبور کرو گے جس پر تار لگے ہوئے ہیں۔ بجلی ہے ان میں۔“

”تم مجھے دیوار تک پہنچا دو۔ میں نے کہا۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم۔“

وہ مجھے واپس اندر لے گیا۔ ایک اسٹور اور کچن سے گزرنے کے بعد میں عمارت کے عقبی حصے میں نکلنا۔ وہ مجھ سے آگے تھا اور میں اس کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتے چھینے چلا جا رہا تھا۔ ایک باغ سے گزرنے کے بعد سونٹ کا ٹراکٹ۔ جو شخص میرے آگے بظاہر بڑے صبر و سکون اور

سعادت مندی کے ساتھ چل رہا تھا میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ اس نے ابتدا ہی سے مزاحمت نہیں کی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اسے واقعی جان پیاری ہے۔ مجھے اس کی ایک جیب کے اوپر جو اٹھارہ سواڑا تھا وہ ریلواری تھا جسے اس نے مشین گن کا مقابلہ کرنے کے لیے لنگھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک دم بچھ گیا۔ میں اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس حد تک مزور مستعد تھا کہ وہ ریلواری لنگھنے یا پلٹ کر مجھ پر حملہ کرے وہ مشین گن کاٹ مار کے اس کا سر توڑ دوں۔ اس کے اوپر میرے درمیان شکل سے دو فٹ کا فاصلہ تھا اور اپنی چال کو کامیاب بنانے کے لیے اس نے ابتدا ہی سے رفتار زیادہ رکھی تھی۔ میں بھی کم سے کم وقت میں خطرناک علاقے سے نکل جانے کا خواہش مند تھا چنانچہ اس کے قدم ایک مشین انداز میں تیز اٹھ رہے تھے تو میں بھی اس کی رفتار کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ اچانک میرے سامنے سنگ راہ کی طرح حائل ہوا تو میں اپنی تیز گامی پر فوراً قابو نہ پاسکا۔ میں اس سے ٹکرایا اور پھر اوپر سے گزر کے اس کے سامنے چپ ہو گیا۔ وہ اس ایکٹیو کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا۔ نیچے بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا ریلواری نکال لیا تھا۔

میں نے اٹھنے میں ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی نہیں کی مگر اس سے پہلے ہی حریف نے ریلواری مجھ پر مار دیا۔ گولی چلانے کے لیے یہ فاصلہ بہت کم تھا۔ اس نے میرے سر کا نشانہ لیا ہو گا لیکن میری بھڑکی میرے کان کی ریلواری کا دستہ میرے شانے پر لگا۔ وارمنٹ تھا اور ہڈی پر پڑا تھا۔ درد کی میں نے ذرا سی دیر کے لیے میرے بازو کو مفلوج کر دیا۔ پھر صورت حال کی سنگینی کے خیال نے مجھے ایک وحشیانہ جذبے کی قوت دی اور میں نے مشین گن کو ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔ دستہ اس کی پشتانی پر یوں پڑا کہ میں نے ہلکی سی چٹائی کی آواز سنی۔ اس کی پشتانی کی ہڈی سامنے سے چٹخ کے اندر دھنس گئی۔

اس نے ایک بھیانک آواز نکالی اور باغ کے درمیان میں بنی ہوئی سنگ مرمر کی روش پر گر گیا۔ اس کے ماتھے سے پھونکنے والا خون سفید سنگ مرمر کو سرخ کرنے لگا۔ میں نے اس کی فیص کے سامنے والے حصے میں ہاتھ ڈالا اور وہ ریلواری کھینچ لیا جو اس نے بیٹوں کی سیلٹ اور پیسٹ کے درمیان دبا رکھا تھا۔ شاید اس کی بیٹوں کی جیب میں کوئی پاک بوجہ ضرورت پڑنے پر وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا اور پر لگا ہوا ریلواری کھینچ لیتا۔ میں نے اس کو خاموش کرنے کے لیے ایک بار پھر مشین گن اس کے سر پر ماری۔ وہ اپنا سر دووں ہاتھوں سے پکڑ کے چیخ رہا

تھا۔ دوسرا وار اس کے منہ پر گر گیا۔ اس کے جھڑوں کی ہڈی کے ساتھ کچھ دانت بھی ٹوٹے ہوں گے اور شاید کچھ بھی ٹوڑا ہو گا۔ ایک بار پھر وہ اذیت سے چلایا۔ اس کا چہرہ سامنے سے ہڑوکی تھا مگر غلط نشانے بازی کا شکار تھا۔ ایک مہم جو آواز اس کی کھونٹ کے پیچھے یا سائیل میں پر جاتا تو وہ آواز نکالے بغیر سہم ہو کر ہولناک حد دور سے میں نے ایک تیز سیٹی کی آواز سنی۔ پھر اس سیٹی میں دھن اور بائیں جانب سے سنائی دی۔ اس ٹھنکی کی چٹخ غافلوں نے سن لی تھی اور وہ ہر سمت سے خطرے کا سنل دے دے رہے تھے۔ سیٹی کے ساتھ مجھے گئے عجیبے نچنے نچنے رات کی خاموشی میں الٹی خورخوار آواز بہت قریب اور زیادہ خطرناک محسوس ہوتی تھی۔ اب میں نے ناپ تول کے وار کیا تاکہ اس شخص کی اذیت بھی ختم ہو اور جنگ آرائی بھی۔ گردن کے ٹوٹنے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی ناک اور منہ سے اچھلنے والے خون کے جھینٹے ٹپک رہے تھے۔ یہی نہیں مجھ پر بھی پڑے تھے۔ یہی بجائے والے بار بار ایک دوسرے کو خبردار کر رہے تھے اور گول کے جھونکنے کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ بھی ادھر ہی دوڑتے ہوئے آ رہے ہیں۔ میں اٹھ کے بھاگا اور سامنے اٹھلے والے پہلے ہی سروٹ کوارڈ کی دیوار پر چڑھ کے اندر کود گیا۔ بیرونی احاطے کی دیوار مزید پچاس گز دور تھی۔ اگر میں دوڑ کر یہ فاصلہ طے کر بھی لیتا تو اس فیصل کو عبور نہیں کر سکتا تھا جس پر ہزاروں دولٹ کی برقی روولے تار پھیلے ہوئے تھے۔

یہ بھی ایک اچھا فیصلہ ثابت ہوا۔ میں اندر کودا ہی تھا کہ باہر دن نکل آیا۔ یہ سرخ لاش کی روشنی تھی معلوم نہیں کتنی سرخ لاشیں ایک وقت آن ہو گئی تھیں۔ میں باہر ہوتا تو میرے لیے خود کو پوشیدہ رکھنا ناممکن ہو جاتا۔ میری خفیت سی حرکت کے ساتھ ہر سمت میں میرا سایہ متحرک نظر آتا اور چند قدم دوڑنے سے پہلے ہی ہر طرف سے آنے والی گولیاں مجھے چھلی کر دیتیں۔

سروٹ کوارڈ کے مختصر سے انجن میں اندر تھا۔ ایک کمرے کا کوارڈ تھا۔ کمرے کے سامنے ولے برآمدے میں ایک طرف شاید کچن تھا اور دوسری طرف باغ دروم۔ دروازہ وسط میں کھٹکا تھا اور باہر سے متعلق نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اندر کمرے میں ایک شخص ہو گا یا اس کے بوی بیٹے ہوں گے۔ باہر کی شورش سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور مزید سے جاگ اٹھنے والی ایک عورت نے باہر جھانک کے دیکھا۔ میں ایک کونے میں تھا چنانچہ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی لیکن وہ باہر آئی تو میرے لیے اس جانے پناہ سے لگتا ضروری ہو گیا ورنہ ایک سیکنڈ بعد وہ چیخ ماتی کو خطرے کی

نہادی کر دیتی۔ اس نے نیند سے بوجھل لیے میں کہا: "ادھی گھنٹہ آفت آگئی؟"

پھر میں نے اس کے منہ پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیا اور اسے بچنے کے واسطے اندر لے گیا۔ مشین گن اب میرے کندھے پر تھی اور ریلواری میں نے دوسری جیب میں ڈال لیا تھا چنانچہ میں اپنے دل میں ہاتھ آزادی سے استعمال کر سکتا تھا۔

عورت قتلے قمر تھی۔ اسے اندر لانے کے لیے مجھے بھی قوت صرف کرنی پڑی کیونکہ وہ خود کو کھینچ لانے کے لیے ہاتھ پیر رہی تھی اور جسم کی ساری طاقت لگا رہی تھی۔ کمرے کے اندر پروٹ کا نیلا بلیب مل رہا تھا۔ اس دم سے اسے آجائے میں مجھے رات کے جھٹ زدہ چہرے کا سایہ یا مائل سا نواز رنگ نظر آیا۔ دو تیس سال سے زیادہ عمر کی تھی اور یقیناً کسی ملازم کی بیوی تھی۔ ہمیں کے مخصوص لباس یعنی بانٹ بھری چوٹی اور لٹنے میں اس کا سا ہوا بدن بہت نمایاں تھا۔ ایک چھوٹے سے تخت پر چھ سات سال کی ایک بچی بیٹی مصروفیت سے منہ کھینے نیند میں بے سندھ پڑی ہوئی تھی۔ وہ خود جس بستر سے اٹھ کر آئی تھی وہ فرش پر لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے وہیں لٹا دیا۔

"اگر تم نے ڈرا بھی آواز نکالی تو میں تم کو اور اس بچی کو لگا کھٹ کھٹ کر مار دوں گا" میں نے اوجھڑناک بنا کے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ یہ بولی کے علاوہ میں اندر میں آدمی مار کے آیا ہوں۔ دو خون اندر سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھ میں آئی بات یا نہیں؟" میں نے اس کی گردن کو ایک جھٹکا دیا۔

اس نے سخت خوفزدہ انداز میں سر کو ملا کے مجھے تعین کیا کہ وہ بات سمجھ گئی ہے۔ اس کی مزاحمت اب ختم ہو چکی تھی۔ یہ تو آواز میں تم سن رہی ہو نا؟ یہ سب لوگ مجھے تلاش کر رہے ہیں؟ میں نے کہا: "جیت تک اس مشین گن کی آخری گولی تم کھل ہوگی۔ اور میرے دونوں ریلواری نہیں ہو جاتے۔ کسی باہر بھی میرے نزدیک نہیں آسکتا۔ جو اندر آئے گا اس کی لاش کھانے میں گرنے لے گی۔ سب کا خون اسی میں ملے گا مگر اچھا بھلا نہیں کھلا شمول کے ڈھیر اور خون کے سیلاب سے محفوظ ہو سکتی۔" میں نے اسے پھر لے لیا۔

اس نے زیادہ خوف کی کیفیت میں سر ہلا دیا اور دم سے نڈر ہی۔ لاشوں کا اور خون کا تذکرہ اس کی رسی تھی بہت کم ختم ہونے کے بعد ضروری تھا۔ عورت نامعلوم پر چڑھو ڈاکو یا قاتل

نہایتی دشت میں زیادہ بتلا ہوتی ہے۔ فوری رد عمل کے طور پر مجھے کچھ کشتی تھی مگر وہ چار منٹ گزر جانے کے بعد جب اس نے کھلیا کہ مجھے سے تعاون کر کے وہ خود کو اپنی بچی کو اور اپنے گھر

کو بچا سکتی ہے تو اس کا خوف کچھ کم ہوا۔ اسے اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے سوا کر سکتی ہے۔ میں نے اسے آزاد کر دیا۔ اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے میں محتاط طور پر دھالیں وہ چیخ مار دیتی تو یہ احتیاط مجھے بھی نہیں پاسکتی تھی۔ شکاری اودان کے کتے سیدھے ادھر آجاتے۔ پھر اس عورت کو یا اس کی بچی کو مارنے کا کوئی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ میں مصروف ہوتا اور میرا حور کرنے والے اطمینان سے سامنے کتے بغیر ساری کارروائی کرتے۔

"دروہیں بہن؟" میں نے نرمی سے کہا۔ "میں کسی غریب کی جان کا دشمن نہیں ہوں۔ میرا دشمن تو یہی تھی۔ اسے میں نے مار دیا۔"

"تم... سیٹھ کو مار دیا...؟" وہ کانپتے ہوئے بولی اور ایک ہاتھ کے سہارے آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کے لیے میں دکھ یا پریشانی، درد یا جبرانی نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال اس لیے نہیں کیا تھا کہ اسے اپنے کانوں سے سننے ہوئے الفاظ پر شک تھا یا چہرہ دوبارہ مجھ سے جواب سن کے ناممکن کے ممکن ہونے کا یقین کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے میں نا معلوم سے اطمینان کا اظہار تھا۔ جو آہستہ آہستہ اس کے لبوں پر ایک خفیف سی زہر بھری مسکراہٹ بن کے پھیل گیا۔

اس نے آہستہ سے سر ہلایا: "یہ تو ہونا ہی تھا ایک دن ایک دن... بلکہ بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔" میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا: "کیوں؟"

اس نے ایک گہری سانس لے کر بیٹوں کو ٹھیک کیا اور اذیتی لے لی: "کیا تم نہیں جانتے؟ یہ تو وہ خود بھی جانتا تھا۔ اسی لیے تو آتی بڑی فوج رکھتا تھا اپنی حفاظت کے لیے۔ پھر جھگڑا نہ چاہیں تو کوئی کیسے جی سکتا ہے۔ بے شک قتلے کے اندر بیٹھ جائے۔ دیکھو لاؤ آخر تم نے کئی دیا وہ کام۔ جو پہلے کوئی نہیں کر سکا۔" باہر ایک شرمچا ہوا تھا۔ گئے مسلسل جھونک رہے تھے اور میٹیاں بھانے والے آپس میں چلا چلا کے کچھ کہہ رہے تھے ان کی ساری دوزخ و صوب اس سروٹ کوارڈ کے کچھ فاصلے پر ہو رہی تھی۔ وہ مجھے بلائی کی ایک ایک جھڑپی میں تلاش کر رہے ہوں گے۔ یہ میں جانتا تھا۔ وہ درختوں کی شاخوں میں جھانک کر دیکھیں گے۔ محل کے اندر باہر کوئی کوئی شہ نہیں جھوڑیں گے اور بالآخر سروٹ کوارڈ کی طرف بھی آئیں گے۔ اب لاش نے ان کو کچھ نہیں بتایا

ہو گا کہ ایک بے ہوش محافظ کی مشین گن اور لاش کا ریلواری غائب پاکے وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ دشمن جو بھی ہے خالی ہاتھ نہیں ہے اب تک تو شاید تریوینی انھیں اس دشمن کے بارے میں تفصیل

سے بتا چکا ہوگا۔ ممکن ہے اس نے کمائی تلاش بھی شروع کر دی ہو اور پولیس کو بھی اطلاع کر دی ہو۔

"تم نے کیوں مارا اسے؟ وہ بولی۔
"تم اسی کے گھر میں رہتی ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہ کیا آدمی تھا؟ میں نے کہا۔

"وہ آدمی نہیں راکھش تھا؟ وہ لعنت سے بولی۔
"پھر تو تمہارا بھی فرض بنتا تھا اسے مارنا۔ مگر ظاہر ہے تمہارے بس کی بات نہیں تھی؟ میں نے کہا۔ "یہ نیک کام میں نے کر دیا۔ اب ایک نیک آدمی میرے ساتھ کر سکتی ہو۔ کسی طرح مجھے ان شکاری نکول سے بچاؤ اور یہاں سے نکال دو۔"

"ابھی۔۔۔ ابھی تو بہت مشکل ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"ابھی نہ سہی۔ کچھ دیر بعد؟" میں نے کہا۔ اور دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک گناہت قریب آ گیا تھا۔ اس کے بھونکنے کی آواز صحن میں سے آتی محسوس ہوتی تھی۔

"وہ ادھر آگئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "وہ ہسروٹ کو اوپر میں جا کے دیکھیں گے۔ ان کو اندر مت آنے دو۔ باہر ہی سے جواب دے کر لوٹا دو۔ اور مجھے بتاؤ میں کہاں چھپوں؟"
وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا۔ "جلدی کرو آؤ۔"

"مگر باہر۔۔۔" میں نے پریشانی اور مذہب کا شکار ہو کر کہا۔ اس عورت کی باتوں نے مجھے یہ اطمینان ضرور دیا تھا کہ وہ تروپس کے قتل پر میرے خلاف اپنے دل میں عناد کے جذبات نہیں رکھتی۔ میرا ایک غیر ارادی اور بے مقصد جھوٹ میرے تحفظ کی ضمانت بن گیا تھا۔ اب مجھے اس عورت یا اس کی بیٹی کے ساتھ زبردستی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے نزدیک میں نے واقعی اچھا کام کیا تھا۔ چنانچہ مجھے بچانے کی کوشش وہ پورے خلوص سے کرتا چاہتی تھی۔

"جیسا کہ کہہ رہی ہوں ویسا کرو۔" اس نے مجھے صحن کے ایک کونے میں بٹھا دیا۔ پھر بڑی چھتری سے اس نے میرے اوپر میلے پڑے پھیلے شروع کیے۔ یہ میلے کپڑے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان کی چھتری چھتری ڈھیر یاں سی بنی ہوئی تھیں۔ جب پہلی کھپ میں تجھ پر پتلونیں اور دوسری کھپ میں ٹیمپوں کا ڈھیر لگا اور تیسری ٹانگ سے میل اور پسینے کی بو محسوس کی تو میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ رہا کہ کسی جھوٹی کھپ میں ہوں۔

دھوپ میں اس کا شوہر تھا یا وہ خود دھوپ میں تھی۔ یہ سب کپڑے اس نے خود ہی الگ الگ کیے ہوں گے۔ جواب پھر ایک ساتھ تجھ پر گر کے ڈھیر کی صورت اختیار کر رہے تھے۔

"بلانت بالک! اس نے میرے قریب سے سر گونڈا اور کھانوں کے لیے چٹیک مت مار دینا۔ تمہارے ساتھ میری ابراہمی بن جاؤ گی۔ خود میرا گھر والا میری ناک چھنی کاٹ دے گا کہ بارگھ تیرا وہ تھے چھپا ہوا تھا۔ وہ کپڑے پھیلنے لگے۔ وہ جاری تھی۔ میں گندے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے غائب ہونے کے بعد کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اتنے کپڑے کہاں سے لاسی ہے اور اندر باہر ترقی تیزی سے آ جا رہی ہے۔ میرا دھیان باہر کی آوازوں پر تھا۔ مجھے تلاش کرنے والے کم سے کم چار آدمی تھے۔

جب کسی نے دروازے پر دستک دی تو میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ میلے کپڑوں کے حصص ڈھیر کے نیچے میں گھس کر نکل جھپکا ہوا تھا۔ میرا سر زمین سے لگا ہوا تھا اور کہنیاں صحن کی گھسیٹنے کی کوشش میں پھل رہی تھیں۔ کیا دھوپ بنی ہوئی ایک قاتل کی تلاش کرنے والوں کو دھوکا دے سکے گی۔ انساں کو تو وہ زبان سے قاتل کر سکتی تھی کہ ادھر کوئی نہیں آیا۔ مگر تھے تو پرائیڈ گئے۔ پھر ایک خیال نے مجھے بڑی امید دی۔ دھوپ کے ذہن میں تو شاید صرف یہی ہوگا کہ مجھے میلے کپڑوں کا ڈھیر کے تلاش کے لیے آنے والوں کو مطمئن کر دے۔ اس کے مختصرے گھر کے کھس خانے یا باورچی خانے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جہاں وہ مجھے چھپا سکتی۔ لیکن میلے کپڑوں کے ڈھیر مجھے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میرے جسم کی نوک سے سو استعمال شدہ کپڑوں کی بوئیں شمال ہو گئی تھی۔ یہ غفلت جسم کی بو تھی۔ اس میں صحن کے اندر کام کرنے والے سب ہی لوگوں نیل اور پسینہ تھا۔ تروپس اور اس کے خاندان کے کپڑے ان کپڑوں میں شامل ہوتے تو مجھے بہترین قسم کی خوشبو بھی آتی۔ لیکن کسی دھوپ کو ان کے کپڑے کسی دے جاسکتے تھے۔ یا وہ ایک لباس کو دوبارہ استعمال کرنے میں نہیں ہوں گے یا سال چھپے ہوئے کوئی لباس دوبارہ پہنا جاتا ہوگا تو ہمیشگی کسی ٹاپ کلاس ڈرائیو کار باہر سے کہا۔ "مگر تمی ہے کیا؟"

"جیو دھوپ مہارانی میں نے دل ہی دل میں فرض ہو کر کہا کہ اس نے فوراً دروازہ کھول دیا ہوتا تو یہ سمجھا جاتا کہ شاید وہ جاگ رہی تھی اور صحن میں ہی تھی۔ مگر وہ مجھے دفن کے اندر چلی گئی تھی اور دوسری دستک پر بھی اس نے جب کہ کواٹھکوں نے دفن آواز کے ساتھ۔

"کون ہے رے۔ اتنی رات کو۔ کواٹھکوں نے کیا؟" وہ غصہ سے بولی۔

میں بڑبڑاتی ہوئی باہر آئی۔ پھر اس نے باہر کا دروازہ کھولا۔ "کیا ہے؟" وہ چلائی۔ "میل کی طرح منہ اٹھانے چلا آ رہا ہوں۔" پھر اس نے بیچ ماری۔ "اپنے باپ کو ساتھ کیوں جا رہی تھی۔" چپ کراہم آزادی۔ "کسی نے غلے کے کہا۔" ہم ایک قاتل کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ ادھر تو نہیں آیا کوئی؟

"آیا تھا۔ اندر سوار تھا میرے ساتھ۔" دھوپ نے چیخ کر ڈھونڈ بھونکنے دے اس کو لٹکا کر ڈھونڈا۔ وہ کتا جھجھکے کو دھوپ نے بیل کا باپ قرار دیتے ہیں۔ چیخ ماری تھی۔ میں دم سا دھڑکا۔ دھوپ صحن کی نہیں آئی تھی۔ بڑی بیٹھی تھی۔ میں نے گھٹنے کے اندر جلنے کی اور غلے کے اندر آئی۔ چند سیکنڈ میں وہ پھر باہر آگئے۔ تلاش کے لیے آنے والے دھوپ سے ایک بڑی بے شرمی کی بات کی۔ دھوپ نے جواب میں اپنے میاں کا نام لے کر کہا کہ اپنی اماں کو بھیج دے گا۔ پاس ٹانم کے لیے۔ غالباً اس نے دھوپ سے ملاقات کرتا مانگا تھا۔

"ادھر۔۔۔ ادھر تو۔۔۔" وہ ہنسا۔ "دیکھ میلے کپڑوں کے ڈھیر میں۔" اس نے مجھے ایک خاصی اشتعال انگیز لہری میں لے کر بہت قریب آ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن نے کئی اور ٹرانزیکٹر پر میری انگلی کی گرفت سخت ہو گئی۔ کشیدگی میرے اعصاب پھٹنے لگے۔ کتے کا کچھروسا۔ اس کی ہڈیوں میں ہاتھ مارنے کا تقاضا تھا کہ وہ میری بو کو گرد و پیش کی ہر شے کے ساتھ لے کر آئے۔

انفشار اضطراب خوف اور محبت کی سسٹنی سے معمور وہ ہڈیوں کے لیے زندگی اور موت کے درمیان کے غمناک طرح کے گرد و کھنڈے تھے۔ بہت سے جھول کے میل اور پسینے کی بو سے ملبہ ہوئے والی چیزیں تھیں کہ ان کے کپڑوں سے نکال لیتا تو میرے ہڈیوں میں ہوتا۔ میں اس ڈھیر میں دریافت ہوتے ہی صحن کے کپڑوں کے ساتھ تھے۔ شاید تو اس کے ساتھ تھے والے کو مار دیتا۔

لیکن گھٹنے کی ٹانگ کو اس عورت کی عقل نے شکست دی تو ایک دھوپ صحن میں اور پھر مجھے کسی رشتے سے نہیں جانتی تھی۔ اس نے ایک حقیقت کو پہلے ہی تسلیم کر لیا تھا کہ تروپس ایک شیطان ہے۔ دوسری حقیقت کو اس نے تسلیم نہیں کیا کہ میں مجرم نہیں ہوں کیونکہ برائی کو مٹا کر میں

نے نیکی کی ہے۔ بس اسی پر ناقص لائق بھی جانے والی اس عورت نے اپنی جان کی بازی لگائے ایک بڑا کھیل۔ اور جیت گئی۔

جب شکاری اور گت دونوں چلے گئے تو اس نے دروازہ بند کیا۔ میرا خیال تھا کہ اب مجھے اس کی آواز سنانی دے گی۔ وہ کتنی کھلوا بھلا آواز نہ گئی تھی۔ میں اس طرح بے بس و حرکت پڑا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر اس میلے کپڑوں کے ڈھیر کی قید بے عفوئی کب تمام ہوگی پھر میں دھوپ کی کالائی کیجھکیگا۔ وہ کوئی ریک نہیں لینا چاہتی تھی۔ اسے ڈر ہوگا کہ باہر کے بند دروازے کی بھری سے کوئی جھانک نہ رہا ہو یا پورے کو اس پر نہ دیکھ لے۔ اس نے نارمل طریقے پر نہ بڑبڑا کر کے والے کو کوسا اور گوا پھر سوچی۔ کتے اب قریب نہیں بھونک رہے تھے وہ ڈھیل کے شال اور صحن کی جانب چلے گئے تھے۔ باتیں کرنے والوں کی بھی اب کوئی آواز سنانی نہیں دے رہی تھی۔ تقریباً اس منٹ بعد جو میرے لیے دس گھنٹوں سے کم نہیں تھے دروازہ کھل گیا اور میں نے اس کے قدموں کی آہٹ سنی۔

"باہر آ جاؤ بابو۔" اس نے میلے پڑے ہٹا کر کہا۔ میں بڑی شکل سے اٹھا۔ آواز میں گن کو پھر کدے سے پڑا لیا۔ "تم کہاں کی عورت ہو، سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کس طرح شکاری ہوا کروں؟" میں نے اس کا موٹا بھینڈا ہاتھ چوم کر کہا۔

وہ کھائی۔ "اندر آ جاؤ۔ ان کا کوئی بھروسہ نہیں پھر آ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "وہ پھر آگئے تو تم کیا کرو گی؟"

"جواب کیا تھا؟" اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ "تمہارا گھر والا۔۔۔۔۔ دھوپ ہے؟" میں نے پوچھا۔ "نہیں بابو، یہ کام تو میں کرتی ہوں۔ میرا باپ اور میرے سارے بھائی دھوپ لکھتے پڑھتے کا کام لے رہے ہیں۔" وہ بولی۔ "یہ بیٹی ہے تمہاری؟"

"کیا تمہیں بیٹا نظر آتا ہے؟" وہ بولی۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ اب۔ آرام سے میں کیسے بیٹھ سکتی ہوں؟" دھوپ نے کہا۔ "مجھے جانا ہے۔" اور تخت کے کونے پر آرام سے بیٹھ گیا۔ "ابھی کیسے جاؤ گے؟" وہ بولی۔ "مجھ کیسے جاؤں گا؟ میں نے کہا۔" ابھی تو رات ہے۔"

"دن رات سے کام ہوتا ہے۔ باہر کون سے راستے سے جاؤ گے؟" ان کو معلوم ہے کہ تم اندر ہی ہو۔ وہ بولی۔ "کچھ میں ہو۔ یہاں تک تک چھپا لے بھوکھی مجھے اپنا رت مجھے خود ہی نہانے لے گا۔" میں نے کہا۔ "یا میں مارا جاؤں گا یا سب

2

”یہ سب واقعی انہیں ناک ہے جو کچھ اس زمانے میں کسی کے ساتھ بھی ہوا برا ہوا۔ ایک ایسا ہی دور تھا وہ سب ناپوں پر بھی شیطان سوار تھا۔ میں کسی کی صفائی پیش نہیں کرتا لیکن سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔ اچھے برے دونوں طرف تھے۔ باب میں تو کوئی بنا دل کے میرے ساتھ کیا جاتا تھا۔ میرا تو بڑا خدا ناک کٹ گیا تھا جس میں میری دل بھی اور زمینیں نہیں چھوٹے جاتی تھے میں لاٹھوں کے نیچے پڑا رہ گیا تھا۔ میری ایک بہن نے نوٹوں میں کو کو کے جان دے دی تھی۔ کیا اس بنیاد پر مجھے ان سب سے نفرت ہونی چاہیے جو مسلمان نہیں بلکہ ہر منہد کو دکھ کو دشمن سمجھا جا رہے ہیں وہ میری ان سے مجھے دھتھی رہی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کا

وہ تیرن ہو کے بولی۔ ”وہ کیوں؟“
 ”بھئی ایک تو میں مسلمان اور تم ہندو، پھر میں پاکستانی اور۔۔۔
 تم بھارت کی ماں ہیں تو مجھے کڑا داؤ۔“
 اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”چھوڑو مالو، کیا کرنا ہے اس

کون ہے یہ کیا لے جا رہا ہے؟ پُر آواز دلاور کی تھی یہ
 ٹانگ سے رہ گیا۔ وہ میٹ ابھی تک اندر ہی تھا۔ اس کی
 طلبہ یہ تھا کہ ترو بوی اور اس کے درمیان کاروباری مذاکرہ کر
 تم نہیں ہوئے تھے۔ دلاور بہت ہوشیار بزنس مین تھا۔ ترو

میا ملازم تنگ حرام نہیں ہوتے، دلاور نے غصے سے کہا۔
 ”میرے ملازم نہیں ہوتے“ تڑپتی ہی عقدہ جواب دیا۔
 شاید دلاور کو اس بات سے تسلی نہیں ہوئی تھی میں نے
 اپنے چاروں طرف دباؤ محسوس کیا۔ یہ دلاور کے ہاتھ مجھے پکڑی
 کو ٹٹول رہے تھے۔ اٹھیں کن میرے سینے سے گئی تھی۔ میں
 کسی بھی ناخوش کو اس صورت حال کے لیے بالکل تیار تھا۔ اپنے
 دریافت کر لیے جانے کے اس امکانات کو میں نے ایک لمحے کے
 لیے بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اور اس بارے میں میرے ذہن میں
 کوئی ابہام نہ تھا۔ اگر دلاور اس گھڑی کو کھولیں یا شک کا اظہار
 کرتا تو میں خود ہی بالکل آنا اور میری جیسی سائنس نظر آنا، اسے
 بھول دیتا۔ بیشن کن کا ایک راؤنڈ ان سب سے سننے کے لیے
 کافی ہوتا جو گلیکٹ پر موجود تھے۔

اور ستر کا اس ابن کے چھینے لگا۔ گدھا گاڑی سے بچھڑکا لیا اور آگے بڑھی۔ مجھے فرار کی ان کثرت کہانیاں یاد آئیں۔ کیسے کیسے نامکن طریقے اختیار کر کے لوگ ان قیدیانوں سے نکل گئے تھے۔ جن کے ہاں میں مشہور تھا کہ وہاں سے جسم کے ساتھ روح نہیں نکل

وہ ہنسی، "اب کہاں جاؤ گے تم؟"
 "جہاں سینگ سمائیں، میں نے کہا۔ یہاں سینگ ہیں میرے
 سر پر، یہ نہیں، لگدے کے سر پر سینگ کہاں۔ میرا مطلب ہے کہ
 جہاں تقدیر سے چلے۔ تم اب جاؤ، خدا حافظ!"
 اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بیگوان! کھٹا کر سن بھاری،"

اب یہ ہو سکتا تھا کہ انھوں نے پولیس کو طلب کر لیا ہوگا۔
اپنے پیشہ ورانہ انداز میں تعینات کریں کہ قتل ہوا کیسے اور ہر کہاں گیا
قاتل۔ کملہ کا بیان اس محافظ نے ہون کا بیان جو پہلے تاک آؤٹ ہو
گیا تھا اور جس سے میں نے شبنم کو کاتھو حاصل کیا تھا۔ بیان تو
پولیس ان کا بھی لے سکتے تھے جن کا وارنٹ سے دور کا تعلق ہی نہ

میں بڑی بھرتی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ خیال کتنا تھا کہ غالباً
لوٹ کر ضرور آیا ہوگا۔ ممکن نہ ہو کہ عذوہ اپنے ساتھ محسن کو بھی لایا ہو۔
نکد ایک جگہ تھی جہاں میرا وہاں پہنچ جانا یقینی تھا اور جہاں مجھے
ان کی خبر مل سکتی تھی۔ گزشتہ شب کے سارے واقعات بہت

عام حالات میں سیراف بن اندیشوں سے دور رہتا ہے۔ فرعون کرلیتا کہ وہ باختر روم میں ہوگی اور اس کے لیے کال ہیل کے جواب میں فوراً نامکمل نہیں، لیکن ان واقعات کے تناظر میں جو میرے

ساتھ بیٹن آچکے تھے میں پریشان کن خیالات میں گھر گیا۔ وہ باہر کا دروازہ کھلا دھڑکے ہاتھ روم میں کھڑے تھے گے۔ اور اگر معمول سے ایسا ہوا تو وہ ہاتھ روم میں سے پکار کے کہہ سکتی ہے کہ دروازہ کھلاؤ۔ یا اس نے دانت دروازہ کھلا چھوٹا تھا تو اندر آ کے بیٹھنے کے لیے کہنا کی شکل تھا؟

میں نے گھبرائے کہ دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہوتے ہی دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا۔ نہ جانے یہ بھیجی جس پر کیا چیز ہے جو بالکل صبح وقت پر آؤی کوئی خبر دار کر دیتی ہے۔ آؤ میٹک اللام کی طرح خطرہ خطرہ چلانے لگی ہے۔

”لتی! میں نے آواز دے کر کہا۔ میں لتی؟ غاموشی، سر ڈسٹاک، پیر آسیب سنا، خوف کی سرگوشی سے گونجنا ہوا جواب کوئی نہیں، میری آواز کی بازگشت ابھی تک فضا میں لرز رہی تھی۔ کون ہے جو اس پکار پر آئے۔“ لتی.... لتی....“ میں نے آگے پیچھے کے کہا۔ آلاکرا وہی تھا جس میں گزشتہ شام میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ساری آرائش و زیبائش ایک سرسبزیت بد صورتی میں بدل چکی تھی۔ کرسیاں اٹنی ہوتی تھیں، موٹے بے ترتیب اور داغ دار تھے۔ یہ داغ بہت بھیا تک تھے ان کا رنگ بڑا بے رحم تھا گہرا سرخ

”لتی! میں نے چلائے کہا اور اس کے بیڈروم میں گھس گیا۔ وہ وہاں قالین پر آٹی پڑی ہوئی تھی۔ دروازے پر اس کا سرخ خون جم کے کالا پڑنے لگا تھا۔ اس کا بے لباس جسم زخموں کا لالہ زار تھا۔ یہ سب زخم انسان میں درد مندوں کی وحشت اور بربریت کی نذر ہوتی تصویر تھے اور اس ظلم کی داستان جو بچکانہ تھی ہوتی کے جسم پر توڑا گیا۔

اس کو سگریٹوں سے داغایا تھا اور کھلی کے تار کے کوٹے سے مارا گیا تھا۔ یہ تار کا لورنگ نیلا بھی وہیں موجود تھا۔ جس نے لٹی کے بدن پر آٹنی تر تھی سیاہ لکیوں کا جال بنا دیا تھا۔ اس کے بھکرے ہوئے بال تاتے تھے کہ اعضاں اس بے رحمی سے ڈوچا گیا ہو گا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا لیکن میری ہمت نہیں پڑی کہ میں اوجھڑے اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھ سکوں۔ اس کے منہ میں ٹھوسا جانے والا پڑا بھی مجھے دکھائی دے رہا تھا۔

میں ایک دم اٹھا اور پیچھے ہٹا۔ میرے پاؤں کے نیچے کانے والی کوئی چیز تھیں گے ٹوٹ گئی۔ نیم روشن کمر اچانک آسب زہ ہو گیا تھا۔ میں نے گھبرائے کہ پھر اٹھا لی اور نیچے دیکھا۔ یہ ایک تصویر کا فریم تھا جو الٹی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے تصور کر لیا تھا کہ دیکھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کی چند کچالیں اب بھی فریم میں لگی ہوئی تھیں۔ شیشے کی تیز دھار نے اس تصویر پر بھی زخمی کر دیا تھا خوشگستہ

فریم میں ایسے لگتی تھی جیسے جنسی ہوتی تھیں میں سے دکھائی دینے والی لاش کا ڈھانچا۔

کسی دشواری کے بغیر میں نے اپنے آپ کو بچان لیا۔ یہ چہرہ کسی اور کا نہیں تھا گزشتہ شام اسے غالب نے دیکھا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ لٹی کی مجھ سے جذباتی وابستگی کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ اس وقت میں نے غالب کا مذاق اڑایا تھا مگر اب مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ لٹی نے میری صورت میں ایک گندہ چہرے کے خدوخال تلاش کر لیے تھے اور اسے احساس تھا یا نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنی کمزوری پر قابو پانے میں ناکام رہی تھی۔

میرا سارا وجود ایک دم سنسنے لگا تھا۔ لٹی کی پرسکون زندگی کے سفر کو اس یونانک انجام سے دوچار کرنے کی تمام ذمے داری مجھ پر تھی۔ میں نے اسے نہیں مارا تھا لیکن میں نے اسے مرادیا تھا۔ اس طرح اخلاقی طور پر اس کے قتل میں بالواسطہ پر میں بھی شریک تھا۔ تریوینی کے سلسلے اس کے عمل کے غلاموں نے صاف بتا دیا تھا کہ انھوں نے لٹی سے میرا پتا پوچھنے کے لیے کوئی تشدد کا حربہ استعمال نہیں کیا تھا۔ انھوں نے جذباتی دباؤ ڈال کے اسے بلیک میل کیا تھا۔ جمائی تشدد کرنے والے جو بددی دلدار کے ایجنٹ ہی ہو سکتے تھے۔ وہ بدیہیں وہاں پہنچے۔ جب انھیں تریوینی کے کسی آدمی سے معلوم ہوا کہ لٹی کے ساتھ تھے۔ وہ ایک طرح سے تریوینی کے گروہ کے پیچھے ابھی کے چھوڑے ہوئے سرائی کی مدد سے لٹی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ اس بات نے لٹی کو مزید پریشان کیا ہوگا کہ آخراں قلعی چہرے والے کے کھٹے دشمن ہیں۔ ان میں قلعی کتے ہیں اور اصل قلعی کتے۔ بعد میں اس سے میرا پتا پوچھنے والوں کا طریقہ کار مختلف تھا۔ انھوں نے لٹی سے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کر لینے کے بعد اسے ہلاک میزبانی کی سزا بھی دی۔

مجھے اب وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں جو لٹی نے ہم سے کہی تھیں اور وہ سارے وعدے یاد آ رہے تھے جو ہم نے لٹی سے کیے تھے۔ وہ سب کھیل ختم ہو گیا تھا اور صرف بچتا وارہ گیا تھا۔ معذرت معافی ثانی سب سے مومن الفاظ ہو گئے تھے۔ لٹی کے بھائی شوہر کی تصویر مجھے بڑا ملاٹ دکھی نظر دے گھور رہی تھی۔

کال بل بجی تو میں اٹھ بیٹھا۔ لیکن مجھے اپنی حاکم کا احساس ہوا۔ مجھے تو یہاں ایک منٹ بھی نہیں رکا تھا۔ جو ہوا تھا ہو چکا تھا۔ سوچنے اور اختتام کی آگ میں پلٹنے سے اور اس قتل پر آنسو بہانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ دیر کی صورت میں برا یہاں اس لاش کے ساتھ کپڑے جانے کا امکان زیادہ تھا۔ گھنٹی کی آواز نے میرے خوف کو یقینی خطرے سے دوچار کر دیا۔

یوں بچا؟ کون پڑوسی؟ دودھ والا یا اخبار والا؟ پولیس؟ گھنٹی بھینچی۔ دروازہ میں سے بھی اندر سے متعلق نہیں کیا تھا۔ کوئی میری طرح مشکوک میں مبتلا ہو کے اندر بھی آ سکتا تھا۔ اس کے شناسا ایسے بھی ہوں گے جو لٹی کی عادات کو اور اس کے معمولات کو سمجھتے ہوں گے۔ کسی کو بات بڑا خلاف معمول کے گی تو وہ حقیقت جاننے کے لیے اجازت کا اختصار نہیں کرے گا۔

میں تیزی سے دروازے کی طرف گیا اور ایک کونے میں سٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت بینڈل گھوما۔

”لتی! کس عورت نے دروازے کو کھٹوڑا سا کھول کے آواز دی؟ کہاں ہو تم؟“ وہ انگریزی بول رہی تھی اور لٹی سے بے تکلف معلوم ہوتی تھی کوئی جواب نہ پاسے اس نے زور سے ”ڈیم اسٹ“ کہا اور اندر آ گئی۔

ایک موضوع کے بغیر میں سناس کو شناسے سے کیڑے کھینچا اور گے دھکیل دیا۔ وہ نمز کے بل گر گئی۔ میں نے بڑی بھرتی سے اپنا چہرہ دوسری طرف کیا اور دروازے سے نکل گیا۔ باہر کی طرف وہ گڑھی بھیجی جس کو کھینچ کر بند کیا جاتا ہے۔ گڑھی لگاتے وقت میں سناس عورت کی چیخ سنی۔ میں نے اس کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھا تھا لیکن یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ بھی جوان عورت تھی اور شاید اینگلو انڈین تھی کیونکہ اس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا۔

اپنے باسے میں مجھے اطمینان تھا کہ وہ میرا چہرہ بالکل نہیں دیکھ سکی ہوگی۔ لٹی کی لاش دیکھ لینے کے بعد اس کے لیے ٹھنک کوئی گنجائی نہیں رہے گی کہ وہ لٹی کا قاتل ہی تھا جو اندر آ کر خود بخود ایک چادر میں چہرہ چھپا کے کھڑا ہوا تھا اور اسے دکھانے کے بعد باہر سے کٹ مٹی لگا کے فرار ہو گیا تھا۔

جب وہ پولیس کے سامنے بیان دے گی تو سو فیصد یقین کے ساتھ تعلق کے گی کہ قاتل وہی شخص تھا۔ اس کا یقین بے بنیاد ہوگا۔ بڑا آدمی جو کچھ دیکھتا ہے اسی پر یقین کی بنیاد رکھتا ہے بعض اوقات ایک جھوٹ ہی سب سے بڑا حقیقت دکھائی دیتا ہے اور جو کچھ جوتے سے نظر سے اوجھل رہتا ہے۔ میرا رویہ میرے جرم ہونے کی تصدیق کرتا تھا اور میرے سوا جانے دار رات پر تھا جو کون۔ لٹی کے آہٹاں تو ہر کی تصویر میں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کی اور بھی بہت سی تصویریں ہوں گی اور اسے اپنی زندگی میں لٹی کے سب دوست احباب نے دیکھا ہوگا۔ مگر اب کوئی یہ بتانے والا نہ ہوگا کہ وہ قاتل بالکل دلیبا ہی چہرہ رکھتا تھا جیسا لٹی کے شوہر کا تھا۔ تصویر میرے آہٹاں لٹی تھی وہ میری یوں مددگار ثابت ہو سکتی تھی کہ اسے دیکھ کر میں ایک بالکل مختلف اور دنیا چہرہ بنوا سکتا تھا۔

جس عورت کو میں لٹی کے قلیف میں لٹی کی لاش دریافت کرنے کے لیے چھوڑا تھا وہ اب مجبور تھی کہ اس وارادات کی خبر دوسروں کو دے۔ اس کی آخری رہائی کی یہی صورت تھی کہ وہ شوہر جانے دروازہ بجائے اور پولیس کو لٹی کے گھر سے ہی فون کرے۔ رات بھر لٹی کی لاش بے کمن اور لاوارث پڑی رہی۔ یہ میری بد بختی تھی کہ سب سے پہلے میں نے ہی لٹی کو اس حال میں دیکھا۔ میرے لیے ممکن ہوتا تو میں اس کی تدفین کی رسوم میں آخر تک شریک ہو کے اظہار عقیدت کرتا۔ لیکن گردش وقت نے مجھے روپوش ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں بلڈنگ سے باہر آیا تو صبح کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا رش زیادہ ہو گیا تھا۔ اپنے اپنے کام پر جانے والے سب یہی لوگ گھروں سے نکل آئے تھے اور بسوں ٹراموں کے لیے قطار بنانے کھڑے ہوئے تھے یا ٹیکسی تلاش کر رہے تھے۔ میں عجلت جلد اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ایک شین گن کو بکل میں چھپا کے بن پٹاڑا میں سفر کرنا فائنل مندی نہ ہوتی لیکن مجھے کوئی بھی کسی خالی نقشہ نہیں آ رہی تھی۔

اچانک میری نظروں نے غالب کو دیکھا۔ وہ مرگ کے دوسرے کنارے پر ایک سائے بورڈ کی آڑے کھڑا تھا۔ اگر وہ چہرے کے سامنے سے اخبار نہ پاتا تو میری نظر چوک جاتی اور شاید اگلے لمحے میں خالی ٹیکسی میں بیٹھ کے نکل جاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہاں اس طرح چھپ کے وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اوپر کے حصے پر چادر لپیٹ لی تھی اور کسی حد تک اپنی صورت کو بھی ڈھانپ لیا تھا چنانچہ مسلسل ٹکرائی کرنے کے باوجود

مقبول ترین مصنف کی اللہ بنی نواب کی کہ وہ انما بنی نواب کی شناخت ہیں
ان کی 8 بہترین کتابیں کا مجموعہ

کچرا گھر

کا پانچویں نمبر کا مجموعہ
نئی کچرا گھر کی تصویر
قیمت 100 روپے ڈاک نمبر 18 روپے

کوٹہ: بی بی اسلم بی بی کا پانچویں نمبر 118 روپے ڈاک نمبر 18 روپے

اقتصادیات بلیک کیشیشن

پوسٹ نمبر 23۔ رحمان چیمبر ریسٹورنٹ لٹی کی کچرا گھر روڈ کراچی 74200

غالب نے مجھے ادھر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اسے یقین ہو گا کہ مجھے موقع ملا تو میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ اس کا خلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔

میں نے اطمینان سے سڑک پار کی حالانکہ اس وقت میں تھوڑا سا زور تھا۔ میں آسمان سے گرے کیجور میں اٹکتے اٹکتے رہ گیا تھا۔ ترپوٹی کے گھسے سے تو میں نکل آیا تھا۔ اب لہ کے گھر میں پھنس جاتا تو ناکرد گناہ کی سزا پاتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس اجنبی دہلی میں ایسی کوئی بات ہو جس سے رسوائی یا تشہیر کے اسباب پیدا ہوں۔ میں گنگام اور دوشور بننا چاہتا تھا مگر میری خواہش کے برعکس واقعات کا سلسلہ میری مشکلات میں اضافہ کر رہا تھا۔

غالب مجھے دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ "یعنی آپ...؟" "ہاں۔ میں یہاں سے فرار ہو رہا ہوں۔" میں نے زکے بغیر کہا۔ وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ کمال سے بار اٹھنے مجھے دیکھ لیا۔ حالانکہ مجھے یہاں اسی لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ تمہیں دیکھتا رہوں۔

"مگر تم اخبار دیکھ رہے تھے؟" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "اخبار تو ایک پردہ تھا۔ اس نے مجھے بندی میں غصیا ہوا اخبار دکھائے کہا۔" مگر تم کیوں بایر پردہ قرار دے رہے ہو اور آخر یہ کیا نیا شوق ہے تمہارا کہل جاتی تھی تم فرار ہو گئے تھے، بغیر کچھ بتائے۔"

"میں اغزا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی تصدیق کی۔" "اوہ بوجھانی اغزا ہوئے سے کون روئے تھیں؟ مرزا غالب نے اخبار کا وہ بڈا سا بنا کے بلایا۔ مگر کچھ بتائے کہ جو اخبار کو تیار کیا تھا۔ یہ بواغین پریشان نہ پھریں۔ ساری بات کہاں سے تم آخر...؟ اور بقول انہی شاعر۔ چنی کھتے گزری آئی رات دے...؟"

"مرزا ایک تھیں معلوم ہے کہ لکھی کا قاتل ہو گیا ہے...؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اسی لیے تو میں کھڑا ہوا تھا۔ یہاں کہ تم کو ادھر نہ جانے دوں؟ مرزا غالب نے کہا۔

"میں اور بوجھانی سب کچھ دیکھ لیا میں نے... تم بھی گئے تھے لکھی کے قتل کے لیے؟"

"نہیں۔ وہ خود نیچے آئی تھی، مجھے یہ بتانے کے لیے کہ میں قاتل ہو گئی ہوں؟ مرزا نے کہا۔

"میں جانتا ہوں اس کا جرم کیا تھا جس پر اسے سزائے موت دی گئی؟"

"جرم تو میں بھی جانتا ہوں۔ بلکہ میں تو اس کے نادرہ قاتل سے بھی واقف ہوں۔" غالب نے کہا۔ "جب سے میں نے قلیٹ

میں جا کے دیکھا ہے میرا خون کھول رہا ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس شیطان کو کہاں جا کے قتل کروں۔ اور کیسے قتل کروں؟"

"مجھے کیا معلوم کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟" "معلوم ہے مجھے۔" غالب نے کہا۔ "یہاں اور کون دشمن ہے ہمارا۔ ہماری وجہ سے جن کا روبرو چرپٹ ہوا۔ جن کا وہ سب مال واپس آ گیا جو لالچ پر تھا...؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ وہ لوگ ہیں تو قتل کر رہے تھے۔ انھیں ناکامی نے زیادہ مشتعل بھی کیا تھا۔ اور وہ لکھی کی کار کے ذریعے اس کے قلیٹ تک رسائی حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہے تھے۔ لیکن انھوں نے لکھی پر کوئی جسمانی تشدد نہیں کیا تھا۔ اس کے بغیر ہی لکھی نے ان کو بتایا تھا کہ تم کہاں ہو گے۔" "مگر یاد... لکھی...؟" "یہ اس نے کیوں کیا؟"

"بجوری۔ یہاں کون ہے جو بجوری نہیں ہے۔ اور اس کے پاس جانے والوں نے بھی ایک بجوری سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن لکھی کے ساتھ یہ بربریت کا سلوک بعد میں جانے والوں نے کیا۔ میں نے کہہ دیا۔"

"بعد میں کون کیا تھا؟"

"ہمارے وزیر نے دشمن، جو بددی دلا اور اینڈ کینی کے شکاری گئے۔" میں نے کہا۔

غالب چلتے چلتے رک گیا۔ "کیا...؟ وہ یہاں؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "یہ لمبی بات ہے۔"

"لمبی بات ہے تو کہیں پیچھے جا کے ہیں۔ چائے پی لیتے ہیں؟"

غالب نے کہا۔

"چائے سے کام نہیں چلے گا۔ ناشتا چاہیے پورا ساری رات کا تھا ہوا ہوں؟"

"ناشتا کیا ملے گا یہاں۔ سب ایرانی ہوئی ہیں؟"

"بھوک لگی ہے۔ نڈا ایرانی ہو یا تو لکھی۔ جو بھی ملے گا چلے گا۔"

میں نے کہا۔ "تو یہ بتا کر...؟ وہ اپنی...؟"

"راہو کیسی ہے...؟ اور کہاں ہے؟" غالب نے طنز سے کہا۔ "بڑی جلدی خیال آ گیا اس کا۔ وہ منتظر ہے آپ کی کرک آپ آئیں تو آپ کو قتل کر دے؟"

میں نے خوش ہو کے کہا۔ "قتل تو ہم ہوتے بستے ہیں مگر یہ اچھی بات ہے کہ اب اسے انتظار ہے۔ ہم نے بھی بہت انتظار کیا۔"

"انتظار میں تو سب ہی ہیں کہ اس نامعقولیت کے مظاہرے پر آپ کی گوشامی کی جائے۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "ایسے تو شاید گرہے کے سر سے سینک بھی غائب نہیں ہو سکتے جیسے آپ

غائب ہوئے تھے۔" میں کوئی پلنگ پر نہیں گیا تھا۔ میں نے غائب کے کہا۔ غائب نے ایک ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کیا جو نسبتاً صاف ستھرا تھا اور کچھ خالی نظر آتا تھا۔ "یہاں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ تو یہ چار دو تہا دے اب۔ اس بجگے سے ہم بہت دور ہیں جہاں خطہ تھا۔"

"خطہ تو میں ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔" میں نے چادر کا کونا ہٹا کر اسے شین گن کی زیارت کرائی۔ "اس کے علاوہ بھی کچھ نوادرات لایا ہوں۔"

ناشتے کے دوران اور پھر اس کے بعد بھی میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ غالب حیرانی سے منتظر رہا۔ شین گن کو میں نے اب چادر میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔ کیونکہ ہم ایک کین میں تھے جہاں سب کی نظریں ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ غالب نے پہلے سوٹ کی تعریف کی۔ پھر دھوین کی اور آخر میں میری۔ کلا کے بارے میں اس نے خاصے نامنا سب خیالات کا اظہار کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ شاید میں نے اصل واقعات کو منسٹر کر دیا ہے۔

"تم لوگ آخر کیسے چلے گئے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تو خاصی امید تھی کہ اغزا کرنے والوں نے سچی کو دیکھا ہو گا۔ گل کے سوا وہ سب کو پہچانتے ہیں۔"

"میں تو حیران ہوں کہ یہ استاد پٹرو آخر کیا چیز ہے۔ کس نئی کا بنا ہوا ہے؟" غالب نے کہا۔ وہ پھر بھی غرق تھیں ہوا؟

"اسے وقت مل گیا تھا۔ کسی جہاز نے نکال دیا ہو گا۔ وہ ہم سے بیچے ہوئے پہنچ کے اپنے چوہدری صاحب کو پوری رپورٹ دے چکا تھا۔ پتا ہے کہ چوہدری صاحب بہت مشتعل تھے۔"

"لیکن انھیں ہمارے بارے میں کسی نے بتایا؟"

"ان سب نے جن کو ہم واپس لے آئے تھے؟" میں نے کہہ دیا۔ "لا لچ کی واپس نے خاصی منہ پیچھلائی ہو گی۔ دلاوڑ نے سمجھ لیا کہ یہ کا نام ہمارا ہے۔"

"ان عورتوں کے بیان سے ہماری تصویر سامنے آگئی ہو گی؟"

غالب نے کہا۔

"ہاں۔ دلاوڑ کے بندے وہیں پھر رہے تھے۔ انھوں نے سنایا خود لاوڑ نے سنا اور اس کے بعد ان کا کام آسان ہو گیا۔ وہ ان کے پیچھے لگ گئے جو ہمارے پیچھے تھے۔ جو بڑی لا لچ کو ساحل تک لے گئی تھی اس نے بتا دیا ہو گا کہ وہ دونوں سیر و کہل اترے تھے۔ لا لچ کے مالکان کے ایجنٹ وہاں پہنچے تو چوہدری دلاوڑ کے بندے ان کے پیچھے گئے۔ وہ لکھی کے گھر پہنچے تو بوجھ لوگ سامنے کی طرح ان کے تعاقب میں تھے وہ لکھی کے گھر گئے اور

وہاں سے حاجی علی کی درگاہ کا پتا بتا دیا گیا تو شکاری نمبر ایک اور دو لکھے پیچھے تھے۔ آگے والے مجھے اٹھا کر لے گئے۔ پیچھے والے پھر پیچھے رہے اور ان سے سیری ملاقات تریوٹی کے کمانڈر پیلس میں ہوئی۔"

"وری سہیل؟" غالب نے اتفاق کیا۔ "کیا اس سے بر وضاحت نہیں ہو جاتی کہ باقی سب گرفتار کیوں نہیں ہوئے تھے۔ مگر تیرے ساتھ میں ہوتا تو ضرور اٹھا لیا جاتا۔ لیکن ساری بات ہے اعمال کی؟" "یعنی آپ نازف کے ساتھ پھر ہند کے ساحل پر عشق فرما رہے تھے تو یہ کب عمل تھا؟" میں نے کہا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ سیری قربانی کے صدمے میں سب بچ گئے۔ وہ مجھے اٹھا کر لے گئے اور دلاوڑ اینڈ کینی کے شکاری گئے جو ان کے پیچھے گئے ہوئے تھے، انھیں بھی پیچھے دوڑ لگائی پڑی۔ تم سب کو تلاش کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی ان کو؟"

"وہ اپنے دلاوڑ صاحب ابھی تک اندر ہی ہیں؟"

"بالکل ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "سالہ بالکل ہو چکے گا کہ زندہ آخر کیسے غائب ہو گیا۔ فیسین کو جو بکر کے نکلے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تیاروں میں بجلی تھی۔ اگر میں تار کاٹ دیتا۔ جو کچھ خالی ہاتھوں سے ایک ناممکن کام تھا۔ تب بھی لازم چلتا ہے۔ گتے لیکن کسی الاڑم نے شور نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ایک ہی بی بی گیت تھا۔ وہاں وہ دونوں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دلاوڑ اور تریوٹی؟"

"لومان یا زمانہ؟" وہ دھوین بالا بخاری چلے گی۔ پولیس والے بہت خبیث ہوتے ہیں۔ جب وہ فٹیش کر لیں گے تو ایک ایک منٹ کی رپورٹ لیں گے تو یہ بات نوٹ کر لیں گے کہ صبح صبح دھوہی ایک گھر کی لے گئی تھی جس کو چیک نہیں کیا گیا تھا۔"

"تریوٹی کے حکم پر؟"

"ہاں تریوٹی کے حکم پر۔ مگر اس سے بعد میں بھی تو پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے۔ تریوٹی بالکل مستعز نہیں ہو گا اور دھوین تریوٹی بھی مہلا رہے یا چالاک ہے۔ یا پھر منٹ میں ساری اسٹوری اگل دے گی۔ اس پر جب اشتد کے وہ چرہ اترے گا تو اسے جانیں گے جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ بولے گی۔ اور نہیں بولے گی تو بہت غلاب جھیلے گی۔"

میں نے ایک سر آہ بھری۔ "معلوم نہیں ہماری وجہ سے کس کس پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا ہے۔ اب منٹ کا باہر ہمارے سر پر ہے۔ میں اس خیال سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں کہ اس دھوین پر ایک اور مسلمان کی وجہ سے بڑا وقت آنے کا ممکن ہے اس کی عزت یا اتباع عیادت لٹ جائے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ اگر وہ اتنی نفرت کرتی تھی تم

وہاں سے حاجی علی کی درگاہ کا پتا بتا دیا گیا تو شکاری نمبر ایک اور دو لکھے پیچھے تھے۔ آگے والے مجھے اٹھا کر لے گئے۔ پیچھے والے پھر پیچھے رہے اور ان سے سیری ملاقات تریوٹی کے کمانڈر پیلس میں ہوئی۔"

"وری سہیل؟" غالب نے اتفاق کیا۔ "کیا اس سے بر وضاحت نہیں ہو جاتی کہ باقی سب گرفتار کیوں نہیں ہوئے تھے۔ مگر تیرے ساتھ میں ہوتا تو ضرور اٹھا لیا جاتا۔ لیکن ساری بات ہے اعمال کی؟" "یعنی آپ نازف کے ساتھ پھر ہند کے ساحل پر عشق فرما رہے تھے تو یہ کب عمل تھا؟" میں نے کہا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ سیری قربانی کے صدمے میں سب بچ گئے۔ وہ مجھے اٹھا کر لے گئے اور دلاوڑ اینڈ کینی کے شکاری گئے جو ان کے پیچھے گئے ہوئے تھے، انھیں بھی پیچھے دوڑ لگائی پڑی۔ تم سب کو تلاش کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی ان کو؟"

"وہ اپنے دلاوڑ صاحب ابھی تک اندر ہی ہیں؟"

"بالکل ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "سالہ بالکل ہو چکے گا کہ زندہ آخر کیسے غائب ہو گیا۔ فیسین کو جو بکر کے نکلے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تیاروں میں بجلی تھی۔ اگر میں تار کاٹ دیتا۔ جو کچھ خالی ہاتھوں سے ایک ناممکن کام تھا۔ تب بھی لازم چلتا ہے۔ گتے لیکن کسی الاڑم نے شور نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ایک ہی بی بی گیت تھا۔ وہاں وہ دونوں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دلاوڑ اور تریوٹی؟"

"لومان یا زمانہ؟" وہ دھوین بالا بخاری چلے گی۔ پولیس والے بہت خبیث ہوتے ہیں۔ جب وہ فٹیش کر لیں گے تو ایک ایک منٹ کی رپورٹ لیں گے تو یہ بات نوٹ کر لیں گے کہ صبح صبح دھوہی ایک گھر کی لے گئی تھی جس کو چیک نہیں کیا گیا تھا۔"

"تریوٹی کے حکم پر؟"

"ہاں تریوٹی کے حکم پر۔ مگر اس سے بعد میں بھی تو پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے۔ تریوٹی بالکل مستعز نہیں ہو گا اور دھوین تریوٹی بھی مہلا رہے یا چالاک ہے۔ یا پھر منٹ میں ساری اسٹوری اگل دے گی۔ اس پر جب اشتد کے وہ چرہ اترے گا تو اسے جانیں گے جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ بولے گی۔ اور نہیں بولے گی تو بہت غلاب جھیلے گی۔"

میں نے ایک سر آہ بھری۔ "معلوم نہیں ہماری وجہ سے کس کس پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا ہے۔ اب منٹ کا باہر ہمارے سر پر ہے۔ میں اس خیال سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں کہ اس دھوین پر ایک اور مسلمان کی وجہ سے بڑا وقت آنے کا ممکن ہے اس کی عزت یا اتباع عیادت لٹ جائے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ اگر وہ اتنی نفرت کرتی تھی تم

وہاں سے حاجی علی کی درگاہ کا پتا بتا دیا گیا تو شکاری نمبر ایک اور دو لکھے پیچھے تھے۔ آگے والے مجھے اٹھا کر لے گئے۔ پیچھے والے پھر پیچھے رہے اور ان سے سیری ملاقات تریوٹی کے کمانڈر پیلس میں ہوئی۔"

"وری سہیل؟" غالب نے اتفاق کیا۔ "کیا اس سے بر وضاحت نہیں ہو جاتی کہ باقی سب گرفتار کیوں نہیں ہوئے تھے۔ مگر تیرے ساتھ میں ہوتا تو ضرور اٹھا لیا جاتا۔ لیکن ساری بات ہے اعمال کی؟" "یعنی آپ نازف کے ساتھ پھر ہند کے ساحل پر عشق فرما رہے تھے تو یہ کب عمل تھا؟" میں نے کہا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ سیری قربانی کے صدمے میں سب بچ گئے۔ وہ مجھے اٹھا کر لے گئے اور دلاوڑ اینڈ کینی کے شکاری گئے جو ان کے پیچھے گئے ہوئے تھے، انھیں بھی پیچھے دوڑ لگائی پڑی۔ تم سب کو تلاش کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی ان کو؟"

"وہ اپنے دلاوڑ صاحب ابھی تک اندر ہی ہیں؟"

"بالکل ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "سالہ بالکل ہو چکے گا کہ زندہ آخر کیسے غائب ہو گیا۔ فیسین کو جو بکر کے نکلے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تیاروں میں بجلی تھی۔ اگر میں تار کاٹ دیتا۔ جو کچھ خالی ہاتھوں سے ایک ناممکن کام تھا۔ تب بھی لازم چلتا ہے۔ گتے لیکن کسی الاڑم نے شور نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ایک ہی بی بی گیت تھا۔ وہاں وہ دونوں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دلاوڑ اور تریوٹی؟"

"لومان یا زمانہ؟" وہ دھوین بالا بخاری چلے گی۔ پولیس والے بہت خبیث ہوتے ہیں۔ جب وہ فٹیش کر لیں گے تو ایک ایک منٹ کی رپورٹ لیں گے تو یہ بات نوٹ کر لیں گے کہ صبح صبح دھوہی ایک گھر کی لے گئی تھی جس کو چیک نہیں کیا گیا تھا۔"

"تریوٹی کے حکم پر؟"

"ہاں تریوٹی کے حکم پر۔ مگر اس سے بعد میں بھی تو پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے۔ تریوٹی بالکل مستعز نہیں ہو گا اور دھوین تریوٹی بھی مہلا رہے یا چالاک ہے۔ یا پھر منٹ میں ساری اسٹوری اگل دے گی۔ اس پر جب اشتد کے وہ چرہ اترے گا تو اسے جانیں گے جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ بولے گی۔ اور نہیں بولے گی تو بہت غلاب جھیلے گی۔"

میں نے ایک سر آہ بھری۔ "معلوم نہیں ہماری وجہ سے کس کس پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا ہے۔ اب منٹ کا باہر ہمارے سر پر ہے۔ میں اس خیال سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں کہ اس دھوین پر ایک اور مسلمان کی وجہ سے بڑا وقت آنے کا ممکن ہے اس کی عزت یا اتباع عیادت لٹ جائے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ اگر وہ اتنی نفرت کرتی تھی تم

وہاں سے حاجی علی کی درگاہ کا پتا بتا دیا گیا تو شکاری نمبر ایک اور دو لکھے پیچھے تھے۔ آگے والے مجھے اٹھا کر لے گئے۔ پیچھے والے پھر پیچھے رہے اور ان سے سیری ملاقات تریوٹی کے کمانڈر پیلس میں ہوئی۔"

"وری سہیل؟" غالب نے اتفاق کیا۔ "کیا اس سے بر وضاحت نہیں ہو جاتی کہ باقی سب گرفتار کیوں نہیں ہوئے تھے۔ مگر تیرے ساتھ میں ہوتا تو ضرور اٹھا لیا جاتا۔ لیکن ساری بات ہے اعمال کی؟" "یعنی آپ نازف کے ساتھ پھر ہند کے ساحل پر عشق فرما رہے تھے تو یہ کب عمل تھا؟" میں نے کہا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ سیری قربانی کے صدمے میں سب بچ گئے۔ وہ مجھے اٹھا کر لے گئے اور دلاوڑ اینڈ کینی کے شکاری گئے جو ان کے پیچھے گئے ہوئے تھے، انھیں بھی پیچھے دوڑ لگائی پڑی۔ تم سب کو تلاش کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی ان کو؟"

"وہ اپنے دلاوڑ صاحب ابھی تک اندر ہی ہیں؟"

"بالکل ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "سالہ بالکل ہو چکے گا کہ زندہ آخر کیسے غائب ہو گیا۔ فیسین کو جو بکر کے نکلے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تیاروں میں بجلی تھی۔ اگر میں تار کاٹ دیتا۔ جو کچھ خالی ہاتھوں سے ایک ناممکن کام تھا۔ تب بھی لازم چلتا ہے۔ گتے لیکن کسی الاڑم نے شور نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ایک ہی بی بی گیت تھا۔ وہاں وہ دونوں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دلاوڑ اور تریوٹی؟"

"لومان یا زمانہ؟" وہ دھوین بالا بخاری چلے گی۔ پولیس والے بہت خبیث ہوتے ہیں۔ جب وہ فٹیش کر لیں گے تو ایک ایک منٹ کی رپورٹ لیں گے تو یہ بات نوٹ کر لیں گے کہ صبح صبح دھوہی ایک گھر کی لے گئی تھی جس کو چیک نہیں کیا گیا تھا۔"

"تریوٹی کے حکم پر؟"

"ہاں تریوٹی کے حکم پر۔ مگر اس سے بعد میں بھی تو پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے۔ تریوٹی بالکل مستعز نہیں ہو گا اور دھوین تریوٹی بھی مہلا رہے یا چالاک ہے۔ یا پھر منٹ میں ساری اسٹوری اگل دے گی۔ اس پر جب اشتد کے وہ چرہ اترے گا تو اسے جانیں گے جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ بولے گی۔ اور نہیں بولے گی تو بہت غلاب جھیلے گی۔"

میں نے ایک سر آہ بھری۔ "معلوم نہیں ہماری وجہ سے کس کس پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا ہے۔ اب منٹ کا باہر ہمارے سر پر ہے۔ میں اس خیال سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں کہ اس دھوین پر ایک اور مسلمان کی وجہ سے بڑا وقت آنے کا ممکن ہے اس کی عزت یا اتباع عیادت لٹ جائے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ اگر وہ اتنی نفرت کرتی تھی تم

مسلمانوں سے۔ تو وہ کیوں عذاب میں ڈال لی خود کو۔ ٹھیک ہے؟
 آپ نے اپنی کافی شنائے کے اسے قائل کر لیا کہ اچھے بڑے لوگ
 دونوں طرف ہوتے ہیں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ اگرچہ جلال
 عورت ہوگی تو خود کو بچا لے گی۔ جھوٹ بول دے گی کہ سرکار میں
 کیا کرتی۔ اس مسئلے نے گھری کے اندر میری بیٹی کو دبوچ رکھا تھا
 میں بولتی تو وہ اس کو مار ڈالتا۔

”بالکل درست“ میں نے مطمئن ہو کر کہا۔ ”وہ ایسا ہی کرے
 گی کیونکہ میں نے ایسا ہی کیا تھا جب میں اس کے گھر میں کود اٹھا تو
 میں نے اسے جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔ یہ بات اس کے
 ذہن میں ہوگی۔ اس کی جان بچ سکتی ہے۔“

”چل اب باقی باتیں بعد میں“ غالب نے کہا۔ ”اس میں شک
 کے علاوہ کیا تخائف دیے ہیں تیرے لیے؟“

میں نے اسے رپوا اور دکھایا۔ پھر کلکا کا زارہ پیتول۔
 ”بہت نفیس چیز ہے“ غالب نے اسے ہاتھ میں لے کر
 اور آٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”گیارہ ہزار روپے سلاخی بھی ملی تھی“ میں نے کہا۔ ”مگر بارہ
 وہ سب اس کے پاس رہ گیا۔ میرا رپوا اور دیا پیکورٹ۔“

”پاکورٹ بھی؟“
 ”ہاں۔ دسے وہ اب بے کار تھا۔“ میں نے کہا۔ ”میرا یہ چہرہ
 اودنام دونوں مشہور ہو گئے ہیں۔ پولیس کو میری وہی تصویر فراہم کر
 دی جائے گی جو پاکورٹ پر تھی۔“ نام کے ساتھ یہ تصویر ان کے
 ریکارڈ پر آجائے گی۔ فی الحال ایک تل کا الزام تو ثابت ہے۔
 ڈیوٹی چھڑی وغیرہ بھی کی ہے میں نے زبردستی مجھ کو عزائم کے ساتھ
 تریوٹی کے گھر میں داخلے کا جرم بھی بولیں۔

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ”ایمیر چند ہی کو نہیں بکلا اس
 کے بھائی فقیہ چند ولد دھڑی لال کو بھی نینا اور نیا علیہ اختیار کرنا
 پڑے گا ورنہ ایک نہ بکرا لیا تو دوسرا بکرا ملے گا۔“

”یہ کام ہوگا کیسے۔۔۔؟“
 ”جیسے اپنے وطن میں ہوتا تھا۔ یہاں بھی پیر ہی سارے
 بگڑے کام سوارے گا۔“ غالب نے کہا۔ ”ہم کون سے ولایت میں
 آگئے ہیں۔ رشوت کا سکہ دونوں طرف ایک جہاں چلتا ہے۔“
 ”دشوت کا سکہ ساری دنیا میں چلتا ہے۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ۔“
 میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اب دھوپ تیز ہونے لگی تھی معلوم نہیں وہ کون سی طرف
 تھی اور ہم کس بازار سے گزر رہے تھے مزاج کے اعتبار سے یہ
 شہر کراچی جیسا ہی لگتا تھا۔ کم سے کم سڑکوں اور تلی پللی عمارتوں کی
 حد تک کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ موسم بھی وہی تھا۔ ہوا

میں تھی۔ مچھلیوں کی بو۔ دھواں۔ آسمان مثیلا نیلا غبارا کوہ لوگ
 قد سے مختلف دکھائی دیتے تھے تو اس کی وجہ اس معاشرے کا
 آزادانہ اختلاط تھا۔ مرد و عورت یہاں نما ایک گاڑی کے دو پہیے
 چلتے تھے۔ کہیں کوئی تعزین نہ تھی۔ سڑکوں بازاروں کی بھڑک
 عورتوں کا تناسب برابر رکھا۔ بولوں میں ان کے لیے کوئی سیٹ
 مخصوص نہ تھی۔ سب ملے جلے بیٹھے ہوتے تھے۔ کیا عورتوں کی
 مرد و عورتوں میں ساری اور اسکرٹ زیادہ نظر آتا تھا۔ بکلاش کا
 میں تو عورتیں خال خال ہی تھیں۔ عورتوں کی مجموعی حالت سے اتنی
 ظاہر ہوتی تھی۔ ساریاں میلی اور بدنمکت تھیں۔ ان کی جسمانی محنت
 کا میاں بھی افسوس ناک تھا۔ خوبصورت عورتا تھی اور اچھی صورت
 کہیں سیکڑوں میں ایک دکھائی دیتی تھی۔ مرد مجھے سب کھوکھو کے
 نیل گئے۔ کام میں مگن۔ اپنی دھن میں رواں۔ تاہم ڈھیلے کے اعتبار
 سے وہ قدرے بہتر معاشرہ تھا۔ لوگ ہر جگہ قطار بنانے کے عادی
 تھے۔ لیٹرکٹ کے بس میں سڑک پر ناشکل تھا۔ بولوں اور ٹراموں
 کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آبادی کے تناسب سے کاریں کم تھیں اور
 ٹیکسیاں زیادہ۔ سفر کے مختلف مراحل میں مشاہدے سے میں نے
 بہت کچھ جان لیا۔

ہم ابھی کسی دانتے سے واقف نہیں تھے چنانچہ ہر جگہ لوگوں
 سے کچھ پوچھنا پڑا تھا تو زیادہ تر لوگ ہم سے بھی زیادہ نادانف
 ثابت ہوتے تھے یا کسی ناقابل فہم زبان میں حلقے کی طرح گولڑا
 کے نکل جاتے تھے۔ ایک بازار سے میں نے اپنے ساتر کے چمٹے
 لیے۔ پھر قیسیں اور پتلون سریدی اور یہ لباس ایک سینما کے
 فائنٹ روم میں چمٹے کے بلا تریوٹی کا عطا کردہ قیمتی سوٹ میں
 نے وہیں چھوڑ دیا۔ مشین گن کو بھی چمٹے ایک لمبوڑے کیوں کے
 بیگ میں ڈال لیا تھا۔ یہ آلات بستی فروخت کرنے والے ایک
 بنگلے میں ہمیں بہت مہنگا دیا تھا کیونکہ خود حقیقت یہ اٹھن کا
 کڑ تھا۔ اگر اسے ملوم ہو جاتا کہ اس میں مشین گن رکھی جائے گی تو
 شاید صدمے سے اس کا ہارٹ ٹیل ہو جاتا۔

اپنے قاتلانہ حلقے کو فوراً آسانی سے بدلنے کے لیے لباس
 کا بدل لینا کافی نہیں تھا۔ غالب کے مشورے پر میں نے ایک
 ہو گوٹر نیپالی ٹوپی خرید کے سر پہ بھالی۔ غالب تو بھر تھا کہ انجوس
 بالوں سے نجات کا آسان اور سب سے سستا نسخہ استعمال کر دین
 یعنی کسی بھی فٹ پاؤں پر کسی بھی خلیفہ کے آسترے کے سامنے سرخون
 ہو جاؤں اور اس سے کہوں کہ ایک ہرے سے دوسرے ہرے تک
 اچھکی صفائی دکھا دے۔ تاہم میں نے اس شہر میں گہنی ہونا قبول
 نہیں کیا جہاں بیڑا شال کی بنیاد پر فنی ہیرو بننے کے امکانات
 بھی روشن تھے۔

مجھے میں ایک رنگین اسکارف باندھ کے اور آنکھوں پر دھوپ
 لگا لیا چتر چڑھانے کے بعد میں نے غالب سے ملنے مانگی تو اس
 نے حاسدانہ ہنسنے میں کہا کہ بیکر کا نہیں البتہ اب وہن کا چانس دے
 لکے۔ کوئی کاٹھ کا تو پر دو لوسر ڈاڑی کیور ورز جو کارول تو
 میں رکھی رہا ہوں۔ مجھے اب بے چینی ہو رہی تھی۔ اپنی حفاظت
 کا خیال ہی ضروری تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اور میرے
 ملنے کی خواہش غالب آ رہی تھی اور مجھے غالب پر بھینچا ہٹ ہونے
 لگی تھی جو میری بے فکری سے محکم رہا تھا۔ پہلے یہ کام کر لیں۔ وہ
 چنیلے لیں وغیرہ وغیرہ۔

”تنگ آکے میں نے کہا۔“ مرزا۔۔۔ تم نمٹا رہے ہو ضروری
 کام اگر دل چاہے تو آجاتا۔ ورنہ میدان جستہ میں تو طاقات ہوگی
 ہی۔۔۔ میں چلا۔“

غالب نے کہا۔ ”یہ جھوڑی داڑھی بھی خطے کی علامت ہے۔“
 ”اسے میں خود کٹر لوں گا لپٹی سے باہر شہر کٹر لوں گا۔“ میں نے کہا۔
 ”نیک کام میں دیر کیوں۔ یہ دیکھنا ہے مولانا صاحب کسی
 بار بھری متوقظ نظر دے دیکھ رہے ہیں۔“ غالب نے کہا اور
 مجھے کھینچ کر فٹ پاؤں پر رکھی ہوئی کرسی میں فٹ کر دیا۔ دو منٹ
 کی بات ہے۔“

مولانا نے شیوے کے سوال پر سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ ”اس
 کو شیوہ لٹا۔ اتنا بڑا جھاڑی کالے گا۔“

”یہ جھاڑی نہیں“ داڑھی ہے۔“ میں نے بھی خفگی سے کہا۔
 ”ابو با جاتا تاہم۔ یہ چارہ آڑیو کا ریٹ ہے۔ ایک دو چیرٹو
 آڑیو ورنہ کرسی خالی کرو۔“ اس نے دو ٹوک جواب دیا۔

ایک روپہ اس محنت کے عوض بہت کم تھا جو اسے میرے
 ہرے کے جنگل سے میری صورت پر اند کرنے کے لیے کرنی پڑی۔
 اس سے زیادہ مسترت مجھے اپنی جلد پر چھڑی ہوا کے لمس سے ہوتی
 اور چھڑی کے گول پر پڑتے ہوئے۔ میں نے اسے پانچ روپے
 کا رٹ پیش کیا تو اس نے نوٹ کو روشنی کے رخ کر کے داڑی مارک
 دکھا جو نہ ہم نے نہیں تھے اس لیے پروپاٹر نیو ہالی
 دو دو لکڑاں اشارہ دے کر ایک سیلون، کوہر شک ہونا فطری امر
 تھا کہ نوٹ جیبی تو نہیں۔ جتنا لباس کا بھنگ خود دکھا ہوا اس کی پور
 تھا وہ اس کی حسی فٹ پاؤں تھی جس کا ہشتادو چھارے دل
 کو تیا ہوگا۔ بھنگ سرحد ایک کیسے ڈی فٹ پاؤں تھی جس کا
 نامہ والا بار بار گلاس ایک ہنگریش لٹکا کے دوڑ لگا تا تھا۔ باہر
 والا۔ ابھی میں جانتے کی آؤٹ دوڑ سروس فراہم کرنے والا کہلاتا
 ہے جو عموماً بارہ پندرہ سال کا لڑکا ہوتا ہے۔
 اب دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے کالے رنگ

کی ایک گاڑی کو دیکھا جو غیر معمولی طور پر لمبی تھی۔ اس کے اوپر پھیل
 رکھے ہوئے تھے۔ یہ جنازہ گاڑی بھی جو بمبئی کی ٹریفک کے درمیان
 رواں تھی۔ زندہ انسانوں کا سفر اپنی اپنی راہوں پر اپنے اختیار
 کے ساتھ جاری تھا۔ ان کے ساتھ ایک لاش آخری باندھنی کی
 سڑکوں پر سے گزر رہی تھی اور کسی کو خیال نہ تھا کہ تلک سب بھی
 انہی کی طرح زندہ جیتا جاگتا متحرک انسان تھا۔ نہ جانے کب
 میرا دھواں لٹی کی طرف چلا گیا۔ اس کی لاش کہاں ہوگی۔ شاید کسی
 سرکاری اسپتال میں۔ مردہ خلع کی بیچ پر یا پتھر لے فرش پر۔

کل اسی وقت وہ اپنی کار میں کہیں سے آ رہی تھی پھر رگ گئی۔
 اس کا پلٹے رہنا ہی زندگی تھا۔ وہ کابھی کہیں لاوارث پڑی تھی۔
 ”معلوم نہیں ملی گا تو یا نہیں اپنا کون تھا؟“ میں نے کہا۔

غالب نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ ”میں بھی اسی کے بارے
 میں سوچ رہا تھا کہ اس کی آخری رسوم میں کون شریک ہوگا۔“
 ”ہم بہر حال نہیں جاسکتے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر معلوم ہو بھی
 جیسے کہ رسوم کہاں ادا کی جائیں گی۔ مگر کون بتائے گا۔۔۔؟“
 ”ہم آکر اسٹوڈیو سے پوچھ سکتے ہیں۔“ لی نے راج کپور کا
 حوالہ دیا تھا۔ اور اس کے باپ پر بھٹی راج کا۔ انھیں یقیناً اطلاع
 ملے گی۔“ غالب نے کہا۔

”کون اطلاع دے گا؟“
 ”اس کے جاننے والے پڑوسی۔ سب جانتے ہوں گے کہ
 وہ کون ہے اور کیا کر رہی ہے۔“ غالب نے کہا۔

”جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”جو ہمدردی
 دلا دے بڑا کامیاب شکاری ہے۔ وہ اپنے شکاری انیسیت کو سمجھتا
 ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق کے بارے میں بھی ہم ایک جذباتی
 دو عمل کا شکار ہوجاتے ہیں انسانی رشتوں کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔
 اس کو سب معلوم ہے۔ لی کو اسی نے مر دیا ہے اور دلور مجھتا ہے
 کہ ہم اس پر جتنے چراغ پا ہوں گے اتنے ہی افسردہ بھی ہوں گے۔
 اگر ہم لٹی کی آخری رسوم میں شریک ہونے بیٹھ تو یہ دلاور کی
 توقعات کے عین مطابق ہوگا۔ وہ لی کو گوارا نہ دے گا۔ گوارا سمجھتے ہوگا۔“
 ”ہاں۔ وہ قربانی کا بکرا یا بیل جسے شیرے مروانے کے لیے
 رکھا جاتا ہے اور پھر شیر کو شکار کر لیا جاتا ہے۔“ غالب نے کہا۔

”ہاں۔ اس پچھڑی مت پڑنا چائی۔ دلاور ہر طرف سے
 محصور کرے گا۔ تریوٹی کے آدمی الگ ہوں گے اور ان سب کو
 دلاور بریف کرے گا کہ خیال رکھنا۔ وہ لوگ کٹی کی طرح رنگ بدلنے
 کے ماہر ہیں۔ مشکوک خلیہ کا کوئی بھی شخص نظر کرتے اسے دھرو۔
 عین ممکن ہے وہ لی کے دوست احباب کو فرداً فرداً شناخت
 کریں اور ان سے کہیں کہ جونا اٹھنا چہرہ ہوا اس کی نشان دہی کریں۔

لی کے لیے ہم دور دروغ بھی دعا کر سکتے ہیں۔
"دعا... غالب نے فرنگی اور ملنی سے کہا۔

دوسرے دھڑکنے لگی تھی جب ہم پھر علی کی درگاہ کے پیچھے ساحل سمندر پر پہنچے۔ وہ جگہ اب مجھے محفوظ نظر آتی تھی جاور بھی جہاں ایک بار چڑھا جائے وہاں ربانی کی صورت میں بھی نہیں جاتا نہ دلاور اور نہ تریبوی کو خیال آسکتا تھا کہ جھکا رہا ہے ہی میں پھر وہیں پہنچوں گا۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا کہ میں اکیلا ترنگہ ہوا تھا۔ وہاں ایم آریس کی ساری قدس نظر آتی تو گمان ہو سکتا تھا۔ مٹی میں یہ بہاؤ مستقر نہ ہو۔

معدائیں نے موت کے حاجی صاحب کا سامنا کرنے سے گریز کیا اور ہم مسجد کے عقب سے گھوم گئے۔ وہ چوب ریت پر چمک رہی تھی اور سمندری موجوں میں ٹھیکل ہو رہی تھی۔ رطوبت اتنی بڑھ چکی تھی کہ میرے جسم پر پسینہ بھی پانی کی طرح بہ رہا تھا۔ حالانکہ تیرا سمندری جانب سے سسل رہی تھی۔ سمندر کے ساحل پر بہت سی برائی شکرست کشتیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سرکنڈوں اور شانیوں کی چھت ڈال کے پورے پورے خاندان آباد تھے۔ لاچ کا صرف ایک ہی دھچکا تھا جو تقریباً آٹھ میل دور ایک کھنڈر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ یہ خاصی بڑی لاچ تھی۔ اس کے اوپر رنگین چھترے سے لہراہے تھے۔ یہ کینٹوں کے کپڑے تھے جو دھوپ میں ٹوٹنے کے لیے ڈالے گئے تھے۔ غالب نے مجھے بتایا کہ لوگ بیٹنے کے لیے باقی ایک میل دور سے لاتے ہیں۔ اور جب باقی لینے جاتے ہیں تو وہیں نہا کے کپڑے بھی دھو لیتے ہیں۔ لاچ میں چار خاندان آباد تھے لیکن اس کا مالک ایک تھا۔ اس نے ہی سب سے پہلے لاچ کا قبضہ حاصل کیا تھا اور موجودہ کمرے داروں نے اس سے حق ملکیت کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ ان میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔ کرانے دار بدلتے رہتے تھے۔ اور بیچنے کی منزل کو یاد خاندانوں نے ایک دوسرے سے نقلے باہمی کے سمجھوتے کے تحت تقسیم کر لیا تھا۔ کیا چیز مشترک ہوگی اور کیا نہیں ہوگی۔ یہ سب پہلے سے طے تھا۔

"کل رات میری لینڈ لارڈ صاحب سے بات ہوئی تو غالب نے کہا۔ بہت اذکاروں دکھا رہا تھا کہ ایسے نہیں چلیں گا۔ کون چھوڑی لوگ ہے یہ اور کیا دھندلا ہے تمہارا۔ ادھر شریف لوگ رہتا چاہیے۔"

"تمہارے مارا نہیں سالے کے ایک بھائی۔"
یاد رہے جگہ جگہ پھر نہیں چلتے۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کا اصل مسند کیا ہے۔ غالب نے کہا۔ اسے پھر چاہیے اور بس۔
"پیسہ دے بغیر تو تم بھی نہیں رہتے۔"

"ہاں۔ لیکن روز کا کرار دینے والے کی کورٹیش ہو مل کے مسافر جیسی رہتی ہے۔ غالب نے کہا۔ میں نے اسے بتا کر اس کو اپن بھی ایک دم شریف لوگ ہے پرا دھر رہنے کے واسطے جا ملے تو جائیں۔ ہم ادھر چکر بنادوا این ادھر خوش۔ پھر اس کا بد بدل گیا۔ اس نے کہا کہ رہنا کچھ ہے۔ ابھی کم کسی سے بات کرلو۔ اس کا مطلب تھا کہ جو لوگ اب وہاں مقیم ہیں۔ ان میں سے کوئی جگہ چھینے کو تیار ہو تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔ رات کو ہی میں نے ایک سے بات کر لی۔ اس نے باج ہزار پکڑی مانگی۔ میں نے فوراً باج سو بیجا منفعدا۔

"کیوں۔ کیا یہاں مستقل رہنا ہے؟"
"نہیں۔ یہاں دویتے ہی ہم بگڑے مالک ہو گئے۔ لیکن قبضہ لگانے پر پندرہ دن بعد غالب ہنسنا۔ میں نے ہی مہلت دی ہے۔ ظاہر ہے اب پندرہ دن تک ہمیں کوئی چکر نہیں کھسکا۔ پانچ سو میں بچے کرانے دار ہو گئے۔ اس سے پہلے ہی جھاک جائیں گے تو وہ بہت خوش ہوگا کہ چھوٹت میں باج سو ملے۔ جو بھی خالی نہیں کرتی بڑی۔ اس کے نقطہ نظر سے تو ہم ہیں احمق۔ میں ہنس پڑا۔ دنیا کے سب متعلقہ لوگ کی رائے ہمارے بلاسے میں ایک میس ہے۔"

ایک طرف سے لاچ کا ڈھانچا پانی کے تھیلوں کی زد میں تھا۔ دوسری طرف تھی خلی اور اوپر سے مجھے کئے کے لیے ایک میٹھی بھی لگا دی گئی تھی۔ لاچ کو سمند کا غمورہ پانی اور مرطوب ہوا مل کے کھارے تھے۔ اس کا فلائی جرم رنگ میں مل رہا تھا اور گل رہا تھا۔ رات کے وقت اس کے دوسری جانب بھی پانی آجاتا تھا۔ اس کے باوجود لوگ یہاں اطمینان سے رہتے تھے اور جاندار غیر متزلزل سمجھ کے اس کی پکڑی وصول کرتے تھے۔ حالانکہ اس بات کا امکان ہر وقت موجود تھا کہ کسی دن لاچ کی قوت برداشت اور مزاحمت بالکل ختم ہوگی تو چانک سمند اس کو کھینچ لے گا یا اس کا ڈھانچا سمندری لینڈ کے سامنے بکھر جائے گا۔

میرا دل اب عجیب سی بے قراری کا شکار تھا۔ میری نگاہیں لاچ پر رہنے والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک کھڑکی کے شگاف کا پردہ ہٹانے کوئی عورت تھا۔ وہاں رہی تھی۔ وہ رات نہیں تھی۔ اوپر کوئی عورت بال نکھار رہی تھی۔ وہ بھی رات نہیں تھی۔ ان میں ناؤ کی جھلک بھی نہ تھی۔ میرے قدم میرے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہونے لگے تھے۔ اسے کب دیکھا تھا۔ جب دیکھا تھا تب کیا تھا۔ آج پھر صحن دلا لای وہی دج ہوگی۔ میں کیا کہوں گا۔ کل ایسا نہ بھد کیوں نہ ہوا؟ اس سے پہلے چوں گا کہ ذرت کے سونڈ ٹپ

میں جو یہ احوال تھا۔ کیا اس کا بھی وہی حال تھا؟
غالب نے ایک بوسیدہ میٹھی کے پاس رک کے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پہلے آپ۔"

میں رنگ گیا۔ میری گھبراہٹ چانک بڑھ گئی تھی۔ میں نے ہر جا بھی کرکھا ہوگا ہے مجھے۔ میں کوئی آغاز شباب کے اولین تجربہ منش سے دوچار ہونے والا جوان لاکا نہیں ہوں۔ رات بعد ادھر تو ایک ہیں۔ قربت میں بھی اور دوری میں بھی۔ حقیقت یہ تھا کہ وہاں مجاز کا ایک ہی روپ۔ جیسے صبح سے رات جہاں نہیں ایسے ہی بخت کا سورج تو ہر حال چمکتا ہے۔ کبھی ادھر تو کبھی ادھر۔ اس کا نلنا ملنا کون سی انکھی بات ہے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ میرا خوف ہے جو دامن گیر ہے۔ اب تک بارہا اس نے قریب آکر دوسے کر بھلا ہوا تھا۔ وہ بھی تو خواب کی صورت ایک جھلک دکھانے کے ادھول ہو گئی۔ میں خواہش کے سراب سے خائف تھا۔ کہیں وہ نل تو میرے کل رات مل کے دل کی تھی۔ ایسے ہی میرے لیے احساں پتہ پانی چھوڑے پھر نکھو گئی۔ ہور میں اندھا جوں تو بس وہی محرومی کے فلاء کا تسلسل ہو۔

"کیا ہوگا۔ حوصلہ جواب دے گیا؟" غالب نے قبضہ مار کے کہا۔ "نعمتی تم کھاؤں؟"

میں نے کہا۔ "یار۔ عجیب سی کیفیت ہے دل کی ڈوڑھائی۔"
"تو ابھی سے ڈرنے لگے آتا۔ آفت ہے تیری مردانگی پر۔ تو سو کر کے گاسیختر مندو ہوں کہ جو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتے ہیں پوچوں کو؟ غالب نے کہا۔ "شفا میں..."
"یہ بات نہیں ہے۔ مرزا..."
"جلازم میں ساتھ ہوں تیرے۔ نہیں مارے گی وہ تجھے غالب نے کہا۔

میں نے جھٹکا کہہ کر وہ ناؤ نہیں بنے۔ اور میں غالب نہیں ہوں کہ مارے ڈروں؟ اور میٹھی پر چڑھ گیا۔
مجھے ایک شکاف کو دروازہ فرض کرتے ہوئے اندر جانے کے لیے سرنگوں ہونا پڑا۔ دروازہ میرا سرٹھی سے اور لگتا۔ تاہم اس سے زیادہ فرق نہیں پڑا۔ میں اندر قدم بچھڑاتے ہی کسی چیز سے ٹکرا گیا جو جتنی آفت صحت سے شباب شاقب کی طرح نمودار ہو تھی۔ اندھا اندھ تھا چنانچہ اقتصاد کے لود میں نے ایک زمانہ چرخ سنی۔
"ناؤ؟" میں نے کہا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"
وہ ہنسی۔ "ایسے لڑکھارے پر عموماً کسی فٹ ہو جاتا ہے۔ آپ آگئے۔ خیر سے؟"
میں نے سر ہلایا کہ کہا۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟
اس نے میری ٹوٹی اٹھانے کے مجھے پکڑائی۔ میں بہت دیر

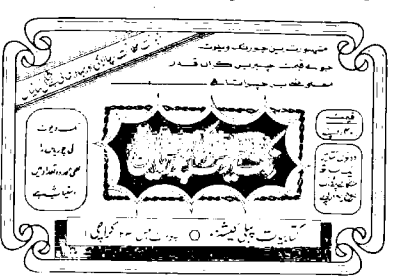
سے دیکھ رہی تھی۔ آپ میٹھی پر قدم رکھتے ہوئے ڈور رہے تھے یا کوئی فلسفیانہ نکتہ تھا جس پر غور فرما رہے تھے۔ یہ مرزا غالب والی ٹوٹی کا آخر تھا؟

غالب میرے پیچھے اندھا گیا تھا۔ اس ٹوٹی کو بھلا مجھ سے کیا نسبت تھی کہ میرے سر پر اچھی لگتی۔ وہ بات ہے۔ ناؤ آگے چلنے لگی۔ "برتن خالی ہو تو اس پر دھکنا لگانے کی کیا ضرورت ہے؟"
میں نے کہا۔ "کل کیسے؟"

"بہت اچھی ہے۔ مجھے تو بہت اچھی لگتی ہے پہلے سے۔ تم کو بہت یاد کرنی چھٹی۔ ناؤ نے کہا۔ کل بہت انتظار کرتی رہی تمہارا جب ہم نے واپس آکے بتایا کہ وہ تو کہیں چلے گئے..."
"لا حول و لا قوہ۔ یہاں جسے دیکھو یہ سمجھتا ہے کہ میں منہ باد جہازی کی طرح منڈا اٹھا کے گھومتے چلا گیا تھا؟" میں نے کہا۔
ناؤ نے ایک پردہ ہٹا کے کہا۔ "ادھر تشریف لائے۔ یہ ہے فی الحال ہمارا دولت خانہ۔"

اندھا وہاں بھی تھا۔ گلاب میری آنکھیں اس اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ خراس اندھیرے میں لوگ زندگی کیسے گزار رہے ہیں! باہر اتنا الجلا دلتا ہے اور اندر ہر وقت رات۔ نئی۔ سیلن اور بو۔

"بھائی سلندر؟" گل کی آواز پر میں چونکا اور میں نے پلٹ کے دائیں طرف دیکھا۔ وہ ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی حالت یقیناً پہلے سے بہتر تھی۔ میں اس کے پاس بٹھ گیا۔
"تم کو کچھ صحت مند دیکھ کے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔"
"نما اور ادھر ادھر دیکھا۔ وہ ایک کوریڈور سا تھا جو تقریباً بیس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا تھا۔ اس میں عجیب خانہ و رانی کی کیفیت تھی۔ میری آنکھیں جسے تلاش کر رہی تھیں۔ میرے کان جس آواز کے لیے ترس رہے تھے، اس کے بغیر وہ اندھا اور نہیں ہو سکتا تھا جو باہر سے زیادہ میرے دل کے اندر چھپا ہوا تھا۔



میں نے ناز کی طرف دیکھا اور کہا: ”راہو کہاں ہے؟“
ناز نے نفی میں سر ہلایا: ”مجھے تو نہیں معلوم“
میں نے غصے سے اس کی صورت کو دیکھا۔ وہ بالکل سنبیدہ تھی اور
کسی شرارت پر مائل نظر نہ آتی تھی۔
”تھیں نہیں معلوم تو پھر کسے معلوم ہوگا؟“ میں نے کہا۔
”اے کہ بابے میں بھی یہی عرض کر سکتی ہے بندی...“
”نازو! خواہ مخواہ پریشان مت کرو مجھے۔ میرا دماغ خراب ہو
رہا ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”دماغ خراب ہو رہا ہے تو باگل خانے جائیں۔ یا نکل جائیں
کسی صبح کی طرف راہ رو ملتا ہے؟“ ناز نے کہا: ”مجھے دست دراز
میں کیا ان کی پراپرٹی سیکرٹری ہوں کہ ان کے پروگرام کی خبر رکھوں؟“
گل بننے لگی: ”بھائی! سکندر! وہ دونوں ہمیں اسٹے گئے ہیں۔
راہو ہی کا کوئی کام تھا۔ کہہ رہے تھے کہ وہ سپرنٹنڈنٹ لوٹ آئیں
گے لیکن شام بھی ہو چائے تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور کسی
کو ان کی تلاش میں جانے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ خود آجائیں گے۔
بہتر ہے سب اسی جگہ رہیں تاکہ ریز ہو کر ایک ایک کر کے دوسرے کی تلاش
میں نکل گیا اور دوسرا آیا تو تیسرا غائب۔“
میں نے مفصل معلومات حاصل ہو جانے کے بعد محسوس کیا کہ
وہ سب انڈیشے جو میرے احساس پر دھندلی طرح چھلے ہوئے
تھے چھٹ گئے ہیں۔ میں نے ناز کو شرمندہ کرنے والی نظروں
سے گھوندا۔

ناز نے گل کو ڈانٹا: ”چپ نہیں رہ سکتی تھیں تم کوئی ضرورت
نہیں تھی اپنے بھائی سکندر کو کچھ بتانے کی۔ ہوتے پریشان تو چھا
تھا۔ ہم کیا کم پریشان رہے رات بھر؟“
”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“ گل نے کہا۔
”یہ میرا فرد! فردا ہر ایک کو نہیں بتا سکتا۔ شام کو ایک پریس
کانفرنس سے خطاب کروں گا۔“ میں نے کہا: ”اس میں وہ سنسنی خیز تفصیلات
بیان کروں گا کہ سب پر جو وہ طبق روشن ہو جائیں گے“
”گل! جوہر طبق یا کسی سے جوہر طبق؟“ ناز نے کہا: ”میرے صفے
کے طبق ابھی روشن کروں۔“

”ابھی تو میری آنکھوں کے آگے بھی اندھیرا چھا رہا ہے...“
”وہ ایسا ہے... کہ یہاں اندھیرا ہی ہے۔“ قصور آپ
کی آنکھوں کا نہیں ہے۔“ غالب نے کہا۔
”قصور میرے پیٹ کا جس میں دوڑنے والے چوہے
بھی بھیک سے ڈھال پڑے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”آپ لوگ کیا غالی ہاتھ آگئے ہیں؟“ ناز نے کہا: ”کھانے

کے لیے کچھ نہیں لائے۔“

”گھر میں کچھ نہیں ہے؟“ میں نے بالوسی سے کہا۔
”گھر، یہ گھر ہے؟“ ناز نے کڑکے کہا: ”آپ لوگوں نے
کیا سمجھا تھا کہ واپس جاؤں گے تو گرم گرم کھانا تیار کیا گیا۔ ہم
ہانڈی جو لیے ہیں لگ جائیں گے بغیر ہانڈی چلے گئے۔...“
غالب نے کہا: ”اس لیے میں نے کہا تھا کہ بیچ کر لو رہو
نہیں مانے اپنے سکندر! اعظم! بھروسہ خراب کرنا تھا کہ ہاتھ
پیرسٹس۔ محبت کی بیچیں ہو گئی تھیں۔ اچھا ہوتا اگر دعوت اڑا کے
آئے اور میری تان کے سوجائے۔ ان چھوٹے عموں سے تو قلع کھنا
یہ عیبت ہے۔ ان کے پاس دس ہسائے ہیں حرام خوری کے۔“
غالب کے ہتھے! بیس چھوڑا اور حرام خور کھتے ہوئے نازو
نے کڑکے کہا: ”کچھ لائے دیکھنا پکڑنے کو۔ کچھ ہے یہاں؟ اور ہو
بھی تو ہم کیا اس کام کے لیے رہ گئے ہیں۔ نوکر ہیں تمھارے۔“

”نوکر نہیں کر سکتا اور کینز ریز خربہ سبے شک تمھارا ہی کام
ہے کہ پکاؤ۔ پھر ہمیں کھلاؤ۔ خود پکا ہوا کھاؤ اور خدمت کرو ہماری
صبح سے رات تک۔“ پتھوری سی لعلٹ کیا وہ دس تھیں ہم تو سر چڑھ
گئی ہو۔ اوقات بھول گئی ہو اپنی۔ زبان چلائی ہو ہمارے سامنے گستاخ
کینز پاؤں کی جوتی! ظاہر ہے اس استعمال انگریزی کے نتیجے میں
فدا ہو سکتا تھا۔ نازو نے جتنی بات سن لی تھی وہی بہت نفی بخود
غالب کا بھی مقصد یہی تھا کہ نازو اس پر دست دلاؤ کرے۔ ایسی ہی
محبت اچھی بنتی تھی اسے۔ وہ اس وقت میری پیاد میں خود کو محفوظ
سمجھ رہا تھا چنانچہ اس نے باہو کی بنی ہوئی نازو کے ساتھ آتش پاک
حساب کی گئی یہاں تک کہ نازو کو آگ لگ گئی۔ جو کم تھی اور
غیر محفوظ بھی تھی چنانچہ میں نے نازو کو روک لیا۔
”یہ کیا کرتی ہو موقع محل تو دیکھا کرو۔ یہاں تم شاہی جاؤ گے؟“
میں نے کہا: ”تمھارے لیے تو دل لگی ہے؟“

”یہ دل لگی کی بات نہیں ہے۔“ نازو نے کہا۔
”یہ دل کو گھسنے والی بات ہے۔“ غالب نے کہا: ”کوئی کچھ بھی بات
ہے اس لیے میں لگ گئی ہیں۔ مگر ہم حق کو ہیں۔ مرا جائیں گے مگر بات
منہ پر نہیں لگے۔ ابھی تو خاموش ہیں ہم۔“
”یار غالب! میں نے ہنستے ہوئے کہا: ”خواب ہے یہ غاموشی
بھی۔ اس کی کتنی زندگی ہے۔ بہت دن بعد مجھے ایسا لگ رہا ہے
جیسے میں واقعی اپنوں میں ہوں۔ اور جہاں اپنے ہوں وہی تو اپنا کھر
ہوتا ہے۔ کل رات میں ایک بہت عالی شان محل میں تھا مگر وہاں
یہ سکون، یہ اپنائیت کی خوشی اور یہ راحت کا احساس نہیں تھا۔ جو
یہاں ہے۔ کاش! یہ ممکن ہوتا کہ آج کے دن پر قناعت کر سکتے۔
اگلے دن کی ضرورت کو نظر انداز کر سکتے۔“

”قناعت۔ سکون۔ پٹھراؤ۔ شاید یہ ہماری فطرت کے خلاف
ہیں۔ کائنات کا نظام ایک مسلسل حرکت سے ہے۔“ غالب نے کہا۔
”ہر دن گزر جاتا ہے۔“ اچھا ہونے کے باوجود۔
”میرے لیے تو ہر آنے والا دن اچھا ہے۔“ گل نے کہا: ”اس
دن سے جو گزر چکا۔“

میں ہنس پڑا۔ ہم سب بھی تو آنے والے اچھے دن کی امید
کے سفر میں ساتھ ہیں۔ آنا میرا نہیں ہونے کی ضرورت ہے۔“
غالب نے چٹکی بجا کے کہا: ”ابھی کھانا لے کر آیا۔ بیٹھی
دیرانی ملے والی۔“

”منو جی! میرے لیے کچھ بھی لے آنا۔“ نازو نے کہا۔
غالب رنگ لگا۔ اس کی ذرا نش کے انداز محبوبی نے غالب
کو ریشہ خطی کر دیا۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ کچھ بھی لے آنا۔ یا ہم سب کی
بات کر سکتی تھی۔ اس نے کہا: ”میرے لیے۔“ تو غالب کے دل پر
گر با پتھری چلا دی۔ اس نے ہاتھ سینے پر رکھا اور جھجک کر بولا: ”میر
کے بغیر میں واپس نہیں آؤں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے جانا پڑے
کراچی۔“ نازو نے ساختگی یا بے خیالی میں جو کہہ جاتی تھی اسے اڑائے

حق کی مصروفیت کے سوا کچھ نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ جب ہم بنے تو
اس کا رنگ گلابی ہو گیا۔
”میرا مطلب... تھا... سب کے لیے... وہ جھجک بولی۔
”اب یہ ناممکن ہے کہ وہ سب کے لیے کھیر لائے۔ شرط
لگاؤ۔“ میں نے کہا۔

آؤ مجھے پچھلے بیس شرط جیت گیا۔ غالب باقی سب کے
لیے حاجی علی کی دکان کے بازار سے بیٹھی ریانی لایا تھا اور صابو کی۔
کچھ کا وہ صرف ایک پیار لایا تھا جو اس نے بڑی عاشقانہ نیاز مندی
کے ساتھ ناز کو پیش کر دیا۔
”یہ بھی کھا میں گئے۔“ میں نے کہا۔
”ایمان سیکھ ناندول گا اس کی جس نے فدا ہوا آنکھ اٹھا کر
بھی دیکھا۔ یہ بڑی میٹھی کھیر ہے۔“ غالب نے کہا: ”یہ میرے
جذبات کی کھیر ہے۔“

گل بننے لگی: ”اگر کھیر نہ ملتی تو...“
”میں ابھی کھیر نہ کے پیش کر دیتا۔ آج زندگی میں پہلی بار تو
اس نے کچھ مانگا جسے صرف اپنے لیے۔“ غالب بہت خوش تھا
شرماتے ہوئے نازو نے خاصا نکٹ اور متعجب کیا لیکن
غالب نے پروا نہیں کی۔ کھیر سے یہ کھانی پڑی۔ پھر میں سو گیا۔
تا کہ کڑکے کر جیسے ہی راہرو احمد سن آئیں مجھے جگا دیا۔
”کتنے شرم کی بات ہے۔ تم کو خود جاگ اٹھا جاتے۔“ نازو نے
کے ساتھ۔ تمھارے دل کے آئینے کا لام میں محبت کی چابی

خوف!

ایک ایسا مسئلہ جس سے ہر شخص دوچار ہے
خوف سے آدمی پریشان ہوتا ہے۔
خوف سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔
خوف سے زندگی ناکام ہو جاتی ہے۔
خوف سے ازدواجی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔
خوف سے آدمی خودکشی کر لیتا ہے۔

خوف دیک کی طرح زندگی کو جاتا رہتا ہے۔
شرم بھی خوف ہی کا ایک پہلو ہے اور تا جب تک



خوف و شرم

اور اس کا سر باب
کا مطالعہ کیجیے
اور ان کمزوریوں سے نجات حاصل کر کے
کامیابان خوش و خرم زندگی گزار لے

قیمت: ۴۰ روپے

مکتبہ نفسیات پوربند ۹۲۳ کراچی ۱

نہیں رہی کیا؟ غالب نے کہا۔

”یہ جانی والی محبت نہیں ہے، میں نے کہا، ”تم آتی دیر کیا کرو گے؟“ فاطمہ صحت بیٹھو۔ دیکھو جسے دل چاہے مگر زبان سے میرا رات کا فساد بھی سناتے ماؤں؟

”پھر تم کی باتاؤں کے پریس کا نفرنس میں؟“

”یہی سب کچھ، رات ڈرامہ بھانپنا، میں نے کہا۔“

جب میں کوکر اٹھا تو ہر سوانہ میرا تھا اور خاموشی بھی پہلے تو مجھے لگان ہوا کہ یہ وہی اندھیرا ہے جو دن رات کی قید سے بے نیاز ہے۔ مگر ایک کونے میں بیٹنے والی لالین نے مجھے رات کی خبر دی۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور پھر دوبارہ دیکھی۔ اس میں رات کے دس بج رہے تھے۔ میں ساڑھے چھ سات گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔

قدرتی طور پر سب سے پہلے مجھے بالوکا خیال آیا۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئی؟ اس گھر سے میں نے ایک پنجرہ لہنا زیادہ مناسب تھا اب میں اکیلا تھا۔ کبھی بھی اپنے بستر پر موجود نہ تھی۔ میں نے اس خراب میں آباد دوسرے خاندان کے افراد کی آوازیں سنیں۔

کہیں تک مرد اور عورت ایک دوسرے پر جھارے تھے۔ ایک بچہ ایک سڑا روئے میں مسلسل رہ رہ کر ہاتھ دھو رہا تھا۔ کسی نے ہار نویم کے ساتھ زیادتی کرنے کی قسم کھائی تھی۔ ہار نویم بھی رہ رہ کر ہاتھ دھو رہا تھا۔ میں اٹھ کے باہر آیا اور اسے کوڑہن میں رکھ دیا۔ بچے سے نیچے اترنا۔ مجھے کچھ فاصلے پر وہ بچوں کی ریت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے قریب جان کر دیکھنے کے بعد وہ ابھی ثابت ہوئے۔ میں نے دوسری طرف نظر ڈالی۔ سمندر کے کنارے اندھیرا کبھی گہرا نہیں ہوتا۔ وہی وحشت لگا یہاں بھی تھا جو کراچی کے ساحل کی ”ماریک راتوں میں نظر آتا تھا۔“ مجھے دو کچھ سامنے سے متحرک دکھائی دیے۔

یہ غالب اور نازو تھے۔ وہ بڑی بے فکری سے ریت پر ٹھل مٹے تھے۔

”ہینسو چیف کے ٹو“ غالب نے کہا۔ ”ہینڈ پوری ہو گئی؟“

”میں نے کہا۔“ وہ لوگ نہیں آئے؟“

”کون لوگ؟“ چوہدری دلاور وحیدہ نہیں وہ نہیں آئے؟ غالب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ دونوں ننگے پاؤں تھے۔

”غالب! میں سمندر میں چھینک دوں گا۔“ میں نے بھنا کے کہا۔

”کیا ہے؟“ اور پھر جوتے پہنے ہی اتار دیے۔

”لاحول ولا قوۃ۔“ بھائی ہم سے پوچھو کہ نازو کہاں ہے تو ہم بتا دیں گے۔ غالب نے کہا۔ ”البرہ کی خیر تم کو ہوتی جائے؟“

میں اس کے پیچھے دوڑا اور وہ پلٹ کے بھاگا مگر بیس چھتیس قدم دوڑنے کے میں نے اسے پکڑ لیا اور اٹھا کے پانی کی طرف چل پڑا۔ نازو نے بالکل مداخلت نہیں کی۔ اس نے تو کہا کہ ذرا آگے لے جا کر چھینکناسی شادک کے سامنے۔

غالب نے شور مچایا۔ ”یاؤ کا دھاندلی ہے۔ ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔ مجھ سے نازو نے کہا تھا کہ تم بتانا۔ اسے پھینکو۔“ مگر میں نے اسے پانی میں پھینکنے کے بعد کہا ”اب بولو!“ غالب کو تیرہ ناخنیں آتا تھا۔ ایک بہت بڑی لہر کو اپنی طرف آتے دیکھ کے وہ واپس دوڑا۔ میں نے اسے پھر پکڑ لیا۔ ”یا ز میں ٹوبہ گیا تو....“

”کوئی بات نہیں۔ ایم آر ایس ٹوٹے گی نہیں۔ نازو بھی خوش رہے گی تمہارے بغیر۔“ میں نے کہا۔ اور اسے پھر اٹھا لیا۔

”یا۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ ادھر۔۔۔۔۔ غالب نے چلا کے کہا۔“ اگلے کے ساتھ ہے، ”مگر اس وقت تک میں پھر اس کو پانی میں اچھال چکا تھا۔ وہ سخت کٹا جھلکا باہر آیا اور اس کی نازو سے لڑائی شروع ہو گئی۔ ”مروادو اٹھا بھی مجھے خوب دانت نکال رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں شادک کے سامنے ڈالو۔“ تم کم ہو کسی شادک سے۔“

”میں شادک ہوں؟“ نازو نے چلا کے کہا۔

میں آگے نکل گیا اور سمندر کے شور میں ان دونوں کی آواز دب گئی۔ یا شادو خد سمندر کا شر اسے مائل سے دب گیا جو میرے وجود میں اچانک برپا ہو گیا تھا۔ ساحل پر کاؤ کا لوگ اور بھی تھے۔ ان میں بیشتر اسی علاقے کے رہنے والے تھے جو اپنے لباس اور خلع سے پہچانے جاتے تھے۔ میری نگاہیں بہت کم تک دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور میرے قدم تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔

دل کی دھڑکن کی طرح۔ وہ اچانک نمودار ہوئی۔ بالکل ایسے جیسے دلو مالا لاتی قہقہوں کی کوئی مخلوق جو سمندر کے جھاگ سے سطح آب پر شش خیال کی طرح تیرتی ہوئی آگے اور پچھتے ہو جائے۔ اس نے سینہ ساری باندھ لی تھی جو تیز ہوا میں بادل کے ٹکڑے کی طرح لٹکتی تھی جس نے چاندنی کو سمولیا ہو۔ میں خواب زدہ شخص کی طرح چلتا گیا یہاں تک کہ اس کے اور میرے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات گیارہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں